اڑیسہ میں اردو

حفیظ اللہ نیولپوری

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

اڑیسہ میں اردو

حفیظ اللہ نیولپوری

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

اڑیسہ میں اردو

حفیظ اللہ نیولپوری

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

Orissa Mien Urdu

By

Hafeezullah Newalpuri

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : اکتوبر، دسمبر 2001 شک 1923

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/157

سلسلۂ مطبوعات : 885

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی۔110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست ابواب

باب اوّل		اڑیسہ میں اُردو کا سیاسی، تاریخی اور ثقافتی پس منظر	9
باب دوم		اڑیسہ میں اُردو شاعری کا ارتقاء	74
باب سوم		اڑیسہ میں اُردو نثر کا ارتقاء	183
باب چہارم	(الف)	اڑیسہ کا اُردو اسٹیج اور اُردو ڈرامے	231
	(ب)	اڑیسہ میں اُردو صحافت	268
باب پنجم	(الف)	اڑیسہ میں عہد جدید میں اُردو کی صورت حال	321
	(ب)	عہد حاضر میں اڑیسہ میں اُردو تعلیم کی صورت حال	409
	(ج)	اڑیسہ میں اُردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے	421
	(د)	اڑیسہ میں اُردو کی اشاعتی سرگرمیاں	443
باب ششم		حاصل مطالعہ	452
		کتابیات	481

پیش لفظ

اُڑیسہ اردو کے مرکز سے دور رہا ہے۔ اردو یہاں کے باشندوں میں مشکل سے دو فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اردو کی باضابطہ ابتدا، بارہویں صدی سے ہوتی ہے جب ۱۱۹۳ء میں مسلمان پنجاب میں تقریباً دو سو سال رہنے کے بعد محمد غوری کی قیادت میں دہلی اور اس کے نواح میں داخل ہوئے۔ علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کے دورِ حکومت اردو دکن کے غیر ہندآریائی علاقہ میں پہنچی جہاں بہمنی سلطنت کی سرپرستی میں اسے پروان چڑھنے کا موقع ملا اور اپنی جائے پیدائش سے پہلے دکن میں یہ زبان پھولنے پھلنے لگی اور دکن کے طول و عرض میں رابطہ کی زبان بنی۔

۱۵۷۰ء میں پہلے پہل جنوبی اُڑیسہ میں مسلم حکومت کا پرچم گولکنڈہ کے سلطان نے لہرایا۔ دوسری طرف فیروز شاہ تغلق کے ساتھ فوجی آئے۔ بعد میں شمالی ہند سے تجارت کی غرض سے بھی لوگ آتے رہے اور ان کی آمد اس فراوانی سے تھی کہ یہاں کی مقامی اُڑیا زبان پر بھی اس کے اثرات بہت جلد حاوی ہونے لگے۔ علاؤالدین خلجی کے بارے میں یہاں کے سنسکرت شاعر وشوناتھ کوی راج نے بھی تذکرہ کیا ہے اور جے دیو نے بھی لکھا ہے کہ علاؤالدین خلجی کا خاندان اس وقت اُڑیسہ کے جنوبی کنارے تک آچکا تھا۔

ناطق لکھنوی کی رائے میں اُڑیسہ میں اردو براہ مرشدآباد آئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُڑیسہ میں اردو بیک وقت مختلف مقامات سے آئی۔ چونکہ اس زمانہ میں اڑیسہ کو تجارتی اہمیت حاصل تھی اور اسلامی حکومت کے زیرِ اثر اردو زبان کو پھولنے پھلنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

اُڑیسہ میں اردو کی ناقابلِ اعتناء آبادی کے باوجود اردو زبان وادب کے ارتقاء میں اس دور افتادہ علاقہ کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فراموش کیا نہیں جاسکتا اور جبکہ ہندوستان

گیر پیمانہ پر علاقائی طور پر اردو کے ارتقاء کا تحقیقی جائزہ مختلف علاقوں میں اردو کی صورت حال سے واقفیت بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ علاقائی سرگرمیوں کو اردو تحریکوں سے مربوط و منسلک کرتا رہا ہے۔ اُڑیسہ میں اردو کے ارتقاء کا تحقیقی جائزہ ضروری تھا کیونکہ کسی زبان کی تاریخ اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک مختلف علاقوں کی تہذیب اور زبان کی روایت کو تاریخی حیثیت سے اس میں سمیٹ کر پیش نہ کیا جائے۔

پیش نظر مقالہ کے باب اول میں اُڑیسہ میں اردو کے سیاسی، تاریخی اور ثقافتی پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اڑیسہ میں اردو تعلیم کی روایت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم میں اُڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقاء کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں ہردے رام جودت، مولوی محمد سلطان راجی، شیخ امین اللہ چرخی، عبدالمجید بھونیاں حیا، خاتم پہراج پوری، ظہور الحق ظہوری، مجرم سمبل پوری، فیض النساء تسخیر، شمس الحق شمس، محمد یوسف یوسف، معلم سمبل پوری، عبدالرحیم احسن، عبدالستار عبد، اشرف علی کٹکی، اظہار علی کٹکی، اولاد مرتضیٰ کٹکی، جان محمد حازم، محمد محسن محسن، نور علی انور، عبدالعزیز عاشق، مولا بخش شاہ مولا، مولوی رحمت علی رحمت اور امجد نجمی کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء سے متعلق ہے۔ اس باب کے حصہ اول میں مولوی محمد سلطان راجی، محمد یوسف یوسف، شیخ غلام غوث، مولوی رحمت علی رحمت، مولوی عبدالرشید نقاد، امجد نجمی، پنڈت لکشمی نرائن مصرا اور شیخ حبیب اللہ کی نثری نگارشات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں اُڑیسہ کے اردو اسٹیج اور اردو ڈراموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور آخری حصہ میں اُڑیسہ میں اردو افسانوں کی پیش رفت کا محاسبہ کیا گیا ہے۔

باب چہارم کے حصہ "الف" میں اُڑیسہ میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور اُڑیسہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ المنصور سونگڑہ، ہفتہ وار مسلم گورٹے کٹک ہفتہ وار دور جدید کٹک، پندرہ روزہ بیداری کٹک، دو ماہی/ ماہنامہ شاخسار کٹک اور ماہنامہ صدائے اُڑیسہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حصہ "ب" میں اُڑیسہ میں اردو تنقید کے ارتقاء کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور حصہ "ج" میں اُڑیسہ اردو تحقیق کی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب پنجم "عہد جدید میں اُڑیسہ میں اردو کی صورت حال" کا تفصیلی مطالعہ پیش

کرتا ہے۔اس باب کے حصّہ "الف" میں اُڑیسہ کے ۲۸ شاعروں کا تذکرہ اور باہر کے ان ۱۳ شاعروں کا بھی تذکرہ پیش کیا گیا ہے جن کا قیام زمانۂ دراز تک اُڑیسہ میں رہا اور جو اردو کی تحریکوں سے براہِ راست وابستہ رہے ہے۔ حصّہ "ب" میں موجودہ دور میں اُڑیسہ میں اردو تعلیم کی صورتِ حال کا صحیح جائزہ لیا گیا ہے۔ حصّہ "ج" میں اُڑیسہ میں اردو کے ادبی اور ثقافتی اداروں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حصّہ "د" میں اُڑیسہ میں اردو کی اشاعتی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور زمانۂ قدیم سے آج تک کی تمام مطبوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ششم حاصل مطالعہ ہے جس میں پوری تحقیق کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے اور نتائج میں اُڑیسہ میں اردو زبان کی نشو و نما کی مخصوص صورتِ حال اور اصل سرچشموں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے اعتبار سے اُڑیسہ میں اردو کی لسانی خصوصیات اور دکنی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ادبی اعتبار سے اُڑیسہ میں اردو کی ادبی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مختصر جائزہ سے مراد یہ ہے کہ اردو دہلی اور لکھنؤ اور دکن میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان علاقوں کی تہذیبی خصوصیات کو سمیٹ کر اور ان اثرات کو اپنے جلو میں لے کر اور اپنا کر ابھری ہے اور اس اعتبار سے وہ ایسی کل ہند زبان اور ادب کی نمائندہ ہے جو قومی بھی ہے اور علاقائی انفرادیت کی خوشبو سے بھی مالا مال ہے۔

راقم الحروف کو پیشِ نظر مقالہ کے سلسلہ میں مواد کی فراہمی کے لئے اڑیسہ کے دور دراز علاقوں میں برسوں بھٹکنا پڑا ہے۔ اُڑیسہ کے اردو شعراء اور ادیبوں کے حالات فراہم کرنا تو ایک مشکل امر تھا ہی لیکن زیادہ پریشانی کن ان کا نمونۂ کلام مہیا کرنا تھا۔ اکثر شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع نہیں ہوئی ہیں۔ ان کی تخلیقات کے نمونے مختلف وسائل سے حاصل کیے گئے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں جن لوگوں نے تعاون کیا ان کا احسان "اُڑیسہ میں اردو" پر ہے۔ بہر حال اس ضمن میں مندرجہ ذیل حضرات کا راقم الحروف تہہ دل سے شکر گذار ہے۔

ڈاکٹر کرامت علی کرامت، الحاج معین الدین احمد، الحاج محمد رفیق ایڈوکیٹ، جناب خالد رحیم، جناب علی حسن جیبی، ڈاکٹر شیریں پروین، جناب محمد عبداللہ، پروفیسر سید منظر حسن دسنوی۔ ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر نصیر احمد خان، جناب الطاف حسین، حسرت سمبلپوری، جناب شفیع الدین، جناب سلیمان خاکی، جناب اسماعیل آذر، ڈاکٹر انوار الحق، پروفیسر شاہ مقبول احمد، جناب تجمل علی فہمی، جناب اصغر علی گدا، مولوی مطیع اللہ نازش، یوسف جمال، خان نیازی امروہوی۔

راقم الحروف استاد محترم پروفیسر محمد حسن کی خدمت میں سپاس گزار ہے جنہوں نے پوری توجہ کے ساتھ اس مقالہ کی تکمیل میں نگرانی فرمائی اور ضروری مشوروں سے نوازا۔

محبی عبدالباسط خاں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جو دہلی میں چار سالہ قیام کے دوران میرے جذبۂ عمل کو مہمیز کرتے رہے اور مقالہ کی تزئین میں خاصی زحمت قبول کی۔ آخر میں جناب عبدالمنان گیاوی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے انتہائی خلوص اور محنت سے مقالہ کا سرورق اور ابواب کے عنوانات میں حسن تحریر کا ثبوت دیا ہے۔

حفیظ اللہ نیولپوری
ہندوستانی زبانوں کا مرکز
اسکول آف لنگویجز۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی ۶۷ ۱۱۰۰

۲۷ ستمبر ۱۹۸۴ء

باب اول

اُڑیسہ میں اردو کا سیاسی، تاریخی اور ثقافتی پس منظر

اُڑیسہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر تقریباً پانچ سو کیلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس ریاست کے مشرق میں بنگال کی کھاڑی، شمال مشرق میں مغربی بنگال، شمال میں بہار، مغرب میں مدھیہ پردیش اور جنوب مغرب میں آندھرا پردیش واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۱۵۵،۷۰۷ مربع کیلومیٹر ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۲،۶۳،۷۰،۲۷۱ ہے جن میں سے مردوں کی تعداد ۱،۳۳،۰۹،۷۸۶ اور عورتوں کی ۱،۳۰،۶۰،۴۸۵ ہے۔ اس مجموعی آبادی میں سے ۳۱،۱۰،۲۸۷ افراد شہروں میں بستے ہیں تو ۲،۳۲،۵۹،۹۸۴ دور دراز علاقوں دیہاتوں کی آبادیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ صوبہ اُڑیسہ، کٹک، پوری، بالیسر، سمبل پور، کیونجھر، ڈھینکا نال، میور بھنج، کوراپٹ، پھول بانی، بلانگیر، کالاہانڈی، گنجام اور سندر گڑھ کے تیرہ اضلاع میں منقسم ہے۔

۱۹۳۶ء میں اُڑیسہ بہار سے الگ ہو کر ایک خود مختار صوبہ کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ اس وقت اس کا رقبہ نسبتاً کم تھا اور اس میں صرف کٹک، پوری، بالیسر، گنجام، سنبل پور اور کوراپٹ یہی چھ ضلعے تھے۔ ان چھ ضلعوں اور ۲۷ ریاستوں کے اشتمال سے صوبہ اُڑیسہ کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد کانگریس سرکار نے علاقائی ریاستوں کو اس صوبہ میں ضم کرنے کا تہیّہ کیا اور نتیجہ کے طور پر

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو میور بھنج کے علاوہ باقی ۲۳ رجواڑے صوبہ اُڑیسہ میں ضم کر دیئے گئے۔ اور ایک سال کے بعد میور بھنج بھی اڑیسہ میں شامل ہو گیا۔(۱)

ویسے اُڑیسہ کی اپنی قدیم تاریخی حیثیت ہے۔ اس کے قدیم ترین نام کلنگا، اُتکل اور اوڈرا رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ موجودہ حدود سے کہیں دور دور تک اڑیسہ کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ مہابھارت کے زمانہ میں کلنگا، اُتکل اور اوڈرا طاقتور ریاستوں کی حیثیت سے آریائی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ مہابھارت میں کلنگا کا بار بار ذکر آیا ہے، اوڈرا اور اُتکل کا بھی قابل اعتنا تذکرہ ہوا ہے۔ مہاویر اور گوتم بدھ کے زمانہ میں کلنگا، اُتکل کے علاقہ نے پورے مشرقی ہند میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

اُڑیسہ کے نام کے ماخذ کے بارے میں تحقیقی نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ متقدمین یونانی مصنفوں نے جن لوگوں کو "Oretes" کہا ہے، انھیں سنسکرت میں Odras کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر Pliny نے اپنی تصنیف Natural History (پہلی صدی عیسوی) میں ہندوستانی نسلوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس میں ان لوگوں کو "Oretes" بتایا ہے جن کا قیام Maleus کے پہاڑی علاقوں میں تھا اور وہ وہاں کے باشندے تھے۔(۲) Pliny نے ان کے ساتھ ساتھ Menedes اور Suaris لوگوں کا تذکرہ بھی اسی Maleus کے پہاڑی علاقوں کے باشندوں کے طور پر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نبین کمار ساہو نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ پلینی کے تذکرہ کے مطابق Menedes اور Suaris موجودہ دور کے Mundas اور Savara ہی ہیں۔ اور مذکورہ بالا Maleus کا پہاڑی علاقہ دراصل ڈھینکا نال ضلع کے پال لہڑا کے جوار میں واقع Malaya Hills یا MALYAYANA ہیں جہاں زمانۂ قدیم سے منڈا اور سورا قبیلے کے لوگ وافر تعداد میں قیام پذیر ہیں۔

---

(1) वृन्दावन चन्द्र आचार्य: उत्कल की भौगोलिक रूपरेखा: (1) राष्ट्रभाषा रजत जयंति ग्रंथ - 1959

(2) Cunningham: Ancient Geography of India P 586

مذکورہ بالا حوالہ میں مندرجہ ہندوستانی نسلوں کی فہرست بلینی نے Maghiotheres کے تذکرہ مرقومہ چوتھی صدی قبل مسیح سے حاصل کی ہے۔[1] اس لئے یہ جانچنے کی ضرورت ہے کہ یونانی اصطلاح Oretes سنسکرت کی اصطلاح Odras کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا اس دور میں مروجہ سنسکرت کی اصطلاح یونانی اصطلاح سے مشتق ہے۔ سنسکرت کی اصطلاح Odras کے ڈانڈے منو (دوسری صدی قبل مسیح) تک جاتے ہیں جبکہ قدیم مثنویوں اور پرانوں سے Oraland کا وجود مہابھارت کی جنگ کے زمانہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ یونانی اصطلاح Oretes اور سنسکرت کی Odras دونوں ہی or یا Orua سے مشتق ہیں جس کے معنی چاول کے ہوتے ہیں۔ درحقیقت زمانۂ قدیم سے لفظ Orua اڑیسہ میں استعمال ہوتا رہا ہے جو یونانی زبان کے لفظ Oruza کا ہم معنی ہے اور چاول کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں Oruza کے باب میں یوں تحریر ہے:۔

Oruza is a loan word in Greek from some Oriental Source.

اس طرح سے Oretes یا O-r (Odras) لوگ چاول خور یا چاول پیدا کرنے والے لوگ رہے ہوں گے۔ عربی اور فارسی تصانیف میں اڑیسہ کا تذکرہ "ارشین" یا "ارسنین" کے طور پر نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ابن خردادبہ اور حدود العالم میں ملتا ہے۔ البیرونی نے ہندوستان پر اپنی مشہور زمانہ تصنیف (گیارہویں صدی عیسوی) میں اڑیسہ کو "اردا دیو" لکھا ہے جو بلا کم و کاست سنسکرت کے Odra Vishaya سے مطابقت رکھتا ہے جس کی تبتی اصطلاح Odivisa ہے۔ اواخر چودھویں صدی کے مورخ شمس سراج عفیف نے اس ریاست کو واضح طور پر "جاج نگر اوڈیسا" لکھا ہے۔ لیکن اس سے قبل سیما چلم کے سنگی کتبہ (۱۳۵۳ء) میں اڑیسہ کے لیے Odya Desa تحریر ہے جبکہ پندرہویں صدی کے اوائل میں سرکاری اور غیر سرکاری ریکارڈز میں عام طور پر اوڈیسا، اوڈیسا راشٹر، اور اوڈیسا راجیہ لکھا گیا ہے۔ گج پتی کپیلیشور دیو نے پوری کے جگن ناتھ مندر اور بھونیشور کے لنگ راج مندر کی دیواروں پر منصوب سنگی کتبوں ۱۴۳۶ء میں اپنے زیر نگیں ملک کا نام "اوڈیسا راجیہ" لکھا ہے۔

---

(1) Sahu, Dr N.K.: Historical Geography of Orissa: 1982 Orissa Sahitya Academy Silver Jubilee Souvenir: P-9

اُڑیا کے مشہور و معروف شاعر سارلا داس جنھوں نے کپیلشور دیو کے زمانہ میں اُڑیا زبان میں "مہا بھارت" لکھی ہے، کپیلشور دیو کی سلطنت "اوڈرا اشٹر" یا "اوڈیسا راشٹر" کے طور پر بیان کیا ہے۔

بہر حال اوڈرا علاقہ کی حدود ساتویں صدی عیسوی تک مکمل طور پر متعین نہیں تھی۔ اُس صدی کے اوائل میں کرنا سوورنا کے راجہ ششانک نے وانڈ بھکتی، اُتکل اور کون گوڈا کے علاقوں پر قبضہ کر کے مشرقی ساحلی علاقوں پر دور دراز تک اپنی حکومت پھیلا لی تھی اور ان علاقوں کا مالک و مختار بن بیٹھا تھا لیکن جلد ہی تھانیسر کے راجہ ہرش وردھن سے اسے ہزیمت اٹھانی پڑی اور ہرش وردھن نے مشرقی ساحلی علاقوں میں موجود گنجام تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ہرش وردھن کی ریاست میں اڑیسہ کا جو علاقہ شامل ہوا تھا وہ *Odra Vishaya* کے نام سے معروف تھا۔ چینی سیاح ہُوان چوانگ نے اس علاقہ کا *WUCHA* ملک کے نام سے تذکرہ کرتے ہوئے اس کی حدود ۷۰۰۰ لائی یعنی ۱۴۰۰ میل بتائی ہے۔[1]

تاریخ کے مختلف ادوار میں سیاسی حالات کی بنا پر "اوڈرا دیشہ" یا "اوڈرا دیس" میں طرح طرح کی تبدیلیاں عالم وجود میں آتی رہی ہیں لیکن مذکورہ بالا حدود کے مطابق یہ علاقہ اوڈرا لوگوں کی سرزمین رہی ہے اور کم و بیش یہاں کے باشندوں کی زبان اڑیا رہی ہے۔ ویسے جی اے گریرسن نے اڑیا زبان کے علاقہ کے حدود متعین کر دیئے ہیں یعنی شمال میں سنگھ بھوم اور مدناپور کے اضلاع سے لے کر دکن میں گنجام اور وشاکھاپٹنم کے اضلاع تک اور مغرب میں سنبل پور اور رائے پور کے کچھ حصہ سے لے کر مشرق میں سمندر کے ساحل تک اُڑیا زبان کا علاقہ قرار دیا ہے۔

قدیم اُڑیسہ کا تمدن

چند مختلف حکومتوں کے اشتمال سے اُڑیسہ کی تشکیل ہوئی۔ مذکورہ بالا حوالوں کے مطابق اس کے چند حصے اوڈرا، کلنگا اور اُتکل کے نام سے معروف تھے۔ ان اسماء میں کلنگا کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ حصہ ساحلی علاقوں میں گنگا سے گوداوری تک پھیلا ہوا تھا اور اُڑیسہ کے دوسرے علاقوں پر اختیارات حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کوروکشیتر کی جنگ سے سالہا سال

---

① Sahu, Dr. N.K.: Historical Geography of Orissa, Souvenir: Orissa Sahitya Academy, Silver Jubilee 1982 - P. 9

قبل کلنگا ایک با اختیار ریاست تھی اور اس وقت وہاں اگرچہ آریاؤں کی حکومت نہ تھی پھر بھی آریہ قوم کا حکمراں خاندان ان لوگوں کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کرنا اپنے لیے باعث توقیر سمجھتا تھا۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر بھرت (جن کے نام کے مطابق ہمارا ملک بھارت سے موسوم ہے) کے جدامجد تنّو اور کوروں کے شہزادے دریودھن کی کلنگا کے شاہی خاندان میں شادی قابل ذکر ہے۔

کلنگا کے راجہ شترو تا بُدھ نے چھ ہزار رتھ اور دس ہزار ہاتھی لے کر اپنے برادر نسبتی دریودھن کی موافقت میں کورو کھشیترا کی جنگ میں اہم حصہ لیا تھا لیکن بالآخر یہی جنگ کلنگا کی تباہی کا باعث بن گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شترتا بدھ کے ساتھ ساتھ ان کے تین بہادر لڑکے اس جنگ عظیم میں ہلاک ہوگئے تھے۔ اس جنگ عظیم کے بعد ایک نئے کھشتری شاہی خاندان کے زیر سلطنت کلنگا نے اپنا وقار اور اختیار پھر سے حاصل کیا۔ ۳۵۰ سال قبل مسیح مگدھ کے راجہ مہاپد مانند نے جب کلنگا پر فتح پائی تو اس وقت کھشتری خاندان کے ۳۲ راجہ کلنگا پر حکومت کر چکے تھے۔ مہا بھارت کی جنگ سے لے کر مہاپد مانند کے زمانہ تک کے طویل عرصہ میں سیاسی مفکرین، فلسفی اور مذہبی رہنماؤں کے ذریعہ کلنگا کے تمدن کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ اس زمانہ کے حکمرانوں میں شتمبھو کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شتمبھو کے دوران حکومت کلنگا کا شمار ہندوستان کی سات عظیم قوتوں میں ہوتا تھا۔[1]

کلنگا کا پہلا جین حکمراں کرکنڈ ویدیہہ کے راجہ نی می اور قندھار کے راجہ نکرجیت کا ہمعصر تھا۔ راجہ کرکنڈ جین مذہب کے تیئیسویں مذہبی پیشوا پارشیو ناتھ کا شاگرد تھا اور اپنی ریاست کے جینیوں کے علاوہ باہر بسنے والے جینیوں کا بھی سرپرست تھا۔ راجہ کرکنڈ کی رحم دلی، انسانیت پرستی، مذہبی احترام اور تبحر علمی کی بناء پر جین روایتوں نے اسے رشی راجہ کا لقب عطا کیا ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں جین مذہب کے چوبیسویں پیشوا مہاویر نے جین مذہب کی تجدید کی اور اس کے زیر اثر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جین مذہب اور اس مذہب سے متعلقہ تمدن میں کافی ترقی ہوئی۔ کلنگا کا حکمراں مہاویر کے والد کا دوست تھا۔ اس کی دعوت پر سوامی مہاویر اڑیسہ (کلنگا) آتے تھے۔ بھوبنیشور کے پاس ادے گری اور کھنڈ گری میں واقع کھار بیل کی ہاتھی گپھا میں

---

(1) Mahtab, Dr. H. K.: History of Orissa I P. 26.

موجودسنگی کتبے اس امر کے شاہد ہیں کہ کماری گری (بھوبنیشور کے قریب واقع اودے گری) کی چوٹی پر کھڑے ہو کر مہا بیرجی نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی تھی۔ان ہی گپھاؤں کے سامنے آبنوسی پتھر سے تعمیر مہابیر کی قدآور مورتی اب بھی وہاں موجود ہے۔

لیکن مہاتما گوتم بدھ کسی مقصد کے پیشِ نظر کلنگا آئے نہ تھے۔قدیم پالی ساہتیہ میں درج ہے کہ تپو اور بھک نام کے اڑیسہ کے دو تاجر بغرضِ تجارت راج گیر جارہے تھے۔ اروبیل کے مقام پر مہاتما بدھ سے ان لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی اور مہاتما بدھ نے حصولِ معرفت کے بعد اڑیسہ کے ان ہی دو تاجروں سے ستو اور شہد لے کر افطار کیا تھا۔نتیجتاً یہی دونوں افراد مہاتما بدھ کے اوّلین مُرید بنے اور ان ہی دونوں نے واپس آکر اڑیسہ میں بدھ مذہب کی اشاعت کی تھی۔ غالباً اسی دور میں مہاتما گوتم بدھ کے ایک حریف پورن کشیپ اڑیسہ میں اپنے مذہبی نظریات کی اشاعت میں مصروف تھے۔انھیں اعمال، اسباب اور حالات سے نظریاتی اختلاف تھا اور ان کا یہ اصول اس خطۂ ارض پر مقبول ہو چکا تھا۔پورن کشیپ ایک سیاح تھے اور کسی قسم کا لباس نہ پہنتے تھے۔لباس سے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ "شرم سے محفوظ رہنے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔شرم گناہ کا ثمرہ ہے۔میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، ہر طرح کی نفسیاتی خواہشات سے میں نے خود کو بری رکھا ہے اور میں مکمل طور پر پاک ہوں"۔

مذہبی اختلافات کی بنا پر اس وقت لوگوں کی قوتِ مفاہمت جواب دے چکی تھی اس لیے سماج میں عام طور پر پورن کشیپ کے نظریات کا استقبال کیا جارہا تھا اور کافی لوگ ان کے پیرو بن چکے تھے جن کی تعداد بہت ہی قلیل عرصہ میں اسّی ہزار سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد مہاتما بدھ کی تعلیم و تبلیغ سے متاثر ہو کر باشندگانِ اڑیسہ میں سے اکثر نے بدھ مذہب اختیار کرلیا۔مہاتما بدھ کی وفات کے بعد کوشی نارا مقام پر ان کی چتا کو نذرِ آتش کیا گیا تھا اور اسی مقام سے مہاتما بدھ کا دندانِ مبارک مندر میں رکھ کر پوجنے کی غرض سے انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ کلنگا کے راج دربار میں لایا گیا تھا۔ان واقعات کے پیشِ نظر اڑیسہ پر بُدھ مت کے اثرات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

برہمنوں کی مذہبی کتابوں میں چوتھی صدی عیسوی تک اڑیسہ کی سرزمین کو ناپاک قرار دیا گیا تھا۔اڑیسہ کی سیاحت کے خواہش مند لوگوں پر یہاں کے پنڈت مذہبی شرائط نافذ کر کے انھیں پاک رکھنے اور گناہ سے محفوظ رہنے کے لیے مذہبی انتظامات کیا کرتے تھے۔پانچویں اور چوتھی

صدی قبل مسیح میں سرزمین اڑیسہ ہر طرح کے اسباب نشاط سے مملو تھی۔ اس عہد میں اہل اڑیسہ نے بحری تجارت میں خاصی ترقی کرلی تھی۔ برما میں ایک تجارتی مرکز قائم ہو چکا تھا اور کلنگا کے جہاز بحر ہند سے ہو کر سیلون اور جاوا تک کا سفر کیا کرتے تھے۔ کلنگا کے مغرب میں موجودہ بلانگیر اور قرب و جوار کے اضلاع کے اشتمال سے "تئی تلک جن پد" سے موسوم ایک سلطنت قائم کی گئی تھی۔ گینڈے کے چمڑے کی تجارت کے سلسلہ میں اس ریاست کو کافی شہرت حاصل تھی۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ ٹیٹلا گڑھ شہر کا ہی نام زمانۂ قدیم میں "تئی تلک" تھا۔ بلانگیر ضلع کے سوم پور مقام سے سوراخ شدہ بہت سے سکے اُتر پردیش کے پالیا اور بجنور سے بھی برآمد ہوئے ہیں جس کی بنا پر شمالی ہند کے ساتھ "تئی تلک" کے تجارتی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

تقریباً چوتھی صدی قبل مسیح کے وسط میں مہاپدم نند کے ذریعہ کلنگا کے اوّلین نہری منصوبہ بندی کا آغاز ہوا تھا۔ اس زمانہ میں جو نہریں کھودی گئی تھیں ان کے ذریعہ زراعت کو کافی تقویت پہنچی تھی۔ نند راجاؤں کے زوال کے بعد اور ۲۶۱ قبل مسیح میں اشوک کی فتح کلنگا تک یہ ریاست ایک مخصوص وقفہ تک آزاد رہی تھی۔ اس سے قبل جس معاشی خوش حالی کا تذکرہ ہو چکا ہے اس نے کلنگا کو ایک عظیم قوت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جہاں عربوں کے ذریعہ بحر ایران اور بحر احمر میں، کار تھیج کے تاجروں کے ذریعہ بحر وسطیٰ میں تجارتی سلسلہ چل رہا تھا تو اس وقت کلنگا کے تجارتی جہاز بحر ہند پر چھائے ہوئے تھے۔

خود مختار کلنگا اور اس کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی بحری تجارت کی بنا پر موریہ سلطنت کے سیاسی اور معاشی حالات کو خطرہ لاحق تھا۔ اس کے ہی پیش نظر اشوک کو کلنگا کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا پڑا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر مگدھ کی یورش کو ناکام کرنے کی غرض سے جنگ کا پوری طرح مقابلہ کرنے کے لئے کلنگا بھی تیار ہو چکا تھا۔ اشوک نے اس جنگ کی روئداد بیان کرتے ہوئے تیرہ سنگی کتبوں میں صاف صاف اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس جنگ کے تباہ کن مناظر کے تاسف سے اس کے دل پر جو اثر پڑا اس سے اشوک کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ کلنگا کی اس جنگ کے اثرات کی بنا پر ہی اشوک نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔

مہاراج اشوک کی سرپرستی میں کلنگا مختلف ذرائع سے بدھ ازم کی تبلیغ کرنے والے آچاریوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اپگت کے وارث دھی ٹک کمار نے روحانیت کی جگہ کلنگا میں بدھ ازم کی تبلیغ کی۔ اس کی توسیع و اشاعت میں ان کے شاگرد کل (کرشن) اور ان کے بعد پوتھر، نے سرگرمی کے ساتھ

حصّہ لیا اور اس طریقہ کو کلنگا میں مقبولِ عام بنایا۔ اچاریہ دھرم رکھشت نے اپنی زندگی کے باقی دن کلنگا میں گزارے تھے اور وہاں بدھ مذہب کے تھسرادا کی تبلیغ کی تھی۔ بھوبک گیری وہار نامی ایک عظیم بدھ خانقاہ میں ان کا قیام تھا۔ اس خانقاہ کو اشوک نے تبت کے لیے تعمیر کروایا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کے باقی دن کلنگا میں گذارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

پہلی صدی قبل مسیح میں چیدی شاہی خاندان نے پھر سے کلنگا کو آزادی اور خودمختاری عطا کی تھی۔ اسی خاندان کے تیسرے حکمراں کھاربیل کا شمار اس زمانہ کے عظیم ترین راجاؤں میں کیا جاتا ہے جو روس کے بادشاہ جولیس سیزرس کا ہمعصر تھا۔ جولیس سیزرس کے ساتھ کھاربیل کے جنگی معاہدہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ثبوت کے طور پر شیشوپال گڑھ کی کھدائی کے وقت وہاں سے دستیاب ہونے والے وہ نایاب جنگی اسلحہ جات ہیں جن کا استعمال اس زمانہ میں صرف رومی فوج کیا کرتی تھی۔ کھاربیل کی فوجیں صرف ناقابل شکست اور فاتح ہند نہ تھیں بلکہ انھوں نے کلنگا کی پربہار زندگی اور وہاں کی صنعت و حرفت کو دوبارہ ترقی کی راہ پر لاکر باشندگان کلنگا کو عظیم حوصلہ عطا کیا تھا۔ فن موسیقی اور فنون لطیفہ کی جانب کھاربیل بہت زیادہ رغبت رکھتا تھا۔ ہاتھی گپھا میں موجود اس کے سنگی کتبوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ موریہ دور حکومت میں کلنگا میں رقص و سرود اور نغمہ سنجی ممنوع قرار دی گئی تھی لیکن کھاربیل نے اپنے عہد سلطنت میں اس طرح کی ۶۷ اصناف کی تجدید کی۔ اس کا مذہبی کارنامہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ کھاربیل پیدائش سے ہی جینی تھا اور اشوک کی طرح اس نے دوسرا مذہب اختیار کیا نہ تھا۔ عظیم منادر کی تعمیر اور وسیع گپھاؤں کی تشکیل کرکے اس نے صحیح معنوں میں جین مذہب کی سرپرستی کی۔ اس کے مختصر دور حکومت میں کلنگا میں جین مذہب کی اچھی خاصی ترقی ہوئی۔ کھاربیل دوسرے تمام مذاہب کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ اس نے اپنی سنگی تحریروں (کتبوں) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ہر مذہب کی عزت کیا کرتا تھا۔ اور اس دور کے صنم کدوں کا مجدّد تھا۔

چیدی حکومت کے زوال کے بعد کلنگا سے جین مذہب بڑی سرعت کے ساتھ اختتام پذیر ہوا اور بدھ مذہب نے اس کی جگہ لے لی۔ پہلی صدی عیسوی میں بدھ مذہب میں ایک نئی لہر رونما ہوئی اور مہاجان بدھ مذہب میں تبدیل ہوکر رہ گئی۔ مہاجان بدھ مذہب کے اصول و قوانین کا تذکرہ "پرگیان پارمیت" اور اسی قسم کے قدیم گرنتھ "اوڈی بھی شا" (اڑیسہ) میں موجود ہونے کی وجہ سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مہاجان مذہب نے سرزمین اڑیسہ میں جنم لیا۔

عوامی محافظوں کے ذریعہ ۱۴۷ء میں اس کتاب کا چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اس کا دیباچہ بھی اسی میں ناگارجن کے ذریعہ لکھا گیا تھا۔ ناگارجن نے پرمل گیری میں واقع اپنی خانقاہ میں بیٹھ کر اس مقدس کتاب کی تصنیف کی تھی۔ اُڑیسہ کے سنبل پور اور بلانگیر ضلع کی حدود میں واقع گندھ ماردن پہاڑ ہی "پرمل گیری" کے نام سے موسوم تھا۔ لیکن اس ناگارجن کو آٹھویں صدی عیسوی میں "ناگارجن کونڈ" میں معرفت حاصل کرنے والا ناگارجن سمجھنا غلط ہوگا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ناگارجن کی تبلیغ کا مرکز "خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا" کی تائید تھا۔ اس فلسفۂ حیات کو تقویت بخشنے کے لیے انھوں نے علم منطق اور فلسفہ کی کئی کتابیں لکھی ہیں اور انھیں مہاجان بدھ مذہب کا 'سینٹ پال' کہا جاتا ہے۔ کلنگا کے سنگھ دوار میں رہنے والے "آریہ دیو" نامی ایک بہت بڑے پنڈت اور فلسفی ان کے شاگرد تھے۔

مذکورہ بالا اصول کے علاوہ مہاجان بدھ مذہب سے سائنٹیفک طریقہ رونما ہو چکا تھا اور زمانۂ قدیم میں اُڑیسہ میں واقع متعدد بدھ مذہب کے مراکز میں اس پر تحقیق کا کام جاری تھا۔ اس نظریۂ تمدن کے سلسلہ میں جن پنڈتوں نے اپنی تحریر اور تحقیق کے ذریعہ تقویت بخشی ہے ان میں سے دگ ناگ اور دھرم کیرتی کا نام قابل ذکر ہے۔ بھوراشیل مقام پر دک ناگ اور دھرم کیرتی کی خانقاہ قائم تھی۔ بھوراشیل کی شناخت پوری ضلع میں واقع "وشوناتھ منڈا" نامی ایک پہاڑ سے کی جاسکتی ہے۔ حالیہ تحقیق کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ کوراپٹ ضلع میں پدم پور کے قریب "جگ منڈ" پہاڑ میں دھرم کیرتی کی خانقاہ قائم تھی۔ دک ناگ کو ہندوستانی علم منطق کا موجد کہا جاتا ہے۔

تقریباً چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں کلنگا ماٹھر راجاؤں کے زیر حکومت تھا۔ ماٹھوں کی حکومت شمال میں مہاندی سے لے کر جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس شاہی خاندان کے زیر حکومت اُڑیسہ کی ثقافتی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ اس دور میں برہمنی مذہب نے ارتقائی منازل طے کیں اور سنسکرت کو سرکاری زبان کے طور پر قبول کیا گیا۔ ماٹھر دورِ حکومت سے قبل جو دستاویزات ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ماٹھر راجاؤں نے پہلی مرتبہ پراکرت زبان کے بجائے سنسکرت میں اپنے فرامین اور اعلانات جاری کیے تھے۔ سنسکرت کی مقبولیت کی وجہ سے مذہبی کتابوں اور پوران کو دیش میں عوامی مقبولیت حاصل ہوسکتی تھی۔

کلنگا کے برہمنی مذہب کے ساتھ "بھگوت مذہب" کو بھی کافی ترقی حاصل ہوئی۔ تقریباً تمام ماٹھر حکمراں 'نرائن' کے معتقد تھے اور وشنو دھرم کے اصول پنچ شب کے حامی تھے۔ ماٹھر

راجاؤں کے بعد جن مشرقی گنگ راجاؤں نے حکومت کی تھی انھوں نے کلنگا کے شیو دھرم کو خاصہ مقبول عام کیا تھا۔ لہٰذا اس دور کے چینی سیاحوں نے اس ملک میں بہت سے وشنو اور شیو مندر دیکھے۔ اڑیسہ میں کرن سو درن کے راجہ ششانک کے دور حکومت میں عوام کی مذہبی زندگی میں شیو دھرم کے اثرات بہت زیادہ وسیع تھے۔

مہاراجہ ششانک نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایکامر میں "تری بھوبنیشور" کے مندر کی تعمیر کروائی تھی اور اس مندر کے دیوتا کا نام "بھوبنیشور" رکھا گیا۔ شیو دھرم کی وجہ سے مندر کی تعمیر کے کام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور اس طرح سے شیو کھشیتر کے نام سے مشہور بھوبنیشور منادر کا شہر بن گیا۔ کلنگا میں ایجاد شدہ فنون نے اس جگہ پہنچ کر جامۂ تکمیل حاصل کیا۔ یہاں کے فنون کے اثرات صرف اڑیسہ تک ہی محدود نہ تھے بلکہ قرب وجوار کے ممالک میں بھی پھیلنے لگے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں چوڑ گنگ دیو کی فتح اڑیسہ سے عوام کے مذہبی تفکرات میں ایک جدید تبدیلی رونما ہوئی۔ راجہ چوڑ گنگ شروع میں شیو کے پیرو تھے لیکن بعد میں راما نوج سے متاثر ہو کر انھوں نے وشنو مذہب اختیار کر لیا۔ انھوں نے ہی پوری کا جگن ناتھ مندر تعمیر کروایا۔ اڑیسہ میں بدھ مذہب کے اثرات کم ہونے کے ساتھ جگن ناتھ دھرم کا آغاز ہوا۔ سنبل پور کے راجہ اندر بھوتی نے بھی اپنے طور پر جگن ناتھ دھرم کا بڑی لگن کے ساتھ پرچار کروایا۔ شری جگن ناتھ سے متعلق اندر بھوتی کا عقیدہ تھا کہ وہ بدھ اول تھے اور بدھ ثانی ان کے ذریعہ تخلیق پذیر ہوتے۔ چوڑ گنگ کے زمانہ میں شری جگن ناتھ کو وشنوؤں کے دیوتا پرشوتم کے روپ میں قبول کیا گیا تھا۔ اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑی سرعت کے ساتھ ان مذاہب کو مساوات حاصل ہوئی تھی۔ اسی زمانہ میں اڑیسہ کی مذہبی زندگی کا مرکز بھوبنیشور سے پوری منتقل ہوا اور پرشوتم جگن ناتھ اس ملک کے قابل تعظیم دیوتا سمجھے جانے لگے۔ اس نئے مذہب میں مختلف انداز فکر کے زوال کے نتیجہ میں لوگوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں صبر و استقلال اور وسیع القلبی کی شاہراہیں کھل گئیں۔

اڑیسہ میں افغانوں کی حکومت

بنگال کے سلیمان کرانی نے ۱۵۶۸ء میں اڑیسہ میں افغان حکومت کی بنا ڈالی۔ ۱۵۶۸ء سے ۱۵۷۵ء تک افغان مہاندی کے شمالی اضلاع پر قابض رہے۔ لیکن افغانوں کی حکومت ان دنوں اڑیسہ پر زیادہ عرصہ کے لیے قائم نہ رہ سکی۔ مغلوں اور افغانوں کے درمیان اقتدار کی

کشمکش جاری تھی۔ اسی وجہ سے افغانوں کو اپنے طور پر زیادہ دنوں تک حکومت کرنے کا موقع نہیں مل پایا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ افغانوں کو اُڑیسہ میں انتظامیہ کے اصولوں میں کسی طرح کی تبدیلی کا موقع نہ مل سکا۔

۱۵۷۶ء میں داؤد کرہانی کی شکست اور وفات کے بعد اُڑیسہ کا انسلاک اکبر کی سلطنت میں ہو گیا۔ اور بنگال کی طرح یہ بھی ایک مغل ریاست کی حیثیت سے قائم رہا۔ لیکن مغل افسروں کی سہل پسندی اور عیش کوشی کی بناء پر اکبر کے اقتدار کے خاتمہ تک افغان اُڑیسہ اور بنگال سے وابستہ رہے۔ ۱۵۷۶ء سے ۱۶۰۵ء تک تقریباً ۳۰ سال تک مغل اُڑیسہ اور بنگال سے افغانوں کی باغیانہ سرکشی کا خاتمہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ داؤد کرہانی کی شکست کے بعد اُڑیسہ براتے نام اکبر کی سلطنت میں ضم کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود افغان مغلوں کے اُڑیسہ پر مکمل طور پر قابض ہونے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے درپے تھے۔ اس طرح بنگال کے مغل صوبہ داروں کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر رکھا تھا۔[1]

بالآخر ۱۵۸۴ء میں بنگال کے مغل صوبہ دار شہباز خاں نے قتلو لوہانی کو امن وامان کے ساتھ اُڑیسہ پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ قتلو لوہانی نے مغلوں کی اس فراخ دلی کے لیے خراجِ تشکّر کے طور پر ساٹھ ہاتھی اور دوسرے کئی تحائف بھیجے تھے، جو ۱۱ر جون ۱۵۸۴ء کو شہنشاہ اکبر کو دستیاب ہوئے۔ اسی طرح ۱۵۹۰ء میں عیسٰی خاں اور راجہ مان سنگھ کے درمیان ایک صلح نامہ تیار ہوا جس میں یہ طے پایا کہ دہلی کے بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا اور اس کے نام کا سکّہ بھی جاری کیا جائے گا۔ پوری کا جگن ناتھ مندر اور اس سے متعلقہ اوقاف میں کوئی دست اندازی نہیں ہوگی اور وفادار زمین داروں کو کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔ لیکن عیسٰی خاں کی وفات کے بعد اس کے ورثاء نے صلح نامہ پر عمل نہیں کیا اور راجہ مان سنگھ کو افغانوں کے سامنے خراج پیش کرنا پڑا۔[2]

۱۵۹۵ء میں شہنشاہ اکبر نے اپنی سلطنت کو بارہ صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن بعد میں خاندیش برار اور احمد نگر کے اشتمال سے پندرہ صوبے تھے لیکن صوبوں کی اس فہرست میں اُڑیسہ

---

(1) Akbar Nama: (Bev), Vol III P 658

(۲) اکبر نامہ:۔ ابوالفضل حصہ سوم ص ۸۷۸

کا کہیں ذکر نہیں آتا بلکہ اُڑیسہ ایک ذیلی صوبہ کے طور پر حکومت کے نقطۂ نظر سے رکھا گیا تھا۔ ابوالفضل نے اس امر کی وضاحت یوں کردی ہے کہ اُڑیسہ کو تاریخی حالات اور جغرافیائی حدبندیوں کے پیش نظر اکبر کی سلطنت میں ہونے کی وجہ سے انتظامیہ کی سہولت کی خاطر اسے بنگال کے ساتھ ضم کردیا گیا تھا۔[1]

انتظامی سہولت کے پیش نظر اُڑیسہ پانچ سرکاروں میں منقسم تھا۔

جلیسر۔ بھدرک۔ کٹک۔ کلنگا ڈانڈپٹ اور راج مہندری۔ اس کے علاوہ ہر سرکار متعدد محالوں میں تقسیم کی گئی تھی اور اس طرح اڑیسہ میں ۹۹ محال تھے جن کی تفصیل "آئین اکبری" میں درج ہے۔ آئین اکبری کے اندراج کے پیش نظر کئی نکتے قابل غور ہیں۔

۱- اول تو یہ کہ محالوں کی فہرست بنگال کے خاکہ کے آخر میں درج ہے۔ اسے حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں لکھا گیا۔

۲- اُڑیسہ کی مختلف سرکاروں کی ترتیب شمال سے جنوب کی طرف جغرافیائی لحاظ سے کی گئی ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں۔

۳- دو جنوبی سرحدوں کی سرکار کلنگا ڈانڈ پٹ اور راج مہندری کے محالوں کی کوئی تفصیل درج نہیں۔

۴- ظاہری طور پر اس ضمن میں کوئی تفصیل نہیں ملتی کیوں کہ مذکورہ بالا دونوں سرکاریں مغلوں کے زیر حکومت آسکیں نہ ان کے بعد افغانوں کی حکومت میں ان کا اشتمال ہوسکا۔ بلکہ اڑیسہ کے جنوبی علاقہ پر گول کنڈہ کے سلطان ابراہیم قطب شاہ کی فوج نے ۱۵۷۱ء میں حملہ کیا اور اس کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

۵- محالوں کے نام قریبی طور پر ہندو دانڈ پٹوں کے نام سے متعلق ہیں۔ اس وقت محالوں کے اشتمال سے سرکار کی تشکیل کا علم ہندوؤں کو نہ تھا۔ کیونکہ یہ مسلم حکمرانوں کی ایجاد تھی۔ سرکار کٹک جو سب سے آخر میں مسلمانوں کے قبضہ میں آئی ہے عملی طور پر پرانی تنظیم سے کچھ الگ ہے لیکن سرکار جلیسر کے محالوں کے نام مسلم ناموں سے کچھ مختلف ہیں جبکہ دانڈ پٹ کے چند نسبتاً چھوٹے سب ڈیویژن انفرادی طور پر محال بن گئے۔

---

(۱) اکبر نامہ: ابوالفضل حصہ سوم ص ۱۳۸

جہانگیر کے عہد حکومت میں اُڑیسہ بنگال سے الگ ہوکر ایک صوبہ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ ۱۶۰۷ء میں سب سے پہلے صوبہ دار ہاشم خاں کا اُڑیسہ میں تقرر ہوا اور اس کے بعد صوبہ کے باقی حصوں پر رفتہ رفتہ قبضہ حاصل ہوا۔ اگرچہ اڑیسہ ایک منفرد صوبہ بن چکا تھا لیکن بہتر انتظامات اور حکومت کے پیش نظر پڑوسی صوبہ بنگال کے وائسرایوں کے سپرد بھی ہوتا رہا۔ ان حالات میں قانوناً بادشاہ کی اجازت سے گورنر، اڑیسہ کے لیے نائب صوبہ دار کا تقرر کرتا رہا۔ ۱۶۱۱ء میں بنگال کے صوبہ دار اسلام خاں کی سفارش پر راجہ کلیان سنگھ کو اُڑیسہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۶۴۲ء شاہ شجاع اڑیسہ، بہار اور بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوا لیکن اس نے اُڑیسہ پر اپنے نائب صوبہ داروں کے توسطے حکومت کی۔ اس طرح بنگال کے ناظموں نے اپنے نائب ناظموں کے ذریعہ اُڑیسہ پر حکومت کی۔[1]

راجہ ٹوڈرمل نے ۱۵۸۰ء میں پہلی مرتبہ اُڑیسہ میں باقاعدگی کے ساتھ انتظامیہ اور Revenue Settlement قائم کیا۔ اس کے مطابق اڑیسہ کو مغل بندی اور گڑھ جات یا قلعہ جات میں تقسیم کیا گیا۔ جو علاقہ براہ راست مغلوں کی حکومت میں رہا اسے مغل بندی کا نام دیا گیا اور جو علاقہ مقامی راجاؤں کی نگرانی میں رہا اسے گڑھ جات کہا گیا۔ اس طرح کے مقامی راجہ مغل دربار میں مقررہ رقم بطور خراج پیش کرتے تھے۔[2]

مسلمانوں کو شروع سے ہی اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ لاتعداد ہندو زمینداروں کو یکسر ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جن ہندو زمینداروں نے ان کی اطاعت قبول کی اور دہلی کی سرکار کے ماتحت رہے ان میں سے اکثر کو اپنے علاقہ میں خود مختار رہنے دیا گیا اور جب اکبر فتحیاب ہوا تو اس نے ان لوگوں کے تئیں مختلف رویہ اختیار کیا۔ اکبر پورے ملک کو اپنا اطاعت گزار بنا کر ایک ہی سیاسی پرچم کے نیچے لانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ملک کی دوسری ریاستوں کو یکسر ختم کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دوراندیشی کی بنا پر اکبر نے اپنے اپنے علاقہ میں ان زمینداروں کی داخلی خود مختاری قائم رہنے دی تاکہ وہ اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا سکے۔ نتیجہ کے طور پر مغلیہ سلطنت کے خاصے علاقے مقامی زمینداروں کے دخل میں رہے۔ اُڑیسہ کے حق میں شہنشاہ اکبر کی یہ پالیسی بہت ہی سودمند ثابت ہوئی۔

---

(۱) تزک جہانگیری، حصہ اوّل ص ۲۰۲

2 - Asiatic Researches : Vol XV : PP43

Settlement کی رو سے گڑھ جات کے موروثی زمینداروں کے اختیارات قائم رہے اور مغل دربار کی طرف سے انھیں اپنی حیثیت کے مطابق خطابات اور درجات سے نوازا گیا۔ مان سنگھ نے ۱۵۹۳ء میں اڑیسہ آکران خطابات کو آخری شکل دی۔

اڑیسہ کے راجاؤں میں سب سے زیادہ اہمیت خوردہ کے راجہ کو حاصل تھی اسے اڑیسہ کا گجپتی تاجور تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے تحت دو سو قلعے اور ۳۱ زمینداریاں تھیں جہاں سے وہ خراج حاصل کیا کرتا تھا۔ راجہ کی اپنی ریاست خوردہ میں ۷۱ قلعے تھے۔ اس کے علاوہ ۳۱ زمینداروں میں مزید ۱۲۹ قلعے تھے جن میں بانکی، ڈوم پاڑہ، تگریہ، نرسنگھ پور، انگول، تال چیر، موردیشور، آٹھ گڑھ، ڈھینکا نال، سرہزہ، اندھیاری، بجرکوٹ، اچل کوٹ، نیا گڑھ، کھنڈ پاڑہ، رن پور، دس پلا، بان پور، گھومیر، کھلی کوٹ، کرلو، آٹھ گڑھ، چکیٹی موہوری، شیر گڑھ، پالور اور ٹیکلی رگھوناتھ پور مشہور ہیں۔(۱)

اڑیسہ کے آخری خودمختار راجہ مکوند دیو کے دونوں بیٹے ادوا نند اور سندر بھی مسلم دورِ حکومت میں راجہ کے خطاب سے نوازے گئے اور انھیں دوسو کی منصب داری کے ساتھ پٹیا، سارنگا گڑھ، آل، ڈیرابسی اور اُتھر کے علاقوں کی زمینداری عطا کی گئی جس کا ذکر "آئین اکبری" میں بھی آیا ہے۔(۲) دور دراز علاقوں کے زمیندار خوردہ کے راجہ کی دسترس سے الگ کر دیئے گئے اور انھیں کیونجھر، موربھنج، بشن پور، فتح آباد، نارائن گڑھ، کرمن گڑھ اور باگ بھوم کے سات مستحکم زمینداروں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔(۳)

اس بات کی وافر شہادتیں موجود ہیں کہ اڑیسہ کے موروثی زمیندار نہ صوبائی گورنر کو خراج ادا کرتے تھے اور نہ ان کے حکم کی تعمیل کرتے تھے بلکہ وہ براہ راست حکومت عالیہ سے متعلق ہوتے تھے۔ شہنشاہ کے فرمان خاص کے ذریعہ انھیں اپنے حقوق کا تحفظ حاصل تھا جس کی وجہ سے صوبائی گورنران معاملات میں مداخلتِ بیجا نہیں کرسکتا تھا۔ ابوالفضل نے اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ "آئین اکبری" میں بیان کیا ہے کہ ۱۵۹۵ء میں مان سنگھ اڑیسہ فتح کرنے کیلئے

---

1. Asiatic Researches : Vol XV PP-43

(۲) ابوالفضل، آئین اکبری، حصہ اول ص ۵۹۴

3. Asiatic Researches : Vol XV PP-44

آیا تو اس نے خوردہ کے راجہ رام چندر دیو کو حاضری کا پروانہ بھیجا۔ رام چندر دیو نے اس پروانۂ طلبی پر سخت احتجاج کیا اور لکھا کہ اسے طلب کرنا نسرائے کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس پر مان سنگھ نے طیش میں آکر اس کے علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی فوج بھیج دی جس نے خوردہ راجہ کے کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اس امر کی اطلاع جب شہنشاہ اکبر کو پہنچی تو انھوں نے مان سنگھ کی اس حرکت پر کافی سرزنش کی۔ مان سنگھ نے اپنی فوج واپس بلالی اور اسے خوردہ کے راجہ سے معافی مانگنی پڑی۔(1)

منرق کے بیان کردہ دوسرے ایک واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اڑیسہ کے یہ راجہ اپنے اندرونی اختیارات میں کسی طرح کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پرتگالی مشینری نے بنڈیل میں ایک کلیسا کی تعمیر کے لیے کسی طرح اڑیسہ کے گورنر سے اجازت نامہ حاصل کرلیا۔ لیکن انھوں نے متعلقہ علاقہ کے راجہ کی اجازت کے بغیر وہاں کلیسا کی تعمیر کی جرأت دی کی۔ جب منرق راجہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ ہمیں گورنر نے گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دے دی ہے، بس آپ کی رضامندی چاہیئے، تو راجہ نے جواب دیا کہ "شہنشاہ کا فرمان گورنر کے نام آیا ہے جس میں صاف لفظوں میں اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ ہمارے علاقہ میں کسی طرح کی جدید تعمیر نہیں ہوسکتی، اس طرح گورنر کے فرمان کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُڑیسہ کے معمولی زمیندار مقامی حکام کی نگرانی میں ہونے کے باوجود انھیں اپنے داخلی اختیارات کا مکمل تحفظ حاصل تھا۔

صوبہ اُڑیسہ کا زیادہ تر علاقہ مقامی راجاؤں کے زیر حکومت تھا۔ ان میں سے چند تو نیم مختار تھے اور دوسرے خود مختار تھے۔ اس طرح کے بہت سارے راجاؤں اور زمینداروں کا تذکرہ "آئین اکبری" میں "مذکورین" یعنی خود مختار تعلقہ دار کے طور پر آتا ہے۔ وہ جلیسر، بھدرک اور کٹک کی سرکار کے لیے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ دیا کرتے تھے جو مجموعی طور پر کلنگا دانڈپٹ اور راج مہندری کو دے دیا جاتا تھا۔

شاہجہاں کے دورِ حکومت میں اُڑیسہ کے انتظامیہ میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ خصوصی طور پر شہزادہ شاہ شجاع کی عملداری (۱۶۴۸ء تا ۱۶۵۸ء) میں اس طرح کی تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔

---

(۱) ابوالفضل: اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۹۶۸

اس وقت تک اڑیسہ براہِ راست دہلی سے متعین کردہ گورنر کی حکومت ہوا کرتی تھی جو ان دنوں شہزادہ شجاع کی حکومت بنگال (جس کا مرکز ڈھاکہ تھا) سے متصل کر دی گئی اور اڑیسہ پر شاہ شجاع کے ڈپٹی گورنر کی عملداری قائم ہوئی۔ خوردہ کا گج پتی راجہ جس کی ۳۲ سے زائد محالوں پر حکومت تھی اور جس کا نام اڑیسہ کے خود مختار زمینداروں کے سرفہرست ہے۔ اس کے تذکرہ سے بنیادی تین سرکاروں کی بارہ سرکاروں میں تقسیم کے دور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خوردہ کے راجہ کا تذکرہ تواریخ میں راجہ دیریپ سنگھ کے طور پر آیا ہے لیکن ڈاکٹر انوارالحق کی تحقیق کے مطابق یہ راجہ دویہ سنگھ دیو ہی تھا جو راجہ مو گند دیو اوّل کا بیٹا اور اس کا جانشین تھا جس نے ۱۶۸۸ء سے ۱۷۱۶ء تک حکومت کی تھی۔ اس طرح سے مذکورہ تین سرکاروں کی ۱۲ سرکاروں میں تقسیم کا واقعہ عہد اورنگ زیب میں عمل پذیر ہوا۔[1]

اس کے بعد اڑیسہ کے ریونیو ڈیویژن (Revenue Division) میں ۱۷۰۴ء میں اڑیسہ کے دیوان اور صوبہ دار مرشد قلی خاں نے کئی تبدیلیاں کیں۔ اڑیسہ کو تیرہ سرکاروں میں تقسیم کیا گیا جن میں سے شمال بعید کی چھ سرکاریں اڑیسہ سے منقطع کرکے بنگال میں ضم کر دی گئیں۔ اس کی خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بالیسر کی بندرگاہ اور اس کے ساحلی علاقہ کے تحفظ کے لیے یہ اقدام کیا گیا۔ یہ چھ سرکاریں گوال پاڑہ، مال جوٹیا، مسکوری، جلیسر، ریمونا اور بستہ کی تھیں۔[2] مرشد قلی خاں خزانے کی وصولیابی کے سلسلہ میں خاصہ سخت گیر تھا۔ اس نے براہِ راست رعایا سے خزانہ وصول کرنے انتظام کیا۔ بنگال اور اڑیسہ کے عاملوں نے ہر گاؤں کی مزروعہ اور غیر مزروعہ اراضی ناپ کرا سے متعلقہ لوگوں کو دینے کے لیے سخ دار اور امین بھیجے۔ انھیں زراعتی سہولتوں کے لیے اور فصلوں کی ترقی کے لیے زراعتی قرضے دیئے گئے۔ مرشد قلی خاں نے اپنے زیر نگرانی صوبوں سے وصول شدہ اضافی خزانے باقاعدگی کے ساتھ اورنگ زیب کو پہنچانے کی اہم خدمات انجام دیں۔ اورنگ زیب نے یہ رقم دکن کی جنگ پر خرچ کی۔ ان خدمات کے عوض میں اورنگ زیب نے مرشد قلی خاں کو مؤتمن الملک علاؤ الدولہ جعفر خاں نصیری ناصر جنگ کے خطاب سے نوازا اور اس کے منصب میں مزید اضافہ کیا۔[3] مرشد قلی خاں نے نظام حکومت میں جو دوسری

---

(1) Dr. Anwarul Haque: Muslim Administration in Orissa: P233 ff.

(2) The Fifth Report. op. cit Vol I, P 245.

(۳) سخی مستعد خاں: معاصر عالمگیری ص ۲۶۸

اہم تبدیلی نافذکی وہ یہ تھی کہ سابق محال پرگنوں میں تبدیل کر دیئے گئے اور خالصہ علاقوں میں سرکاری حیثیت سے ADMINISTRATIVE DIVISION قائم کیے گئے جنھیں چکلہ کہا گیا۔ شمالی سرکار جو بنگال میں ضم کردی گئی تھی اسے بالیسر بندر اور ہجلی کے دو چکلوں کے تحت رکھا گیا۔ قبل الذکر چکلہ میں سترہ پرگنے تھے جو سرکار ریمونا، بستہ اور مسکوری میں واقع تھے۔ موخرالذکر چکلہ کے تحت ۳۵ پرگنے تھے جو مال جیٹھیا، جلیسر اور گوال پاڑہ کی سرکار میں واقع تھے۔ ان دو چکلوں سے وصول شدہ خزانہ کے سالانہ ۵ لاکھ ۲۷ ہزار ۴۶۵ روپئے بنگال کو دیئے جاتے تھے۔ بعد میں ۱۷۲۷ء میں مرشد قلی خاں کے عہد میں اُڑیسہ کا مجموعی خزانہ ۳۶ لاکھ ۶۷ ہزار ۲۴۵ روپئے تھا[1] مرشد قلی خاں کے عہد میں چکلہ میدنا پور صوبہ اُڑیسہ سے الگ کرکے مستقل طور پر صوبہ بنگال میں ضم کر دیا گیا۔

مراٹھوں سے جنگ و جدل میں تنگ آکر ۱۷۵۱ء میں علی وردی خاں نے دریائے سُوبَرنَو رَیکھا پر پِپلی سے لے کر جنوب میں چلیکا کے ساحل پر واقع مالوہ تک اُڑیسہ کا یہ علاقہ مراٹھوں کے حوالہ کر دیا۔ بالآخر یہیں سے اُڑیسہ کی سرحد میں نہ کوئی اضافہ ہوا نہ کوئی تفریق۔

مغلوں نے اپنے دور حکومت میں تمام عہدوں اور ڈیویژنوں کی اُڑیا اصطلاحوں کو عام فہم فارسی میں رائج کیا۔ گج پتی راجاؤں کے زیر حکومت اُڑیسہ دو انتظامیہ ڈیویژنوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ کچھ حصے تو براہ راست گج پتی راجاؤں کے زیر حکومت تھے اور باقی حصوں پر خود مختار راجاؤں کا عمل دخل تھا۔ جن راجاؤں نے گج پتی راجہ کے اعلیٰ اختیارات تسلیم کیے وہ گڑھ جات راجہ کے نام سے موسوم و معروف ہوئے۔

عرصہ دراز کے بعد گنگا، سوریہ ونشی اور بھوئی خاندان کے تحت دانڈپٹ کا افسر انچارج دانڈپٹ پریکشا کہلانے لگا اور بی سیٹیس کے ریونیو افسر کو "بی سوئی" کہا جانے لگا۔ اس کے تعاون کے لئے ایک Accountant-cum-Record Keeper ہوا کرتا تھا جسے "بھوئی مول" کہا جاتا تھا اور ریونیو اکاؤنٹنٹ کو بھوئی کہا جاتا تھا۔ شہروں کے لیے "کٹک" کی اصطلاح عام تھی۔

مغلیہ ریونیو انتظامیہ کے تحت دانڈپٹ کے لیے 'سرکار' کی اصطلاح عام ہوئی۔ یہی

---

(1) The Fifth Report. Op. Cit Vol I P. 456

(Revenue Units) محال یا پرگنہ کے طور پر معروف ہوتی، کھنڈ تعلقے بنے، گاؤں کے لیے 'موضع' استعمال کیا گیا۔ اسی طرح ڈسٹرکٹ کا افسر انچارج "فوجدار" کہلانے لگا اور پرگنوں کے سردار کو 'چودھری' کے لقب سے نوازا گیا اور اکاؤنٹنٹ یا بھومی مول کے لیے "قانون گو ولایتی" کی اصطلاح سامنے آئی۔ تعلقوں کے سردار کو 'تعلقدار' کہا جانے لگا۔ اور موضع کے سردار کو "مقدم" کہا گیا۔

اس دور میں گڑھ جات کے انتظامیہ میں بہت ہی معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ خود مختار زمیندار راجہ کہلانے لگے اور گڑھ یا قلعہ کے سربراہ کو 'قلعدار' کا لقب دیا گیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو اڑیسہ کے قدیم دستور اور مغلوں کے انتظامیہ اور مالیات کے طریقوں میں معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ مغلوں نے اڑیسہ کی حکومت کا انتظام عام طور پر ہندو افسروں کے ذریعہ کر دیا۔ دیہاتی طبقہ پر کسی طرح کی مداخلت نہ کی گئی اور انھیں اپنے طور پر پرسکون زندگی گذارنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس طرح عوام سے حکومت کے انتظامیہ میں پوری طرح تعاون حاصل کیا۔

مغل عہد حکومت میں ریاست کے سربراہ کو سرکاری طور پر صوبہ دار کہا جاتا تھا۔ بعد میں اسے ناظم کہا گیا۔ صوبہ دار یا ناظم شہنشاہ کا نمائندہ ہوا کرتا تھا۔ سرکاری عہدہ کے مطابق ناظم کے بعد دیوان کا عہدہ تھا۔ ریاست میں ان ہی دو اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں پر پوری ریاست کے انتظامیہ کا دارومدار تھا۔ صوبہ دار فوجداری عدل، دفاع اور نفاذ Executive کے علاوہ امورعامہ کی نگہداشت کیا کرتا تھا اور دوسری طرف دیوان کے ذمہ بنیادی طور پر مالیات کے انتظامات اور شہری دفاع (Civil Justice) ہوا کرتے تھے۔ صوبہ دار یا دیوان کا تقرر، ترقی یا معزولی براہِ راست شہنشاہ کے ہاتھوں عمل میں آتا تھا۔ اور یہ دونوں (ناظم/دیوان) صرف شہنشاہ کو جواب دہ ہوا کرتے تھے۔ اس طرح صوبہ میں دو مساوی مستقل اور باہمی خود مختار عہدے تھے۔ اس طرح کے اعلیٰ خود مختار عہدوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان اعلیٰ عہدوں پر نافذ افسران ایک دوسرے کے کاموں پر اندرونی طور پر نگاہ رکھتے تھے۔ اور جب بھی دوسرے سے کوئی سہو ہوتا تو دہلی دربار تک اس کی خبر پہنچا دیتے۔ لیکن اگر مرکزی حکومت کو دیوان یا صوبہ دار کی کسی طرح کی باہمی چشمک کا پتہ چل جاتا تو دونوں میں سے کسی کو یا بعض اوقات دونوں کو متعلقہ صوبہ سے واپس بلا لیا جاتا۔ اس طرح دیوان اور صوبہ دار آپس میں خوش گوار تعلقات بحال رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے

ریاست کے انتظامیہ کو بہتر بنانے میں مصروف رہتے۔

مغلیہ حکومت اکبر کے زمانہ سے لے کر اورنگ زیب کے عہد تک اپنی رعایا کو اولاد کی طرح شفقت سے دیکھتی اور رعایا کے تحفظ، صحت عامہ، خوش حالی اور ترقی کا خاص خیال رکھتی رہی۔ ریاست کے کسی بھی افسر سے رعایا پر ظلم وجور ہوتا تو اسے اس کی سخت سزا دی جاتی۔

اہل اُڑیسہ کی بدحالی کے ازالہ کے لیئے اورنگ زیب نے اپنے خاص فرمان کے ذریعہ متعدد اشیاء پر عائد شدہ چنگی ہٹا دی۔ سولہویں صدی کے اختتام پر مشرقی ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح اُڑیسہ میں بھی خال خال سنگ دل والدین اپنے بچوں کے خصیہ تناسل نکال کر انھیں خواجہ سرا بننے کے لیے بیچنے لگے۔ ۱۶۸۸ء میں اورنگ زیب نے ایک مخصوص فرمان کے ذریعہ پوری سلطنت میں اس عمل قبیح سے باز رہنے کا حکم جاری کیا۔(۱)

عہد اورنگ زیب کے آغاز میں ہر ریاست اور اہم شہروں میں اسلامی شرع کے مطابق قاضی اور محتسب مقرر کیے گئے۔ اسی زمانہ میں کٹک میں شیخ جنید کا تقرر محتسب کی حیثیت سے ہوا۔ شیخ کے ماتحت دو قاضیوں کا بھی تقرر کٹک میں ہوا۔ جن میں سے قاضی رحمت اللہ کو اسلامی شرع کی خلاف ورزی کے جرم میں معزول کر دیا گیا۔ اور ان کے بعد ۱۶۶۵ء میں سید محمد غوث کو قاضی اور میر عدل کی حیثیت سے یومیہ چار روپئے پر مقرر کیا گیا(۲)

اُڑیسہ کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے پاس ایسے اسناد موجود ہیں جن کے ذریعہ مسلم بادشاہ وقت نے امداد معاش کے طور پر اس علاقہ کے عالموں اور مذہبی پیشواؤں کو اچھی خاصی جاگیریں عطا کی تھیں۔ ان میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ مختلف کاموں کے لیے ہندوؤں کو بھی امدادِ معاش کے طور پر جاگیریں عطا کی گئیں۔ اس قبیل کی ایک سند شہنشاہ عالم گیر ثانی نے اُڑیسہ کے ایک برہمن لچھمی پر ہراج کو کفالت کی غرض سے عطا کیا تھا۔ دوسری سند کے ذریعہ شاہ عالم نے شیب داس نامی مہادوت کے نام بطور خیرات دیوتا کے نام بھوگ چڑھانے کے لیے جاگیر عطا کی تھی۔ شجاع الدین محمد خاں نے چیتنیہ داس بابا جی کو کفالت کے لیے جاگیر

---

(۱) ابوالفضل: آئین اکبری، جلد دوم صـ۱۳۸

(2) J.B.O.R.S. Vol II, P.346.

عطا کی تھی۔(۱)

۱۶۰۹ء میں کٹک کے نواح وڈیا دھر پور میں محمد تقی بخشی نے جگن ناتھ سڑک کے کنارے مختلف علاقوں سے رتھ یاترا کے زمانہ میں پوری جگن ناتھ دھام جانے والے زائرین کی سہولت کے لیے ایک کنواں کھدوایا تھا۔ اس کے علاوہ اس طرح کے کئی کارنامے مختلف علاقوں میں تاریخی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ مسلم عہد حکومت کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ لوگوں کے سماجی، مذہبی اور معاشی اداروں میں کسی طرح کی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔ بلکہ یہ ادارے قوم کی خوش حالی اور خوشنودی کے لیے مشترکہ طور پر سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔

اُڑیسہ پر افغان اور مغل دور حکومت کے اثرات

اُڑیسہ کے ساتھ افغانوں اور مغلوں کے سیاسی تعلقات کم و بیش پانچ صدیوں پر محیط ہیں۔ پہلی تین صدیوں تک اُڑیسہ کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق بار بار فوجی حملوں کی بنا پر قائم رہا لیکن بعد کی دو صدیاں اس فتحیافتہ ریاست پر حکومت کرنے میں گزریں۔ اس طرح آخر کے دو سو سال اڑیسہ میں مسلمانوں کے سیاسی اور انتظامیہ کی دیکھ بھال میں گزرے۔

بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں بنگال پر مسلم حکومت قائم ہو چکی تھی اور سو سال کے بعد تو جنوبی ہند مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا تھا لیکن اُڑیسہ پر مسلمانوں کی حکومت کا آغاز وسط سولہویں صدی میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر کے عہد میں مذہبی آزادی کا دور دورہ تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت اڑیسہ پر اسلامی اثرات بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ لیکن انتظامیہ کے نقطۂ نظر سے اڑیسہ نے مالیات کے معاملے میں مغلیہ حکومت سے کافی استفادہ کیا۔ ہندو مسلم ثقافتی اشتراک کے نقطۂ نظر سے اڑیسہ نے ملک کے دوسرے صوبوں کی طرح اسلامی اثرات حاصل کیے۔ اگرچہ آبادی کے لحاظ سے اُڑیسہ میں مسلمانوں کی حیثیت اقلیت صغریٰ کی ہے لیکن مسلم دور حکومت کے اثرات اور واقعات اب بھی زندہ ہیں۔

---

(1) Dr. M. Anwarul Haque : Muslim Administration in Orissa P - 242

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ بنگال پر قبضہ کرنے سے بہت دراز قبل اکبر نے اُڑیسہ کے راجہ موکوند دیو سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کا اہم مقصد محض دونوں کے مشترکہ حریف سلیمان کرہانی کے خلاف محاذ قائم کرنا۔ ۱۵۶۵ء میں اکبر نے اسی مقصد کے لیے حسن خزانچی اور بھٹ مہاپاترا کو اپنے ایلچی کے طور پر اڑیسہ بھیجا۔ بھٹ مہاپاترا مغل دربار کا ایک اُڑیا موسیقار تھا۔ مذکورہ دونوں ایلچی موکوند دیو کے دربار میں تقریباً چار ماہ رہے۔ اس کے بعد موکوند دیو نے چند ہاتھی اور دیگر قیمتی تحائف دے کر انھیں اپنے سفیر پرمانند کے ساتھ اکبر کے دربار میں بھیج دیا۔[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُڑیسہ پر مغلوں کے تسلط سے قبل ہی مغل دربار سے اڑیسہ کے ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ اس کے علاوہ اُڑیسہ کے اور ایک شاعر وشوناتھ سامنترائے نے اکبر کے دربار میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کا تذکرہ اُڑیسہ میوزیم میں محفوظ ایک غیر مطبوعہ سنسکرت قلمی نسخہ "سوری سروتم" میں بھی ملتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب راجہ مان سنگھ ۱۵۹۳ء میں اڑیسہ آیا تو اُڑیا شاعر وشوناتھ سامنت رائے نے اپنی بلند پایہ شاعری سے اسے متأثر کیا اور جب مان سنگھ اُڑیسہ سے جانے لگا تو یہاں کے اُڑیا شاعر وشوناتھ سامنت رائے کو اپنے ساتھ لے گیا اور شہنشاہ اکبر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اکبر ہندو شعراء اور پنڈتوں کی بڑی فراخدلی کے ساتھ سرپرستی کر رہا تھا۔ وشوناتھ سامنت رائے اکبر کے دربار میں بہت ہی کم عرصہ کے لیے رہا۔ اس نے اپنی بلند پایہ شاعری کے عوض بادشاہ سے قیمتی خلعت حاصل کیا۔ مغل دربار میں مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کے بعد سامنت رائے اُڑیسہ واپس آگیا۔[2]

یہ امر مسلّم ہے کہ راجہ مان سنگھ ۱۵۹۴ء میں دہلی لوٹا اور اس نے ۲۳ فروری ۱۵۹۴ء کو مغل دربار میں اڑیسہ کے دو صاحب طرز اور اعلیٰ ظرف افراد پیش کیے۔ اس طرح وشوناتھ سامنت رائے ۱۵۹۴ء میں دہلی پہنچا۔ آئین اکبری میں وشوناتھ کا نام ایک عظیم المرتبت ہندو پنڈت کے طور پر آیا ہے۔[3] مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اسے اُڑیسہ کا کوی چندر

---

(۱) ابوالفضل :- اکبر نامہ، صـ ۳۸۲

② Orissa History Research Journal Vol I No I P. 54.

(۳) ابوالفضل : آئین اکبری، جلد ۲، صـ ۶۱۱

بشوناتھ سامنت رائے کہا جاتا ہے۔ اُڑیسہ کے شاعروں، عالموں اور پنڈتوں نے مغل دربار میں جو مقبولیت حاصل کی اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ثقافتی لین دین سے اُڑیسہ میں ہندو مسلم ثقافت کے پہلو سامنے آئے تو ان میں اجنبیت، عدم اعتماد اور پرائے پن کا احساس نہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ سماجی اور معاشی قوتوں نے انھیں قریب سے قریب تر کر دیا۔

اُڑیسہ میں مسلمانوں کی حکومت ۱۷۵۱ء میں ختم ہوئی لیکن مسلم حکومت کے سماجی اور ثقافتی اثرات بعد میں مراٹھوں اور برطانوی دور حکومت تک جاری رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ برطانوی دور میں بھی اراضی کے سلسلہ میں مغلیہ دستور کار فرما رہا۔ انھوں نے سابق ضریب قائم رکھی اور ان کے مالیات کے افسران سابق فارسی ناموں سے پکارے جاتے رہے۔ مثلاً قانون گو، زمیندار، تحصیلدار اور محرر وغیرہ آج تک بھی یہ اصطلاحیں اُڑیسہ میں مروّج ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اُڑیسہ میں مسلم دورِ حکومت کے اہم اثرات یہاں کے زبان و ادب، رسم و رواج، طرز معاشرت، خور و نوش اور لباسوں تک میں پائے جاتے ہیں۔

اڑیسہ میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد سے فارسی اُڑیسہ کی کچہریوں کی زبان بنی حتیٰ کہ مراٹھوں کے دورِ حکومت میں یعنی ۱۷۵۱ء سے ۱۸۰۳ء تک فارسی اپنی سابقہ حیثیت میں رہی۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے اڑیسہ پر قبضہ کر لیا لیکن ۱۸۲۳ء تک فارسی اُڑیسہ کی سرکاری زبان رہی۔ ملک کے مسلم حکمرانوں نے جب فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر جاری کیا تو مقامی لوگوں کو ملازمت، تجارت اور دوسرے مراعات کے حصول کی غرض سے فارسی پڑھنا پڑی۔ آج انگریزی تعلیم جس طرح تہذیب کا جز بنی ہوئی ہے اُس دور میں فارسی کی بھی یہی حالت تھی۔ سکندر نامہ نظامی گنجوی کا ایک قلمی نسخہ راقم الحروف کو دستیاب ہوا جو اجودھیا رام کی رہائش گاہ پر ۱۱۲۰ھ عملی (مطابق ۱۷۱۲ء) میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ کا اختتام ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے۔

"تمت تمام شد کار من نظام شد نسخۂ سکندر نامہ بحری من تصنیف
حضرت مخدومی نظامی بوقت ۳ پہر بروز ۳ شنبہ
بتاریخ بیست و نہم شہر شوال در عمل نواب نام دار میر محمد افضل
صوبہ دار اڑیسہ سالنہ ۱۱۲ عملی درمقام رگھوناتھ پور بدولت
خانۂ اجودھیا رام از خطِ خام ضیاء الدین نام تحریر یافت۔"

سکندر نامہ بحری کا یہ قلمی نسخہ ۵۷ سال تک اجودھیا رام کے خاندان میں رہا اور بعد میں اس نسخہ کو دیوان بھگت رام کے بیٹے لالہ سری پت رائے نے ۱۱۷۷ھ علی مطابق ۱۷۶۹ء میں کسی غلام حسین کو ہبہ کر دیا جیسا کہ کتاب قلمی نسخہ کی پشت پر مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"لالہ سری پت رائے ولد دیوان بھگت رام بتاریخ دوئم
شہر رمضان المبارک در سال ۱۱۷۷ھ علی بحضور آخوند محمد ذاکر
صاحب و استادی میاں منوچہر صاحب بہ ایں بندۂ عاصی
غلام حسین ایں نسخۂ متبرکہ منظومہ را بخشش نمودہ قابض گردانیدند
فقط۔"

مذکورہ بالا شواہد سے اڑیسہ کے ہندوؤں میں بھی فارسی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ مزید اس امر کی تقویت فارسی لغات کے ایک قلمی نسخہ "فرہنگ جانی" سے بھی ہوتی ہے۔ ۱۷۵۰ء میں کٹک سرکار کے جان محمد نے یہ لغات مرتب کیا تھا۔ لغات کے آخری صفحہ کی تحریر کے مطابق یہ نسخہ اڑیسہ کے جگ موہن دیو کی ملکیت تھا۔(۱)

اڑیسہ میں مسلم دور حکومت سے قبل اڑیا زبان و ادب میں عربی اور فارسی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

اڑیسہ کی تاریخ میں مسلم دور حکومت سے قبل کئی کتبوں میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ کپیلندر دیو کے ۱۴۵۰ء کے ایک سنگی کتبے "ملک پارسا" پر اس کی فتح کا ذکر ہے جسے محققین "ملک پادشاہ" کی بگڑی ہوئی شکل بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تک ۱۴۰۰ء کے ایک کتبہ میں معطی کا نام بزبان اڑیا "لڑاؤ سورت مان" لکھا ہوا ہے جو یقینی طور 'سلطان' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مادلا پانجی میں بنگال کے مسلم حکمراں کے لیے متعدد جگہوں میں "سرتھان" (سلطان) درج ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے وشوناتھ کوی راج نے اپنی تصنیف "ساہتیہ درپن" میں فارسی الفاظ کی ایک مختصر فہرست دی ہے جو اس دور کی سنسکرت نظموں میں استعمال ہوتے تھے۔ مذکورہ کتاب کے بوسیدہ نسخہ سے صرف

---

(۱) "فرہنگ جانی" کا قلمی نسخہ کرامت علی کرامت نے مدرسہ سلطانیہ کٹک کی لائبریری سے حاصل کیا تھا۔ (ح ن)

'سورتران' (سلطان) اور الابودین (علاؤالدین) کا پتہ چلتا ہے۔

संचौ सर्वस्व हरैण विग्रहे प्राण निग्रह
अलावदीन नृपतौ न साधि न च विग्रह ॥
गंगाभ्यासे सुरत्राण तव निःशान निस्वनः
स्नाति वारि वधूवर्ग गर्भपातन पातकी ॥ (۱)

پرشوتم دیو کے ایک سنگی کتبہ میں "مقابلار" اور "تیاراچھو" کی نشان دہی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ "مقابلار" دراصل مقابلہ اور "تیاراچھو" دراصل تیار ہیں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ۱۵۲۹ء کے ایک سنگی کتبہ میں "سرحد" اور "قیمد" استعمال ہوتے ہیں۔ مؤخرالذکر لفظ "قیمت" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ڈاکٹر کنج بہاری تری پاٹھی نے اپنی تصنیف The Evolution of Oriya language and script میں بہت سارے قدیم سنگی کتبوں کی اڑیا تحریروں میں عربی اور فارسی الفاظ کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے مطابق ہندی یا ہندوستانی کے توسط سے سیمیٹک یا فارسی و عربی الاصل الفاظ چودہویں صدی عیسوی تک اڑیا زبان میں کثرت کے ساتھ داخل ہو چکے تھے۔ اور جب اڑیسہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار الفاظ تیزی کے ساتھ اڑیا زبان میں مدغم ہونے لگے (۲)

برج ناتھ بڑجینا (۱۷۳۰ء تا ۱۷۹۵ء)، ابھی منیو سامنت سنگھار (۱۷۵۷ء تا ۱۸۰۶ء) اور بلدیو رتھ (۱۷۸۹ء تا ۱۸۴۵ء) نے اپنی ادبی تخلیقات میں بے شمار اردو اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کی تخلیق "ستیہ نارائن پالا" اور "مغل تماشا" تو اس امر کی بیّن دلیل ہیں جن میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مکالمے استعمال کیے گئے ہیں۔ مغل تماشا اگرچہ اڑیا رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس میں پانچ زبانوں کا استعمال ہوا ہے۔ اس میں اردو حاوی زبان رہی ہے اور یہی اردو کا پہلا ڈرامہ ہے۔ اڑیسہ کے ہندوؤں میں بھی اردو اور فارسی مقبول رہی ہے۔ کٹک کا ہردے رام

---

(۱) وشوناتھ کوی راج: ساہتیہ درپن، ص۱

(2) Tripathy, K. The Evolution of Oriya language and script PP88.

جو دت اڑیسہ میں اردو کا اولین شاعر گذرا ہے۔ وہ کٹک سے مرشد آباد جاکر وہاں نواب سرفراز خاں کے دربار سے منسلک ہوگیا تھا جس کا تذکرہ نساخ نے کیا ہے۔ بنگال کا اردو ادب/بنگال میں اردو میں ڈاکٹر جاوید نہال اور وفا راشدی نے بھی کیا ہے۔ اردو اور فارسی کی اڑیسہ میں مقبولیت کی نشان دہی فقیر موہن سیناپتی اور رادھا ناتھ رائے کی اُڑیا تخلیقات سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے ہمعصر شعراء و اُدباء نے بھی اڑیا زبان میں بے تکلفی کے ساتھ بے شمار اردو، فارسی اور ترکی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بعد میں تو اردو اور فارسی الفاظ اڑیا زبان کا ایک حصہ بن گئے اور آج اُڑیا لغات میں دو ہزار سے زیادہ اردو، فارسی اور عربی الفاظ ملتے ہیں جنھوں نے اُڑیا زبان میں اپنا مستقل مقام بنالیا ہے۔ ہنوز اُڑیسہ کی عدالتوں اور کچہریوں میں جو محرر استغاثے اور قبالے وغیرہ اڑیا زبان میں لکھتے ہیں ان پر بھی اردو اور فارسی کے اثرات واضح ہیں اور مذکورہ محرر خود کو نویسندہ لکھتے ہیں اور کہیں محرر۔ اڑیا کی کرنی طرز تحریر بھی فارسی کے زیر اثر وجود میں آئی ہے جس کا اندازہ منشی شیخ احسان اللہ مرحوم کی منسلکہ کرنی طرز تحریر سے بآسانی ہوسکے گا۔ اسی طرح مسلمان بھی اڑیا زبان سے دلچسپی لینے لگے اور انھوں نے قابل اعتناء طور پر اُڑیا کی ادبی تخلیقات پیش کیں۔ اوائل سولہویں صدی کے مسلم شاعر سال بیگ کے اُڑیا بھگتی گیتوں نے ہندوؤں میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ مسلم ادیبوں نے بہت سے اردو اور فارسی ادب پاروں کا اڑیا میں ترجمہ کیا۔ عبدالمجید بھونیاں نے پند نامہ عطار کا اڑیا میں منظوم ترجمہ کیا جو ۱۸۶۹ء میں "پرلودھ کادیۃ" کے نام سے شائع ہوا۔ مولوی شیخ حمیداللہ نے اڑیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوم سیرت " جگت گرو حضرت محمدؐ " لکھی۔ مولوی شیخ منصور علی نے قرآن کریم کا اُڑیا میں ترجمہ کرکے "କୋରାନ ର ଆଲୋକ" (کورانورو آلوکو) کے نام سے شائع کیا۔ اس طرح کی بیشتر مثالیں اُڑیا زبان وادب میں موجود ہیں۔

اُڑیسہ کا اولین تذکرہ ملک محمد جائسی کی " پدماوت " میں پایا جاتا ہے۔ جائسی نے شیر شاہ کے دور حکومت میں " پدماوت " لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ جہانگیر کے زمانہ کے شاعر عثمان غازی پوری نے اپنی نظم " چترا ولی " میں بھی اُڑیسہ اور جگن ناتھ کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

---

(1) Orissa Historical Research Journal Vol I No I PP. 41

مذہبی طور پر ستیہ پیر کی پوجا کا آغاز بنگال میں ہونیکے باوجود اب تک اسے اڑیسہ میں مقبولیت حاصل ہے۔ ستیہ پیر کی پوجا کا سلسلہ دراصل بنگال میں سولہویں صدی میں یعنی حسین شاہی خاندان کے دور حکومت (۱۴۹۴ء تا ۱۵۳۸ء) میں بنگال کے دو فرقے کے لوگوں کو ایک ہی جگہ مشترکہ عبادت کے لیے پیش قدمی کی کوشش تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں جب شجاع الدین محمد خاں اڑیسہ کا صوبہ دار تھا، اڑیسہ میں ستیہ پیر کی پوجا کا آغاز ہوا۔

ستیہ پیر جس طرح سنسکرت کے لفظ "ستیہ" اور فارسی کے لفظ "پیر" کا مرکب ہے، یہ پوجا ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کے نظریہ سے فروغ پذیر ہوتی۔ اس پوجا کے سلسلہ میں بہت سی ادبی تخلیقات بھی وجود میں آئیں جنھیں اڑیسہ میں پالا کہا جاتا ہے۔ جہاں اردو اور فارسی اڑیسہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کے تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول تھیں وہاں علاقائی زبان اڑیا پر ان زبانوں کا اثر پڑنا فطری بھی تھا اور لازمی بھی۔ مسلم کلچر اور اردو زبان کا اڑیسہ کے ہندو کلچر پر جو گہرا اثر پڑا اس کی زندہ مثال اڑیا زبان کے پالا یا جاترا میں نظر آتی ہے۔ دراصل ستیہ پیر کی پوجا کا سلسلہ ایک قطعی غیر فرقہ وارانہ دینی رسم اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھا۔ عام طور سے پالا دو پارٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ستیہ پیر کی پوجا کے بعد اصل پالا شروع ہوتا ہے جو ایک طرح کا ادبی مقابلہ و مناظرہ ہوتا ہے جس میں اشعار گاکر تمثیلی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں، ساتھ ساتھ نثر میں بعض حصوں کی تشریح بھی کی جاتی ہے۔ پالا گاتے وقت گائک مسلم شاہی لباس پہنتے ہیں۔ اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پالا مسلمانوں کے ہی دور حکومت میں وجود میں آیا۔ ستیہ نرائن کی پوجا صرف اڑیسہ یا بنگال میں ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں مقبول ہے۔ لیکن اڑیسہ کے ستیہ پیر کی پوجا کی اہمیت یہ ہے کہ ستیہ پیر کی روایت کو جگن ناتھ کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اڑیا کے ستیہ پیر پالا میں کبھی کبھی مخلوط قسم کی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ اب اڑیسہ میں ہندوؤں نے ستیہ پیر پالا کی جگہ ستیہ نرائن پالا مروج کیا ہے۔

اڑیسہ میں ہندو مسلم اتحاد کی مثالیں ملک کے دوسرے علاقوں میں مشکل سے ملیں گی۔ یہاں ہندو اور مسلم اتحاد اور اتفاق کے ساتھ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں کس طرح شریک ہوتے ہیں اس کی زندہ مثال پوری ضلع کے مانکا گوڑہ گاؤں میں ملتی ہے

جہاں ہندو اور مسلم مشترکہ آبادی ہے۔ اتفاق سے اس گاؤں کا دل بہرا (سرداں) ایک مسلم ہے اور اس گاؤں میں درگا پوجا کی ساری ذمہ داریاں اس کے سر ہیں۔ وہ پوجا کا معرفت دار کہلاتا ہے۔ دسہرہ کے دن برہمن کے لباس میں اسے جلوس کے ساتھ پوجا منڈپ پر لے جایا جاتا ہے۔ وہاں جاکر وہ برہمن پنڈت کو اپنی طرف سے پوجا کی اجازت دیتا ہے، تب پنڈت پوجا کا آغاز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مقدس تلوار جس سے دسہرہ کے وقت جانور کی قربانی دی جاتی ہے، معرفت دار دبیر الدین خاں کے گھر رہتی ہے۔ جلوس کے ساتھ اس تلوار کو پوجا منڈپ میں لے جاتے ہیں۔ اس جلوس کے ساتھ مسلمانوں کا اکھاڑہ بھی جاتا ہے۔
اس علاقہ میں شادی بیاہ کے موقع پر ہندوؤں کی تقریبات میں مسلمان اور مسلمانوں کی تقریبات میں ہندو آیا کرتے ہیں جنھیں مقامی اصطلاح میں "ଗୋଆଦିଆ ବନ୍ଧୁ" (گوادیا بندھو) کہا جاتا ہے۔ اُڑیسہ میں اس طرح ہندو مسلم یک جہتی کی متعدد مثالیں پیش نظر ہیں۔
کٹک کے "قدم رسولؐ" میں ہندو اور مسلم زائرین مشترکہ طور پر زیارت کی غرض سے آتے ہیں اسے ہندو مسلم عقیدوں کا مشترکہ ورثہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تپدرک کے سید جلال الدین بخاریؒ کا مزار ہے جہاں دونوں فرقہ کے زائرین منتیں مانگتے ہیں۔ اور فاتحہ خوانی کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پوری ضلع کے استرنگ میں ساحل سمندر پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خانقاہ ہے جو ہنوز ہندو مسلم عقیدت مند زائرین کی مشترکہ آماجگاہ ہے۔ حضرت جہانیاں جہاں گشت عہد وسطیٰ کے ایک سیاح صوفی بزرگ تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شیخ جلال معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ابن سید احمد کبیر ابن سید جلال بخاری ملتان کے ایک صوفی درویش تھے۔ موصوف شیخ رکن الدین ابوالفتح کے مرید تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ساری دنیا کا دورہ کیا تھا اس لیے انھیں جہاں گشت کہا جاتا ہے۔ مختلف جگہوں میں جہاں جہاں انھوں نے قیام کیا تھا ان کی خانقاہیں قائم ہیں۔ پوری ضلع کے سوہان پور گاؤں میں اس طرح کی ایک اور خانقاہ قائم ہے۔ اس خانقاہ کا متولی اور خادم دار ایک ہندو ہے جو مذکورہ خانقاہ میں فاتحہ خوانی کرتا ہے۔ شہر کٹک کے بارہ باٹی قلعہ کے اندر سید علی بخاریؒ کا مزار ہے جہاں ہندو مسلم زائرین زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور تزک و احتشام کے ساتھ ہر سال وہاں عرس منایا جاتا ہے۔ بھدرک کے پہلوان شاہ کے مزار پر بھی ہر جمعرات کو ہندو مسلم زائرین کی بھیڑ رہتی ہے۔ الٹی کے

پہاڑ پر حضرت سلیمانؑ کے تخت کا ورود ہوا تھا۔ بلند پہاڑ کی چوٹی پر ۱۷۲۰ء میں نواب مرشد قلی خاں کے نائب شجاع الدین محمد خاں نے ایک مسجد اور خانقاہ قائم کی ہے۔ یہاں بھی دونوں فرقوں کے زائرین کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ وہاں نصب سنگی کتبہ پر فارسی میں مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:

چوں شجاع الدین محمد خاں بساخت	بقعہ کز وے بتابد نور دیں
سال تاریخش بجستم از خرد	تا شود سال بنائے او مبیں
دست بردار از سر جہد و بگو	گفت ہاتف زشکِ فردوس بریں

۱۱۳۲ھ

اس ضمن میں بالیسر کے "بھوجا کھیا پیر" صاحب کا تذکرہ بھی لازمی ہے جہاں ہندو مسلم زائرین مشترکہ طور پر زیارت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک قدیم نیم کے درخت کے نیچے پیر صاحب بیٹھے رہا کرتے تھے۔ عام طور پر بھوجا (بھونے ہوئے چاول کے مُرمُرے) ان کی غذا تھی۔ ان کے عقیدت مند ان کی خدمت میں بھوجا پیش کیا کرتے تھے جسے پیر صاحب بچوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اسی نیم کے درخت کے نیچے پیر صاحب کا مزار ہے۔

مسلم پیروں سے ہندوؤں کی عقیدت مندی کی مثال اُڑیا ادب کے پیش رو اور ناول نگار فقیر موہن ہی ہیں۔ فقیر موہن (۱۸۴۳ء تا ۱۹۱۸ء) کا اصل نام برج موہن تھا۔ لڑکپن میں والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور یہ اکلوتے لڑکے تھے۔ سات آٹھ سال کی عمر میں شدید بیمار ہوئے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ان کی دادی جب علاج سے تھک ہار گئیں تو تمام دیوی دیوتاؤں سے پرارتھنا کی لیکن برج موہن کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ان کی دادی نے بالیسر کے پیر صاحب کے پاس فقیر موہن کو لے کر ڈال دیا اور اس کی زندگی کے لیے منتیں مانگیں۔ فقیر موہن اچھے ہو گئے تو ان کی دادی نے ان کا نام بدل کر پیر صاحب کے فقیر کے طور پر برج موہن سے فقیر موہن کر دیا۔ تب سے ہر محرم میں فقیر موہن فقیروں کا بھیس بنائے آٹھ دنوں تک در در بھیک مانگا کرتے اور اس سے جو کچھ حاصل ہوتا اسے پیر صاحب کے نام شیرینی فاتحہ کروا دیتے۔ فقیر موہن کی زندگی کے اس واقعہ سے اُڑیسہ میں مسلم اثرات کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔

ملک کے جنوب مشرقی علاقوں میں خصوصاً اُڑیسہ، بنگال اور آسام میں یاترا اور تماشا کی روایت قدیم ہے۔ یہ تماشے اوپیرا کے پیرایہ میں کھلی فضا کے اسٹیجوں پر منعقد کیے جاتے ہیں۔ اُڑیسہ میں یاترا کا آغاز اور ارتقاء مسلم دور حکومت ہی میں ہوا۔ اس لیے "یاترا" پر مکمل طور پر مسلم

اثرات پائے جاتے ہیں۔ اُڑیسہ میں پالا اور تماشا مقبول عام ہیں۔ خصوصاً بھدرک علاقہ میں اواخر اٹھارہویں صدی سے آج تک بنسی بلّبھ گوسوامی کے مغل تماشا کی مقبولیت اور شہرت مستند ہے۔ اس تماشا کے انعقاد میں ہندو مسلم مشترکہ طور پر حصہ لیتے ہیں اور اس تماشا میں کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ بنسی بلبھ گوسوامی نے جب "مغل تماشا" لکھا تو اڑیسہ میں اس وقت مراٹھوں کی حکومت تھی۔ مغلیہ دور حکومت ختم ہو چکا تھا لیکن اس دور حکومت کے اثرات باقی تھے جنھوں نے بنسی بلّبھ گوسوامی سے اپنے دور کا عظیم ڈراما لکھوایا جو ہندو مسلم کلچر کا ایک اعلیٰ نمونہ اور بین لسانی ہم آہنگی کا بیّن ثبوت ہے۔(۱)

اُڑیسہ کے رسم و رواج، وضع قطع، خورد و نوش اور طرز معیشت کی بات کی جائے تو قدم قدم پر مسلم اثرات پھیلے ہوئے ہیں۔ آج بھی اُڑیا زبان میں ٹوپی، جامہ، پائجامہ، رومال، شال، تکیہ، چپل، شلوار وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں مٹھائی، گلاب جامن، حلوہ، برفی قلا قند، بریانی، جلیبی، چپاتی، روٹی، پلاؤ، قورمہ، کھچڑی، شربت۔ اور پھلوں میں انگور، بادام، پستہ، اخروٹ، کاجو، چلغوزہ، آم، انجیر، سیب، ناشپاتی، انار وغیرہ اُڑیا میں بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ مسلمانوں نے اُڑیا زبان کو کاغذ، قلم اور عطریات سے روشناس کرایا جس کا تذکرہ بنسی بلّبھ گوسوامی نے بھی مغل تماشا کے مکالمے میں کیا ہے۔

اُڑیسہ میں جگہوں اور علاقوں کے نام بھی مسلمانوں کے اپنے انداز میں رکھے گئے ہیں۔ جس طرح دیوان بازار، قاضی بازار، اعظم خاں بازار، قافلہ بازار، مہندی پیر، شہدائی باغیچہ، صاحبزادہ بازار، عالم چند بازار، قاضی محلہ، میرا محلّہ، شیخ ساہی، مرزاپور، رسول پور، مولانا ساہی، شاہ پور، رسول پور، مولوی محلّہ، معصوم پور، خان پور، خان نگر وغیرہ۔ اس طرح ہر شہر اور گاؤں کے جن علاقوں میں مسلم بستیاں ہیں وہاں اس طرح کے نام ضرور ہیں۔

دوسری طرف دیکھا جاتا ہے کہ ہندو کلچر کے زیر اثر اُڑیسہ کے مسلمانوں نے بھی کئی ہندو رسوم اپنائی ہیں۔ ان میں سے ولادت کے وقت بچہ کا زائچہ بنوانا (اڑیا میں جاتک کہا جاتا ہے)، علم رمل پر عقیدہ رکھنا، تعویذ گنڈوں کا استعمال۔ یہ تمام چیزیں صوفیا کے توسط سے مسلمانوں میں آئی ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ دو کلچر ساتھ ساتھ رہیں تو ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا لازمی ہے۔

---

(۱) حفیظ اللہ نیولپوری۔ مغل تماشہ پیش لفظ ۱۹۸۱ء

اُڑیسہ میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا ایک دوسرے پر اسی طرح اثر پڑا ہے۔ اسی طرح پوری ضلع کے خوردہ وغیرہ نواحی علاقوں میں مسلمان ہندو کلچر سے اس قدر زیادہ متاثر ہوئے ہیں کہ اپنا کلچر فراموش کر بیٹھے ہیں۔ چلکا کے ساحلی علاقہ میں خود کو "اردا پٹھان" کہلانے والے لوگوں کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ مسلمان رہے ہوں گے۔ ان کے یہاں اسلامی کلچر کا کوئی نام و نشان ہی نہیں رہا۔ ان کی زبان اُڑیا ہے اور پوری طرح ہندو رسم و رواج اپنائے ہوئے ہیں۔ البتہ عید کے دن ان کے یہاں "لال کتاب" کی پوجا ضرور ہوتی ہے۔ ایک قدیم کتاب پشتہا پشت سے سرخ رنگ کے کپڑے میں لپٹی ہوئی رکھی ہوتی ہے جس کی عید کے دن پوجا کی جاتی ہے۔ در اصل سرخ کپڑے کے اندر قرآن کریم کا ایک قدیم نسخہ ہے جو انھیں اجداد اعلیٰ سے ترکہ میں ملا ہوگا۔ یہ "اردا پٹھان" دراصل ان عرب مسلمانوں کی نسل سے ہیں جو ۱۵۷۱ء میں قطب شاہی فوج کے ساتھ اُڑیسہ آئے ہوں گے اور مقامی لوگوں کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد یہیں کے ہو رہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ زبانیں یا تہذیبیں کسی شاہی فرمان کے نتیجے میں اچانک نمودار نہیں ہوئیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی اور بڑھتی ہوئی ضرورتیں اور اظہار کے وسیلوں کی توسیع و تلاش انھیں جنم دیتی ہے۔ اور صدیوں کے خون جگر سے پروان چڑھتی ہیں۔ اردو کی ترقی و ترویج میں بلا امتیاز مذہب و عقیدہ سب نے حصہ لیا اور یہ زبان مسلمانوں، ہندوؤں اور ملک کے دوسرے طبقہ کے درمیان اظہار و ابلاغ کا مؤثر وسیلہ بنی اور رفتہ رفتہ اس نے ملک کی مختلف مذہبی اور لسانی اکائیوں کے لیے مرکز اتصال کی حیثیت اختیار کی۔ اردو زبان و ادب میں اسلامی و غیر اسلامی آدرش و تصورات ہمیشہ پہلو بہ پہلو جگہ پاتے رہے ہیں۔ یہ زبان صرف صوفیوں اور درویشوں کے پند و نصائح کا ذریعہ ہی نہیں بنی بلکہ ہندو سنتوں آریہ سماجی اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغ کا مؤثر وسیلہ رہی۔ ہندوستان کے عوام میں اگر کوئی زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی تو صرف یہی ایک زبان تھی۔ اس کا نہ کوئی مخصوص علاقہ تھا، نہ عقیدہ۔ ہر نظریہ کی تبلیغ و اشاعت نے لاشعوری طور پر اسے آگے بڑھنے اور پھولنے پھلنے میں مدد دی۔

تہذیب کے بغیر زبان کا تصور ممکن نہیں۔ اردو کا تعلق اس مشترکہ تہذیب سے ہے جو کسی مذہب یا فرقہ میں محدود نہیں ہے۔ یہ تہذیب دراصل ان حد بندیوں کو توڑ کر پیدا ہوئی اس لیے یہی مشترکہ تہذیب دراصل ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ہے اور مکمل طور پر سیکولر مزاج

کی آئینہ دار ہے۔ رواداری اور انسان دوستی کی بناء پر ہندو مسلمانوں نے مل کر اس کی تعمیر کی ہے۔

اڑیسہ میں جو مسلمان حکومت کرنے کی غرض سے آئے۔ ان کی مشترکہ تہذیبی زبان فارسی تھی۔ چونکہ وہ سرکاری اور دفتری حیثیت رکھتی تھی اس لیے یہاں کی مقامی زبان اڑیا کو بھی متاثر کرتی رہی، لیکن مسلمانوں کی حکومت سے قبل ہی شمال اور جنوب کی جانب سے مسلمان اڑیسہ میں تجارت و کسب معاش کے لیے آنے لگے تھے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ زبان تہذیب اور مذہبی عقائد و تصورات کا ایک مکمل فطری نظام تھا۔ ان میں سے بیشتر نے اڑیسہ کو اپنا وطن بنایا اس لیے لسانی اور تہذیبی سمجھوتہ ضروری تھا۔ چنانچہ یہاں کی قدیم تہذیب کے بہترین اجزا میں نو آمدہ تہذیبی تصورات شامل ہو کر ایک قومی تہذیب نمودار ہوئی جس کی ترجمان اُردو ہے۔

اشوک کے زمانہ کے جو کتبے اڑیسہ کے مختلف مقامات پر موجود ہیں ان کی تحریر پالی زبان میں ہے۔ اشوک کے زمانہ میں پالی زبان کے کتبے اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں یہاں پالی سمجھی جاتی رہی ہو گی اور یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اس زبان کے بولنے والے بھی یہاں رہے ہوں گے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو اشوک کے زمانے سے ہی اڑیسہ میں اُردو زبان کے لیے مزاج بن رہا تھا۔

مغلیہ دورِ حکومت میں شہر کٹک کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی اڑیسہ کا دارالسلطنت تھا۔ بیرونی علماء و فضلاء مسلسل یہاں آتے رہے۔ اڑیسہ کے مختلف علاقوں میں صوفیائے کرام کی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جہاں ایک طرف دہلی، پنجاب، اتر پردیش، بہار اور بنگال نے معیاری اُردو زبان براہ راست یہاں پہنچی وہیں آندھرا کی طرف سے دکنی اُردو بھی یہاں آئی۔ اڑیسہ کے جنوبی علاقوں یعنی گنجام اور کوراپٹ ضلعوں میں اب بھی دکنی اُردو رائج ہے۔ لیکن کٹک اور دیگر شہری اضلاع میں جو اُردو بولی جاتی ہے وہ معیاری اردو اور دکنی اُردو کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ یہ امتزاج اتنا واضح ہے کہ کٹک اور اس کے مضافات میں بولی جانے والی اُردو میں دکنی زبان کے اثرات معیاری اُردو کے اثرات میں دب کر رہ گئے۔

بقول سید سلیمان ندوی عبدالقادر بیدلؔ کی سیاحت کا مشرقی نقطہ شہر کٹک تھا۔ جہاں اس زمانہ میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خانِ دوراں سید محمود صوبہ دار تھے۔ خانِ دوراں ستمبر ۱۶۶۰ء سے مئی ۱۶۶۷ء تک اڑیسہ کے صوبہ دار رہے۔ ظاہر ہے کہ اسی زمانہ

میں عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی کا قیام کٹک میں تھا۔ قاضی عبدالودود کے مطابق غالباً اسی زمانہ میں فارسی گو درویش والہ ہروی جو فصیحی ہروی سے تلمذ رکھتا تھا، اڑیسہ میں ہی تھا۔

محمد بن امین والیٔ بلخ نے اپنے سفر نامہ "بحر الاسرار" میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۶۲۴ء میں ہندوستان کی سیاحت کی۔ ۱۶۲۶ء سے ۱۶۲۸ء تک وہ اڑیسہ میں مقیم رہے۔ مذکورہ سفر نامہ سے اڑیسہ کی تہذیبی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مذکورہ سفر نامہ کی ایک کاپی ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب کے پاس اور اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اسٹیٹ آرکائیوز بھوبنیشور میں موجود ہے۔ سفر نامہ میں اڑیسہ سے متعلق باب کا ترجمہ اسماعیل سعیدی نے کیا ہے۔

ناطق لکھنوی نے نظم اُردو کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کٹک میں ایک نامعلوم مدّت سے نہایت عمدہ اُردو بنگال (مرشد آباد) کے ذریعہ پہنچی۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کی اُردو سے بنگال، بہار اور اودھ کو شرف حاصل ہوا۔ شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری بنگال میں بھی رہے۔ یعنی پنجاب سے دہلی، دہلی سے دولت آباد، اودھ، بہار، بنگال اور دولت آباد سے گجرات، گجرات سے بیجاپور (دکن) اور بنگال سے کٹک، اس طرح تمام صوبوں میں اُردو پہنچ گئی۔ بنگال کے کچھ لوگ اپنے ساتھ اردو زبان لے کر اڑیسہ پہنچے ہوں گے۔ لیکن اُردو براہِ راست دہلی، اترپردیش اور پنجاب سے اُڑیسہ پہنچی جیسا کہ اُڑیسہ کے مختلف مقامات پر موجودہ خاندانی شجرات سے پتہ چلتا ہے۔

اڑیسہ کا تعلیمی نظام

دورِ قدیم سے اُڑیسہ ایک دور افتادہ، سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے زبوں حالی صوبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ انگریزوں کی حکومت سے قبل یہاں تعلیم کا رواج عام نہیں تھا۔ عام طور پر اعلیٰ خاندان کے لوگ محض مذہبی تعلیم پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے۔ اور اس طرح کی تعلیم کا دائرہ محدود تھا۔ افغانوں اور مغلوں کے دورِ حکومت میں کسبِ معاش کے لیے لوگوں نے فارسی پڑھی۔ اہلِ ثروت لوگ گھروں پر اتالیق رکھ کر اپنے بچّوں کو تعلیم دلواتے تھے۔ پھر مسجدوں سے متصل مکاتب کا آغاز ہوا لیکن جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے اُڑیسہ پر قبضہ کر لیا تو اس وقت سیاسی اور سماجی

حالات بدلنے لگے۔ لیکن مسلمان چونکہ ایک فاتح قوم کی حیثیت سے یہاں آئے تھے، اپنے علوم وفنون اور زبان وادب کو چھوڑ کر عیسائیوں کی زبان وعلم کو سیکھنا اپنی تہذیب و شرافت کے خلاف سمجھتے تھے۔ گرچہ انگریزی تعلیم کی ابتدا سب سے پہلے بنگال میں ہوئی۔ کلکتہ میں اسکول اور کالج قائم کیے گیے لیکن ان اداروں میں زیادہ تر طلباء ہندو تھے کیونکہ مسلمانوں کی کثیر آبادی گاؤں میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۸۵ فی صد بنگالی مسلمان انگریزی تعلیم سے بالکل محروم رہے اور اس طرح مغربی افکار سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔[1] ٹھیک یہی حالت اُڑیسہ میں بھی تھی۔ اس سے قبل زمین داروں کو عوام کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اس کے باوجود مقامی لوگوں میں تعلیم کا رجحان پیدا ہونے لگا تھا۔ لوگوں نے اپنی کوشش سے مکاتب اور مدرسے قایم کیے تھے۔ جنوبی اُڑیسہ میں گاؤں کے پردھانوں نے چھوٹے چھوٹے پاٹھ شالے قائم کیے لیکن ان میں عوام کے بچوں کی گنجائش نہیں تھی۔ صرف برہمن یا اونچی ذات کے بچے ہی ان پاٹھ شالاؤں میں پڑھنے کے لیے جایا کرتے تھے۔

سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۲۲-۲۳ء میں مدراس پریزیڈنسی میں تعلیمی اقدامات کیے۔ ان دنوں اُڑیسہ کا جنوبی حصہ مدراس پریزیڈنسی کے تحت تھا۔ مقامی لوگوں کی تعلیم کے سلسلہ میں متعلقہ کلکٹروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ ان کے تعلیمی رجحان کا پتہ چلائیں۔ لیکن اڑیسہ کے لوگ انگریزوں سے اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ انگریزی تعلیم میں انھیں طرح طرح کے خدشات نظر آرہے تھے سابقہ اسکولوں میں طلباء خال خال نظر آتے۔ اساتذہ کی حالت نہایت خستہ تھی۔ طلباء کے والدین سے انھیں جو بھی مل جاتا وہی ان کی روزی روٹی کا ذریعہ تھا طلبا کی فیس ماہانہ ایک آنہ سے لے کر چار آنے کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی طالبعلم فیس نہیں دے پاتا تھا۔ ۲۱ر فروری ۱۸۲۵ء کے ریونیو رپورٹ کے مطابق اڑیسہ کے گنجام ضلع میں ۲۲۵ اسکول تھے جس میں مندرجہ ذیل خاکہ کے مطابق طلبا زیر تعلیم تھے:۔

قوم	طلباء	طالبات	مجموعی تعداد
برہمن	۸۰۸	x	۸۰۸
ویشنو	۲۴۳	x	۲۴۳
شودر	۱۰۰۱	۲	۱۰۰۳
مسلم	۲۷	x	۲۷
دوسری قوم کے	۸۸۶	۱۰	۸۹۶
مجموعی تعداد = ۲۹۷۷[2]			

حاشیہ (۱) و (۲) اگلے صفحے پر دیکھیے۔

ان پاٹھ شالاؤں کے اساتذہ شاستری پنڈت ہوا کرتے تھے جن کی ماہانہ تنخواہ آٹھ آنے سے ایک روپیہ کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ اس قلیل آمدنی سے وہ نہ صرف اپنے اہل و عیال کی کفالت کرتے تھے بلکہ بعض اوقات ضرورت مند طلباء کی بھی امداد کیا کرتے تھے۔(۱)

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر حکومت نے اپنے طور پر چند اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور ہر کلکٹریٹ کے تحت ۲ کلکٹریٹ اسکول اور پندرہ تحصیلداری اسکول قائم کرنا طے پایا۔ کلکٹریٹ اسکول کے اساتذہ کا مشاہرہ پندرہ روپئے اور تحصیلداری اسکول کے اساتذہ کا مشاہرہ نو روپئے مقرر کیا گیا۔ اس زمانہ میں طلباء سے کسی طرح کی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ لیکن اساتذہ کی کم یابی کی بناء پر زیادہ اسکول قائم نہیں ہو پائے۔ سنہ ۱۸۳۶ء تک تعلیم کی توسیع کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو پایا۔ دور دراز کے علاقوں میں تو تعلیم کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ مثال کے طور پر ان دنوں پورے کورایٹ ضلع میں ایک بھی اسکول نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو کورایٹ کا دور افتادہ علاقہ اور بلند پہاڑی گھاٹیوں کی دشوار گزار راہیں تھیں اور دوسری طرف اساتذہ دستیاب نہ تھے۔ مقامی لوگوں میں سے جو بھی تعلیم حاصل کرتا فوری طور پر اسے شعبۂ مالیات میں ملازمت مل جاتی۔ جو اس ملازمت سے کسی وجہ سے محروم رہتے وہ درس و تدریس کی طرف متوجہ ہوتے۔ تب اس بات کا خیال آیا کہ مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر تعلیم کی توسیع و اشاعت ممکن نہیں ہے۔ عوامی تعاون حاصل کرنے اور مقامی لوگوں کی عملی پیش قدمی کے لیے ہر اسکول میں مقامی لوگوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی جو تعلیم کی نگرانی اور اسکول کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ یہ صورت کسی قدر کارگر ہوئی اور مقامی لوگ اپنے اپنے اسکولوں کے مسائل سے واقف ہونے لگے لیکن اس کے باوجود یہ دور غیر یقینی اور تذبذب کا دور تھا کیونکہ مقامی طریقۂ تعلیم اور انگریزی طریقۂ تعلیم

حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔

(۱) سیمیں ثمر و فضل رب: اردو کے ابتدائی ناول ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے، مطبوعہ عصری ادب شمارہ ۳۵ ص ۴۵۔

① Revenue Report Dated 21-2-1825 from Secretary of the Board of Revenue to the Chief Secretary to Govt Selection No II Appendix - C.

② Abid.

دونوں گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ کوئی واضح شکل سامنے نہ تھی۔ ۱۸۴۹ء کے بعد جنوبی اُڑیسہ کی تعلیمی صورت حال میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ سر ہنری پوٹنگر شعبۂ تعلیم کے سربراہ ہو کر اُڑیسہ آئے تو انھوں نے تعلیمی اداروں کی ترقی پر کافی توجہ دی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی کہ اڑیسہ کے قبائلیوں کے لیے بھی اسکول کھولے گئے۔ ۱۸۵۲ء میں سر ہنری پوٹنگر نے گنجام ایجنسی میں چھ اسکول قائم ہوئے۔

اپریل ۱۸۵۶ء میں برہم پور ضلع اسکول قائم ہوا۔ اس میں اساتذہ کی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا۔ تاکہ وہاں سے فارغ ہو کر جنوبی اُڑیسہ کے اسکولوں میں تعلیم دے سکیں۔ ۱۸۶۷-۶۸ء میں برہم پور ضلع اسکول سے تین لڑکوں نے جب میٹرک پاس کیا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ معاشیاتی اور معاشرتی زندگی میں تعلیم کی اہمیت سے واقف ہونے لگے۔ مقامی اُڑیا لوگوں نے اڑیا زبان کو سرکاری اور اصطلاحی زبان کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تحریک چلائی۔ بالآخر متواتر کوششوں کی بنا پر ۱۸۷۱ء میں اڑیا زبان کو اصطلاحی زبان کے طور پر حکومت نے منظور کیا۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مقامی لوگ جو اب تک اپنی مادری زبان میں سرکاری امتحانات نہیں دے پاتے تھے اب انھیں یہ مراعات حاصل ہو گئی تھیں۔[1]

اُڑیا زبان کو سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کے بعد تعلیمی اداروں کی حالت بدلی۔ اُڑیا لوگوں نے اپنے مقامی اسکولوں سے امتحانات پاس کیے اور سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے لگے۔ اس طرح کی مراعات اس سے پہلے انھیں کبھی بھی حاصل نہیں تھیں۔ اب تعلیم کا رواج عام ہونے لگا اور زبان و ادب کی ترقی کے ذرائع نکل آئے۔ زمینداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اسکول قائم کرنے کے لیے فراخ دلی کے ساتھ عطیات دیئے۔ مقامی زمینداروں کے عطیات پر دھرا کوٹ، کھلی کوٹ، چِنا کھمنڈی، پڑا کھمنڈی، پارلا کھمنڈی، سوروڈا، چکیٹی اور بوئرائی میں اسکول قائم ہوئے۔[2]

۱۸۷۰ء تک جنوبی اڑیسہ میں، ۴ اسکول قائم ہو چکے تھے اور ۱۳ اسکول درس نظامیہ

---

(1) Sattianandham, S: History of Education in the Madras Presidency Journal of Education: Madras No 10, October 1892. P 590.

(2) Journal of Education Madras, Vol XXXVI 1896 PP 3-5.

کی تعلیم دے رہے تھے۔ سرکاری اسکولوں میں ۵۶۸ طلبا تھے اور درس نظامیہ والے اسکولوں میں طلبا کی تعداد نسبتاً زیادہ یعنی ۱۱۲۴ تھی۔(۱)

۱۸۶۶ء کے قحط کا اڑیسہ کی تعلیمی صورت حال پر بھی خاصہ اثر پڑا۔ بہت سارے بچے یتیم و یسیر تھے۔ عیسائی مشنریوں نے ان بے سہارا مفلس بچوں کو پناہ دی اور ان کی ہر طرح سے سرپرستی کی۔ قحط کے بعد اڑیسہ کے معاشی، معاشرتی اور تعلیمی زندگی پر خاصہ اثر پڑا۔ ۱۸۶۸ء میں پارلاکھمنڈی میں تعلقہ اسکول قائم ہوا تھا جس میں اس سال ستر بچوں نے داخلہ لیا تھا۔(۲) ۱۸۶۹ء میں برہم پور ضلع اسکول کو ثانوی درجہ کے کالج میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کا نام NATIVE COLLEGE رکھا گیا۔ اس کالج پر مقامی افراد کی کمیٹی نگراں رہی۔ گنجام کے کلکٹر مسٹر چورگل نے کالج کی ترقی اور قیام کے سلسلہ میں سرپرستی کی اور ہر طرح سے کالج کو مدد پہنچائی۔(۳)

جنوبی اڑیسہ کے مقابلہ میں شمالی اڑیسہ میں تعلیمی صورت حال کسی قدر مختلف تھی۔ کلکتہ میں مقیم عیسائی مشنریاں مذہبی تبلیغ اور تعلیم کی توسیع اشاعت میں سرگرم عمل تھیں کمپنی کی حکومت مشنریوں کی مکمل طور پر حمایت کر رہی تھی۔ حکومت کو ہندوستانیوں کی جدید تعلیم کا خاص خیال تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جدید علم کی روشنی پورے برّ اعظم پر پھیلانا چاہتی تھی۔ اس امر کے پیش نظر ۱۸۱۳ء میں ایک چارٹر ایکٹ تیار ہوا جس کے ایک دفعہ کے مطابق علم و ادب کی ترقی کے لیے سالانہ ایک لاکھ روپئے کی رقم منظور کی گئی تھی۔ اس دفعہ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقوں میں اور خصوصی طور پر مشرقی علاقہ میں ترویج علم و ادب کا خاص انتظام کیا گیا۔(۴) ۱۸۰۳ء میں اڑیسہ پر قابض ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اڑیسہ کے پوری اور کٹک میں بنگال کی طرح مالیات،

---

(1) Selection from the Records of Madras Govt Vol XV, Report of Public Instruction in the Madras Presidency for the year 1868-69. P-4.

(2) Report on The Third Tour of Pentland, Governer of Madras to Vizianagaram and Ganjam in 1913. P-177

(3) Ibid, Ganjam Collectorate: P. 138.

(4) Sharp. W.H, Selection from Educational Records. Vol I, P-29.

انتظامیہ اور تعلیمی امور کا اجرا کیا۔ لیکن اڑیسہ کا بنگال کے ساتھ تقابل مناسب نہ تھا۔ کیونکہ بنگال اور اڑیسہ کے مسائل مختلف النواع تھے اور بنگال میں تعلیم کی ترویج کافی پہلے ہو چکی تھی۔ بنگال پر مغلوں کا قبضہ اُڑیسہ سے کافی پہلے ہو چکا تھا اور اُڑیسہ کے مقابلہ میں بنگال کافی ترقی یافتہ تھا۔ اس کے علاوہ انگریز بنگال میں بہت پہلے سے آچکے تھے۔ اس طرح بنگالیوں کی جدید تعلیم و تربیت بھی واضح طور پر بیشتر ہو چکی تھی۔ بد قسمتی سے انگریزوں نے اڑیسہ کو بنگال کے ساتھ ملا کر رکھ دیا۔ اس طرح سے اُڑیسہ کے اندرونی مسائل مناسب طور پر آشکارہ نہیں ہو پائے۔

دوسری طرف بنگالیوں نے فراخدلی کے ساتھ انگریزی طرز تعلیم کا استقبال کیا اور حکومت کے ساتھ پوری طرح تعاون کیا۔ چنانچہ کلکتہ اسکول سوسائٹی کو ہر طرف سے تعاون حاصل ہوا اور بنگال سوسائٹی کو پوری حمایت حاصل ہوئی لیکن اُڑیسہ میں صورت حال مختلف تھی۔ یہاں کے باشندوں نے انگریزی طریقہ تعلیم پر احتجاج کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تعلیم ان کے مذہبی عقائد اور ثقافت کو تباہ کردے گی۔

مغربی تعلیم کی طرف عدم توجہ جدید تعلیم میں اُڑیسہ کی پس ماندگی کا اہم سبب بنی۔ ان دنوں توسیع تعلیم کا کام عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھا۔ مشنریوں نے دیگر مذاہب کی مخالفت کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ اڑیسہ میں جگن ناتھ مندر کی انھوں نے سخت مخالفت کی۔ اور ساتھ ساتھ مندر کے دیوتاؤں کی بھی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار تحریری طور پر کرنا چاہا۔ لیکن اس وقت تک اُڑیسہ میں کاغذ کا رواج نہ تھا۔ اہل اڑیسہ تاڑ کے پتوں پر لوہے کے قلم سے لکھا کرتے تھے۔ انگریز اس طرح لکھنے کے عادی نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اُڑیسہ میں کاغذ اور پریس فراہم کیا۔[1]

مشنریوں میں ولیم کیری بنگلہ کے عالم تھے۔ اُنھوں نے اُڑیا ٹائپ کے حروف بنائے اور اُڑیا زبان میں پہلا بائبل ۱۸۰۴ء میں شائع کیا۔ New Testament کا ۱۸۰۹ء میں مرتیونجے ودیالنکار نے اُڑیا زبان میں ترجمہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ولیم کیری، مارشمین اور وارڈ کی مساعی کی بنا پر اُڑیا زبان میں یہ ترجمہ ممکن ہو سکا۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۰۴ء کو فورٹ ولیم کالج کی رپورٹ بھی اڑیا زبان میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔[2]

---

(1) Sutton, A. Introduction: Narrative of the Mission in Orissa.
(2) Samantray, N: History of Oriya Literature. P-5.

اپنی حکومت کے دن سے لے کر ۱۸۳۲ء تک برطانوی افسران اور مشنریوں نے بائبل اور متعلقہ مذہبی لٹریچر کے علاوہ بہت ہی کم دوسری طرف توجہ دی۔ وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں پریس کی پابندیاں کسی قدر کم ہونے پر ۳۱ مئی ۱۸۱۸ء میں ولیم کیری نے بنگلہ زبان میں ایک ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" شائع کیا جو ہندوستان میں کسی دیسی زبان کا پہلا اخبار تھا۔ ولیم کیری نے بنگلہ میں ایک گرامر بھی لکھا۔ اڑیا کی ایک پرائمری کتاب اور ایک چھوٹی سی ڈکشنری بھی ولیم کیری اور مارشمین کی مساعی جمیلہ سے منظر عام پر آئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے عوام کی مکمل حمایت حاصل کرنے کی غرض سے ان کے معاملات اور مسائل میں پوری دلچسپی لے رہی تھی اور ساتھ مشنریوں کی طرف سے مذہبی تبلیغ کا کام بھی پوری سرگرمی کے ساتھ جاری تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی چالیس زبانوں میں دو لاکھ مذہبی کتابیں عوام میں تقسیم کی تھیں لیکن بنگلہ کے مقابلہ اڑیا کا حصہ بہت ہی کم تھا۔(۱)

ولیم کیری کی سرپرستی میں انجیل کا جو اردو ترجمہ مرزا فطرت نے کیا تھا اس کی کچھ جلدیں اڑیسہ کے اردو داں طبقہ میں بھی تقسیم کی گئی تھیں۔ مدراس پریزیڈنسی کے مقابلہ میں بنگال پریزیڈنسی تعلیمی اعتبار سے کافی ترقی یافتہ تھی لیکن دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی انگریزی تعلیم کی طرف احتجاجی رجحان پایا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں DAVID HARE کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے اپنی کوششوں سے بنگال پریزیڈنسی میں نئے انگریزی اسکول قائم کئے۔

اس وقت کا عالم یہ تھا کہ جدید طرز معاشرت سے لوگ گریز کر رہے تھے۔ ان غیر یقینی حالات میں ڈیوڈ ہیئر نے محسوس کیا کہ مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر جدید طرز تعلیم کامیاب ہو نہیں سکتی۔ شروع میں تو لوگ بے تعلق رہے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ بنگالیوں نے ڈیوڈ ہیئر کی تحریک کا ساتھ دیا۔ سر ہائیڈ ایسٹ نے ۱۸۱۷ء میں کلکتہ کا ہندو کالج قائم کیا تھا۔ اس کالج کی مجلس انتظامیہ میں تیس اراکین تھے لیکن اس کالج میں صرف بیس طلباء نے داخلہ لیا تھا۔(۲)

اس میں شک نہیں کہ اڑیسہ کے مقابلہ میں بنگال کو زیادہ تعلیمی مراعات حاصل تھے۔ بنگال کے تعلیمی اداروں سے فارغ ہو کر لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملازمت حاصل کر رہے تھے۔

---

① Mansinha, M. History of Oriya Literature : P 170.

② Kary. J. W. : The Administration of East India Company : P58

سنہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوچکا تھا اور کمپنی کی ملازمت کے لیے بہت سارے کلرکوں کو تربیت دی جاچکی تھی۔ بنگال کے لوگوں پر انگریزی تعلیم کی اہمیت واضح ہوچکی تھی۔ ان حالات میں تقریباً اٹھارہ سال بعد جب کلکتہ میں ہندو کالج کا قیام عمل میں آیا تو لوگوں کی طرف سے کوئی خاص مخالفت نہیں ہوئی۔ شروع شروع میں کچھ مسائل البتہ درپیش ہوتے لیکن بہت جلد ان کا ازالہ بھی ہوگیا۔ اس کالج سے بڑی تعداد میں مترجم اور کلرک برآمد ہوتے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے وفادار رہے۔ انھوں نے عوام اور سرکار کے درمیان ارتباط قائم کیا۔

برطانوی نظام تعلیم کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جسے تعلیم یافتہ اشرافیہ کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا اور جس کا تعلق سماج کے اونچے طبقے سے ہوتا تھا۔ کیونکہ انگریز ان اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے ذریعہ ہندوستانی عوام پر کچھ دن اور حکومت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو انگریزی اعلیٰ ملازمتوں پر بحال کرتے۔ اس طرح ہندوستانیوں کا ایک گروپ انگریزی تعلیم سے مزیّن ہوکر نکلا۔ لیکن اڑیسہ میں حالات مختلف تھے۔ ملازمت کی پیش کش کے باوجود اڑیسہ کے لوگ تعلیم کے میدان میں آگے نہیں آرہے تھے۔ محض کلرک کی معمولی آسامیوں کے لیے ان کا تقرر مشکل تھا۔ اڑیسہ کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات مرتسم تھی کہ انگریز ہندوستان میں زیادہ دنوں تک ٹکنے والے نہیں۔ ان کے ساتھ اشتراک عمل سے اپنا مذہب اور عقیدہ تباہ کرنا مناسب نہ تھا۔ یہ غلط فہمی ایک طرح سے ان کی پس ماندگی کا اہم سبب بنی۔

انگریزی طریقۂ تعلیم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے اڑیا لوگوں کی عدم دلچسپی کے باعث بنگالیوں نے حالات سے خاصہ استفادہ کیا۔ جب انگریز افسروں کو اڑیا لوگوں کی ناسمجھی اور زبوں حالی کا مکمل اندازہ ہوگیا تو انھیں فارسی یا اڑیا میں تحریر کی اجازت دی گئی۔ سنہ ۱۸۰۵ء میں کٹک کے کلکٹر نے اس سلسلہ میں ہدایت نامہ جاری کردیا۔ انگریزوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اکثر و بیشتر قوانین مقامی لوگ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس زمانہ میں اگرچہ شوہر کی وفات پر بیوی کا اس کی لاش کے ساتھ جل کر ستی ہوجانے کی رسم پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ اور شدت کے ساتھ حکم امتناع جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس طرح کے ۴۳ واقعات رونما ہوگئے۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ کم علمی کی بنا پر عوام قانون کی تہہ تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔(۱) چنانچہ سنہ ۱۸۱۸ء میں

---

(1) Papers relating to East India Affairs: Hindoo Widows and Voluntary immolation 1-7-1821. P-176.

ستی ہونے کے خلاف بزبان اُڑیا قانون نافذ کیا گیا۔

شمالی اُڑیسہ میں اُڑیا زبان کو نظرانداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بنگالیوں نے اس زمانہ میں ایک تحریک چلائی کہ اُڑیا لسانی طور پر الگ کوئی زبان نہیں ہے اور اس ضمن میں پنڈت مانتی بھٹاچاریہ نے بیان دیا تھا کہ اُڑیا بنگلہ زبان کی ہی ایک بولی ہے جس کی زبان کے لحاظ سے الگ کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔[1] اس بات پر اڑیا اور بنگالیوں میں کافی کشیدگی رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامیہ میں ابتدائی چند سالوں تک حکومت نے اڑیا زبان کو انفرادی زبان کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ ۲۱؍دسمبر ۱۷۹۸ء میں جاری کردہ ایک سرکاری اعلان کے مطابق ہر شخص کو کمپنی حکومت کے تحت ملازمت کے لیے مقامی زبان کا جاننا لازمی قرار دیا جا چکا تھا۔ اگر حکومت نے اُڑیا زبان کو انفرادی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہوتا تو اُڑیسہ کے انتظامیہ کی صورت حال مختلف ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں اڑیا زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔

۱۸۱۹ء میں پائک لوگوں کی بغاوت کے بعد اڑیسہ کے مقامی لوگوں کے رجحانات میں تبدیلی آئی۔ انگریزی طرز تعلیم کو اپنانے کی غلطی کا احساس ہوا۔ بنگالیوں کے خلاف جذبۂ بغاوت تیز ہونے لگا اور مشنریوں کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔[2] مشنریوں نے جو بھی اسکول قائم کیے تھے اس میں پوری طرح کامیاب ہوتے تھے۔ شمالی اُڑیسہ میں پہلا مشنری اسکول یکم جون ۱۸۲۲ء میں قائم کیا گیا تھا جس میں اُردو بطور مضمون پڑھائی جاتی تھی۔ البتہ حکومت نے ایک سال کے اندر یعنی ۱۸۲۲ء سے ۱۸۲۳ء کے دوران پندرہ مقامی اسکول (Native School) بھی قائم کیے۔ عوام میں اب تعلیم کی جانب دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان اسکولوں میں ۳۵۰ طلبا اور ۷۰ طالبات تھیں اور جنوبی اُڑیسہ کے مقابلہ میں نسبتاً یہاں کی تعلیمی صورت حال بہتر تھی خصوصاً تعلیم نسواں کے سلسلہ میں شمالی اُڑیسہ پیش قدمی کر رہا تھا۔[3]

---

(1) Samantray, N. History of Oriya Literature : P 221.

(2) Pegge, J. : A Brief History of General Baptist Mission in Orissa P 389.

(3) General Report on the Public Instruction in the lower Provinces of Bengal Presidency 1857-58, PP 115-16.

۲۱ر جولائی ۱۸۲۲ء میں حکومت نے تعلیمی سلسلہ کے فروغ کے لیے پبلک انسٹرکشن کی ایک جنرل کمیٹی قائم کی۔ اکتوبر ۱۸۲۳ء میں کٹک انگلش چیریٹی اسکول قائم کیا گیا۔ یہ گویا کہ مشنریوں کی تاریخ میں علم وادب کی ترویج کا ایک سنگ میل تھا۔ اس کے بعد مشنریاں اڑیسہ میں قیام پذیر ہوئیں۔ مقامی زبانوں میں کتابچے شائع کیے۔ لاعلمی اور جہالت کے خلاف تعلیم وتدریس کے فروغ میں مصروف عمل رہے۔ جون ۱۸۲۲ء سے دسمبر ۱۸۲۴ء تک مشنریوں کی سرگرمی اور ذاتی کوششوں کی بنا پر کٹک سے باہر دور دراز مضافاتی علاقوں میں انھوں نے ۱۳ مشن اسکولز قائم کیے۔ ۱۸۲۳ء میں حکومت کی جانب سے تعلیم کے منصوبہ میں ترمیم ہوئی جس کی رو سے مضافاتی اسکولوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ مشنریوں نے اپنی کوششوں سے شہر کے نواح اور دور دراز مضافاتی علاقوں میں اپنے طور پر اسکول قائم کیے۔[1] البتہ ۱۸۳۳ء کے بعد یہ کام آسان ہو گیا۔ حکومت نے اس سال ایک منشور جاری کیا جس کی رو سے مضافاتی اسکولوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ مشنریوں نے اپنی کوششوں سے شہر کے نواح اور دور دراز مضافاتی علاقوں میں اپنے طور پر اسکول قائم کیے۔ البتہ ۱۸۳۳ء کے بعد یہ کام آسان ہو گیا۔ حکومت نے اس سال ایک منشور جاری کیا جس کی رو سے تعلیم کی ترویج واشاعت کی آزادی دی گئی۔ ان تمام تبدیلیوں کی بنا پر شمالی اڑیسہ میں مشنریوں کی سرگرمی کافی تیز اور نتیجہ خیز رہی۔ امریکہ کے (Baptist Mission) نے اپنی سرگرمیاں سمبلپور، بالیسر اور جلیسر تک محدود رکھیں۔ رومن کیتھولک مشنری نے کٹک اور بالیسر کو مرجع عمل بنایا۔ جرمن اور اسپینش مشنریوں نے پوری اور جنوبی اُڑیسہ کو اپنی سرگرمیٔ عمل کے لیے منتخب کر لیا۔ ان تمام مشنریوں نے عوام میں شعوری ادراک اور تحریک عمل پیدا کیا جس کا نام ونشان تک اس سے قبل ان لوگوں میں موجود نہ تھا۔[2] مشنریوں نے تعلیم نسواں کی طرف بھی توجہ دی اور اساتذہ کی تربیت کی جانب بھی تاکہ تعلیمی عمل فرد اور خاندان کے درمیان خود بخود پیدا ہو کر آئندہ نسل تک پہنچے۔

مقامی زبان کا پہلا Native School ۱۰ر نومبر ۱۸۳۵ء میں بمقاپوری قائم

---

① Samantnay, N. History of Oriya Literature : P46.

② Ruth, B.N. Development of Education in Orissa : P49.

کیا گیا۔ ۲ر فروری ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے اپنے Minutes on Education میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ فی الحال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مقامی زبان کے علاوہ دوسری زبان کی ضرورت ہے اور وہ دوسری زبان کون سی ہوگی؟ کمیٹی کے نصف اراکین کی رائے تو انگریزی کی حمایت میں تھی لیکن باقی لوگوں کی رائے عربی اور سنسکرت کے حق میں تھی۔ اس امر کے پیش نظر مقامی لوگوں سے کسی طرح کا تعاون نہیں مل رہا تھا۔ جو تعلیم ان کے لئے مفید تھی اس سے انھیں محروم رکھا جا رہا تھا۔ اور ان پر ایسی مضحکہ خیز تعلیم عائد کی جا رہی تھی جو ان کی طبیعت اور مزاج کے منافی ہے۔ اس لیے میکالے نے خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ اس طرح کے حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے والے طلبا کو رقم ادا کرنی پڑے گی۔ دوسری طرف جبکہ انگریزی پڑھنے کے خواہشمند ہیں فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔(1)

مذکورہ بالا Minutes on Education میں میکالے نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ محدود ذرائع کے پیش نظر تمام لوگوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی کوشش ناممکن ہے بلکہ فی الحال اس بات کی پوری کوشش ہونی چاہئے کہ ایک جماعت تعلیم سے بہرہ ور ہو کر سامنے آئے جو ہمارے اور کروڑوں محکوموں کے درمیان رابطہ قائم کر سکے۔ ایسے لوگوں کی ایک جماعت جو رنگ و نسل میں تو ہندوستانی ہو لیکن مزاج، تخیل، اخلاق اور ذہانت میں انگریز ہو۔ ایسی جماعت کے ہاتھ میں اس ملک کی مقامی بولیوں کی شائستگی کا کام سپرد کر دیا جائے۔ یہی جماعت مغربی علم کے خزانہ سے سائنسی اصطلاحات مستعار لے کر عوام تک علم کی روشنی پہنچائے گی۔

انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کے آغاز سے قبل ہی ہندوستانیوں کے متوسط طبقے نے انگریزی تعلیم کے حصول پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انگریزی تعلیم کا رواج عام ہو اور انگریزی زبان ہی ذریعۂ تعلیم ہو۔ راجہ رام موہن رائے اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ لارڈ میکالے حکومت ہند کی کونسل کا ممبر قانون تھا۔ اور راجہ رام موہن رائے کا ہم خیال تھا لیکن انگریزی تعلیم کے فوائد کا جہاں تک تعلق ہے دونوں کے نظریئے ایک دوسرے سے قطعی متضاد تھے۔ انگریزوں کی اکثریت ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم

---

(1) Machanlay, L. Minute on Education : 1835.

کوکلرکی کی نوکری دینے کے بعد ملک کے پڑھے لکھے طبقے کے اندر
سیاسی بے اطمینانی پیدا ہونے کے امکانات کم ہوجائیں۔"(۱)

نوراللہ اور نائک کے مطابق:۔

"دراصل اس تعلیمی اقدام کا دوسرا اور سب سے اہم مقصد تو مے کالے
کے الفاظ میں ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو رنگ
ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن انداز فکر اور ذہن
ودل کے اعتبار سے انگریز ہو۔"(۲)

کسی قوم کے ساتھ اس سے زیادہ سفاکانہ عمل اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے ذہن ودل کو مسخ کر دیا جائے۔ اور ان کے انداز فکر پر بھی حاوی رہا جائے۔ مے کالے فطرتاً ایک دیندار عیسائی تھا اور اس کی مصلحت کوشی تہہ دار معنویت کا نمونہ تھی۔ اس نے اپنے باپ کو ایک خط میں لکھا تھا:۔

"انگریزی تعلیم کا ہندوؤں پر بہت زیادہ اثر ہے۔ کوئی ہندو جو
انگریزی داں ہے کبھی سچائی کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم نہیں
رہتا۔ کچھ لوگ مصلحتاً ہندو رہتے ہیں مگر اکثر یا تو موحد ہو جاتے
ہیں یا عیسائی مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ میرا تو پختہ عقیدہ ہے
کہ ہماری اسکیم پر اگر پورا عمل درآمد کیا گیا تو بنگال میں ایک بھی
ہندو نظر نہ آئے گا۔"(۳)

مے کالے کی تعلیمی اسکیم کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ:۔

"ہر وہ شخص جو انگریزی اسکولوں میں تعلیم پاتا، ذہنی اعتبار سے
اس کا رشتہ اپنے ہم وطنوں سے ٹوٹ جاتا۔ چنانچہ انگریزی
دانوں کا ایک الگ طبقہ بن گیا جن کو عوام الناس سے جو انگریزی

---

(۱) محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۳۲۵

(1) Noorullah & Naik: History of Education in India, P. 117.

(2) Basin: History of Education in India under the Company: PP 203 ff

سے نا بلد تھے قطعاً ہمدردی نہ ہوتی اور یہی نہیں بلکہ وہ ان کے
ساتھ کسی قسم کے تعلق کو بھی تسلیم کرنے سے منکر ہو جاتے ہیں۔"(۱)

غالباً اڑیسہ میں تعلیم کی ترویج اور اس کے ارتقا کے جائزہ سے ہی برطانوی حکومت کے تحت اڑیسہ کی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اڑیسہ کے لوگ عام طور پر سادہ لوح اور غبی تھے اور یہ محض ان کے تعلیمی فقدان کی بنا پر تھا۔ یہاں تمام سرکاری عہدوں پر بیرونی افراد کا تقرر ہوتا تھا اور اس ضمن میں کہا جاتا تھا کہ اڑیا لوگوں میں اہم عہدوں کو سنبھالنے کی صلاحیت نہ تھی۔ جب ۱۸۰۳ء میں پہلے پہل ایسٹ انڈیا کمپنی نے اڑیسہ پر قبضہ کیا تو اس وقت سرکاری ملازمت میں شاید ہی کوئی مقامی اُڑیا رہا ہوگا۔ کچہریوں اور عوامی دفاتر کی زبان فارسی تھی لیکن ۱۸۰۵ء میں فرمان جاری کیا گیا کہ اڑیسہ کے مقامی لوگوں سے رابطہ کے وقت فارسی کے ساتھ ساتھ اڑیا میں بھی لکھا جاتے۔ ایسی صورت حال میں اڑیا محرروں کے تقرر کی ضرورت درپیش ہوئی۔ اڑیا محرر تاڑ کے پتوں پر لوہے کے نوکدار قلم سے لکھنے کے عادی تھے۔ جب کاغذ پر معمولی قلم سے لکھنے کا موقع آیا تو ان کی بے چارگی قابل دید تھی۔ نتیجہ کے طور پر تمام سرکاری عہدوں پر بنگالی کلرک قابض تھے جو اچھی تنخواہ کی توقع پر اپنے اہل و عیال کے ساتھ آکر اڑیسہ میں بود و باش اختیار کرنے کے ساتھ Naturalised اُڑیا بن چکے تھے۔

۱۸۲۱ء میں کٹک کے مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مقامی اڑیا رہا ہوگا جو ماہوار دس روپئے سے
زیادہ تنخواہ پاتا ہو۔ لیکن جو چند پاتے ہیں وہ یا تو وہاں کے بنگالی
رئیس ہیں یا مسلمان۔ میں ہمیشہ اُڑیا لوگوں کی حمایت کرتا ہوں
لیکن شاذ و نادر ہی کوئی ایسا اڑیا نظر آتا ہے جو معمولی محرر کی
قابلیت رکھتا ہو۔"(۲)

ایچ۔ اے۔ اسٹارک نے ۱۹۱۶ء میں اڑیسہ کی تعلیمی صورت حال اور ملازمتوں میں

---

① Noorullah & Naik : History of Education in India : P, 114.
② Bihar and Orissa District Gazetteers, Cuttack 1933
Chapter XIV: Early History of Education by O'Malley : P. 211.

اُڑیسہ کے لوگوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :-

"اس وقت اڑیسہ کے تمام دفاتر میں تقریباً چھ سو ملازمین کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سو بیس خاندانی طور پر قانون گو تھے۔ ۲۱۶ اُڑیا تھے جبکہ بنگالیوں کی تعداد ۲۴۴ تھی اور باقی مسلمان تھے۔"(۱)

۱۹۲۹ء میں اُڑیسہ میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے او میلے نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے :-

"اس وقت سرکاری انتظام کے تحت ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت کے لیے چار اسکول ہیں۔ پچھلے پانچ سالوں میں پوری ضلع کے اسکولوں میں مقرر شدہ تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد ۴۶ سے بڑھ کر ۶۷ تک پہنچی ہے۔ یہاں ۲۷ سنسکرت ٹول ہیں۔ ان میں سے پوری کا سنسکرت کالج براہ راست سرکار کے زیر انتظام ہے۔ مسلم طلباء کے لیے ۴۵ مکاتب ہیں اور زیر تعلیم مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ سے غیر مسلموں سے زیادہ ہے۔"(۲)

اُڑیسہ کے تعلیمی ارتقاء کی تاریخ میں WOOD کے DESPATCH کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹ر جولائی ۱۸۵۴ء میں اس DESPATCH کے ذریعہ اُڑیسہ کے علاقہ میں تعلیم کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں تعلیم کے سلسلہ میں بہت سارے مفید مشورے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس منشور کے مطابق اڑیسہ کی طرز تعلیم میں کافی تبدیلیاں عمل میں آئیں اور تعلیمی معیار خاصہ بلند ہوا۔ ۵۹-۱۸۵۸ء میں شمالی اُڑیسہ میں صرف ۳۰ اسکول تھے۔ ۱۸۶۸ء میں ان کی تعداد ۶۳ ہوئی اور ۱۸۷۰ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۹۵ ہو گئی۔(۳) اس دوران صوبہ کے دور دراز علاقوں میں بھی اسکول قائم ہوئے۔ کندراپاڑہ

---

(1) H.A. Stark: Vernacular Education in Orissa: Calcutta Review Vol 38: 1916

(2) O'Malley, Lss: Education: Bihar & Orissa District Gazetteers Chapter XV Puri 1929. Page 262.

(3) General Report on the Public Instruction in the lower Provinces of Bengal Presidency. 1869: PP 149-60

میں ایک اسکول قائم ہوا جس میں ان دنوں ۳۵ طلباء تھے۔ اس اسکول میں اُردو تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ پوری کے اسکول میں ۵۹ طلبا تھے۔ اس اسکول میں بھی اُردو تعلیم کا انتظام تھا۔ اس دوران بھدرک اور بالیسر میں بھی اسکول قائم ہو چکے تھے۔ بھدرک کی ساٹھ فی صد آبادی اُردو بولنے والوں پر مشتمل تھی اور وہاں اُردو کے اثرات مقامی اڑیا زبان پر حاوی تھے۔ عرصۂ دراز سے بنسی بلبھ گوسوامی کا مغل تماشہ جو اُردو کا پہلا ڈرامہ ہے، بھدرک میں مقبول عام تھا۔ بھدرک کے مذکورہ اسکول میں اُردو پڑھنے والے طلبا کی خاصی تعداد موجود تھی۔ بالیسر ضلع اسکول میں بھی اُردو تعلیم کا انتظام تھا۔ اس قبیل کے اسکول مہانگا، ہری ہرپور، معصوم پور، کنواں پال اور دوسری کئی جگہوں میں قائم ہو چکے تھے۔ ان اسکولوں میں معصوم پور میں اُردو کی تعلیم کا انتظام تھا۔

۱۸۸۰ء کے دوران بالیسر ضلع میں ۲۸ مقامی ورناکولر اسکول قائم ہو چکے تھے۔ اسی سال کٹک ضلع میں ۱۵۰ اسکول قائم ہو چکے تھے جن میں ۲۷۵۵ طلباء زیر تعلیم تھے۔ اسی سال اڑیسہ کا پہلا گرلز اسکول کٹک میں قائم ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں اس اسکول کی ۲۵ طالبات میں صرف ۴ اڑیا طالبات تھیں۔ بعد میں جلیسر، پوری، بالیسر اور دوسرے اہم شہروں میں گرلز اسکول قائم ہوئے حتیٰ کہ ۱۸۸۱ء تک تعلیم نسواں تشفی بخش ہو چکی تھی۔

کٹک کا ضلع اسکول ۱۸۵۱ء میں اور بالیسر ضلع اسکول ۱۸۵۳ء میں قائم ہو چکے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں اس طرح کے مزید پانچ ہائی اسکول اعلیٰ تعلیمی مراکز کے طور پر عمل پیرا تھے۔ ۱۸۶۷ء میں اُڑیسہ کا پہلا کالج کٹک میں قائم ہوا۔ اس کا قیام لوگوں کے عطیات پر عمل میں آیا۔ ۱۸۷۹ء میں موربھنج کے مہاراجہ نے کٹک کالج کی پیش رفت کے لیے بیس ہزار روپئے کا عطیہ دیا۔ بعد میں کٹک کالج راونشا کالج کے نام سے موسوم ہوا۔[1]

۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے شمالی اُڑیسہ پر قابض ہونے کے ایّام سے تعلیم کے فروغ کے سلسلہ میں جو اقدامات ہوئے وہ قابل تعریف ہیں۔ اس دوران طرح طرح کے فرقہ وارانہ، لسانی، معاشی اور معاشرتی مسائل در پیش ہوتے رہے لیکن

---

(1) Utkal Dipika : 27th July 1883.

خوش قسمتی سے اس صدی کے آخر تک بیشتر مسائل کا ازالہ ہوگیا اور اڑیسہ میں تعلیمی ارتقاء کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ اڑیسہ میں موجودہ تعلیمی صورت حال کا تذکرہ اگلے باب میں آئے گا۔

درج ذیل گوشوارہ سے اوائل بیسویں صدی میں اڑیسہ میں اُردو تعلیم کے ارتقا کا جائزہ لیا جاسکتا ہے :-(1)

تعلیمی ادارہ/اسکول کی نوعیت		سال کے آخر تک اسکولوں کی تعداد	سال کے آخر تک طلبا کی تعداد		[illegible]	اسکول کی ہر جماعت میں اُردو پڑھنے والے مسلم طلباء کی تعداد
			طلباء	طالبات		
ہائی اسکول	سرکاری	۳	۷۹۹	—	۳۲٫۵	۷۵
	امدادی	۷	۱۲۶۸	۱	۱۸۰۱	۱۰۳
	غیر امدادی	۲	۳۲۶	—	۲۲۰۲	۲۶
	مجموعی تعداد	۱۲	۲۳۹۳	۱	۲۳۰۸	۲۰۳
مڈل انگلش اسکول	سرکاری	۷	۵۷۱	—	۱۱۰۸	۴۹
	امدادی	۳۶	۲۰۲۴	۱۹	۱۲۰۵	۲۴۵
	غیر امدادی	۲	۱۱۸	—	۱۱	—
	مجموعی تعداد	۴۵	۲۷۱۳	۱۹	۱۲۰۳	۲۹۴
مڈل ورناکولر اسکول	سرکاری	۱۱	۴۰۸	۲	۱۱۰۵	۳۰
	امدادی	۲۲	۷۰۲	۲۸۲	۱۱	۴۴
	غیر امدادی	۵	۲۲۰	۷	۲۰۹	۷
	مجموعی تعداد	۳۸	۱۳۳۰	۲۹۱	۱۰۰۳	۸۱
اپر پرائمری	امدادی	۲۷۴	۱۰۰۷۱	۹۷۷	۴	۴۱۷
	غیر امدادی	۱۸	۵۹۹	۴۷	۲۰۳	۲۶
لوئر پرائمری	امدادی	۳۸۰۵	۶۵۵۸۱	۱۰۸۴۳	۲۰۸	۱۷۸۴
	غیر امدادی	۲۲۷۰	۳۰۳۲۴	۲۱۲۱	۲۰۴	۴۶۷
	مجموعی تعداد	۶۳۶۷	۱۰۶۵۷۵	۱۳۹۸۸		۲۶۹۳

(1) Abstract from the Annual Report on Progress of Education in Orissa 1904-05

مذکورہ بالا اندراج کے علاوہ ٹریننگ اسکول میں اُردو پڑھنے والے ۲ طلباء اور دوسرے اداروں میں مزید طلباء موجود تھے۔ اس طرح اُڑیسہ میں ۱۹۰۴-۵ء کے دوران اُردو خواں طلباء کی مجموعی تعداد ۲۸۰۴ تھی۔

اُڑیا زبان پر اردو/فارسی/عربی/ترکی/پشتو کے اثرات

اُڑیا اور اردو دونوں کا تعلق نو ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ اگرچہ اُردو کا تعلق شورسینی پراکرت سے اور اُڑیا کا تعلق ماگدھی اَپ بھرنش سے ہے لیکن دونوں اس انڈک زبان سے نکلی ہیں جسے قدیم آریہ بولتے تھے۔ اس طرح اُڑیا اور اُردو میں لسانیاتی اختلاف کے باوجود مزاج کی یکسانیت کا پایا جانا فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی گرامر کے علاوہ بہت سے ضرب الامثال جو اُردو میں مستعمل ہیں ان کا ہو بہو عکس اُڑیا کے ضرب الامثال میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُڑیا کی روزمرّہ زبان میں اُردو کے بہت سارے الفاظ اس طرح داخل ہو گئے ہیں کہ ان کے مترادفات کا اُڑیا زبان میں پانا مشکل ہے۔ ان الفاظ کو اڑیا زبان نے کلی طور پر اپنا لیا ہے اور اس قبیل کے تقریباً دو ہزار الفاظ اُڑیا زبان کا لازمی جز بن چکے ہیں۔

مراٹھوں کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا اڑیسہ پر ۱۸۰۳ء پر قبضہ ہوا تو اس زمانہ میں فارسی اُڑیسہ کی عدالتی زبان رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اُردو عوامی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اردو عوام کی بول چال کی زبان تھی اور فارسی سرکاری دفاتر کی۔ لیکن ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں اُڑیسہ کی عدالتوں میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں دستاویزات لکھے جانے لگے۔ اردو اور فارسی اڑیسہ کے ہندو مسلمان دونوں کے تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول تھی۔ مسلم کلچر اور اردو زبان کا اُڑیسہ کے ہندو کلچر اور اُڑیا زبان پر جو گہرا اثر پڑا اس کی بیشتر مثالیں اڑیا ادب کے پیشوا فقیر موہن سیناپتی کے ناولوں سے مظہر ہیں۔ فقیر موہن سیناپتی نے فارسی کا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ناولوں اور مختصر افسانوں میں لاتعداد اُردو اور فارسی الفاظ بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ ان کے ناولوں [illegible] (چھومانڑ و آٹھو گونٹھو) میں صدہا اردو فارسی الفاظ کا اس قدر برمحل استعمال ہوا ہے کہ قاری کے ذہن پر خارجی الفاظ کا قطعی کوئی بار نہیں پڑتا۔ فقیر موہن کے علاوہ اُڑیا کے شاعر رادھاناتھ رائے نے بھی بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی شاعری میں اردو الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ کثرت استعمال اور مرورِ ایّام سے اردو الفاظ اُڑیا زبان میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ ان کے

مترادفات اڑیا زبان میں پانا دورازکار ہے۔ مندرجہ ذیل اُردو، فارسی، عربی، ترکی اور پشتو الفاظ اڑیا زبان میں خلط ملت ہوکر کس طرح اپنی شکل بدل چکے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ
آبخور	ଅବଖୁର	امین	ଅମିନ୍	آمدنی	ଆମଦାନୀ
آبکاری	ଅବକାରୀ	انار	ଅନାର	اسامی	ଆସାମୀ
آئینہ	ଅଇନା	انبار	ଅମ୍ବାର	اقرار	ଇକରାର
احکم	ଅହକମ୍	انداز	ଅନ୍ଦାଜ	اجرا	ଇଜରା
اخبار	ଅଖବାର	اندر	ଅନ୍ଦର	اجمالی	ଇଜମାଲି
آخون	ଆଖୁନ	اندرمحل	ଅନ୍ଦରମହଲ	استعفا	ଇସ୍ତଫା
عداوت	ଅଦାୱତ	انگور	ଅଙ୍ଗୁର	استمراری	ଇସ୍ତିମରାରୀ
آدمی	ଆଦମି	آواز	ଆୱାଜ	اصطبل	ଅସ୍ତବଲ
عادت	ଆଦତ	اوزار	ଅଉଜାର	اشارہ	ଇଶାରା
آداب	ଆଦାବ୍	آئندہ	ଆଇନ୍ଦା	اشتہار	ଇସ୍ତହାର
آرام	ଆରାମ	آئینہ	ଅଇନା	افیون	ଅଫିମ
عرضی	ଅରଜି	عقل	ଅକଲ	اقرارنامہ	ଇକ୍ରାରନାମା
آزاد	ଆଜାଦ୍	اختیار	ଅଖତିଆର	انعام	ଏନାମ
اسباب	ଅସବାବ୍	عجب	ଅଜବ	انقلاب	ଇନ୍କିଲାବ୍
استر	ଅସ୍ତର	عدالت	ଅଦାଲତ	اجلاس	ଇଜଲାସ୍
آسمان	ଆସମାନ	افسوس	ଅବସୋସ୍	عزت	ଇଜ୍ଜତ୍
اشرفی	ଅସରଫି	امانت	ଅମାନତ	اطلاع	ଏତଲା
اصل	ଅସଲ	عرق	ଅର୍କ	علاقہ	ଇଲାକା
عمل	ଅମଲ	البتہ	ଅଲବତ୍	علم	ଇଲମ
امیر	ଅମିର	آتش بازی	ଆତସବାଜି	عید	ଇଦ

اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ
ଖରବୁଜ୍	خربوزہ	କାଫଲା	قافلہ	ଇସଫଗୁଲ୍	اسپ گل
ଖରିଦ	خرید	କାଏମ୍	قائم	ଉମେଦ୍‌ୱାର	امیدوار
ଖରିଦାର	خریدار	କାରବାର	کاروبار	ତରଫ	طرف
ଖରିଫ୍	خریف	କିଲା	قلعہ	ଓସ୍ତାଦ	استاد
ଖର୍ଚ୍ଚ	خرچ	କିସ୍ତି	قسط	କାବୁ	قابو
ଖଲାସ	خلاص	କିସମତ	قسمت	କଜିଆ	قضیہ
ଖଲାସୀ	خلاصی	କିମତ	قیمت	କାଜି	قاضی
ଖଲିଫା	خلیفہ	କୋରକ୍	قرق	କଦିମ	قدیم
ଖାସି	خصی	କୁର୍ତା	کرتہ	କବାବ	کباب
ଖାନ୍‌ସାମା	خانساماں	କୁଲି	قلی	କବଲା	قبالہ
ଖାନା	کھانا	କଇଦି	قیدی	କବିଲା	قبیلہ
ଖାନ୍‌ଦାନ୍	خاندان	କୈଫିୟତ	کیفیت	କବର	قبر
ଖାଲି	خالی	କତୁଆଲ	کوتوال	କାମିଜ୍	قمیص
ଖିଦମତ୍‌ଗାର	خدمت گار	କୋସିସ୍	کوشش	କାରିଗର	کاریگر
ଖିଲାପ୍	خلاف	କାଲିଜା	کلیجہ	କରଜ	قرض
ଖିସରା	خسارہ	ଖାରଜ	خارج	କଲେଇ	قلعی
ଖିସମିସ୍	کشمش	ଖଜାଞ୍ଚି	خزانچی	କଲମ	قلم
ଖୁଦ୍	خود	ଖଜଣା	خزانہ	କଲମୀ	قلمی
ଖୋଦା	خدا	ଖତମ୍	ختم	କଂସେଇ	قصائی
ଖୋରାକ୍	خوراک	ଖାକି	خاکی	କସୁର	قصور
ଖୋରମା	خرمہ	ଖପା	خفا	କାଗଜ	کاغذ
ଖୁସ୍	خوش	ଖବର	خبر	କନ୍ଦ	قند
ଖୁସବୋ	خوشبو	ଖବିସ୍	خبیث	କାନୁନ	قانون
ଖୁନ୍	خون	ଖୟାଲ	خیال	କାନୁନ୍‌ଗୋ	قانون گو

اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ
ଜାଫିରି	جعفری	ଜାଗିର	جاگیر	ଖୁବ୍	خوب
ତାଲୁକା	تعلقہ	ଜାନ୍	جان	ଖଇରାତ	خیرات
ତକଦିର	تقدیر	ଜାନବର	جانور	ଖୋସାମଦି	خوشامدی
ତକରାର	تکرار	ଜାଲ	جال	ଗଜ	گز
ତକଲିଫ୍	تکلیف	ଜିଜିଆ	جزیہ	ଗଜଲ	غزل
ତକିଆ	تکیہ	ଜିନିଷ	جنس	ଗସ୍ତ	گشت
ତଖତ	تخت	ଜିଲା	ضلع	ଗରଜ	غرض
ତନଖା	تنخواہ	ଜମାନା	زمانہ	ଗରିବ	غریب
ତଫସିଲ	تفصیل	ଜବତ୍	ضبط	ଗଲତ	غلط
ତବକ	طبق	ଜରୁର	ضرور	ଗାଏବ	غائب
ତବଲା	طبلہ	ଜାଫରାନ	زعفران	ଗିରଫତାରି	گرفتاری
ତମାଦି	تمادی	ଜମି	زمین	ଗୁଜରାଣ	گذران
ତମାମ	تمام	ଜାରୀ	جاری	ଗୁମାନ୍	گمان
ତାମସା	تماشہ	ଜିମା	ذمہ	ଗୁମାସ୍ତା	گماشتہ
ତାରକସି	تارکشی	ଜିନ୍	زین	ଗୁମ୍ବଜ	گنبد
ତରକାରି	ترکاری	ଜୁଲମ	ظلم	ଜମା	جمع
ତାରିଖ	تاریخ	ଜୋଲାବ	جلاب	ଜମାନା	زمانہ
ତାରିଫ୍	تعریف	ଜୋର	زور	ଜମାନତ	ضمانت
ତରଫ	طرف	ଜଙ୍ଗ	جنگ	ଜରି	زری
ତରତିବ	ترتیب	ଜଞ୍ଜିର	زنجیر	ଜରିବ	ضریب
ତରାଜୁ	ترازو	ଜୋରିମାନା	جرمانہ	ଜଲଦି	جلدی
ତରଜମା	ترجمہ	ଜମିଦାର	زمیندار	ଜାଦୁ	جادو
ତଲବ	طلب	ଜମାନତ	ضمانت	ଜଲ୍ଲାଦ	جلاد
ତସବିର	تصویر	ଜମାବନ୍ଦି	زباں بندی	ଜାହାଜ	جہاز

اڑیاتلفظ	الفاظ	اڑیاتلفظ	الفاظ	اڑیاتلفظ	الفاظ
ଦାଗୀ	داغی	ଦରଜା	دروانہ	ତହବିଲ୍	تحویل
ଦରବାର	دربار	ଦରଘା	درگاہ	ତହସିଲ	تحصیل
ଦରବାନ	دربان	ଦଲିଲ	دلیل	ତହସିଲଦାର	تحصیل دار
ଦଫାଦାର	دفعدار	ଦୱା	دوا	ତାଃକତ	طاقت
ଦଲାଲ	دلال	ଦୁଆତ	دوات	ତାକିଦ୍	تاکید
ଦିଲବର	دلبر	ଦସ୍ତଖତ	دستخط	ତାଜ୍	تاج
ଦିଲଦାର	دلدار	ଦସ୍ତା	دستہ	ତାଜା	تازہ
ଦୁନିଆ	دنیا	ଦସ୍ତର	دستر	ତାଜିଆ	تعزیہ
ଦୂରବିନ୍	دوربین	ଦାଗ	داغ	ତଜବିଜ	تجویز
ନକସା	نقشہ	ଦେଗ୍‌ଚି	دیگچی	ତାମିଲ	تعمیل
ନଗଦ	نقد	ଦେମାଗ	دماغ	ତମ୍ବୁରା	طنبورہ
ନକଲ	نقل	ଦିଲ	دل	ତେଜାବ	تیزاب
ନଜଦିକ୍	نزدیک	ଦରବାର	دربار	ତୀର	تیر
ନାଜିର	ناظر	ଦିୱାନ	دیوان	ତୋତା	طوطا
ନଜିର	نظیر	ଦେୱାଲ	دیوار	ତୋଫାନ୍	طوفان
ନଫା	نفع	ଦୁଆ	دعا	ତୟାର	تیار
ନମକ	نمک	ଦୁସମନ	دشمن	ତଦାରକ	تدارک
ନମାଜ	نماز	ଦୋକାନ	دکان	ତଲାସ	تلاش
ନମୁନା	نمونہ	ଦୋକାନଦାର	دکاندار	ଦଗା	دغا
ନରମ	نرم	ଦୋସ୍ତ	دوست	ଦଫା	دفعہ
ନାରଙ୍ଗୀ	نارنگی	ଦୌରା	دورہ	ଦପ୍ତର	دفتر
ନବାବ	نواب	ଦୌଲତ	دولت	ଦରକାର	درکار
ନବିସ	نویس	ଦାଲଚିନି	دارچینی	ଦର୍ଜୀ	درزی
ନବିସିନ୍ଦା	نویسندہ	ଦାରୋଗା	داروغہ	ଦରିଆ	دریا

اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ
ପଲଉ	پلاؤ	ପାରଚୁନ	پارچون	ନସିବ୍	نصیب
ପାଲକ	پالک	ପାର୍ସି	پارسی	ନାଜିମ୍	ناظم
ପଲ୍ଲା	پلّہ	ପାସଂଗ	پاسنگ	ନାମା	نامہ
ପଥର	پتھر	ପାଇଖାନା	پاخانہ	ନାଏବ	نائب
ପଞ୍ଜର	پنجر	ପାଜିବ	پازیب	ନାଲ	نعل
ପହିଲୱୀ	پہلوی	ପୋଖତ	پختہ	ନାଲିସ	نالش
ପେସକସ	پیش کش	ପାଇଜାମା	پائجامہ	ନାସ୍ପାତି	ناشپاتی
ପେସା	پیشہ	ପରୱା	پرواہ	ନିସାନ	نشان
ଫକିର	فقیر	ପରବାନ୍	پروان	ନୋକସାନ	نقصان
ଫଜର	فجر	ଫତୁହି	فتوحی	ନୌକର	نوکر
ଫଜିସ୍ତ	فضیحت	ପସନ୍ଦ	پسند	ନାମ	نام
ଫାଜିଲ୍	فاضل	ପସମ	پشم	ନାମଦାର	نامدار
ଫରମାସ	فرمائش	ପହିଲବାନ	پہلوان	ନାଢ	ناز
ଫାର୍ସୀ	فارسی	ପତା	پتہ	ନିସାପ୍	انصاف
ଫେରାର	فرار	ପିଆଦା	پیادہ	ନଜର	نظر
ଫରକ	فرق	ପିଆଲା	پیالہ	ନଜରବନ୍ଦ	نظربند
ଫସଲ	فصل	ପୀର	پیر	ନିଘା	نگاہ
ଫାନୁସ	فانوس	ପୋଲ	پُل	ନୌବତଖାନା	نوبت خانہ
ଫାଇଦା	فائدہ	ପେଞ୍ଚ	پیچ	ପର	پر
ଫିରଙ୍ଗ	فرنگ	ପେଞ୍ଚକସ	پیچ کش	ପରୀ	پری
ଫି	فی	ପେସ୍କାର	پیش کار	ପରଦା	پردہ
ଫୁରସତ	فرصت	ପୈଗମ୍ବର	پیغمبر	ପରୱାନା	پروانہ
ଫୈସଲ	فیصل	ପୋସାକ	پوشاک	ପାଦଶା	پادشاہ
ଫୌଜ	فوج	ପୋସ୍ତଦାନା	پوست دانہ	ପାର୍ଚା	پارچہ

الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ
فوج دار	ଫୌଜଦାର	باطل	ବାତିଲ	برقع	ବୁରକା
فوج داری	ଫୌଜଦାରୀ	باغیچہ	ବଗିଚା	بے ایمان	ବେଇମାନ
فرد	ଫର୍ଦ୍ଦ	باقی	ବାକି	بے کار	ବେକାର
فساد	ଫିସାଦ	بالکل	ବିଲକୁଲ	بے گار	ବେଗାର
بادام	ବାଦାମ	بالش	ବାଲିଶ୍	بیشی	ବେଶୀ
بندوبست	ବନ୍ଦୋବସ୍ତ	بخشش	ବକ୍ଷିସ୍	بیسن	ବେସନ
بندوق	ବନ୍ଧୁକ	بدل	ବଦଳ	بے حیا	ବେହିଆ
بیع نامہ	ବୈନାମା	بدنام	ବଦନାମ	مکتب	ମକ୍ତବ
بیان	ବୟାନ	بطخ	ବତକ	مکان	ମକାନ
برفی	ବରଫି	بقیہ	ବକାୟା	مخمل	ମଖମଲ
برف	ବରଫ	بلبل	ବୁଲବୁଲ	مغز	ମଗଜ
بار	ବାର	بنیاد	ବୁନିଆଦ	مزدور	ମଜଦୁର
برآمدہ	ବରଆମଦା	بہادر	ବାହାଦୁର	مضبوط	ମଜବୁତ
باربار	ବାରମ୍ବାର	بہادری	ବାହାଦୁରୀ	مجلس	ମଜଲିସ
بابت	ବାବତ	بہانہ	ବାହାନା	مزہ	ମଜା
برج	ବରଜ	بحالی	ବହାଲି	مطلب	ମତଲବ
بارود	ବାରୁଦ	بالوشاہی	ବାଲୁସାହି	مدرسہ	ମଦ୍ରସା
باریک	ବାରିକ	بیمہ	ବିମା	منظور	ମଂଜୁର
باز	ବାଜ	بے چارہ	ବିଚରା	منع	ମନା
بازار	ବଜାର	بے باک	ବେବାକ	مرمت	ମରାମତି
بازاری	ବଜାରୀ	بے وقوف	ବେକୁଫ	مرد	ମରଦ
بازوبند	ବାଜୁବନ୍ଦ	بستہ	ବସ୍ତା	مرہم	ମଲମ
بازی	ବାଜି	برباد	ବରବାଦ	مال	ମାଲ
بازی گر	ବାଜିକର	بیمار	ବେମାର	ملائی	ମଲେଇ

اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ
ମୁସ୍ତରୀ	مشتری	ମିଜାଜ	مزاج	ମାଲଦାର	مال دار
ମୁସ୍କିଲ	مشکل	ମିଆଁ	میاں	ମାଲିସ	مالش
ମୁର୍ଦ୍ଦାର	مردار	ମିସ୍ତୀ	مستری	ମାଲଗୁଜାରୀ	مال گذاری
ମୁଲକ	ملک	ମିସ୍ରୀ	مصری	ମାଲିକ	مالک
ମୁଲତବୀ	ملتوی	ମିସଲ	مثل	ମସାଲ	مشعل
ମୁଲାକାତ	ملاقات	ମିନା	مینا	ମସାଲଚୀ	مشعلچی
ମୁଲାଏମ	ملائم	ମିଆଦ	میعاد	ମସ୍‌ଜିଦ୍	مسجد
ମୁଲ୍ଲା	مُلّا	ମୋକଦମ	مقدم	ମସ୍ତ	مست
ମୁଦାଲା	مدعا علیہ	ମୋକଦମା	مقدمہ	ମସଲା	مصالحہ
ମୋସାଫିର	مسافر	ମୋକରର	مقرر	ମହକୁମା	محکمہ
ମୋହବତ	محبت	ମକାମ	مقام	ମସିହା	مسیحا
ମଥକିଲ	مؤکل	ମୁକାବିଲା	مقابلہ	ମଇଦା	میدہ
ମୋହରିର	محرر	ମୁକ୍ତିଆର	مختار	ମାମୁଲି	معمولی
ମହାଫିଜ	محافظ	ମୋଗଲ	مغل	ମୌରୁସି	موروثی
ମେବା	میوہ	ମତାବକ	مطابق	ମହେତାବ	مہتاب
ମେହେନ୍ତର	مہتر	ମୁନସି	منشی	ମହଲ୍ଲା	محلّہ
ମେହେମାନ	مہمان	ମୁନସଫ	منصف	ମହଲ	محل
ମେହେରବାନ୍	مہربان	ମୋନାଫା	منافع	ମହାସିଲ	محاصل
ମେହରାବ	محراب	ମୁନିବ୍	منیب	ମାସୁଲ	محصول
ମୈଦାନ	میدان	ମୁନିମ	منیم	ମାଫ	معاف
ମୋଜା	موزہ	ମୋଫତ	مفت	ମାଫିକ	موافق
ମହମ	موم	ମୋବାରକ	مبارک	ମାମଲା	معاملہ
ମୋହର	مُہر	ମୋରବ୍ବା	مربع	ମାସୁଲ	محصول
ମହଲତ	مہلت	ମୁରବି	مربی	ମାରଫତ	معرفت

اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ
ଶତରଂଜ	شطرنج	ରଫିକ୍	رفیق	ମୌକା	موقع
ଶତରଂଜି	شطرنجی	ରସୁଲ	رسول	ମୌଜ	موج
ଶଙ୍ଗତରାସ	سنگ تراش	ଲଗାମ	لگام	ମୌଲାନା	مولانا
ସର୍ତ୍ତ	شرط	ଲଗାୟତ	لغایت	ମୌଲବୀ	مولوی
ସରବତ	شربت	ଲଫଙ୍ଗା	لفنگا	ମୌସମ	موسم
ସରମ	شرم	ଲସକର	لشکر	ରକବା	رقبہ
ସଲଗମ	شلغم	ଲାଖରାଜ	لاخراج	ରକମ	رقم
ଶହନାଇ	شہنائی	ଲାଚାର	لاچار	ରେକାବି	رکابی
ଶାହୀ	شاہی	ରସୁଣ	لہسن	ରଫାଦଫା	رفع دفع
ସାବାସ	شاباش	ଲଫାଫା	لفافہ	ରସିଦ	رسید
ସାମିଆନା	شامیانہ	ଲବାସ	لباس	ରସଦ	رسد
ଶାଲ	شال	ଲେକିନ	لیکن	ରାଜି	راضی
ଶାହ	شاہ	ଲଙ୍ଗର	لنگر	ରାଜିନାମା	راضی نامہ
ଶିକାର	شکار	ଲୁଙ୍ଗି	لنگی	ରାୟ	رائے
ଶିକାରୀ	شکاری	ଓକିଲ	وکیل	ରାସ୍ତା	راستہ
ଶିରିଣି	شیرینی	ଓକ୍ତ	وقت	ରାହା	راہ
ଶିରା	شیرہ	ଓଜନ	وزن	ରିୟାସତ	ریاست
ଶିଶି	شیشی	ଓଜର	عذر	ରୁଜୁ	رجوع
ସୁମାର	شمار	ଅସୁଲ	وصول	ରୁମାଲ	رومال
ସୁରୁ	شروع	ୱାକିଫ	واقف	ରେସମ	ریشم
ସଇତାନ	شیطان	ୱାପସ	واپس	ରୋଜଗାର	روزگار
ଶୋରବା	شوربہ	ୱାରିସ	وارث	ରୋସନୀ	روشنی
ଶୌକ	شوق	ଶକ୍କର	شکر	ରୋଜା	روزہ
ସଜା	سزا	ଶକ୍କରକନ୍ଦ	شکرقند	ରଫୁ	رفو

اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ
ସରଜମିନ୍	سرزمین	ସାୟା	سایہ	ସନଦ	سند
ହକ୍	حق	ସାଲ	سال	ସନ୍ଦୁକ	صندوق
ହାକିମ୍	حاکم	ସାଲିସ	ثالث	ସାଫା	صافہ
ହଜ	حج	ସାହେବ	صاحب	ସଫେଇ	صفائی
ହଜମ	ہضم	ସାହେବଜାଦା	صاجزادہ	ସଫେଦ	سفید
ହଜାର	ہزار	ସାହେବାନ	صاحبان	ସାବିତ୍	ثابت
ହଦ	حد	ସିପେହି	سپاہی	ସବର	صبر
ହମାମ	حمام	ସୁପାରିସ	سفارش	ସରଅଞ୍ଜାମ	سرانجام
ହର	ہر	ସିରକା	سرکہ	ସରକାର	سرکار
ହରାମ	حرام	ସିରିସ୍ତା	سرشتہ	ସରଦାର	سردار
ହରାମଜାଦା	حرام زادہ	ସୁରାଗ	سراغ	ସର୍ଦ୍ଦି	سردی
ହରକାରା	ہرکارہ	ସୁରେହି	صراحی	ଶଲୱାର	شلوار
ହରକତ	حرکت	ସୁରମା	سرمہ	ସଲାମ	سلام
ହରଫ	حرف	ସୁଲତାନ	سلطان	ସବାରୀ	سواری
ହଲକ	حلق	ସୁସ୍ତି	سستی	ସୱାଲ	سوال
ହଲଫ	حلف	ସୁଧ	سود	ସହଲ	سہل
ହାଲୁଆ	حلوہ	ସୁବା	صوبہ	ସାକି	ساقی
ହବାଲ୍‌ଦାର	حوالدار	ସେଓ	سیب	ସାକିନ୍	ساکن
ହାୱା	ہوا	ସଉଦା	سودا	ସାଦା	سادہ
ହବେଲି	حویلی	ସଉଦାଗର	سوداگر	ସାନି	ثانی
ହାଜତ	حاجت	ସଙ୍ଗିନ୍	سنگین	ସଫା	صاف
ହାଜର	حاضر	ସାହାରା	سہارا	ସବୁଜ	سبز
ହଜାରୀ	ہزاری	ସଦର	صدر	ସାବୁନ	صابن
ହାଲ	حال	ଶହୀଦ	شہید	ସାବିକ	سابق

الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ	الفاظ	اڑیا تلفظ
حالت	ହାଲତ	حکم	ହୁକମ	حیران	ହଇରାଣ
حاصل	ହାସଲ	حاکم	ହାକିମ	ہوش	ହୋସ
حوض	ହଉଜ	حضور	ହଜୁର	ہشیار	ହୁସିଆର
حفاظت	ହେପାଜତ	حرمت	ହୁରମତ	ہنگامہ	ହଙ୍ଗାମା
ہمت	ହିମ୍ମତ	حلیہ	ହୁଲିଆ	ہفتہ	ହପ୍ତା
حساب	ହିସାବ	حرکت	ହରକତ	ہاون دستہ	ହିମାମଦିସ୍ତା
حصہ	ହିସା	حسنہ	ହୁସନା		
حقہ	ହୁକ୍କା	ہیضہ	ହଇଜା		

اُڑیسہ میں اراضی سے متعلق قدیم ریکارڈز اور سرکاری کاغذات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پندرہویں صدی سے لے کر ۱۸۴۰ء تک اڑیا کے ساتھ فارسی بھی اُڑیسہ کی عدالت اور کچہریوں کی زبان رہی ہے۔ ۱۵۶۸ء سے ۱۸۰۳ء تک اُڑیسہ پر کم وبیش مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مسلم حکومت کے اثرات عرصۂ دراز تک باقی رہے۔ ۱۷۱۹ء میں راجہ ہری کرشن دیو کی وفات کے بعد ان کا بیٹا گوپی ناتھ دیو تخت نشیں ہوا اور عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے کرن دیوان کے بجائے ایک مغل دیوان مقرر کیا۔ اس سے گوپی ناتھ کا مقصد تھا کہ اپنے دربار میں مغل دیوان رکھنے کی وجہ سے وہ مغل بندی علاقوں سے رابطہ قائم رکھ سکے گا اور ان کے لیے مددگار ومعاون ثابت ہوسکے گا۔ اس دور میں مغل بادشاہت کی وجہ سے فارسی سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ چنانچہ گوپی ناتھ دیو کے حکم ناموں اور دوسرے احکامات کے سلسلہ میں اُڑیا کے ساتھ فارسی کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ اس لیے مہاراجہ کے دربار میں ایک فارسی نویسندہ بھی رہا کرتا تھا۔ گوپی ناتھ دیو نے مرزا سعید بیگ کو اپنا دیوان مقرر کیا جو ایک شریف النفس اور انصاف پسند شخص تھا۔ گوپی ناتھ دیو کے عہد کی ایک اُڑیا سند کی نقل ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔ سند کے سرنامہ پر خود مہاراج کے ہاتھ کی تحریر ہے جس میں اڑیا میں لکھا ہوا ہے (بیر پرمان) اس کے نیچے مہاراج کی مہر ہے جس میں فارسی رسم الخط میں " راجہ دیو گوپی ناتھ" مرتسم ہے۔ اس کے نیچے ۵ جمادی الاوّل

سنہ ۱۱۳۳ ملی (مطابق ۱۷۲۵ء) اور سند کی پشت پر ۲، جمادی الثانی درج ہے۔ سند کا مضمون تو اڑیا رسم الخط اور اڑیا زبان میں ہے لیکن خط کشیدہ الفاظ عربی/فارسی/اردو کے ہیں۔

"[illegible]"

مذکورہ بالا اقتباس کے ۵۷ الفاظ میں اردو اور فارسی کے ۳۵ الفاظ مستعمل ہیں۔ اوائل انیسویں صدی کے ریکارڈز اور بندوبست کے کاغذات میں بھی اس طرح کی ذولسانی تحریر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۲۹ء کے ایک قبالہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"[illegible]"

پیش نظر اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز سرکار کے دورِ حکومت میں بھی انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی اڑیسہ میں دفاتر کی اصطلاحی زبان کے طور پر استعمال ہو رہی تھی اور آج بھی کم و بیش اس کا استعمال جاری ہے۔ اس قبیل کی اصطلاحوں میں مستعمل ذیل کے الفاظ اڑیا زبان میں مدغم ہو چکے ہیں:۔

اقرار نامہ۔ خسارہ۔ نالش۔ مذکور۔ موضع۔ دخل۔ ضامن نامہ۔

حاضر۔ قبالہ۔ پرگنہ۔ قلعہ۔ وصول۔ لاخراج وغیرہ وغیرہ۔

اُڑیا زبان پر اُردو فارسی کے اثرات صرف اسماء وصفات تک محدود نہیں ہے بلکہ زبان کے بنیادی عناصر تک پہنچ گئے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) عام طور پر صفت اسم سے پہلے آتی ہے لیکن اڑیا میں فارسی ترکیب کے مطابق کہیں کہیں صفت اسم کے بعد آتی ہے۔ اس کا استعمال خصوصاً زمینداری کے قدیم ریکارڈز اور سرکاری کاغذات میں ملتا ہے۔ مثلاً:۔

موضع مذکور — ମୌଜା ମଜକୁର

سالِ گذشتہ (وغیرہ) — ସାଲ ଗୁଜସ୍ତା

اس طرح کی ترکیب میں اکثر فارسی وعربی صفات اڑیا اسماء کے ساتھ مل کر استعمال ہوتی ہیں اور اس کے زیرِ اثر اڑیا صفات بھی اسم کے آخر میں استعمال ہونے لگی ہیں۔

(۲) اڑیا زبان میں مغلوں کی آمد سے پہلے اضافت کا پتہ نہیں چلتا لیکن فارسی کے اثر سے بعض الفاظ کے ساتھ اضافت کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعمال زیادہ تر مغلیہ دور کے ریکارڈز اور قدیم سرکاری کاغذات اور قبالوں میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:۔

پرگنۂ التی = ପରଗଣାଠ ଅଲତି

قلعۂ درپن = କିଲ୍ଲା ଦରପଣ

ضلع کٹک = ଜିଲ୍ଲା କଟକ

صوبۂ اُڑیسہ = ସୁବା ଓଡ଼ିଶା

(۳) اردو فارسی کے حروف فجائیہ بھی اُڑیا زبان میں کثرت سے مستعمل ہیں۔ مثال کے طور پر:۔

شاباش! خوب! واہ! ہاں! — ସାବାସ୍! ଖୁବ୍! ବାଃ! ହାଁ!

البتہ! ہائے! افسوس! ہائے ہائے! — ଅଲବତ୍! ହାଏ! ଅଫସୋସ! ହାଏ ହାଏ!

خبردار! بس! وغیرہ وغیرہ [illegible]

مندرجہ بالا شواہد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمانۂ قدیم سے اڑیا زبان پر اردو کے اثرات کافی گہرے رہے ہیں۔ اس کے برعکس جن کا اندازہ اڑیسہ میں بولی جانے والی اردو کے مندرجہ ذیل لفظیات سے ہو سکتا ہے:۔

گچھ برائے درخت۔	باڑی برائے باغیچہ۔	بڑھی برائے سیلاب۔
بچھرو برائے بچھڑا۔	پوکھر برائے تالاب۔	باتیا برائے طوفان۔
پرچھت برائے احاطہ کی دیوار۔	چٹی برائے چپل۔	پتر برائے پتہ۔
ہانڈی سال برائے باورچی خانہ۔	جنس پتر برائے اسباب۔	پنڈا برائے برآمدہ۔
گچو برائے اروی۔	بوتال برائے کدو۔	اوکھ برائے گنا۔
پکھال برائے پانی بھات۔	امانی برائے باسی چاول میں ڈالا ہوا پانی۔	
نیٹا برائے ناک کا بلغم۔	کھینکار برائے بلغم۔	پگھا برائے مہار۔
چھن برائے پھوس۔	کھلا برائے کھلیان۔	پیٹھا برائے کیک۔
دیہہ برائے طبیعت۔	ستی پات برائے نمونیہ۔	جھاڑا برائے پاخانہ
ہاتی برائے قے۔	گوٹی برائے چیچک۔	گرب برائے فخر وغیرہ وغیرہ۔

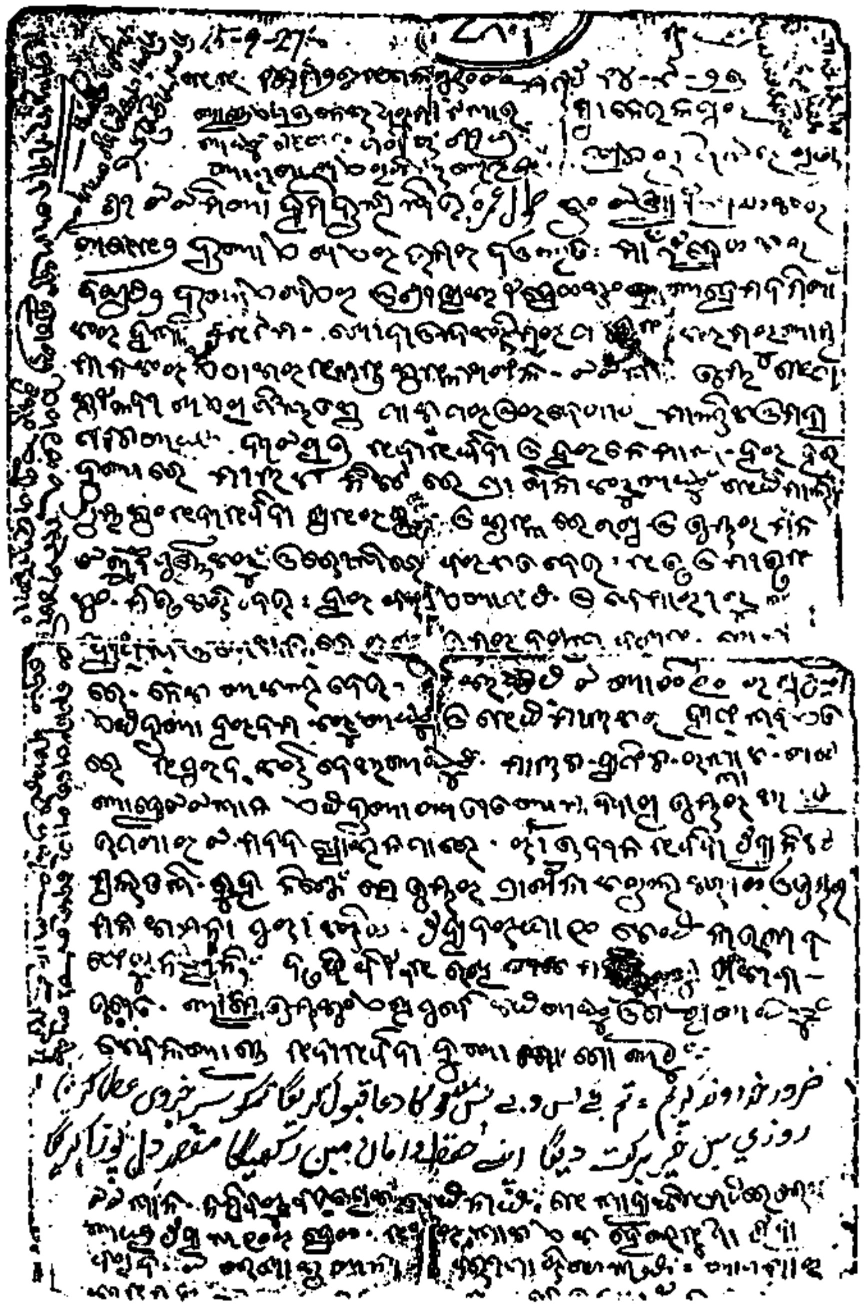

اڑیا زبان پر اُردو کے حاوی اثرات کا نمونہ ، منشی احسان اللہ کا خط ، مرقوم ۱۴/ستمبر ۱۹۲۷ء

اُڑلیسہ میں بولی جانے والی اُردو میں بہت سے ایسے مرکب الفاظ ملتے ہیں جن میں ایک لفظ اُردو کا اور دوسرا اُڑیا کا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

مثلاً، چاول پتر۔ کاغذ پتر۔ جنس پتر۔ خیرانتر۔ امانی پانی۔ ہانڈی ڈوئی۔
مول مجوری (مزدوری)۔ دبہہ بات۔ وغیرہ وغیرہ۔

اُڑلیسہ میں بول چال کی اُردو میں اگرچہ اس قبیل کے اُڑیا الفاظ سرایت کر گئے ہیں لیکن وہاں کے اردو ادیبوں پر اُڑیا کا اثر اتنا گہرا نہیں پڑا ہے۔ اُڑلیسہ کی اردو میں مندرجہ ذیل الفاظ کا استعمال آج بھی ہوتا ہے اور شمالی ہند میں اردو کی اولین نثری تصنیف فضلی کی "کربل کتھا" کی لفظیات کے ساتھ بڑی حد تک یہ الفاظ مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً:۔

الفاظ	کربل کتھا صفحہ نمبر
ڈاڑھی بجائے داڑھی	۴۳
کاندھا بجائے کندھا	۱۰۴
دولہہ بجائے دولہا	۱۰۴
درگہہ بجائے درگاہ	۹۹
کوتہ بجائے کوتاہ	۱۰۵
ماٹی بجائے مٹی	۱۵۰/۹۳
بھوکھا بجائے بھوکا	۷۶
ہاڈ بجائے ہڈی	۱۴۷
حکم کرنا بجائے حکم دینا	۷۹
خبر کہنا بجائے خبر دینا	۷۷
دعوت کرنا بجائے دعوت دینا	۴۳
وعدہ دینا بجائے وعدہ کرنا	۴۲

اُڑلیسہ کے اردو ادیبوں پر اُڑیا کے اثرات گہرے نہ ہونے کا سبب غالباً یہ ہے کہ اُڑلیسہ کے قدیم اردو ادیبوں میں فارسی کا ذوق وشوق بہت گہرا تھا۔ اب بھی اڑلیسہ کے قصبات میں سکندر نامہ بحری، گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ، کریما، پندنامہ عطار وغیرہ

کے قدیم قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ اس وقت شمالی ہند کے اردو ادیبوں کی بعض تخلیقات بھی اڑیسہ پہنچتی تھیں۔ کرامت علی کرامت کو آفاق علی معصوم پوری کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ (بابت ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء) دستیاب ہوا جس میں نظیر اکبرآبادی کی مندرجہ ذیل نظمیں مرقوم ہیں۔
تندرست نامہ، تندرستی نامہ، بھونچال نامہ، دکھ سکھ نامہ، دولت نامہ، کوڑی نامہ، رنگین نامہ اور احمد کی مثنوی "قصۂ منصور" وغیرہ شامل ہیں۔ اسی زمانہ کے اور ایک قلمی نسخہ میں "ہری داس نامہ" کے عنوان سے کسی سنت شاعر کی مذہبی مثنوی موجود ہے۔ نظیر اکبرآبادی والے نسخہ میں "بھونچال نامہ" اور "کوڑی نامہ" میں چند ایسے بند موجود ہیں جو نول کشور کے ایڈیشن میں نہیں ہیں بلکہ صرف مخمور اکبرآبادی کے ایڈیشن میں موجود ہیں[1] ہری داس نامہ زبان کے لحاظ سے بہت قدیم مثنوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مطبوعہ ہے یا نہیں اس کا علم نہ ہو سکا۔

راقم الحروف کو سید رسول بخش احمدی کی ایک بیاض سونگڑہ سے دستیاب ہوئی جس کے ایک ورق میں انھوں نے اپنی شادی کی تاریخ ۲۱ر جولائی ۱۸۹۵ء لکھی ہے۔ اس خستہ بیاض میں جو ادب پارے درج ہیں وہ اس دور کے شعری ادب سے ساکنان اڑیسہ کی خاصی دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور ان کی قدامت سے اڑیسہ میں اردو کلچر کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے اور ایک بات واضح ہوتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں آمد و رفت کی دشواریوں کے باوجود اڑیسہ کے اردو داں طبقہ کا اردو دنیا کے ساتھ ایک طرح کا رابطہ ضرور قائم تھا اور دوسری بات یہ کہ اڑیسہ کی اردو شاعری مذہب اور تصوف کی راہ سے جدید نظم و غزل تک پہنچی۔

---

(۱) کرامت علی کرامت :۔ اڑیا اور اردو کے باہمی تعلقات۔ مطبوعہ سوئیر بزم سخن کٹک ۱۹۷۷ء ص ۲۱

باب دوم

اڑیسہ میں اردو شاعری کا ارتقاء

اڑیسہ ایک چھوٹی سی ریاست ہونے کے باوجود تہذیبی اور لسانی اعتبار سے ایک بڑے منطقے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ ایک زمانہ تک وہ بنگال اور بہار کے ساتھ مشترک رہا ہے اور اس کی حدود آج بھی ان ریاستوں سے ملتی ہیں اور کہیں کہیں تو تہذیبی اور لسانی سطح پر دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنا مشکل ہوتا ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دو بڑے کلچروں کے درمیان رابطہ کی سرزمین رہی ہے۔ میری مراد شمالی مشرقی ہندوستان کے اس کلچر سے ہے جو بیک وقت آریائی، نیم آریائی اور دراوڑ کلچر کے مشترک عناصر اپنے اندر رکھتا تھا اور اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے ہم جسے ہندوستان کے مشرقی علاقہ میں پھولتا پھلتا اور پھر ہندوستان گیر اور اس سے آگے بڑھ کر پورے ایشیا میں پھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دوسرا وہ کلچر جسے ہم دراوڑ کلچر کہتے ہیں جس میں خود کئی تہذیبوں کے عناصر شامل ہیں اور جس کا رشتہ شمال سے اس اعتبار سے بھی رہا ہے کہ وہ کبھی شمالی مغربی ہندوستان میں پھولتا پھلتا رہا اور اس اعتبار سے بھی کہ شمالی کلچر کے دھارے جنوب کی سمت صدیوں تک بہتے رہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ قدیم زمانہ سے لے کر قریب مغلیہ دور تک دو راستوں سے پہنچا جا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک راستہ اڑیسہ سے ہو کر گذرتا تھا۔ شری رام چندر جی کی فتح لنکا کے لیے جس راستے کی نشاندہی کی گئی ہے اس میں اڑیسہ ایک پل کے طور پر کام آیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اڑیسہ تجارت کا بڑا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے تجار

جاوا سماٹرا اور بالی تک بحری راستوں سے سامان تجارت لے کر جاتے تھے اور دوسری طرف راجستھان اور مغربی یوپی سے تجارتی قافلوں کا اڑیسہ میں ورود ہوا کرتا تھا جس کی وجہ سے یہاں ایک ایسی زبان کو علاقائی تمدن سے وابستگی کا موقع مل گیا جس کا تعلق اساسی طور پر آگرہ اور اس کے قرب و جوار سے تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں راجستھانی، برج اور کھڑی کے عناصر شامل رہے ہوں گے جس کا اندازہ آج بھی سادری[1] زبان سے ہو سکتا ہے۔

اُڑیسہ میں اردو ادب کا قابل اعتنا سرمایہ موجود ہے جن میں سے منتخب فنکاروں کی نگارشات سے شاہکار نمونے ہی پیش خدمت ہیں۔ تمام فنکاروں کا تذکرہ یا منتخب فن کاروں کی پوری تخلیقات کو منظر عام پر لانے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے انتخاب میں چند باتیں پیش نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ اہم فن کاروں کا انتخاب ہو اور دوم یہ کہ انتخاب اس لحاظ سے ہو کہ اردو کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت ثابت ہو سکے۔ سوم یہ کہ ان ادبی نمونوں کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے جن سے اردو دنیا عام طور پر واقف نہیں ہے۔

پیش کش میں یہ ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے کہ پہلے شعرائے متقدمین کا بیان ہو پھر دورِ وسطیٰ کے شعراء کا ذکر اور آخر میں دورِ جدید کے شعراء کا تذکرہ سامنے آئے "دورِ جدید" کے شعراء میں راقم الحروف نے "جدید شاعروں" کو صف بستہ نہیں کیا ہے بلکہ اُڑیسہ میں اردو کی جدید شاعری کے تناظر میں مذکورہ شاعروں کا بیان باب پنجم میں رکھا ہے۔ اور اڑیسہ میں اردو ادب کے ارتقاء میں جن بیرونی حضرات نے براہِ راست حصہ لیا ہے ان کا ذکر ضمیمہ کے طور پر ان کے عہد قیام کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"آب خضر"[2] میں چند افراد کا تذکرہ حصہ سوم میں بیرونی حضرات کے طور پر ہوا ہے لیکن جبکہ

---

(۱) اڑیسہ کے قبائلیوں کی زبان کھڑی بولی سے ملتی جلتی ہے سادری زبان ہے جس کی ڈکشنری رومن رسم الخط میں آسٹریلیا کے ایک پادری نے ترتیب دی ہے۔ سندرگڑھ کے نواح میں یعنی مدھیہ پردیش کے مشرقی علاقہ میں کریا زبان بولی جاتی ہے جسے ہندی کی ایک بولی کہا جاتا ہے۔ سادری زبان جمشید پور، رانچی اور چھوٹا ناگپور کے آدی باسیوں سے لے کر سندرگڑھ، سمبل پور اور کھریار تک کے آدی باسیوں کی لنگوا فرینکا ہے۔ سادری زبان کی بہ نسبت زیادہ سہل اور عام فہم ہے اور تلفظ، املا اور گرامر کی حد تک کھڑی بولی سے مماثلت رکھتی ہے۔ رحن

(۲) کرامت علی کرامت، آب خضر ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۴

اُڑیسہ میں بسنے والوں کے آباء واجداد مختلف اوقات میں یہاں آکر بس گئے اور یہیں کے کہلائے تو راقم الحروف نے بھی اس مقالہ میں یہ بات ملحوظ خاطر رکھی ہے کہ جو اڑیسہ میں آکر اس خطہ کا ہو رہا تو وہ اسی مقام کا باشندہ کہلائے گا اور اسی خطہ کی طرف منسوب ہوگا۔ اس لحاظ سے مذکورہ حضرات کا تذکرہ بیرونی حضرات کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے بلکہ انھیں مقامی فنکاروں کا جزء لاینفک سمجھا گیا ہے کیونکہ ان کی شاعری نے ان کے وطن مالوف میں نہیں بلکہ اُڑیسہ کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔

سترہویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اردو ایک مکمل تخلیقی زبان بن چکی تھی۔ اردو کے مرکز سے دور ہونے کے باوجود اُڑیسہ سے اردو والوں کا رابطہ قائم تھا۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> "عبدالقادر بیدل کی سیاحت کا نقطہ اُڑیسہ کا شہر کٹک ہے جہاں اس زمانہ میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خان دوراں سید محمود صوبے دار تھے۔"(۱)

خان دوراں ستمبر ۱۶۶۰ء سے مئی ۱۶۶۷ء تک اُڑیسہ کے صوبہ دار رہے۔ ظاہر ہے کہ اسی دوران عبدالقادر بیدل کا قیام کٹک میں رہا۔ اور ساحل احمد کے بیان کے مطابق:

> "مرزا عبدالقادر بیدل بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں جنھوں نے فارسی نظم ونثر میں اجتہادی روش اختیار کی۔ ۱۶۷۰ء میں جب وہ اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ اڑیسہ میں قیام پذیر تھے۔ شیخ سعدی کی پیروی میں شعر کہنے کی ابتداء کی۔ اسلوب و معانی کے لحاظ سے کلام گنجینۂ معانی کا طلسم اور درک و بصیرت کا سنگ آئینہ ہے۔"(۲)

جن باکمال شخصیتوں سے مرزا بیدل کی طبیعت متأثر ہوئی اور جن معروف افراد کی صحبت کے اثر نے بیدل کے طبعی ذوق کی تربیت کی ان میں حضرت شاہ قاسم ہواللّٰہی بھی تھے جو اُڑیسہ کے دارالخلافہ کٹک میں موجود تھے۔ شاہ صاحب قطب زماں اور علامۃ الدہر تھے۔

---

(۱) عطا کاکوی: حیرت زار۔ ص ۵۹

(۲) ساحل احمد: غزل پس منظر پیش منظر ۱۹۷۶ء ص ۱۵۶

عطا کاکوی کے مطابق:۔

"جب بیدل اپنے ماموں مرزا ظریف کے ساتھ جو فقہ و
احادیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے، تجارت کے سلسلہ میں
اڑیسہ کے دارالخلافہ کٹک میں گئے تو وہاں شاہ صاحب
موصوف سے متعارف ہوئے۔ اس وقت بیدل کی عمر سترہ
سال کی تھی۔"(۱)

بیدل کا قیام اڑیسہ میں تین سال تک رہا جس کے بارے میں اکرام الحق کا کہنا ہے:۔

"جب بیدل اڑیسہ میں تین سال رہ کر ۱۰۷۵ھ میں لوٹ آئے
تو ان کے ماموں مرزا ظریف کا انتقال ہو گیا۔"(۲)

ڈاکٹر عبدالغنی کے مطابق:۔

" بہار کے مختلف شہروں میں بھی ان کی آمد و رفت ہوتی رہی۔
ان کا ۱۰۷۵ھ تک کا زمانہ عظیم آباد، رانی ساگر، آرہ، مہسی،
کٹک اور کساری میں گذرا۔ اس کے بعد وہ شاہجہاں آباد کی طرف
چلے گئے۔ اور پھر صوبہ بہار اور اڑیسہ کی طرف نہ لوٹے۔"(۳)

مرزا بیدل وہ پہلے مجتہد شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو فارسیت سے قریب کیا اور ایک ایسے طرز بیان اور حصول معانی کی اختراع کی کہ غالب جیسا شاعر بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جس کا اعتراف یوں کیا ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

بیدل کے صرف دو شعر میر اور قائم کے تذکروں میں محفوظ ہیں:۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

---

(۱) عطا کاکوی: حیرت زار، ص ۱۹
(۲) اکرام الحق، شعر العجم فی الہند: ص ۱۳۱
(۳) ڈاکٹر عبدالغنی: تذکرۂ بیدل، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین۔ بابت اگست ۱۹۵۲ء ص ۲۶

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

ہردے رام جودت

ہردے رام جودت اڑیسہ میں اردو کا اولین شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی ولادت اڑیسہ کے دارالخلافہ کٹک میں ہوئی لیکن عمر کا بیشتر حصہ مرشدآباد میں گذرا۔ اس لحاظ سے صرف توطن کے تعلق سے ہم اسے اڑیسہ کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ شورش نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے :۔

"جودت صاحب شوکت لالہ ہردے رام جودت ساکن مرشدآباد
والد ایشاں بوقت حکومت نواب شجاع الدولہ دیوان صوبۂ اڑیسہ
بود۔ ایشان ہم بہ ثروت بسر بردند۔ شاعر فارسی، فاضل جید گاہے
بہ سبب دوستی میر محمد حیات حیرت و بہ صلاح ایں احقر شعر
ریختہ ہم می فرمودند۔ چنانچہ اشعار ایشاں مع قلمدان وش رفتہ
وقت تحریر تذکرہ یک شعر بدست آمدہ است۔
برنگ شمع سوزاں دل سے میرے آہ نکلے ہے
الٰہی شکر کرتا ہوں کہ خاطرخواہ نکلے ہے " (۱)

شورش سے جودت کا براہ راست تعلق تھا اور جودت کو شورش سے عقیدت و ارادت بھی تھی اس لئے شورش نے جودت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ محمد حیات حیرت اور شورش کی دوستی اور اصلاح کے سبب ہردے رام جودت ریختہ بھی کہتے تھے۔ ان کے کلام ریختہ کا یقیناً خاطرخواہ ذخیرہ ہوچکا تھا جو دست برد زمانہ ہوگیا۔ شورش نے اپنے تذکرہ میں جودت کا مرشدآباد سے تعلق ظاہر کرنے کے لیے 'ساکن' لکھا ہے متوطن نہیں لکھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرشدآباد میں جودت کا قیام رہا لیکن ان کا اصل وطن کٹک ہی تھا۔

---

(۱) تذکرہ شورش۔

عشقی کے تذکرہ میں جودت کی صرف ایک ہی رباعی ملتی ہے:۔

واعظ تری بات دل سے کہنے کا نہیں
پتھر کی چوٹ شیشۂ دل سہنے کا نہیں
جا زاہد خشک تو ہے جب تک مرے پاس
لو ہو مری چشم تر سے بہنے کا نہیں

عشقی نے اپنے تذکرہ میں جودت کا نام رائے ہر دے رام لکھا ہے۔ اور اس کی وفات کا تذکرہ یوں کیا ہے:۔

"جودت تخلص مرشدآبادی موسوم بہ رائے ہردے رام اصلش از کٹک و سلسلۂ او بہ نواب علاؤالدولہ سرفراز خاں مرحوم می رسد۔ آخر ہماں جا پیمانۂ عمرش لبریز گردید۔" (۱)

عشقی کے تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ جودت کا انتقال مرشدآباد میں ہوا لیکن عشقی و شورش دونوں میں سے کسی نے بھی اس کی تاریخ وفات کا ذکر نہیں کیا۔ شورش کا تذکرہ ۱۱۹۹ھ سے قبل مرتب ہو چکا ہو گا۔ گلزار ابراہیم ۱۱۹۸ھ میں مکمل ہوا تھا جس میں جودت کا حال بھی درج ہے۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل نے لکھا ہے کہ جودت کا انتقال ہو چکا ہے۔ عشقی کے تذکرہ میں چونکہ ۱۲۱۵ھ تک اضافے ہوتے رہے اس لیے اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی روایت کی تکمیل کے بعد ان کے واقعۂ وفات کے متعلق کوئی اضافہ نہ کیا ہو۔ بہرحال اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جودت ۱۱۹۸ھ سے قبل وفات کر چکے تھے۔ اس ضمن میں علی ابراہیم خان خلیل کا بیان ان کے زمانۂ وفات کے تعیّن میں مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ خلیل کی روایت کے مطابق بھی وہ مرشدآباد میں انتقال کر چکے ہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جودت کا انتقال تذکرہ کی تکمیل سے قبل ہوا۔ یعنی ۱۱۹۰ھ سے ۱۱۹۹ھ کے درمیان ہوا ہو گا۔

ڈاکٹر جاوید نہال کے مطابق "جودت کی زندگی عیش و عشرت میں گذری۔ جاگیردارانہ نظام کی تمام آسائشیں انھیں میسّر تھیں۔ ان کی شاعری بھی تفریح طبع کے لیے تھی۔ شورش کا کہنا ہے کہ جودت فارسی کے جید عالم تھے۔ فارسی زبان ان کو مرغوب تھی اور فارسی شاعری بھی۔ بنیادی

---

(۱) کلیم الدین احمد مرتبہ عشقی و شورش

طور پر وہ فارسی کے شاعر تھے۔ اردو میں محض تفنن طبع اور شوق کی خاطر کہہ لیا کرتے تھے چونکہ ان کا کلام ناپید ہے اور زمانہ برد ہو چکا ہے لہٰذا شاعری میں ان کے مقام کا تعین کرنا دشوار گزار امر ہے۔" (۱)

راقم الحروف کو اڑیسہ میں اردو کے تحقیقی مواد کی تلاش کے دوران سکندر نامہ بحری کا ایک قدیم قلمی نسخہ دستیاب ہوا جس کے آخری صفحہ پر بخط نستعلیق یہ تحریر ہے:۔

"تمت تمام شد کار من نظام شد نسخہ سکندر نامہ بحری من تصنیف
حضرت مخدومی نظامی بوقت سہ پہری بروز شنبہ بتاریخ بیست
و نہم شہر شوال در عمل نواب نامدار میر محمد افضل صوبہ دار اڑیسہ
سال ۱۲۰۰ھ علی در مقام رگھوناتھ پور بدولت خانہ اجودھیارام
از خط خام ضیاء الدین نام تحریر یافت۔"

اسی نسخہ کے دوسرے صفحہ پر ذیل کی عبارت درج ہے:۔

" لالہ سری پت رائے ولد دیوان بھگت رام بتاریخ دوئم شہر
رمضان المبارک در سال ۱۲۰۲ھ علی بحضور آخوند محمد ذاکر صاحب
و استادی میاں منوچہر صاحب بربندۂ عاصی غلام حسین این نسخہ
متبرکہ منظومہ را بخشش نمودہ قابض گردانیدند۔ فقط۔"

مذکورہ بالا تحریری حقائق کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ دیوان بھگت رام ہی لالہ ہرے رام کا باپ رہا ہوگا اور لالہ سری پت رائے اس کا بھائی۔

مولوی محمد سلطان راجیؔ

مولوی محمد سلطان راجیؔ ایک صوفی المسلک بزرگ تھے۔ مولوی محمد حسن کے خلیفہ تھے۔ مذہبی تبلیغ اور رشد و ہدایت میں عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ دکن سے شہر کٹک میں وارد ہوئے۔ ان کے اسلاف کے حالات کا کچھ علم نہیں ہو سکا۔ شہر کٹک کے بخشی بازار میں ایک

---

(۱) ڈاکٹر جاوید نہال: انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، صفحہ ۴۶

مسجد تعمیر کروائی جو آج سلطانیہ مسجد یا مولوی صاحب کی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ مسجد کی موجودہ عمارت ۱۲۸۱ھ میں تعمیر ہوئی۔ مسجد کے حوض میں مندرجہ ذیل اشعار تانبے کی پلیٹ پر کندہ ہیں:۔

چوں کرد بنا بہر خدا شیر علی بیاں
ایں حوض طرحدار و خوش انداز و دلآویز
از تائید حق سال بنا راجی ہمیں گفت
آنچہ لبالب کہ شد حوض دلآویز

۱۲۹۹ھ

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولوی محمد سلطان راجی انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں کٹک میں زمانۂ دراز سے مقیم تھے اور دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے فریضۂ حج ادا کیا تھا۔ مسجد کے حجرہ میں قیام کرتے تھے اور عبادت، ریاضت، تصنیف و تالیف میں مصروف رہا کرتے تھے۔ عربی و فارسی کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں سے مندرجہ ذیل مطبوعہ نسخے ان کے نبیرہ محمد رفیق (ایڈوکیٹ) کے پاس محفوظ ہیں:۔

۱۔ فصیح الحلال والحرام؛ مطبوعہ مطبع مظہر العجائب مدراس۔ سنہ طباعت ۱۲۸۴ھ

۲۔ مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی؛ مطبع مظہر النصائح کٹک۔ سنہ طباعت ۱۲۸۶ھ

۳۔ معرفت خدا و رسول؛ ایضاً سنہ طباعت ۱۲۸۶ھ

۴۔ مہتاب المجالس؛ ایضاً۔ سنہ طباعت ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۳ء

مولوی محمد سلطان راجی کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں کٹک کے ایک شاعر عبدالغفور کے چند اشعار محمد رفیق کے توسط سے دستیاب ہوئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی وفات ۲ رجمادی الاول ۱۳۱۱ھ میں ہوئی۔(۱) مرحوم سلطانیہ مسجد سے متصل اپنے حجرہ میں مدفون ہوئے۔

---

(۱) کئے رحلت ہیں مولوی سلطان — خلد میں پائے ہیں وہ عالی مقام
پیر حاجی و عارف و اکمل — سالکان و عابد و افضل
زہد و تقویٰ میں تھے بہت کامل — اور عالم تھے فاضل و عاقل
روز شنبہ دوم جمادی الاول — تیرہ سو چودہ ہجری کا تھا کامل
اے غفور سال ہجری تو نے کہا — جو کہ سچ تھا زباں سے حق نکلا

اردو کے کسی تذکرہ میں سلطان راجی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ اڑیسہ کے شعرائے اردو کے تذکرہ "آب خضر" میں بھی ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

سلطان راجی کا "مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" دراصل ساٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو خانۂ کعبہ کے خطیب نے سال کے ہر مہینے کے لیے جاری کیا تھا۔ حافظ احمد کبیر صاحب کی فرمائش پر سلطان راجی نے تمام خطبوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے اختتام پر لکھا ہے:۔

"مجموعۂ شصت خطب جمع تمام سال کہ برائے ہر شہر از شہور سال پنج پنج خطب جداگانہ و دو خطبۂ عیدین از خطیب بیت الحرام و مدینہ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بموجب ارشاد مخدوم انام قدوۂ کرام جناب حضرت مولانا حاج الحرمین حافظ احمد کبیر صاحب مدظلہ العالی برائے خطبہائے اہل اسلام حنفیہ...... طبع درآورد و ہر خطیب را باید کہ اولیٰ دریافت نماید این ہمہ کہ مذکور شد صرف یک یک خطبہ ہر جمعہ و ہر عید است و خطبہ دیگر کہ بعد نشستن ساعتے خواندہ می شود آن یک خطبہ کہ برائے تمام خطب جمع و عیدین کافی ست...... این خطبہا کہ مطبوع شدہ بودند بغیر ترجمہ بودند چونکہ بعضے احباء مصر شدند بریں کہ ترجمہ کردہ شود تا کہ از واقف شدن مطالب نصائح و وعظ مندرجہ نفع خلائق است پس بنابر اصرار احباء ترجمہ مطالب مالوف را بہ لباس نظم آوردہ شد...... تاریخ و سنہ طبع ثانیہ کہ ترجمہ بامنظومہ شد ایک ہزار و صد ہشتاد و ہفت بود۔ ۱۲۸۷

بتاریخ یکم ماہ ربیع الاول در مطبع مظہر النصائح واقع شہر کٹک مطبوع گردید۔ واللہ الہادی وہو الموافق۔ مترجم مولوی محمد سلطان است۔ مہتمم مطبع سوداگر فخر الدین است۔"(۱)

مذکورہ بالا کتاب میں مشتمل ہر خطبہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ عربی میں ہے اور

(۱) محمد سلطان راجی: مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی، مطبوعہ ۱۲۸۸ھ، ص ۱-۳۷

دوسرا حصہ اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہوا ہے جس سے مولوی سلطان راؔجی کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے ۔سلطان راؔجی نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں کہیں روایت شعری سے بھی کام لیا ہے ۔بہر حال ان کے اشعار کو صرف شاعری کے تناظر میں نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ اڑیسہ میں اردو کے ارتقا میں مذہبی لٹریچر اور تبلیغ کے توسط سے سلطان راؔجی کی ادبی خدمات کا محاسبہ کیا جا سکتا ہے ۔راؔجی صرف اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے شاعری کرتے تھے ۔پھر بھی ان کے کلام نے عرصۂ دراز سے عوامی مقبولیت حاصل کی ہے ۔ ان کے کلام میں مذہبی یکسانیت و تناسب کو ان کے داخلی جذبات کا پر خلوص اظہار کہا جاسکتا ہے ۔

پہلا خطبہ "الخطبۃ الاولیٰ لشہر عاشوراء الحرام" ہے ۔اس خطبہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

حمد حق کو کہ مقدر مہینے اور اعوام کا — اور مجدّد ہے زمانوں کا اور ایّام کا
سال کا حق شروع ماہ محرم سے کیا — اور چھ دن میں زمین و آسمان پیدا کیا
قصد پیدا کرنے کا پھر عرش کو بعد از کیا — ایک ہے اور لافنا ذات اس کی لے مرد صفا
اور گواہی دوں کہ نئیں ہے کوئی خدا اسکے سوا — ایک ہے اور نئیں شریک اس کا کوئی اور دوسرا
نئیں ہے کوئی اللہ مگر وہ بادشاہ پاکتر — حمد میں اس کی کروں حمد کثیر ہر وقت پر[1]

پہلے خطبہ میں اس قبیل کے کل ۲۳ اشعار ہیں جن میں نئیں بجائے 'نہیں' لوگ کی جمع 'لوگاں'۔ کتیں بجائے 'کو' استعمال کیا ہے ۔

مولوی سلطان راؔجی کے خطبوں کے ترجمہ کی تفصیلات کا جائزہ ذیل کے گوشوارے سے لیا جاسکتا ہے :۔

مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر	
محرّم	پہلا	۲۳	۵	۷
"	دوسرا	۳۸	۱۱	۱۴
"	تیسرا	۳۱	۱۷	۲۰
جمادی الثانی	پہلا	۴۱	۱۵۶	۱۶۰
"	دوسرا	۲۶	۱۳۳	۱۳۵
"	تیسرا	۳۱	۱۳۸	۱۴۱

(۱) مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی ، ص ۵

مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر
محرم	چوتھا	۳۵	۲۳ — ۲۶
"	پانچواں	۳۲	۳۰ — ۳۳
صفر	پہلا	۳۰	۳۶ — ۳۹
"	دوسرا	۳۳	۴۲ — ۴۵
"	تیسرا	۳۵	۴۹ — ۵۲
"	چوتھا	۲۴	۵۵ — ۵۷
"	پانچواں	۲۵	۵۹ — ۶۱
ربیع الاول	پہلا	۳۳	۶۵ — ۶۸
"	دوسرا	۴۰	۷۲ — ۷۵
"	تیسرا	۳۱	۷۸ — ۸۱
"	چوتھا	۵۴	۸۶ — ۹۱
"	پانچواں	۳۷	۹۴ — ۹۷
ربیع الثانی	پہلا	۲۹	۱۰۰ — ۱۰۳
"	دوسرا	۳۱	۱۰۶ — ۱۰۸
"	تیسرا	۲۲	۱۱۱ — ۱۱۲
"	چوتھا	۲۴	۱۱۵ — ۱۱۷
"	پانچواں	۳۰	۱۲۱ — ۱۲۳
جمادی الاول	پہلا	۳۶	۱۲۷ — ۱۳۰
"	دوسرا	۲۶	۱۳۳ — ۱۳۵
"	تیسرا	۳۱	۱۳۸ — ۱۴۱
جمادی الثانی	چوتھا	۳۶	۱۴۴ — ۱۴۷
"	پانچواں	۲۹	۱۵۰ — ۱۵۳
رجب	پہلا	۳۹	۱۸۶ — ۱۸۹
"	دوسرا	۳۵	۱۹۲ — ۱۹۵
"	تیسرا	۲۸	۱۹۸ — ۲۰۱
"	چوتھا	۴۳	۲۰۵ — ۲۰۹
"	پانچواں	۲۰	۲۱۱ — ۲۱۳
شعبان	پہلا	۲۴	۲۴۶ — ۲۴۹
"	دوسرا	۲۵	۲۲۰ — ۲۲۳
"	تیسرا	۴۴	۲۲۶ — ۲۳۰
"	چوتھا	۴۰	۲۳۳ — ۲۳۷
"	پانچواں	۳۳	۲۳۹ — ۲۴۲
رمضان	پہلا	۴۰	۲۴۶ — ۲۴۹
"	دوسرا	۲۰	۲۵۱ — ۲۵۳
"	تیسرا	۲۶	۲۵۶ — ۲۵۸
"	چوتھا	۳۰	۲۶۱ — ۲۶۳
"	پانچواں	۳۹	۲۶۷ — ۲۷۰
شوال	پہلا	۲۹	۲۷۳ — ۲۷۶
"	دوسرا	۲۴	۲۷۸ — ۲۸۰
"	تیسرا	۲۹	۲۸۳ — ۲۸۶

مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر	مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر
جمادی الاول	چوتھا	۳۶	۱۴۴ — ۱۴۷	شوال	چوتھا	۲۹	۲۸۹ — ۲۹۱
//	پانچواں	۲۹	۱۵۰ — ۱۵۳	//	پانچواں	۳۰	۲۹۴ — ۲۹۶
ذیقعدہ	پہلا	۲۸	۲۹۹ — ۳۰۲	ذی الحج	پہلا	۲۳	۳۲۵ — ۳۲۷
//	دوسرا	۳۸	۳۰۵ — ۳۰۹	//	دوسرا	۳۱	۳۳۱ — ۳۳۳
//	تیسرا	۲۹	۳۱۱ — ۳۱۴	//	تیسرا	۳۸	۳۳۷ — ۳۴۰
//	چوتھا	۲۵	۳۱۶ — ۳۱۸	//	چوتھا	۳۷	۳۴۴ — ۳۴۷
//	پانچواں	۲۶	۳۲۱ — ۳۲۳	//	پانچواں	۲۹	۳۵۰ — ۳۵۴
خطبہ عید الفطر	—	۳۶	۳۵۸ — ۳۶۰	خطبہ عید الضحیٰ	—	۴۲	۳۶۴ — ۳۶۷
مجموعی اشعار	۶۲	۱۹۷۰	—	مجموعی صفحات	—	—	۳۶۷

مولوی سلطان راجی نے مثنوی کے پیرایہ میں تمام خطبے نظم کیے ہیں جو ایک ہزار نو سو ستر اشعار پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے اشعار کے ربط و تسلسل میں سماجی معنویت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور تلازمۂ خیال میں عرفان و ادراک کے دامن پر ان کی گرفت درست ہے۔ چونکہ یہ طبع زاد نظمیں نہیں ہیں بلکہ عربی خطبوں کا ترجمہ ہیں جن میں مترجم نے بڑی حد تک لفظی معنویت سے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا جائزہ ذیل کی عبارت و اشعار سے لیا جا سکتا ہے۔

متن :- نَبِیٌّ قَالَ جَابِرٌ فِی وَصْفِهٖ رَأَیْتُ النَّبِیَّ جَالِسًا وَّالْقَمَرُ فِی لَیْلَةِ کَمَالِهٖ اَنْظُرُ اِلَی النُّوْرَیْنِ فَاِذَا نُوْرُ النَّبِیِّ اَبْهٰی وَاَحْسَنُ مَعَاشِرَ الْحَاضِرِیْنَ اِعْلَمُوْا اَنَّ الدُّنْیَا دَارُ الْاَکْدَارِ وَالْحُزْنِ وَدَارُ الْمَصَائِبِ وَالْفِتَنِ وَدَارٌ کُسِرَتْ کَسْرًا غَدَرَتْ بِالْحُسَیْنِ وَالْحَسَنِ بَیْنَمَا اَنْتَ مُرَفَّهُ الْحَالِ خَالُ الْبَالِ قَوِیُّ الْبَدَنِ۔

(من الخطبة الثالثة لشهر عاشوراء)(1)

---

(1) مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی، ص ۱۵

ترجمہ:۔

ہیں نبیؐ ایسے کہ جابرؓ نے روایت یوں کیے
وصف میں سردار عالمؐ کے سنو اے نیک پَے
ایک دن بیٹھے تھے حضرتؐ میں نے دیکھا وقتِ شب
چاند پورا تھا منور اور روشن خوب تب
میں کیا تب فکر یہ نور دونو دیکھ کر
نور حضرتؐ کا زیادہ نیک تھا اور بیشتر
ہے بشارت حاضریں کو جانتے دنیا کتیں
یہ دعا کی ہے مکاں بھی اور ہے غم کی یقیں
اور جاتے مشکلوں کی اور ہے فتنہ کی جائے
دیکھئے حسنینؓ نے دنیا میں کیا سختی اٹھائے
تو ہے اب خوشحال میں اور سبک بار و عزیز
اور بدن تیرا قوی ہے خوب ترا اے باتمیز (۱)

سلطان راجیؔ کی زبان

سلطان راجیؔ اڑیسہ کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر شیخ امین اللہ جرخیؔ کے ہم عصر رہے ہیں۔لیکن دونوں کی زبان میں خاصہ فرق رونما ہوتا ہے ۔ اگرچہ سلطان راجیؔ شہر کٹک میں تھے جو زبان و ادب کے کلچر کے لحاظ سے مرکزی حیثیت کا حامل تھا لیکن امین اللہ جرخیؔ کٹک سے تقریباً پچیس[۲۵] کیلومیٹر دور مضافات کے علاقہ بالوبیسی کشنا نند پور میں عروس سخن کی مشاطگی میں مصروف تھے۔ان کا طبعی میلان شعر و سخن کی طرف تھا۔ ان کی زبان صاف شستہ اور ادبی ہے۔ لیکن راجیؔ کے کلام میں شاعرانہ لطافت ، نازک خیالی اور فکر کے عنصر کا فقدان واضح ہے ۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ مولوی محمد سلطان راجیؔ ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے مریدین کا حلقہ وسیع

---

(۱) مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی: ص ۱۷—۱۸

تھا۔ مذہبی تبلیغ اور دینی امور کی طرف وہ نسبتاً زیادہ مائل تھے۔ پیش نظر "مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" میں انھوں نے عربی خطبوں کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کیا ہے اور اس ضمن میں ایک ہزار نو سو ستر اشعار کہے ہیں۔ راجی کے کلام سے دکنی اثرات مترشح ہیں جن کا جائزہ تفصیلی طور پر اس طرح لیا جا سکتا ہے:۔

"نئیں" بجائے نہیں کا استعمال:۔

اور گواہی دوں کہ نئیں ہے کوئی خدا اس کے سوا
ایک ہے اور نئیں شریک اس کا کوئی دوسرا (ص۵)

ایسا نئیں پر ان کو دوزخ میں گرا دیویں یقیں
اس کے ہول عظیم پر دیویں گواہی اہل دیں (ص۵۶)

اور نفع نئیں کچھ کریں گے اہل و اولاد اور مال
جب ہوا اس پر چلے گی موت کی اے نیک فال (ص۱۵۲)

لوگ کی جمع لوگاں:۔

نیک لوگاں کرتے ہیں تعظیم اس کی بالیقیں
ہے بشارت واسطے اس کے سوائے اہل دیں (ص۹)

کتیں بجائے کو:۔

لڑکے سب ہو دیں گے بوڑھے خوف سے اے اہل دیں
دیکھو گے لوگوں کتیں جیسے نشہ میں ہیں یقیں (ص۳۸)

سال ماہ کو جو نیکی سے گذارا دیندار
ہے بشارا اس کتیں اور ہے بشارت بے شمار (ص۶)

قیام بجائے قیامت:۔

مکر پر اس کے گواہی دیوے گا روز قیام
پڑے کے گراہی میں نئیں جن نے کیا نیکی کے کام (ص۶)

خصم بجائے دشمن:۔

اور کرو راضی خصم کتیں ندامت کے قبل
اور کہو تم اپنے دل سے اے خداوند فضل (ص۷)

عذاب کی جمع عذاباں :-

آگے تیرے ہیں عذاباں سختیاں بھی بے شمار
آگ سلگائی ہوئی ہے اور ہے وہ شعلہ دار (ص۲۵)

سوں/کوں بجائے سے/کے :-

ہے شہادت ایسی پہنچاتی ہے دار ثواب کوں
ظاہر و باطن کے جو اس کو پڑھے اخلاص سوں (ص۳۰)

کوچ بجائے کوچ :-

اب محرم سے صفر تک نقل تم کو حق کیا
یہ نشانیاں کوچ کی ہیں اور سفر کی اے فتیٰ (ص۳۷)

تُمرے بجائے تمھارے :-

واسطے اپنے کرو اختیار تقوے کا لباس
کی بیاں تُمرے لئے یہ نیک سمجھو حق شناس (ص۱۲)

سپڑنا :-

اس پہ زنجیریں ہیں اس میں کا فرو فاسق تمام
جا سپڑ جاویں گے زنجیروں میں سمجھو نیک نام (ص۵۶)

لفظ کے آخر میں الف نون کے اضافہ سے جمع بنانے کی ترکیب کا استعمال :-

بادشاہاں کیا ہوئے بابل کے سب اے اہل دیں
حادثے دنیا کے ان کو کر دیتے غارت یقیں (ص۹۱)

حاکماں شیروں کی مانند اور وزیراں بھیڑیئے
اور مددگاراں کے ہوویں لومڑیوں کے ظہور سے (ص۹۵)

اور جواناں ہوویں گے اس دور کے سب بے ادب
بوڑھے انکتیں نئیں دکھلاویں کے راہ ادب (ص۹۵)

سلطان لاآچی نے بڑی حد تک عوامی زبان کو اپنے اشعار میں برتا ہے اور تذکیر و تانیث کے استعمال میں بھی ان کی زبان پر مقامی اثرات حاوی ہیں۔

مہتاب المجالس

مہتاب المجالس مولوی محمد سلطان راجی کی منظوم تخلیق ہے۔ بارہ مجلسوں میں مشتمل ۳۶۶ صفحات کی یہ کتاب تقریب عید میلاد النبیؐ میں بارہ دنوں تک پڑھنے کی غرض سے کٹک کے مطبع مظہر النصائح میں سنہ ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی جس کی تفصیلات کا جائزہ ذیل کے گوشوارہ سے لیا جاسکتا ہے:۔

مجلس	تعداد حمد	تعداد سلام	تعداد قصائد	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر
مجلس اوّل	۱	۱	۱۳	۴۳۵	۶ — ۳۶
مجلس دوم	۱	۱	۷	۳۳۸	۳۷ — ۶۴
مجلس سوم	۱	۱	۸	۳۶۶	۶۵ — ۹۴
مجلس چہارم	۱	۱	۷	۴۰۲	۹۵ — ۱۲۶
مجلس پنجم	۱	۱	۹	۲۸۵	۱۲۷ — ۱۵۰
مجلس ششم	۱	۱	۱۳	۳۲۳	۱۵۱ — ۱۷۸
مجلس ہفتم	۱	۱	۱۲	۳۲۱	۱۷۹ — ۲۰۶
مجلس ہشتم	۱	۱	۱۱	۳۱۱	۲۰۷ — ۲۳۱
مجلس نہم	۱	۱	۱۵	۲۶۸	۲۳۲ — ۲۵۵
مجلس دہم	۱	۱	۱۲	۳۵۶	۲۵۶ — ۲۸۵
مجلس یازدہم	۱	۱	۱۳	۴۰۶	۲۸۶ — ۳۱۹
مجلس دوازدہم	۱	۱	۱۱	۳۴۲	۳۲۰ — ۳۵۶
الوداع	—	—	۱۰۱ بند	۴۰۴	—
مناجات	—	—	۳	۲۶	—
فاتحہ	۱	—	—	—	۳۵۷
کل	۱۲	۱۲	۱۳۱	۴۵۸۳	۳۶۶

مہتاب المجالس میں اس طرح کل چار ہزار پانچ سو تراسی اشعار پر مشتمل ۱۳۱ قصیدے۔ اور بارہ مجلسوں میں بارہ حمد اور بارہ سلام کے علاوہ ۱۰۱ بند پر مشتمل الوداعیہ مثنوی اور تین مناجاتیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں فاتحہ درج ہے سلطان راجی ایک عزلت نشیں صوفی بزرگ تھے۔ ان کی تخلیقات و تالیفات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ انھوں نے مذہبی تصنیفات و تالیفات میں صرف کیا ہے۔ اڑیسہ جیسے دور افتادہ علاقہ میں مذہبی اور تہذیبی تحریک کے اردو زبان کے فروغ میں اہم حصہ لیا ہے۔ معاشرتی اعتبار سے زبان کی ترقی و ترویج میں سلطانؔ راجیؔ کی علمی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

مہتاب المجالس کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ربیع الاوّل کے موقع پر مثنوی سیرت پڑھنے کا رواج تھا۔ ایک شخص سیرت کی کسی کتاب کا مطالعہ کرتا اور حاضرین مجلس سنا کرتے لیکن ان کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی تھی اس لیے سلطان راجیؔ عام فہم زبان میں روایتوں کو منظوم کر کے پیش کیا۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ :۔

> "اب شوق لوگوں کا قصیدہ خوانی اور سننے پر زیادہ مائل ہے۔ کیونکہ اس میں دو شخص یا تین ہم آواز ہو کر خوش الحانی سے پڑھتے اور ہر بیت پر مطلع شعر کو دوسری ایک جماعت تکرار کرتی جاتی ہے۔ اس طور سے پڑھتے ہیں بہت خوبی معلوم ہوتی ہے۔ حضّار مجلس کی دلکشی کا موجب ایک شخص کے پڑھنے میں یہ خوبی نہیں اس لئے قصائد، نعت نبیؐ پڑھنے اور سننے میں مائل ہو کر کتاب موصوف کے پڑھنے اور سننے میں سستی کرنے لگے اور اس کے مطالب فیض آگیں سے بے بہرہ اس لئے راجی الی رحمت رحمان بندۂ فقیر محمد سلطان عفا اللہ عنہ وعن والدیہ نے کتاب موصوف کے بارا مجلس کے جمیع روایات کو قصائد میں لایا تاکہ ماہ ربیع الاول میں بارہ روز تک بارہ مجلس بطور قصائد کے پڑھا جائے کیونکہ واحد کے پڑھنے سے جماعت کے پڑھنے میں رونق زیادہ ہے۔"(۱)

---

(۱) مولوی محمد سلطان راجیؔ، مہتاب المجالس سنہ ۱۳۰۳ھ، ص ۲

مہتاب المجالس کی ترتیب میں مولوی سلطان راجیؔ کے پیش نظر میلاد کی مقبول کتاب "مصباح المجالس" رہی ہے اور اس میں مندرجہ روایات ہی ان کے قصائد کا ماخذ ہیں۔ راجیؔ نے ہر مجلس کے لیے ایک حمد، ایک سلام اور روایات کے مطابق متعدد قصائد کہے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ دیباچہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:-

> "جب روشنی واحد کی مانند مصباح کے ہو روشنی جماعت (قاریوں) کی مانند مہتاب کے ہو گی۔ اس لئے اُس کا نام "مصباح المجالس" تھا تو اس کا نام "مہتاب المجالس رکھا اور یہ کتاب بھی جو انجام پائی ماہِ رمضان المبارک کی چودھویں تاریخ پنجشنبہ کے دن ہیں کہ جس میں مہتاب کو درجۂ کمال حاصل ہے کہ جس کو بدر کہتے ہیں، اوس نام کے جہت سے بھی "مہتاب المجالس" نام رکھنا زیبا ہے کیونکہ کمال مہتاب کے دن تیار ہوئی اور جب سن انجام کو کہنے کا خیال کیا تو یہ رباعی برمحل واقع ہوئی۔
>
> بہ انتخاب مصباح المجالس — شدہ تالیف مہتاب المجالس
> سن انجام را ایں گفت راجیؔ — سنہ افزودہ بہ خورشید المجالس
>
> (سنہ ۱۲۸۸ھ ہجری)(۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مہتاب المجالس کی تکمیل اگرچہ سنہ ۱۲۸۸ھ میں ہو چکی تھی لیکن اس کی اشاعت پندرہ سال بعد سنہ ۱۳۰۳ھ میں عمل میں آئی۔ مولوی محمد سلطان راجیؔ کے پڑپوتے محمد رفیق (ایڈوکیٹ) سے معلوم ہوا کہ کٹک میں واقع مطبع مظہر النصائح مولوی سلطان راجیؔ کی ہی ملکیت تھی اور اس میں بیشتر مذہبی کتابچے اور جناب راجیؔ کی تصنیفات و تالیفات شائع ہوا کرتی تھیں۔

"مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" میں ایک بات کھٹکتی ہے کیونکہ جن لفظوں کے آخر میں "ہائے مختفی" ہوتی ہے ان کی جمع جب "ہا" کے اضافے سے بنائی جاتی ہے تو اس ہائے مختفی کو لکھنا

---

(۱) مولوی محمد سلطان راجیؔ:- مہتاب المجالس سنہ ۱۳۰۳ھ، ص ۳

ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جیسے " اندیشہ ہائے دور و دراز" یہی اردو کا چلن ہے۔ لیکن مولوی سلطان راجی نے خطبہ کی جمع "خطبہا" لکھی ہے اور یہاں ہائے مختفی کو حذف کر دیا ہے۔

شیخ امین اللہ چرخی

شیخ امین اللہ چرخی تعلقہ کشنانندپور، پرگنہ بالوبیسی، ضلع کٹک کے رئیس اور زمین دار تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ رسول بخش اور والدہ کا نام نورالنساء تھا۔ چرخی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد منشی عبدالمجید اور منشی تصدق علی ان کے جانشین ٹھہرے۔ منشی عبدالمجید کے فرزند عبدالرشید قاصر نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں دیوانِ چرخی شائع کیا۔ دیوانِ چرخی بڑے سائز کے ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے کاتب ماہ لکھنوی تھے اور اس کتاب کی پانچ سو جلدیں رضوانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھیں۔

دیوانِ چرخی میں ۲۵۲۰ اشعار پر مشتمل ۲۲۷ غزلیں ہیں۔ دیوانِ اوّل صفحہ ۱ سے صفحہ ۹۲ تک ہے جس میں ۱۲۹ غزلیں ہیں اور دیوان دوم صفحہ ۹۳ سے صفحہ ۱۴۰ تک ہے جس میں ۹۸ غزلیں ہیں۔ دیوان ردیف وار مرتب کیا گیا ہے جس کا اندازہ ذیل کے گوشوارہ سے لگایا جا سکتا ہے:-

صفحات	ردیف	تعداد غزل	صفحات	ردیف	تعداد غزل	صفحات	ردیف	تعداد غزل
۱ — ۱۶	الف	۱۹	۲۹	خ	۱	۴۲ — ۴۵	ش	۵
۱۷ — ۲۲	ب	۱۰	۲۹ — ۳۴	د	۲	۴۵ — ۴۶	ص	۲
۲۲ — ۲۵	ت	۵	۳۴	ذ	۱	۴۷ — ۴۹	ض	۳
۲۵	ث	۱	۳۵ — ۳۹	ر	۵	۴۹ — ۵۱	ط	۳
۲۵ — ۲۷	ج	۳	۳۹ — ۴۱	ز	۳	۵۱ — ۵۳	ظ	۳
۲۷ — ۲۹	ح	۳	۴۱ — ۴۲	س	۳	۵۳ — ۵۵	ع	۳

صفحات	ردیف	تعداد غزل	صفحات	ردیف	تعداد غزل	صفحات	ردیف	تعداد غزل
۵۵ — ۵۷	غ	۳	۷۰ — ۷۸	ن	۴	دیوان اوّل کی کل غزلیں ۱۲۹		
۵۷ — ۶۱	ف	۴	۷۸ — ۷۹	و	۳			
۶۱ — ۶۳	ق	۴	۷۹ — ۸۹	ہ	۱۳			
۶۳ — ۶۴	ک	۵	۸۹ — ۹۲	ے	۲			
۶۴ — ۶۷	ل	۵	۹۲ — ۹۳	ی	۱			
۶۷ — ۷۰	م	۴						

امین اللہ چرخی نے سب سے زیادہ غزلیں ردیف "ہ" اور سب سے کم غزلیں ردیف "ی" میں کہی ہیں۔

دیوان چرخی کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت سے اس کی تفصیل پر روشنی پڑتی ہے:۔

تمت

"مسماۃ حورالنساء بی بی بنت درگاہی خان و مسماۃ نعمت النساء بی بی بنت منشی شیخ نور محمد و مسماۃ زہرالنساء بی بی بنت سید غلام حیدر کو اس کتاب فیض انتساب کے چھپوانے کے لئے بہ سبب نہ ہونے مصنف مرحوم سے ولد بجز اس دیوان چرخی کے کروہ قائم مقام اولاد اور حسنات جاریہ کے ہے۔ تاقیامت باقی رہنے والی ہے۔ رضوان اللہ علیہم۔ باہتمام مالاکلام مولوی عبدالرشید خلف منشی عبدالمجید و منشی تصدق علی کہ یہ دونوں متولی اور جانشین مصنف مرحوم کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ راضی انھوں سے ہو اور سعادت دارین اور شرافت کونین عطا کرے۔ جزاہما اللہ تعالیٰ فی الدّارین۔ فقط

مولوی عبدالرشید خاں صاحب، زمیندار ساکن کشنانندپور۔ پرگنہ بالوبیسی۔ ڈاک خانہ ٹینڈاکوڑہ۔ ضلع کٹک۔ ملک اڑیسہ۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۷ء"(۱)

---

(۱) شیخ امین اللہ چرخی: دیوان چرخی ۱۹۰۷ء، صفحہ آخر۔

دیوان چرخی کا نسخہ نایاب ہے۔ انتہائی تلاش و جستجو کے بعد کشنا نند پور بالو بیسی کے شیخ تجمل علی فہمی کے توسط سے دیوان چرخی کا ایک انتہائی بوسیدہ نسخہ راقم الحروف کو حاصل ہوا۔ اور ایک قلمی نسخہ جو کاغذ کی ساخت، روشنائی اور طرز تحریر کی بنا پر مطبوعہ نسخہ سے قدیم ہے کرامت علی کرامت کے توسط سے امجد نجمی کی ذاتی لائبریری سے حاصل ہوا ہے۔ مذکورہ قلمی نسخہ میں صفحہ ۵۶ سے ۱۱۶ تک صفحات ہیں۔ اس نسخہ کے شروع کے ۵۵ صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔ صفحہ ۵۶ کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ؎

دن رات مجھ پہ ہے وہ نہایت ہی مہربان
پل پل میں رحم کرتا ہے از اختیار خاص

قلمی نسخہ اور مطبوعہ نسخہ کا فرق :-

قلمی نسخہ میں صرف دیوان اوّل ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں دیوان اوّل کے علاوہ دیوان دوم در صنعت صفحہ ۹۳ سے صفحہ ۱۴۰ تک محیط ہے۔ دیوان دوم کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ؎

للہ الحمد آنکہ ایک دیوان کی تمہید آج ہے
طبع سے لے تا زبان اوصاف تجدید آج ہے

مندرجہ ذیل جدول سے دیوان چرخی کے قلمی نسخہ کا فرق واضح ہو سکتا ہے :-

قلمی نسخہ		مطبوعہ نسخہ
صورتوں میں اپنی قدرت اس کی پیدا دیکھ لو صورتیں دیتے ہیں قدرت کی شہادت ہر سو ہڈی اور گوشت غلط خوں مع پوست غلط شکم و پشت و گلو کمر و سینہ و ناف دوسرے سارے ملائک کو سمجھا اس کے بیچ تیسری جملہ کتابیں جو کیا رب نے نزول دوستو پہ اپنے بہر صحت و تحسین جوں دن ہوئے حساب خیر و شر عین شرع		صورتوں میں اپنی اس کی شکل پیدا دیکھ لو صورتیں دیتی ہیں قدرت کی شہادت ہر سو استخواں گوشت غلط خوں مع پوست غلط شکم و پوست و گلو و کمر و سینہ و ناف دوسرے سارے ملائک کو سمجھا اس کے بیچ تیسرے جملہ کتابیں جو کیا رب نے نزول دوستوں پر اپنے بہر تو بیو تدقین شرع جون دل ہووے حساب خیر و شر عین شرع

مطبوعہ نسخہ		قلمی نسخہ
چھٹواں ہر نیکی بدی کو بوجھنا اس کا کیا ہے یہی ایمان مفصل سے ہے تلقین شرع		چھٹواں ہر نیکی بدی کو بوجھنا اس کا کیا ہے یہی ایمان مفصل جس سے ہے.... شرع

شیخ ابن اللہ چرخی کا خاندانی شجرہ حاصل نہ ہو سکا لیکن ان کی ذیلی تیسری پشت کے ایک اہم فرد مولوی عبدالحلیم حلیم سے معلوم ہوا کہ ان کا خاندانی شجرہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے ملتا ہے۔ چرخی کے سنِ ولادت کے سلسلہ میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا لیکن ان کے متبنیٰ منشی عبدالمجید کے ذیل کے شعر سے ان کے سال وفات پر روشنی پڑتی ہے ؎

نحیف عبدالمجید را ایں دعا خدایا قبول فرما
کہ نام چرخی مدام باشد بنام نیکو بدہر باقی (۱) (۱۸۷۹ء)

۱۲۹۲ھ

دیوان چرخی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے رہے ہوں گے۔ وہ ایک صوفی شاعر تھے اور وحدت الوجود کے فلسفہ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے سوا اڑیسہ کے کسی اور شاعر کو خالصتاً صوفی شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کلاسیکل شاعری کے بجائے فارسی کی صوفیانہ شاعری سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ ان کی شاعری کا موضوع تصوف ہے اور انھوں نے اظہار کے پیرایہ میں مشکل زمینیں منتخب کی ہیں اور اس کے باوجود اپنے کلام میں سلاست اور روانی قائم رکھی ہے۔ ان کے یہاں بعض الفاظ اور افعال اردو کے عام رویّے کے خلاف ملتے ہیں۔ چرخی کا عام رجحان مذہبیات کی طرف ہے۔ اور دوسرے شعرائے معاصر سے ایک بات ان کے یہاں مختلف ہے کہ ان کی بہت سی ردیفیں مذہبی الفاظ اور مقدس کلمات سے لی گئی ہیں اور یہ اس کے باوصف ہے

---

(۱) شیخ مبین اللہ: اڑیسہ کا پہلا صاحب دیوان شاعر چرخی: مطبوعہ ہماری زبان دہلی: ۸ر جولائی ۱۹۷۹ء۔

کہ یہ ردیفیں جن غزلوں میں آئی ہیں وہ سرتاسر مذہبی نہیں ہیں۔ ولی دکنی نے بھی مذہبی لفظیات سے بہت ساکام لیا ہے۔ بلکہ ولی کی جمالیات میں مذہبی طرز فکر اور روحانی انداز نظر کو بہت کچھ دخل ہے۔ چرخی ولی کا مقلد نہیں ہے بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک نئی روایت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

چرخی کا تخلص غیر معمولی ہے۔ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسرے ہمعصر شعرا کی طرح نسبتاً کسی پرکشش اسم کو تخلص کے طور پر کیوں نہیں استعمال کیا؟ اس سلسلہ میں کوئی توجیہہ مشکل ہے۔ چرخی بلند پایہ صوفی ہیں اور ان کے تخلص میں حضرت معروف کرخی کے نام کے ساتھ نسبت کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن سلسلہ ہائے تصوف میں چرخی کسی سلسلہ سے وابستگی کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ چرخی غالب کے ہمعصر تھے مگر ہندوستان کے ایک ایسے گوشہ میں سانس لے رہے تھے جہاں اس وقت دہلی یا لکھنؤ کسی بھی دبستان شاعری کے اثرات مشکل سے پہنچتے تھے۔ اس لیے خسرو، فردوسی، سعدی اور جامی جیسے قدیم فارسی شعرا کی طرح ان کے کلام میں بھی تصوف اور مذہب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

چرخی کی لفظیات شعری

اردو کے عام رویّہ کے خلاف چرخی نے متفرق الفاظ اپنے طور پر استعمال کیے ہیں۔ مثلاً پابندگی بجائے پابندی۔ ور بجائے ورنہ۔ خندگی بجائے خندہ۔ سازندگی بجائے مطابقت۔ گردندگی بجائے گردش۔ قدسئین بجائے قدسیاں۔ تندگی بجائے تندخوئی۔ رحم لانا بجائے رحم کرنا۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

غور کر جس وقت رب سے قدسئین
چاہئے آنے جگ میں در سازندگی [(۱)]

مذکورہ بالا شعر سے اڑیسہ میں اردو زبان کے ارتقاء کی جھلک ملتی ہے۔
چرخی نے نئے الفاظ تشکیل دیئے ہیں اور پرانے الفاظ کو نئی تشکیلی ہیئتوں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً لرزندگی بمعنی لرزہ۔ صفی لکھ کر آدم مراد لیا ہے۔ اسی لیے کہ

---

(۱) دیوان چرخی: ص ۱۱۵

حضرتِ آدمؑ کے لیے صفی اللہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے لیے کلیم اللہ، حضرت ابراہیمؑ کے لیے خلیل اللہ، حضرت اسماعیلؑ کے لیے ذبیح اللہ، حضرت عیسیٰؑ کے لیے روح اللہ۔ دانندگی بمعنی دانائی۔ خواہندگی بمعنی خواہش۔ بخشندگی بمعنی بخشش۔ زائندگی بمعنی پیدائش۔ خاکی بمعنی آدم اور ابن آدم استعمال کیا ہے جبکہ خاکی آدم کی صفت ہے جیسے آدم خاکی۔ ارزندگی بمعنی لائق استعمال کیا ہے اور انسانوں کو خاکیو کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ کدر بمعنی کدورت۔ آرزندگی بمعنی شرمساری۔ تازندگی بمعنی فرار۔ پائندگی بمعنی بیام و دوام۔ زیبندگی بمعنی زیبائش۔

ایسا نہیں ہے کہ چرخی کو زبان کا صحیح علم نہ رہا ہو اور وہ اس زمانہ کی معیاری زبان، محاورہ اور شعری روزمرہ سے واقف نہ رہے ہوں۔ الفاظ کی یہ تراش خراش اور نئے الفاظ کے لیے نئی تشکیلی صورتوں کی یہ کوشش ان کی جودتِ طبع کو ظاہر کرتی ہے۔ لفظیات کی سطح پر بہت سے ایسے الفاظ آئے ہیں جس سے چرخی کی فارسی اور عربی زبان سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک طرف تو چرخی کے شعری لفظیات میں نوریوں (بمعنی فرشتے)۔ پرستش، رب، رحم، خشم، دانش، ملکوت، تائیدِ مولا، ربِّ پاک، خالق، امر و نہی، خوشنودی، حیران، غلطان، زار و پریشان، عقل و حواس، فہم و خرد، ظن و ایقان، غمِ ہجراں، چشمِ گریاں، موسمِ آذر، مخمل، دے، فروردین، پارچہ، ستر، تنِ عریاں، جامہ و دستار، تارِ گریباں، دامنِ صحرا، ہمدمِ باد، انوارِ تجلی، جلوۂ اعلیٰ، روزِ نخست، باغِ دہر، چشمِ شہلا، عالمِ ایجاد، شۂ گردو، رکابِ آفتاب، پیرانہ شاب، سپہ سالار، لشکرِ اجرام، رقاصِ آفتاب، سمندِ عقل، ترکِ تازی، روح الامین، نوری غلام، زرّیں عقاب اور شباشب انتہائی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

ہے چہارم چرخ پر کس شاہ کا نوری غلام — کون پیارا ہے مسیح وآفتابِ آفتاب
چیر ڈالا سینۂ مرغِ سیاہ رات کو — مارِ چنگل نور کا زرّیں عقابِ آفتاب

آنکھ نیچے ہیں بنا سارے سراپا اپنی — چشم براہ ترے حسن پر نگراں کوکب

کھوجتے کس کو ہیں عاشق کی طرح سیارے — برجِ افلاک پر چکراتے شباشب کوکب

چرخی کی لفظیات میں عربی اور فارسی کے دخیل الفاظ کی بہتات ہونے کے باوجود ٹھیٹھ اردو ہندی الفاظ کا بھی قابل اعتنا ذخیرہ موجود ہے جسے انھوں نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

صندلی رنگ صنم گھر میں تھا دو دن مہمان　　پھول گیندے کا وہ ہنس ہنس مجھے مارا دن رات
بلبلِ دل جو کیا یادِ رُخ صیاد　　باندھا پنجرے پہ مرے ہار ہزارا دن رات
صندلی رنگ صنم سے محبت توری ہے مراد　　گھر سے مقصود ہے دنیا کا گزارا دن رات
پارچہ کوئی کمر میں دیا گر اپنے لپیٹ　　تو ہوئی ستر نہیں تو تنِ عریاں رہے

کمر میں پارچہ لپیٹ لینا یہ گویا مقامی صورت حال کی عکاسی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہاں کی غربت ہی نہیں ہے بلکہ وہ قدیم تہذیبی اثرات بھی ہیں جنھوں نے جغرافیائی ماحول اور مذہبی طرز فکر کے سہارے ترک لباس کی طرف بھی انسانی ذہن کو مائل کر دیا تھا۔ یہاں ستر کا لفظ مذہبی اصطلاح ہے۔ ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنوں تک کپڑا لپیٹ لینا مرد کی ستر پوشی کے لیے ضروری ہے۔

چرخیؔ کا رنگِ سخن

چرخی اجمالی طور پر تصوف کے شاعر ہیں۔ لیکن دوسرے عناصر بھی ان کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تصوف

دیکھ لو تم کھول اپنی چشم بینا دیکھ لو　　عالمِ ایجاد کا کچھ تو تماشا دیکھ لو
صنعتوں میں صانعِ مطلق نظر آتا ہے صاف　　صورتوں میں اپنی قدرت اس کی پیدا دیکھ لو

جلوۂ وحدت الوجود

صاف دنیا غلط اور دم گذاراں غلط　　یہ زمانہ ہے غلط اس کو تو پہچان غلط
ہڈی اور گوشت غلط خون مع پوست غلط　　رودہ و معدہ و جملہ رگ و شریان غلط
شکم و پشت و گلو کمر و سینہ و ناف　　سر سے ہے پاؤں تلک بود ئی انسان غلط

تغزّل

عاشق ہو اگر دل بتِ عیار پہ دے دو　　جاں اپنا تم اک جلوۂ دیدار پہ دے دو
دے دو خرد و ہوش کو اک ناز پہ اس کے　　اور صبر و سکوں زلف کے اک تار پہ دے دو

خوں رلاتا ہے مجھے غنچۂ بتاں کا ہے　　داغ دیتا ہے بدل نو گل خنداں کا ہے
عشق میں کون گل تر کے برنگِ عاشق　　چاک کرتے ہیں یہ گل سارے گریباں کا ہے

صفتِ بلبل شوریدہ ہوں مشتاق جمال　　چمنِ حسن کا اپنے گل خنداں دِکھلا
ہے کھنچی دل پہ مرے غنچہ دہن کی تصویر　　کلکِ قدرت سے نگارِ بت ذیشاں دِکھلا
کوک زن صورت قمری ہے یہ شیدا دن رات　　قدِ موزوں ترا اے سروِ خراماں دکھلا

دیوانِ حرّحیؔ کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس کے مطالعہ سے انیسویں صدی میں اُڑیسہ میں بولی جانے والی اردو کے بہت سے قدیم الفاظ کا پتہ چلتا ہے۔ جو اب اُڑیسہ میں بھی متروک ہیں۔

عبدالمجید بھونیاں حیاؔ

(ولادت ۱۸۴۰ء)

نام عبدالمجید۔ خاندان بھونیاں۔ تخلص بمنفعت الحیا (حیاؔ)۔ بالیسر ضلع کے گڑپدا کے رہنے والے تھے۔ مؤلف آبِ خضر نے حیاؔ کے ضمن میں لکھا ہے :-

"آپ بالیسر کے مشہور بھونیاں خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کا ذکر ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب نے اپنی "تاریخ اُڑیسہ" میں بھی کیا ہے۔ اسی

خاندان کے پٹنیشور بھٹ نامی ایک شخص کو راجہ پرشوتم دیو نے، ۱۰ اپریل ۱۴۸۳ء
کو کافی جاگیر عطا کی تھی۔ اس خاندان نے اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں
اسلام قبول کر لیا اور اُڑیا کی بجائے اردو کو اپنا لیا۔ حتیٰ کہ اس نے عبدالمجید
بھونیاں جیسے اردو کے نعت گو شاعر کو جنم دیا۔ آپ اڑیا اور اردو دونوں زبانوں
میں ملی جلی شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ کو ستار بجانے کا بہت شوق تھا۔
تخلص حیا کرتے تھے۔ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ شائع ہو کر اُڑیسہ کے
عوام میں مقبول ہوا ہے۔"(۱)

حیا صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ خاندانی پس منظر کی بنا پر اڑیا زبان میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کا نعتیہ کلام اڑیسہ کے اردو داں طبقے میں خاصہ مقبول تھا۔ خصوصًا ان کے اڑیا اور اردو زبان کے مشترکہ ذولسانی اشعار عام طور پر مقبول تھے۔ آج بھی ان کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے جس کا مصرع اول اردو اور مصرع ثانی اُڑیا میں ہے ؎

حسن کا نورِ صنم ہے جو ترے تن میں بھرا
ଚାହିଁ ଦେବୁଟି ମୋତେ ଚନ୍ଦ୍ରମୁଖୀ ସୁରଗ ତୋରା
(چاہیں دے بوٹی موتے چندرمکھی سورگ توَرا)

حیا کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "دیوانِ مجید" کے نام سے نول کشور پریس میں شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ ½ ۱۷ سینٹی میٹر × ۲۶ سینٹی میٹر تقطیع کے ۳۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعۂ کلام انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کی تصنیف ہے جو اس وقت نایاب ہے۔ اس کا ایک ہی بوسیدہ اور کرم خوردہ نسخہ مجھے کرامت علی کرامت کے توسط سے دستیاب ہو سکا۔ زیرِ نظر نسخہ کے ابتدائی ۴۸ صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔ اتفاق سے دیوان کے اندر صفحہ اوّل شکستہ حالت میں محفوظ تھا جس سے دیباچہ تک پہنچنا ممکن ہو سکا۔ دیباچہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"امابعد عاجز شکستہ بال فدوی حسین (...... کذا) بلیا پال علاقہ
ضلع بالیسر بخدماتِ صاحبانِ نکتہ رسِ معنی و دقیقہ شناسِ معنوی عرض پرداز
است کہ عزیز از جان منشی المناشی مولوی بھونیاں عبدالمجید خاں المتخلص بنفعت

---

(۱) کرامت علی کرامت، آبِ خضر ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۶

الحیا نسخۂ نعتیہ دیوان مجید بعبارت عربی وفارسی و اردو کہ مضمونش مالا مال
از فصاحت و بلاغت و قابل پسند ارباب ہنر و مقبول نظر جمہور انام است
بخیال شروع از تاریخ اول و اختتام تا تاریخ دوازدہم شہر ربیع الاول
تصنیف و تحریر فرمودہ اند بمقتضائے ابیات :۔

میاں عبدالمجید اند خوب شعرا | مثل سُہیل یمن اُو تکل ستارا
نثر برجستہ گفتہ نظم دلچسپ | بدیوان حمد رب نعت نبی را
ز دل فدوی حسین اورا دعا کن | جزاک اللہ فی دارین خیراً[1]

شیخ مبین اللہ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس میں شائع ہوئی تھی[2]
حوالہ کے طور پر انھوں نے دیوان کے آخر میں حیاؔ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ پیش کیا ہے :۔

بست ہفتم شہر رمضان روز دو شنبہ سعید | احد کی دو کان کا سودا گنج احد سے خرید
بعد صلوات الفجر بس یعنی الصبح کے وقت | سال ہجری کے موافق قفل ایماں کی کلید

یازدہ ماہ ڈسمبر عیسوی تاریخ میں
اے حیاؔ یہ ختم ہے بامنفعت دیوان مجید

۱۸۷۱ء

مذکورہ بالا قطعۂ تاریخ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ۱۱ر دسمبر ۱۸۷۱ء کو حیاؔ نے دیوانِ مجید کی تکمیل کی۔ تصنیفی تکمیل اور طباعت کے مراحل سے گذر کر ۲۱۶ صفحات کی کتاب کے شائع ہونے میں خاصہ وقت لگتا ہے اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ مصنف اشاعتی مرکز سے صدہا میل کی دوری پر ہو۔ چنانچہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ جس کتاب کی تصنیف کا سلسلہ ۱۱ر دسمبر کو ختم ہوئی ہو اس کی طباعت ۳۱ر دسمبر سے قبل ہو گئی ہو۔ بہر حال اس میں اختلافِ رائے کی گنجائش کم ہے کہ "دیوان مجید" ۱۸۷۱ء کی تصنیف ہے۔ دوران تصنیف حیاؔ کی عمر ۳۱ سال تھی۔ جیسا کہ مذکورہ دیوان کی دسویں جلد کے آخر میں مندرجہ سلام کا یہ شعر مظہر ہے ؎

---

(۱) عبدالمجید بھونیا حیاؔ، دیوانِ مجید، ص۱۔
(۲) شیخ مبین اللہ : دیوان مجید ایک مطالعہ، مطبوعہ ہماری زبان نئی دہلی۔
بابت ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء ص۱۳

السّلام اے صاحبِ روشن جمال
عمر میری ان دنوں اکتیس سال

اس حساب سے حیا کا سال ولادت ۱۸۴۰ء ہونا چاہئے۔ مذکورہ بالا سلام سے ہی حیا کی ناسازئ طبع اور شکستہ حالی کا پتہ چلتا ہے کہ ۳۱ سال کی عمر میں وہ نزلہ اور دمہ کے عارضہ میں بتلا تھے اور اس جواں سالی میں بھی وہ کافی لاغر ہو گئے تھے اور ان کے تمام دانت گر گئے تھے۔ کہتے ہیں:-

السّلام اے صاحبِ نوری جھلک — طفلگی کی حال مجھ میں اب تلک
السّلام اے صاحبِ محفوظِ گور — میرے بد اعمال سے نزلہ کے زور
السّلام اے صاحبِ حق دیں پناہ — دانت سارے گر گئے بہر گناہ
السّلام اے صاحبِ روشن دیا — اوس میں پھر دمہ مجھے بے دم کیا
السّلام اے صاحبِ من دے نجات — ورد تیرا نام ہے اوس دم کے سات

السّلام اے صاحبِ حق نیک پے
نوجوانی میں حیا ناچار ہے

دیوان مجید کے پیش نظر نسخہ کے آخری صفحہ میں حیا کی نظم کردہ تاریخ سنہ علی درج ذیل ہے:-

العبد عبدالمجید خاں جب وہ شاہ کلی کا دفتری ہے
بمنفعت الحیا مؤدب تو برج حملی کا مشتری ہے
نکال تقویم کی کتابیں لکھایاں زائچہ ساحسابیں
یہ ہند و دیسہ صوبہ اوڑیسہ نجوم ربلی کا مہتری ہے
مہینا اگہن (اونگلی) گن گن شماری من وعن پچیس دو دن
ہزار دو صد اٹھتر ابجد برس یہ عملی کا جنتری ہے

شیخ امین اللہ جرخی کا انتقال ۱۸۷۰ء کے اطراف میں ہوا۔ ان کی وفات سے تقریباً ایک دہائی قبل مشرقی اڑیسہ میں حیا مذہبی شاعری کو فروغ دے رہے تھے اور ان کے نعتیہ کلام کا دیوان مرتب ہو چکا تھا جو حیا کی زندگی میں ہی شائع ہوا تھا۔ امین اللہ جرخی کشنا نند پور کے نامور زمیندار تھے۔ انھیں اپنے دیوان کی اشاعت کے سلسلہ میں وسائل

کی کمی نہ رہی ہو گی لیکن وہ تصوف اور فلسفۂ وحدت الوجود میں اس قدر غرق تھے کہ انھیں اپنے کلام کی اشاعت کی طرف خاص توجہ نہ رہی ہو گی۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے ۲۸ سال بعد "دیوانِ چرخی" شائع ہوا۔

حیاؔ نے "دیوانِ مجید" میں سرورِ کائناتؐ کے حضور میں سلام پیش کرتے ہوئے اپنے خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

السلام اے صاحبِ اشتر سوار — ہے نہایت یہ اُڑیسہ نابکار
السلام اے صاحبِ دارالسلام — ہے کٹک کا تحت بالیسر مقام
السلام اے صاحبِ نجم الہدا — تھانہ بستہ پرگنہ ہے گڑ پدا
السلام اے صاحبِ تاج و نگیں — باپ دادے کا مرے مسکن وہیں
السلام اے صاحبِ دُرِّ یتیم — میں بھی اب تک ہوں وہیں قائم مقیم
السلام اے صاحبِ ذوالاقتدار — سر بسر دارالحرب ہے یہ دیار
السلام اے صاحبِ خیر الانام — بت پرستی کارخانہ یاں تمام
السلام اے صاحبِ کیف الورا — آج تک نوپشت ہوتا ہے مرا
السلام اے صاحبِ معنی متن — تھے بزرگان میرے پہلے برہمن
السلام اے صاحبِ کردارِ نیک — روک بیدی چار بیدوں سے بھی ایک
السلام اے صاحبِ فرماں بری — تھی او پادھی ادن سبھوں کی بھٹ سری
السلام اے صاحبِ زنّار توڑ — ایک ادن سے بت پرستی دل سے چھوڑ
السلام اے صاحبِ ہر خاص و عام — بھٹ سری سر بیسر ادن کا تھا جو کام
السلام اے صاحبِ روشن جہاں — اسم پھر ادن کا ہو سرمست خاں
السلام اے صاحبِ باغ و بہار — کفر کا جاتا رہا سب کاروبار
السلام اے صاحبِ دُرِّ نظر — ہو گئے مومن وہ دین میں خوبتر
السلام اے صاحبِ صدر العلا — ان کی اولادوں سے میں ہوں برملا
السلام اے صاحبِ بطحا مکیں — اور کچھ ہے خفاش کی صورت زمیں
السلام اے صاحبِ احوالِ غور — پرورش ہوتا ہوں اس سے کوئی طور
السلام اے صاحبِ رتبہ بلند — زیں قبل تھا اک مسلمان شاہِ ہند

السلام اے صاحبِ والا جناب   وہ دیا ہے خاں لقب بھونیہ خطاب

مذکورہ بالا اشعار سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حیاؔ ایک ایسے خاندان اور ایک ایسے معاشرتی ماحول سے تعلق رکھتے تھے جو قبول اسلام کے بعد اپنی شرافت و نجابت، تہذیب واخلاق، مذہب و عقائد اور تعلیم و تربیت کے معیاروں میں بہت روایت پرست، سخت گیر اور عصبیت زدہ ہوا کرتا ہے۔ حیاؔ اپنے شعری تفکر کے ذرہ ذرہ میں عشق نبیؐ میں سرشار نظر آتے ہیں۔

حیاؔ کی شاعری میں جہاں مذہبی رجحان شدت سے حاوی ہے وہاں انیسویں صدی میں اڑیسہ میں اردو زبان کی صورت حال کا بھی اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آپ اپنے بخت سے نا ہند نا ہنجار ہوں   ہند میں ملک اڑیسہ نا سزا کو دیکھ کر
یاں کے دھانگڑا اوڑیوں کا ہر سخن ہے اوڑیا   اوڑسا میں بھی ہوئیک ہر اوڑیا کو دیکھ کر
لاکھ میں دو چار جو مومن ہیں یاں خانہ نشیں   اون کا اوٹکل زباں ہے رابچا کو دیکھ کر
جب بھی ہے تو اوڑیا آمیز ہندی بات چیت   دال چاول کھچڑی آسا ذایقا کو دیکھ کر
پونڑیں یہ عاصی بھی بیاکرون دال نہیں   شاعروں کی پرانو شعرہا کو دیکھ کر
نمونہ یاں کے روبھاکے زباں کا اس وجہ
ہوش اڑ جاتی ہے اردو قاعدہ کو دیکھ کر (۱)

حیاؔ نے اردو اور فارسی کے مختلف شعراء کے کلام پر تضمین کی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ خاتم مہاراج پوری کے کلام پر تظمینیں کی ہیں۔ خاتم کے ایک مقطع پر تظمین کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

حیاؔ پھر آج پوری خاتم الشرف ہے ایک ناظم   کہ جس کی نعت گوئی سے کنک ہاشی ہوئے نادم
صلہ دیتا یہ شعروں کا بچارہتا اگر خاتم   عبث خوف و خطر عصیاں کرتا ہے تو خاتم
شفیع ہوئے گا محشر میں شفیع المذنبیں تیرا (۲)

---

(۱) دیوان مجید، ص ۱۵۱

(۲) دیوان مجید، ص ۸۴

حیاؔ کے پیش نظر اشعار سے دو تین باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ ان کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی کم تھی اور جو تھی بھی تھے وہ اڑیا آمیز اردو بولتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں اردو بولنے والے لوگوں کی زبان پر مقامی پراکرتوں کا گہرا اثر تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی اپنی کوئی زبان نہ تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اس زبان کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ جس سے اس کی لفظیات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے بعد ہو سکتا ہے کہ حیاؔ کے خاندان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مذہبی جذبہ کے تحت محسوس کرتے ہیں کہ یہاں اہل اسلام تو خیر کم ہیں ہی کفر کا غلبہ زیادہ ہے۔ اس میں ممکن ہے ان کی شخصی نفسیات اور خاندانی حالات کا بھی بہت کچھ دخل رہا ہو۔ اس ضمن میں ان کا یہ مصرعہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ع

اور کچھ ہے خفّاش کی صورت زمیں

خفّاش چمگادڑ کو کہا جاتا ہے جس کا شمار چرندمیں ہے نہ پرندمیں اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام کے ختم ہو جانے کے بعد جو کچھ زمین بچی کھچی ہے وہ کسی بھی لائق نہیں برائے نام ہے۔

کلام حیاؔ میں مقامی اثرات

بنیں گے آپ واں ساقی پلانے آبِ کوثر کو ۔ الٰہی سب کو موثر ہو اجالا دین اور دنیا (۴۹) صفحہ نمبر

مذکورہ بالا شعر کے مصرعہ اول کے اختتام پر 'کو' اضافی ہے اور مصرعہ ثانی میں 'موثر' میسر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اڑیسہ میں آج بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔

کوئی دم میں ڈوب جانا تعجب نہیں یہ بحر ۔ پورا بوجھائی ہو چکا میرا یہ چھوٹا بوٹ (۱۱۹)

مصرعہ ثانی میں بوجھائی 'بوجھ' سے ہے۔ اڑیا میں بوجھائی بمعنی لادنا ہے۔

لیے لنگارے شہدوں کا یاں ہو گیا چلن ۔ لنگی کو دور کرکے لگاتے پھریں لنگوٹ (۱۱۹)

مصرعہ اول میں 'لنگارے' بمعنی لفنگے اور مصرعہ ثانی میں لنگوٹ بمعنی دھوتی باندھنا ہے۔

بلکہ دو یارا پیتے ہیں وائن انگوری جن   کچھ ڈر نہ رکھ کے برملا ہو کر کے گوٹ گوٹ (۱۱۹)

'گوٹ' اڑیسہ میں بولی جانے والی اردو میں گروہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

جان ہیں واں دے دیا ہوں جانو یار و بالیقیں   دل یہاں ہوتا ہے میرا دس سببے چنگ چنگ (۱۸۹)

اڑیسہ میں چنگ چنگ مضطرب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں اڑیسہ پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں "دیوان مجید" کی تکمیل ہوئی۔ تقریباً سات دہائی کے عرصہ میں اڑیسہ کی معاشرتی زندگی میں مغربی اثرات جس نہج سے در آئے اس سے حیا کبیدہ خاطر ہیں۔ بنیادی طور پر مذہبی حصار میں گھرے ہوئے شاعر کو ترقی پسند رویوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ حیا نے اپنے دیوان کی محفل چہارم میں ۲۸ اشعار پر مشتمل (ردیف تا ہندی) جو غزل کہی ہے اس سے اس عہد کی معاشرتی تبدیلیوں کا واضح عکس سامنے آتا ہے۔

چرخی کے مقابلہ میں حیا کی زبان سادہ ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس میں سپاٹ پن کا بھی احساس ہوتا ہے۔ چرخی کا موضوع تصوف اور ان کی زبان معیاری ہے۔ ان کے کلام میں پختگی اور فکر میں بلندی ہے۔ حیا نے اپنے تصور کے گرد عشق رسولؐ کا ہالہ قائم کر رکھا ہے۔ انھوں نے ترقی پذیر زبان کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا کے پس منظر میں تہذیبی اعتبار سے ارتقا پذیر اردو کا نقشہ بھی ہمارے سامنے واضح طور پر آجاتا ہے۔ حیا نے مقامی زبان اُڑیا کے بہت سارے الفاظ یا تو براہ راست اپنی اردو شاعری میں بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیے ہیں یا دوسری صورت میں ان کی زبان انیسویں صدی میں اڑیسہ میں بولی جانے والی اردو ہے جس پر مقامی اثرات غالب ہیں۔

خاتم بہراج پوری

خاتم اڑیسہ کے ایک گمنام شاعر گذرے ہیں۔ دیوانِ مجید کے اوراقِ پارینہ سے ہی خاتم تک رسائی ممکن ہو سکی ہے۔ اس کے علاوہ خاتم کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام قطعی طور

پر نایاب ہے ۔ عبدالمجید بھونیاں حیا نے اپنے دیوان میں مختلف شعراء کے کلام پر مخمس کی شکل میں ۲۷ تضمینیں پیش کی ہیں جن میں سب سے حاوی خاتم بہراج پوری کٹکی کے اشعار ہیں۔ دیوان مجید، مجلس دوم میں مندرجہ مخمس میں خاتم کے کلام پر تضمین کرتے وقت حیا نے لکھا ہے۔

"مخمس برغزل حاجی منشی خاتم الاشرف خاتم بہراج پوری کٹکی"

خاتم پر مزید روشنی حیا کے اس شعر سے پڑتی ہے ۔

حیا پھر آج پوری خاتم اشرف ہے ایک ناظم　　کہ جس کی نعت گوئی سے کٹک باشی ہوتے نادم

صلہ یہ دیتا شعروں کا بچا رہتا اگر خاتم (۱)

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دیوانِ مجید کی تکمیل سے قبل یعنی ۱۸۷۱ء سے قبل ہی ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابن اللہ جرخی کا سنہ وفات ۱۸۷۹ء ہے۔ اس طرح سے خاتم بہراج پوری کو ابن اللہ جرخی کا ہمعصر قرار دیا جا سکتا ہے اور چونکہ غالب کی تاریخ وفات ۲ر فروری ۱۸۶۹ء ہے اس لیے اگر خاتم کو غالب کا بھی ہمعصر تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

عبدالمجید بھونیاں نے یوں تو بہت سے شعراء کے کلام پر تضمینیں کی ہیں لیکن ان کی زیادہ تضمینیں خاتم بہراج پوری کٹکی کے کلام پر ہیں۔ کل تیرہ مخمسات میں سے شروع کے چھ صحیح و سالم ہیں اور آخری سات مخمسات کے کچھ بند کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھے نہیں جاتے۔

حیا کی تحریر کے مطابق خاتم کا تعلق کٹک کے نواح میں بہراج پور سے تھا۔ لیکن اس وقت ضلع کٹک میں بہراج پور نام کا کوئی موضع نہیں ہے ۔ البتہ بہراج پور نام کا ایک قصبہ ہے جو زمانہ دراز سے اسلامی کلچر کی بناء پر معروف ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں ہو سکتا ہے کہ اس کا نام بہراج پور رہا ہو۔ لیکن اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہی بہراج پور دراصل خاتم کی جائے ولادت ہے ۔ اس قصبہ میں ایک علاقہ "خاتم باڑی" کے نام سے معروف ہے۔ یقینی طور پر یہ خاتم کی ہی ملکیت رہا ہو گا اور اسی جگہ خاتم کی رہائش گاہ بھی رہی ہو گی۔

خاتم کے جن اشعار پر حیا نے تضمین کی ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ خاتم کے یہاں زبان و

---

(۱) دیوان مجید: ص ۸۴

بیان کے اعتبار سے قدامت کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان کے کلام میں بے پناہ روانی بھی پائی جاتی ہے۔

دیوانِ مجید سے خاتم کے کلام کو یکجا کر لینا اس لیے ضروری ہے کہ ان کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔ دیوان مجید میں خاتم کی چھ غزلیں تو صحیح و سالم ملتی ہیں لیکن باقی سات غزلیات کے چند اشعار کرم خوردہ ہیں جو پڑھے نہیں جا سکتے۔ بہر حال ذیل میں خاتم کی غزلوں کو من و عن پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان سے انیسویں صدی میں اُڑیسہ میں اردو شاعری کی پیش رفت کا صحیح اندازہ ہو سکے:۔

غزل(۱)

بس میں زباں سے شکر کروں اس رحیم کا — اُمّت بنایا ہم کو رسولِ کریمؐ کا
غوّاص بحر فکر میں گر غوطہ زن رہے — ہرگز پتہ نہ پاوے وہ دُرِّ یتیمؐ کا
آئے جہاں میں جبکہ وہ سلطان مرسلینؐ — سجدہ میں آیا کعبہ جھکا سر حطیم کا
ملبوس خاص بریں جو اک شاہِ دینؐ کے تھا — افزوں ہے دو جہان سے مول اس گلیم کا
آزاد ثوبیہ کو ابو لہب کر دیا — سن مژدۂ ولادت حق کے ندیمؐ کا
تخفیف عذاب اس کو ہوا دو زہر کے — دوزخ میں گرچہ جائے ہوا اس لئیم کا

خاتم پڑھے ہے صدق سے کلمہ محمدؐ کی
پھر خوف اوس کو کچھ نہیں نارِ جحیم کا

غزل(۲)

لقب جب حق نے فرمایا ہے ختم المرسلینؐ تیرا — نہ کیوں کلمہ پڑھیں پھر حشر تک سب اہل دیں تیرا
پڑے گا شور نفسی نفسی کا جس دم قیامت میں — شفاعت کا رکھیں گے زعم ہر اک مذنبیں تیرا

---

(۱) دیوان مجید: ص ۸۱–۸۲

(۲) دیوان مجید: ص ۸۳–۸۴

ترے ایوان قدر ومنزلت کے سامنے بے شک　　نہیں یک زینہ کے مانند چرخِ ہفتمیں تیراؐ
یقیں ہے آسماں سے آملائک سب ملیں آنکھیں　　اگر نقشِ قدم پڑ جائے بر روئے زمیں تیراؐ
شب اسرا کی دعوت سے زیادہ کیا فضیلت ہے　　ہوا جب عرش پر خواہاں ربّ العالمیں تیراؐ
خلیلؑ آتش سے یونسؑ چاہ سے اور نوحؑ طوفاں سے　　بچے جس دم پکارے نام لے لے شاہِ دیں تیراؐ

عبث خوف دخطرِ عصیاں کا کرتا ہے تو کیوں خاتمؔ
شفیع ہووے کا محشر میں شفیع المذنبیں تیراؐ

غزل

مالکِ دنیا و دیں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ　　دو جہاں سے برتریں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ
اولیاؒء وانبیاؑ و غوثؒ و ابدالؒ وقطبؒ　　ان سبھوں سے افضلیں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ
جتنے دنیا میں ہوئے پیدا نبیؑ و مرسلیںؑ　　سب میں ختم المرسلیں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ
ہر نبی مرسلؑ کا یہ رتبہ کہ تھے حق کے رسولؑ　　سرگروہِ مرسلیں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ
حشر کے صدمے سے تم اے عاصیو خائف ہو کیوں　　رحمتہ للعالمیں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ
طور پر موسٰیؑ کو دیدارِ خدا کا فخر تھا　　عرش پر حق کے قریں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ
جنت الفردوس میں رضواں کا ہر دم ذکر ہے　　نزہتِ بستانِ دیں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ

سایۂ دامانِ عالی سے ہے خاتمؔ گرچہ دور
ہر مصیبت کے قریں ہے ذاتِ پاکِ آنجنابؐ

غزل(۲)

مصطفٰےؐ عرش پہ داخل ہوئے معراج کی رات　　اور اللہ سے واصل ہوئے معراج کی رات

---

(۱) دیوان مجید: ص ۱۰۳—۱۰۴

(۲) دیوان مجید: ص ۱۱۴—۱۱۵

بو نواس اور شیاطین تھے جہاں میں جتنے	سارے پابندِ سلاسل ہوئے معراج کی رات
اور افلاک میں جتنے تھے ملائکؑ اس دم	حمد و تسبیح میں مائل ہوئے معراج کی رات
اور جبریل امیںؑ ساتھ گئے سدرہ تک	آگے بڑھنے کے بھی حائل ہوئے معراج کی رات
چہچہے کرنے لگے اور مزنم گوئیاں	باغِ جنت کے عنادل ہوئے معراج کی رات

جائے آداب ہے کر بند زباں اے خاتمؔ
نعتیں جو جو تھیں حاصل ہوئیں معراج کی رات

غزل[1]

آتشِ ہجراں سے ہے یہ سینہ سوزاں الغیاث	الغیاث اے سرورِ دیں شاہِ شاہاں الغیاث
صدمۂ دوری سے ہوں دن رات میں زار و نزار	دیدۂ گریاں بن گئے ہیں مثلِ باراں الغیاث
جذبۂ دل لے چلا جس دم مدینے کی طرف	حرصِ دنیا کھینچے ہے پیچھے سے داماں الغیاث
پا برہنہ راہِ یثرب میں چلا دیوانہ وار	ہر طرف سے چبھ گئے خارِ مغیلاں الغیاث

اے مسیحائے زماں بارے مسیحائی کرو
عشق میں خاتمؔ ہوا ہے بس کہ بے جاں الغیاث

ظہور الحق ظہوری

(ولادت ۱۸۱۳ء	وفات ۱۹۰۶ء)

ظہور الحق ظہوریؔ کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد حسن کی وجہ سے قصبہ معصوم پور ضلع کٹک میں اردو اور فارسی کلچر کا ایک اہم مرکز بنا۔ ظہوریؔ کے دادا مولوی محمد حسن متوفی ۱۲۵۳ھ مطابق

---

(۱) دیوان مجید؛ ص ۱۲۴

۱۸۳۶ء مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ حضرت نعیم اللہ بہرائچی کے مرید خاص تھے۔ ظہوری کے والد کا نام عبدالاحد تھا۔ ظہوری نے گھر ہی پر اپنے والد سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ظہوری لاولد تھے۔ اُڑیسہ کے دوسرے ہم عصر شعراء کی طرح ظہوری کی شاعری میں بھی مذہبی رچاؤ ہے۔ ان کی مذہبی نظمیں اب بھی عید میلادالنبیؐ کے موقع پر اڑیسہ کے مضافات میں پڑھی جاتی ہیں۔(۱)

ظہوری کا شجرۂ نسب ملاحظہ ہو:۔

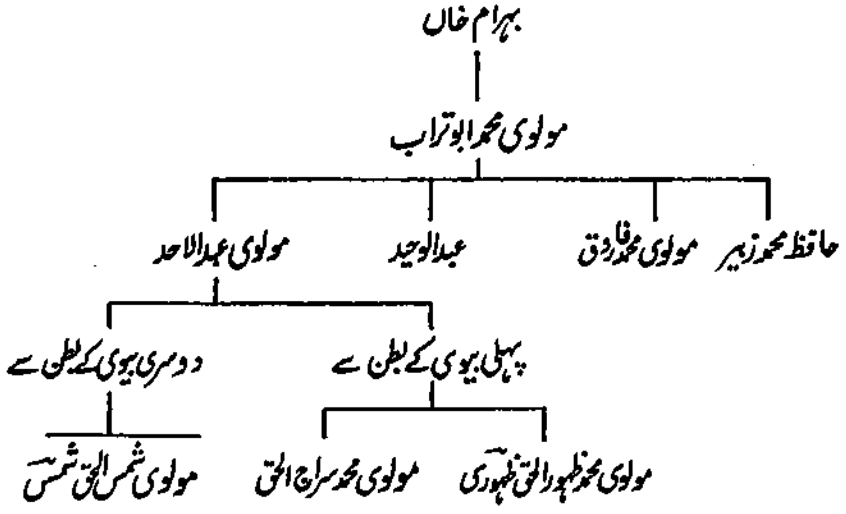

ظہوری کے کلام کا ذخیرہ جو دستبرد زمانہ سے کسی طرح بچ رہا تھا انتہائی بوسیدہ قلمی نسخوں کی شکل میں معصوم پور کے علی حسین حبیبی کے توسط سے راقم الحروف کو دستیاب ہوا۔ ان کا کلام مکمل طور پر نعتیہ اور مذہبی ہے۔ انھوں نے فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت بھی وہی ہے۔ ظہوری کے کلام میں بیشتر نعتیں اور سلام ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کئی معجزے بھی ہیں جن میں سے چند اشعار اس عہد کی زبان، مذہبی عناصر اور اس دور کے معاشرتی ماحول کی نشان دہی کے لیے پیش ہیں:۔

---

(۱) آب خضر، ص ۱۶۵

سلام

پادشاہِ دوجہاں سلطانِ عالم السّلام
سرورِ کون و مکاں سلطانِ عالم السّلام

مالکِ ہر دوسرا شافعِ روزِ جزا
شافعِ کل عاصیاں سلطانِ عالم السّلام

باعثِ ایجادِ عالم رحمۃٌ للعالمین
موجبِ خلقِ جہاں سلطانِ عالم السّلام

سیر کی یک پل میں تونے فرش سے لے تا بہ عرش
اے ممدِ عاجزاں سلطانِ عالم السّلام

توبہ آدمؑ کا ہوا مقبول تیرے نام سے
حامیِ درماندگاں سلطانِ عالم السّلام

نارِ ابراہیمؑ بھی تھا سرد تیرے نام سے
آپؐ ممدِ عاجزاں سلطانِ عالم السّلام

ذبح سے تونے بچایا ہے گا اسماعیلؑ کو
راحمِ واماندگاں سلطانِ عالم السّلام

خاص رحمت تیری ہے گی عاصیِ لاچار پر
مرجعِ بے چارگاں سلطانِ عالم السّلام

روزِ محشر کی حکومت حق نے ہے بخشی تجھے
مالکِ باغِ جناں سلطانِ عالم السّلام

اب ظہوریؔ کو کرم سے لے غلامی میں تجھے
کارسازِ عاصیاں سلطانِ عالم السّلام

مستزاد

یا رسولِ عربی فخرِ انام
لیجئے میرا سلام

آپؐ کے در کا ہوں ادنیٰ سا غلام
لیجئے میرا سلام

زبدۂ خلقِ جہاں
قاسمِ خلد و جناں

باعثِ امن و اماں
سیدِ کون و مکاں

صدق سے اہلِ زمیں، جن و ملک، اہلِ سما
ساری مخلوقِ خدا

آپؐ کے ذکر میں مصروف ہیں یاں صبح و شام
لیجئے میرا سلام

آپ ہیں شاہِ اُمم | دافعِ رنج والم
پیکرِ لطف وکرم | مالکِ ملکِ نعم

امتوں میں ہے ظہور آپ کی یہاں ناچیز وحقیر | ایک ادنیٰ سا فقیر(۱)
کیجئے اس پہ نظرِ لطف وعنایت کی مدام | لیجئے میرا سلام

مجرم سنبل پوری

(متوفی ۱۹۱۲ء)

نام سید محی الدین۔ مجرم تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد سید جلال حسینی نے رائے ویلور سے آکر سنبلپور اڑیسہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے تفصیلی حالات کا پتہ نہیں چل سکا۔ ان کے صاحبزادہ معلّم سنبلپوری کے قلم سے لکھی ہوئی مجرم کی صرف چند غزلیں ہی دستیاب ہوئی ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور انھیں امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

---

غزل

جا کے گلزارِ مدینہ کی ہوا لے بلبل | باغِ عالم تو خزاں کے ہے حوالے بلبل
گلشنِ دہر میں کیا کرتی ہے نالے بلبل | گل تو پہنا ہے یہاں خار کے مالے بلبل
نغمۂ صلِّ علیٰ روضہ پہ گا لے بلبل | مرحمت ہوں گل رحمت کے دوشالے بلبل
بند منقار نہ رکھ بولنے والے بلبل | گل مضمون ثنا سب کو سنا لے بلبل
نہیں وہ قطرۂ شبنم وہ چمن آرا کے | تپ فرقت میں سب گل پہ ہیں چھالے بلبل

---

(۱) آبِ خضر: ص ۳۵-۳۶

عارضِ گل کے تصور میں گل و لالہ کو — داغ دل سے ہیں پڑے جان کے لالے بلبل
چمن دہر میں دل آتش گل سے نہ جلا — وہ گل نور سے یہ نار بجھالے بلبل
شاخ مسجود محمد ہیں تو کف بستہ برگ — غنچہ بند تو چپ چیخنے والے بلبل

صرف سنبل ہوئے پابند نے ملک مجرم
نقطۂ وصف شگوفہ ہیں نرالے بلبل

غزل

اے طائر جاں دام تعلق سے نکل جا — کر قفلِ بدن جامۂ ہستی کو بدل جا
عارف جو تو کر ترک یہ دنیا تے دغل جا — مانند مگس پھنس کے نہ در حرص عسل جا
اے عمر رواں بارِ گناہ پھینک سنبھل جا — گر چاہئے بے رخت سفر نیک عمل جا
میں راہِ محمد کا مسافر ہوں تو اے نفس — ہے دشمن ایمان و انداز خلل جا

جو داغ بدل عشق محمد میں ہے مجرم
غم نامہ وہ بتلاؤں نہ کیوں محشر میں کل جا

فیض النساء بیگم تسخیر کٹکی

(ولادت ۱۸۶۶ء — وفات ۱۲ فروری ۱۹۴۳ء)

تسخیر اڑیسہ کی اولین اردو شاعرہ ہیں۔ گذرتے ہوئے زمانہ کی مسلم معاشرت میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اڑیسہ کی ایک خاتون شعر و شاعری سے بھی دلچسپی لے گی۔ عام طور پر روایتی مسلم ماحول میں جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے۔ تسخیر نے خود کو اس سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک قلمی نسخہ کی رو سے تسخیر کا سنہ ولادت ۱۸۶۶ء ہے۔ ان کے والد صوبہ دار میجر سردار بہادر عزیز محمد تھے۔ کٹک کے بخشی بازار سے متصل بیوپاری ساہی میں ان کا قیام تھا۔

تسخیر کی ولادت مدراس میں ہوئی تھی اور ان کی شادی ۱۸۷۸ء میں محمد عبدالصمد سے ہوئی تھی جو بالیسر میں ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار تھے۔ تسخیر کی تاریخ وفات ۱۲ فروری ۱۹۴۳ء ہے۔ ان کے تین لڑکے تھے، محمد عبدالاحد، محمد عبدالسّلام اور محمد عبدالباری۔ تسخیر کے بھائی خان صاحب قاضی ناظر محمد (۱۸۵۰ — ۱۹۱۴ء) بھی ایک اچھے شاعر تھے۔

تسخیر کے خلف رشید ایم۔ اے۔ احد برطانوی دور حکومت میں کٹک کے مجسٹریٹ تھے۔ شیل بالا کالج سے متصل کٹک چنڈی کے چوک پر واقع ان کا انتہائی عریض و وسیع احاطہ دکوٹھی ان کے انتقال کے بعد مذکورہ کالج کے احاطہ میں ضم کر دی گئی۔

تسخیر نے مخمس اور مسدس کے انداز میں سلام اور مناجاتیں کہی ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں ادبی رچاؤ نسبتاً زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

مسدّس

عزیزو! ہمارے ہی خواب پریشاں کی آنکھوں کے آگے یہ تعبیر آئی
نظر میں جو صورت نہ تھی برگشتگی کی وہی دور د بن کے تصویر آئی
کہے ہم کو تعذیر کے ہے حوالے، نہ انصاف میں ان کے تعذیر آئی
مدبر تھے ہر حال میں عقلِ کامل، نہ بن اس کے آخر کوئی تدبیر آئی
مٹا کون سکتا ہے اب لوحِ قسمت کو، روزِ ازل سے ہے تحریر آئی
لکھا ہے مقدر کا، کیا ہے تعجب جو پاؤں میں تسخیر زنجیر آئی

مخمّس

دو جہانِ مظہرِ نورِ خدا کا ساتھ ہو ۔۔۔ معدنِ عرفان اس کانِ حیا کا ساتھ ہو
منزلِ ہستی میں ایسے رہنما کا ساتھ ہو ۔۔۔ یاالٰہی حشر میں خیرالوریٰ کا ساتھ ہو
رحمتِ عالم جناب مصطفےٰ کا ساتھ ہو

ہے پڑا یارب مرے منہ پر گناہوں کا نقاب دور کر میری نظر کے سامنے سے کل حجاب
یاالٰہی جب قریب نیزہ آوے آفتاب کھائے گا اپنا دل مضطر کہاں تک پیچ و تاب
اس سزاوار خطاب والضحیٰ کا ساتھ ہو

تسخیر کا سنہ ولادت ۱۸۷۶ء اور ان کی تاریخ وفات ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء ہے۔ اس طرح انھیں تقریباً ۷۹ سال کی زندگی نصیب ہوئی۔ تسخیر کے کلام میں جو پختگی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عرصۂ دراز تک شاعری کی ہوگی۔ سب سے پہلی چیز جو اس دور کی خصوصیت کا اہم جزو سمجھی جاتی ہے وہ مذہبی رچاؤ ہے۔ تسخیر کے کلام میں مذہبی قنوطیت تو نہیں ہے بلکہ ایک نئی فکر کا احساس جھلکتا ہے۔ ان کی بیاضِ پارینہ میں سب سے پہلے ایک مناجات کے چند بند ملتے ہیں جن سے ان کی عقیدت مندی اور توکل کا اظہار ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے روایتی انداز سے اپنا رشتہ مستحکم کر رکھا تھا پھر بھی اس دور میں اڑیسہ کی مسلم خواتین میں تعلیم کے وسائل کی کمی کے پس منظر میں ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی فنی پختگی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

تسخیر نے شروع کے بند میں لکھا ہے ؏ "عزیزو جاتا ہے تسخیر چھوٹی کر تسخیر سے اپنا چھوٹا وطن ہے" یہ بحر اور طرز ادا اردو کی عوامی شاعری سے بہت قریب ہے۔ اس کے علاوہ 'عزیزو' کا لفظ اردو شاعری کی زبان پر خاص خاص موقع پر آتا ہے جب وہ گہرے جذباتی لگاؤ کے ساتھ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ؎

عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

تسخیر کے اشعار کے زیریں لہروں میں جس کرب کا اظہار ہے یہ ایک بیدار ذہن اور حساس فطرت کا لازمہ ہے جس میں فطری سادگی بھی ہے اور متانت کا عنصر بھی۔

راقم الحروف کو فیض النساء بیگم تسخیر کٹکی کا کلام کرامت علی کرامت کے توسط سے حاصل ہوا۔ (ح ن)

شمس الحق شمس

(ولادت ۱۸۳۱ء وفات ۱۹۰۱ء)

شمس الحق شمس اڑیسہ کے مشہور و معروف صوفی بزرگ حضرت مولوی محمد حسن (جن کے نام پر ضلع کٹک کے قصبۂ معصوم پور کا مولوی محلہ موسوم ہے۔) کے پوتے اور مولوی عبدالاحد کے بیٹے تھے۔ معصوم پور میں ان کی ولادت ۱۸۳۱ء میں ہوئی۔ بھدرک میں رہ کر عبدالغنی عرف پنچو میاں زمیندار کے مدرسہ سے درس نظامیہ میں فراغت حاصل کی۔ حافظِ قرآن بھی تھے اور ایک اچھے واعظ بھی۔ اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا نعتیہ کلام آج بھی علاقۂ معصوم پور میں عید میلاد النبیؐ کے موقع پر پڑھا جاتا ہے اور ان کا اکثر کلام وہاں کے میلاد خواں حضرات کو ازبر ہے۔ لیکن ان کی قدیم بیاض سے جو کلام حاصل ہوا ہے اسے ہی متن کے طور پر ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مجھے پیمبرؐ کے در کا رستہ بتا دے مولا بتا دے مولا
وہ آستانِ درِ معلیٰ دکھا دے مولا دکھا دے مولا

گناہ کا بوجھ لے کے سر پر بھٹکتا پھرتا رہا سراسر
مجھے اب ایک اس کے در کا..... بنا دے مولا بنا دے مولا

کہیں خدایا مرے نبیؐ کو، مرے وہ آقا مرے سخی کو
مری یہ فریاد و آہ و نالہ سنا دے مولا سنا دے مولا

میں اس کا ہوں گا جو دھیان جوگی بنوں گا اس کے لئے بروگی
کہیں سے خاکِ مدینہ تھوڑا منگا دے مولا منگا دے مولا

ہے جاری خونِ جگر برابر، ہوا ہوں کاہیدہ خس سے کم تر
ہوا سے مجھ کو سوئے مدینہ اڑا دے مولا اڑا دے مولا

عذابِ گور و سوال کا بھی، بہت ہے ڈر مجھ کو یا الٰہی
مدد میں مولا کو مرے اس جا بھجا دے مولا بھجا دے مولا

ملیں جو محشر میں خیر اور شر جو ہوں میں ملاح شاہِ محشر
تو میری نیکی کا صاف پلّہ جھکا دے مولا جھکا دے مولا
الٰہی تجھ سے یہی دعا ہے، یہ شمسؔ عاجز کا مدعا ہے
جمالِ ختم النبیؐ برو یاد دکھا دے مولا دکھا دے مولا

اس کے علاوہ شمس الحق شمسؔ نے معجزۂ ماہی، ہرنی نامہ اور دوسری کئی مذہبی نظمیں اور متعدد سلام لکھے ہیں۔ لیکن افسوس کہ کرم خوردہ صفحات میں سے اشعار و ربط و تسلسل کو بروئے کار لانا ممکن نہیں ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مؤلف آبِ خضر نے شمسؔ کے بھائی ظہور الحق ظہورؔ کا تو تذکرہ کیا لیکن وہ نہ شمسؔ کی حیات پر نہ ان کے نمونۂ کلام پر روشنی ڈال سکے۔

محمد یوسف یوسفؔ

(ولادت ۱۸۷۴ء وفات ۱۹۲۴ء)

محمد یوسف نام، تخلص یوسفؔ۔ یوسفؔ صاحب کا اپنے زمانہ کے عمائدین میں شمار ہوتا تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ اُڑیسہ کی تین مختلف ریاستوں، نیل گری، ڈھینکانال اور تال چیر میں نائب دیوان کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد پال لہڑا کی ریاست میں دیوان مقرر ہوئے تھے کہ سال ڈیڑھ سال بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ بارہ برس تک اسی عالم میں بسترِ علالت پر پڑے رہے۔ اس مرض کے علاج میں بہت زر رائیگاں گیا، لیکن سارا علاج بے سود ثابت ہوا۔ انھوں نے موت و حیات کی کشمش میں انتہائی حسرت آمیز لہجہ میں کہا ہے:-

معالجہ کوئی فالج میں کارگر نہ ہوا   چلے چلیں گے عدم کو جو یاں گذر نہ ہوا

شمسؔ کی تاریخ ولادت، تاریخ وفات اور ان کے حالات کا علم ان کے قریبی عزیز عبدالباسط معصوم پوری (عمر تقریباً ۹۲ سال) کی نوٹ بک سے ہوا۔ (ح ن)

اور ایک جگہ کہتے ہیں:۔

سب مرتے ہیں پر حضرتِ یوسفؔ نہیں مرتے حکما بھی علاج ان کا ادھر کو نہیں کرتے

فالج کو بتاتے ہیں بیماریٔ سَر ہے سَر کاٹ لے قاتل مِرا کس کا تجھے ڈر ہے

بالآخر اسی مرض کے عالم میں ۱۲ رمضان ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء جمعرات کے دن تین بجے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔(۱) یوسف کے جدا مجد بھی شاعر تھے۔ اس طرح شعروادب کے ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔

مالک رام ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"محمد یوسف صاحب اڑیا کے علاوہ اُردو و فارسی اور انگریزی میں بھی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ اُردو میں شعر بھی کہتے اور یوسفؔ تخلص کرتے تھے۔ وہ داغؔ اور اس کے طرزِ کلام کے عاشقِ زار تھے۔ مدتوں ان کا اپنا کلام "دامنِ گلچیں" اور "پیامِ یار" میں چھپتا رہا۔ مجموعہ بھی "نکہتِ یوسف" کے نام سے تیار تھا لیکن آخری ایام کی طویل علالت اور بے خبری کے دوران میں ضائع ہو گیا۔"(۲)

امجد نجمی محمد یوسف کے فرزند تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے ادبی خطوط کو "نکہتِ باغِ یوسفؔ" کے نام سے مرتب کیا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء کے باب میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ 'نکہتِ باغِ یوسفؔ' میں حضرت یوسفؔ کی متعدد غزلیں بھی درج ہیں جو انیسویں صدی کے اس شاعر کا آخری اثاثہ ہیں۔ ان کی دستیاب شدہ مکمل شعری تخلیقات آئندہ اوراق میں پیش کی جارہی ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کو اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی میں اُڑیسہ کی اردو شاعری کے معیار و اقدار کا سراغ مل سکے۔

---

(۱) امجد نجمی: نکہتِ باغِ یوسف: قلمی نسخہ: ص ۴

(۲) مالک رام: وفیات: مطبوعہ سہ ماہی تحریر دلّی: جلد ۸، شمارہ ۴۔ بابت اکتوبر/دسمبر ۱۹۷۵ء ص ۵۹۔

امجد نجمی نے مندرجہ ذیل غزلیں "دامنِ گلچیں" سے فراہم کی تھیں (۱)۔

(۱)

تری فرقت میں یہ عالم ہے تیرے جاں نثار دل کا — کبھی بستی سے جنگل ہے کبھی جنگل سے بستی ہے
لحد پر فاتحہ کو بھی نہ تو ظالم کبھی آیا — ہماری خاک کیا کیا پائے بوسی کو ترستی ہے
فقط اک شمع بالیں پر ہے وہ بھی سخت افسردہ — مزارِ بے کساں پر کس قدر حسرت برستی ہے
محبت مہ جبینوں کی بڑی دولت تو ہے لیکن — یہ وہ دولت ہے ہونے پر بھی جس کی تنگدستی ہے
نہیں اپنے برابر ہم سے رندوں کو سمجھتا تو — خدا کا خوف کر زاہد یہ کیسی خود پرستی ہے

دلِ پُر آرزو کا میرے خواہاں کون ہو یوسف
کہ بازارِ محبت میں بہت یہ جنس سستی ہے

---

(۲)

یار کی برقِ تجلّی نے جو کی جلوہ گری — خانۂ دل طورِ سینا رشکِ ایمن ہو گیا
رنگ لایا بوسہ پر کیا عارضِ گلگونِ یار — تمتمایا اس قدر چہرہ کہ کندن ہو گیا
خاک کر ڈالا گھڑی بھر میں بھڑک کے جان کو — شعلۂ عشقِ حسیناں برقِ خرمن ہو گیا

کہتے ہیں وہ مجھ سے ان باتوں کا کیا ہو گا اثر
سنتے سنتے دل ہمارا سنگ و آہن ہو گیا

---

(۳)

ہم وہ میخوار ہیں ساقی کہ جھجکتے نہ کبھی — زہر میں بھی جو بجھا ہے کا پیالہ ہوتا
یہ بھی اک بات تھی گر تم نے گلی سے اپنی — اپنے عاشق کے جنازہ کو نکالا ہوتا

شاید اے ماہ تو اس وقت نگہ پر چڑھتا
حسن صورت پہ اگر گیسوؤں والا ہوتا

---

(۱) امجد نجمی؛ نکہتِ باغِ یوسف، قلمی نسخہ، صفحہ ۴۱۔

(۴)

تو جو شمعِ سحر کا شانۂ خوبی ٹھہرا ہم سے عشاق کو عہدہ ملا پروانوں کا
کشورِ حسن میں لیلیٰ کی جگہ تجھ کو ملی قیس کے بعد میں مالک ہوا ویرانوں کا

ہے تمنا دلِ یوسف کی کرم کر یارب
ہوں بگولا میں مدینے کے بیابانوں کا

---

(۵)

محفلِ یار میں چل دور ہے پیمانوں کا امتحاں آج ہے زاہد کئی ایمانوں کا
چار دن بزم میں رندوں کی جو بیٹھا آکر پھر تو دم بھرنے لگا شیخ بھی مے خانوں کا

تیر ہی کم ہیں نہ خنجر جو تو ہو ہو دل میں
ہو کھلانے کو تو توڑا نہیں مہمانوں کا

(مذکورہ بالا تینوں اشعار دراصل چوتھی غزل کے ابتدائی اشعار ہیں۔ ح۔ن۔)

---

(۶)

ہم اور وہ سر بستر ہیں جیسے دو زلفیں ملا ہوا ہے وہ ہم سے مگر جدا بھی ہے
کھلا رہا ہے رقیبوں کو گالیاں در پر نہیں خیال کہ باہر کوئی گدا بھی ہے
نکال دے مجھے زلفوں سے شانہ شاید دل چڑھا ہے سر پہ تو چوٹی کا آشنا بھی ہے
یہ کس پہ آج چڑھائی[1] ہے کیوں سنورتے ہو کمر میں تیغ ہے قبضہ میں نیمچا بھی ہے
حلال کر کے ملو خون میرا ہاتھوں سے کہ اس میں ہاتھ کی زینت بھی خوں بہا بھی ہے

تمھیں ہے جوشِ مئے حسن ہم کو مستیٔ عشق
گلے ملو کبھی صاحب تو کچھ مزا بھی ہے

---

(۱) چڑھائی: اڑیسہ میں حملہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ (ح۔ن)

(۷)

سر ہی نہیں ہے دوش پہ خنجر سے کیا کہیں — دل ہی نہیں بغل میں تو دلبر سے کیا کہیں
دنیا میں ہم بتوں کو سمجھتے رہے خدا — مر کر ہے سوچ داورِ محشر سے کیا کہیں
آئے تھے ہم حضور میں کہنے کو اپنا حال — سنتے نہیں جب آپ تو پتھر سے کیا کہیں
کچھ پاس ہو تو کیجئے سودا کی بات چیت — قابو میں دل نہیں بتِ کافر سے کیا کہیں
ذکر آپ کا جو حشر میں آ جائے دفعتاً — فرمائیے کہ داورِ محشر سے کیا کہیں
اندر بلائیے تو کریں عرضِ حال کچھ — دروازے پر کھڑے ہوئے باہر سے کیا کہیں

یوسف شبِ فراق کی بے تابیاں نہ پوچھ
کیوں کر بلائے ہجر ٹلی سر سے کیا کہیں

قطعہ

جاتی ہے یوسف کی میت دفن ہونے کے لئے — عمر بھر جاگے تھے گھر جاتے ہیں سونے کے لئے
امتحانِ عشق میں کامل نہیں نکلا کوئی — ہم نکل آئے اکیلے جان کھونے کے لئے

---

(۸)

جاتے جاتے اس کے در پر گر پڑا — میں کہاں آیا کہاں پر گر پڑا
یہ نزاکت قتل کا بیڑا اٹھائے — ہاتھ سے دیکھو کہ خنجر گر پڑا
محتسب کو دیکھ کر تھرا گیا — ہاتھ سے ساقی کے ساغر گر پڑا
خطِ شوق اپنا نہ پہنچا تھا وہاں — آدھے رستے میں کبوتر گر پڑا
ہاتھ سے قاتل کے جب لے جائے تھا — دل ہمارا ہو کے مضطر گر پڑا
شب کو پی تھی خوب سی مے مفت کی — دردِ سر سے صبح کو سر گر پڑا
ضعف سے ہائے دمِ آہ و فغاں — نالہ میرا مجھ کو لے کر گر پڑا
ہو مجھے شوقِ شہادت اس قدر — پائے قاتل پر میں جا کر گر پڑا
ہو گیا ہر ایک اب راحت پسند — آسماں اہلِ زمیں پر گر پڑا

دل ہمارا چاہِ غبغب میں تری — دیدہ و دانستہ کیو نکر گر پڑا
جم سکا پاؤں نہ بحرِ عشق میں — بارہا اٹھا اٹھ کے اکثر گر پڑا
جستجو کرتے ہیں کوچے میں تری — دل ہمارا ہائے دلبر گر پڑا
ناتوانی اس قدر یوسف رہی
میں کھڑا ہوتے اٹھا گر گر پڑا

دامنِ گلچیں سے ماخوذ مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ ذیل کی غزلیں "نکہتِ باغِ یوسف" میں پائی جاتی ہیں:

(۹)

دلِ کم بخت پہ ہوتا کبھی قابو اپنا — کب یہ ہوتا تھا کہ سر اور ہو زانو اپنا
(اس غزل کے سات اشعار ہیں۔)

---

(۱۰)

رنگ لائے گی، کوئی روز جو الفت تیری — مار ہی ڈالے گی ہم کو یہ محبت تیری
(اس غزل کے دس اشعار ہیں۔)

---

(۱۱)

پھوڑا سینے میں ہو گیا غم کا — اب بھروسہ نہیں مرے دم کا
(اس غزل کے پانچ اشعار ہیں۔)

---

(۱۲)

دن تھے قسمت میں اے حبیب بُرے — ہو گئے مجھ سے اب رقیب بُرے
(اس غزل کے چھ اشعار ہیں۔)

---

(۱۳)

کسی طرح سے دل کو شاد کرنا ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا
(اس غزل کے ۵ اشعار ہیں)

---

(۱۴)

ملے خاک میں ہم اکڑتے اکڑتے پڑے ایڑیاں ہیں رگڑتے رگڑتے
(اس غزل کے ۴ اشعار ہیں۔)

---

(۱۵)

دردِ دل اٹھ کے بیٹھ جاتا ہے جس سے مُنہ کو کلیجہ آتا ہے
(اس غزل کے بھی چار اشعار ہیں۔)

---

(۱۶)

موت آتی نہیں مروں کیسے صحت ہوتی نہیں کروں کیسے
(اس زمین پر تین اشعار ہیں۔)

---

(۱۷)

وہ زمانہ کہاں وہ بات کہاں ہائے وہ دن کہاں وہ رات کہاں
(اس زمین پر تین اشعار ہیں۔)

---

(۱۸)

میں تمھارے حق میں پیارے مرگیا تھا بڑی رنجش میں یارے مرگیا
(اس زمین پر چار اشعار ہیں۔)

---

(۱۹)

مجھ پہ کس سبب سے آفت ہے　　رنج ہے درد ہے مصیبت ہے

(اس زمین پر چار اشعار ہیں۔)

---

(۲۰)

صبح جب بستر سے میں سو کر اٹھا　　یاد آتے ہی تری رو کر اٹھا

(اس زمین پر بھی چار اشعار ہیں)

معلّم سنبل پوری

(متوفی ۱۹۲۴ء)

اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا میں معلّم کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے شیخ امین اللہ جرحؔی اور عبدالمجید بھونیاں جیسا کی طرح معلّم بھی صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ ان کا نام سید عبدالعزیز تھا اور معلّم تخلّص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام سید محی الدین تھا۔ وہ بھی اردو کے اچھے شاعر تھے۔ مجرم تخلّص کرتے تھے۔ معلّم کے دادا سید جلال حسینی نے مدراس سے آکر سنبل پور اڑیسہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ معلّم امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ انھیں فن شاعری پر کافی عبور حاصل تھا معلّم کے شاگردوں کا وسیع حلقہ سنبل پور، بلاس پور، دبلور اور کٹک وغیرہ میں تھا۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ حکیم تھے۔

نوٹ: "نکہت باغ یوسف" میں مندرجہ حضرتِ یوسف کے کل اشعار کی تعداد ایک سو سات ہے۔ ان غزلوں کے علاوہ ۱۶ قطعات بھی ہیں۔ یعنی ۳۲ اشعار، ابیات اور منفرد اشعار کی تعداد ۴۴ ہے۔ اس طرح سے ۱۰۷+ ۳۲+۴۴ = ۱۸۳ اشعار ہیں۔ (ح ن)

مختلف علاقوں میں منعقدہ مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔

معلّم کا دیوان "کاخِ سخن" کے نام سے ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء مطبع آگرہ اخبار میں قاضی محبوب بیگ مالگذار شہر بلاس پور کی فرمائش پر اور ارا کین اسلامیان کمیٹی جاٹاپارہ بلاس پور کی خواہش پر خواجہ صدیق حسین کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

ڈیمائی سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل "کاخِ سخن" میں ۱۵۵ غزلیں ردیف وار مرتب ہیں۔ صفحہ ۹۵ پر مولانا کافیؔ مرحوم کی غزل پر اور صفحہ ۹۷ پر رِندؔ کی غزل پر تضمین ہے۔ اسی صفحہ پر دیوان ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۹۸ سے ۱۱۲ تک قطعات تاریخ اور تقریظات ہیں۔ "کاخِ سخن" کی تکمیل پر ملشی عثمان، عبدالمجید مجیدؔ، اسماعیل شمسؔ، عبدالغفور فروغؔ، جگن ناتھ پرشاد، شرف الدین شرفؔ، عبدالرحیم واعظؔ، علی شیر احسنؔ، تراب محمد ترابؔ، غلام حسین صولتؔ، عبدالسبحان سبحانؔ، عبدالعزیز عزیزؔ، عبدالقادر قادرؔ، شیخ عبداللہ، عبدالحق بنگوری، محمد علی قیصرؔ، محمد امین شیداؔ مانک پوری، عبدالعلیم شررؔ سکندر آبادی، اور عبدالحسین وغیرہ ۲۰ شعراء نے قطعات تاریخ کہے ہیں جو اس دور میں معلّم کی مقبولیت کا مظہر ہیں۔(۱)

"کاخِ سخن" کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک نعت ہے اور اس کے بعد جارج پنجم کے شکریہ کے طور پر ایک قصیدہ ہے۔ اس دور کے معاشی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر حاکم وقت کی خوشنودی کے لیے بہ طور توصیف و تعریف کا رویہ معلّم کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کی صدق دل سے حمایت کرتے رہے ہوں جیسا کہ ذیل کے اشعار برطانوی حکومت کے تئیں ان کے اخلاص و وفا کا مظہر ہیں:۔

جب تک کہ ہے آفتاب روشن — جب تک کہ ہے ماہتاب روشن
سیّاروں میں روشنی ہے جب تک — اشجاروں میں تازگی ہے جب تک
جب تک کہ شمیم ہے گلوں میں — جب تک کہ عشق ہے بلبلوں میں

---

(۱) سید عبدالعزیز معلّم سنبل پوری، کاخِ سخن مطبوعہ ۱۹۱۳ء، ص ۹۸ — ۱۱۲

قائم رہے تاج و تخت تیرا
دائم رہے جاہ و بخت تیرا[1]

"کاخ سخن" میں معلم کے کلام کی ترتیب ذیل کے گوشوارہ سے واضح ہو سکتی ہے:۔

ردیف	تعداد غزل	صفحہ	ردیف	تعداد غزل	صفحہ
الف	۲۶	۱ — ۲۱	ص	۱	۴۳ — ۴۴
ب	۳	۲۲ — ۲۳	ض	۲	۴۴ — ۴۵
پ	۱	۲۳ — ۲۴	ط	۲	۴۵ — ۴۶
ت	۲	۲۴ — ۲۵	ظ	۲	۴۶ — ۴۷
ث	۳	۲۵ — ۲۷	ع	۲	۴۷ — ۴۸
ج	۲	۲۷ — ۲۸	غ	۲	۴۹
چ	۱	۲۹	ف	۲	۵۰
ح	۳	۲۹ — ۳۱	ق	۲	۵۱ — ۵۲
خ	۱	۳۱	ک	۲	۵۲ — ۵۳
د	۵	۳۲ — ۳۵	ل	۹	۵۳ — ۵۹
ذ	۲	۳۵ — ۳۶	م	۱	۵۹
ر	۵	۳۶ — ۳۹	ن	۲۳	۶۰ — ۷۳
ڑ	۱	۳۹ — ۴۰	و	۶	۷۳ — ۷۶
ز	۲	۴۰ — ۴۱	ہ	۵	۷۶ — ۷۸
س	۲	۴۱ — ۴۲	ے	۱۷	۷۸ — ۹۵
ش	۲	۴۲ — ۴۳	ی	۶	۸۱ — ۹۵
کل غزلوں کی تعداد					۱۵۵

(۱) کاخ سخن: ص ۵

محمد ابن شیدا مانک پوری نے کاخ سخن پر اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے :-

"میں تصنیف اور صاحب تصنیف کی بے جا مدح سرائی کرنا پسند نہیں کرتا .... مگر اس کہنے میں مجھے ذرا باک نہیں کہ جو ماہر فن اس دیوان پر منصفانہ نگاہ ڈالے گا وہ بے اختیار مصنف کی خدا داد قابلیت کی داد دے گا۔ میں نے اس دیوان کو غائر نگاہوں سے دیکھا ہے اور بخوبی سیر کی ہے ۔ بے شبہ کاخِ سخن کا خوشنما دامن ہر رنگ کے شاداب پھولوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے جس کی مختلف مگر دل آویز خوشبوؤں سے دماغ معطر ہو جاتا ہے اور یہی دل چاہتا ہے کہ گھنٹوں اس سیر سے لطف اٹھاتا رہے۔"(۱)

معظم کے یہاں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ ان کی جودت طبع اور روانی کی بنا پر غزل کہتے وقت ایک ایک غزل میں کئی کئی حسن مطلعے کہتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح ردیف الف میں حمد باری تعالیٰ ۱۳ اشعار پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے پانچ مطلعے کہے ہیں۔(۲)

نمونۂ کلام:

کھلا شاخ قلم سے کیا شگوفہ حمد یزداں کا — الف الحمد للہ کا ہے ثمرہ نخل ایماں کا
میں خود معجز بیانی سے ہوا تلمیذ رحماں کا — صحیفہ سمجھے معنی فہم صفحہ میرے دیواں کا
بھلا حمد خدا میں کیا ہے منہ لسّانِ انساں کا — نہ کنہ ذات سبحاں تک رسا ہو فہم سبحاں کا
زباں رکھتا ہے گویا گرچہ ہر موجسم انساں کا — مگر ہو شکر کس منہ سے خدا کے بذل احساں کا

صراطِ عشق پر ثابت ہوں شاکر ہوں میں احساں کا
جزا میں اس عمل کے بس گراں پلہ ہو میزاں کا

دم اعجاز معظم دم تقریر دکھا — ید بیضا کی طرح شعر میں تنویر دکھا
گرئ طبع خدا داد کی تاثیر دکھا — شررِ طور کی ہر شعر میں تنویر دکھا

---

(۱) کاخ سخن: ص ۱۰۶

(۲) کاخ سخن: ص ۵

کر کے دل سلسلۂ شعر میں تسخیر دکھا　　　سحر دلکش کی مضامین میں تاثیر دکھا
خامۂ تیز رواں جو ہر تحریر دکھا　　　خطِ تیغی میں خطِ سایۂ شمشیر دکھا
کربلا کا تو مرقع دم تقریر دکھا　　　ہر سخن میں غم شبیّر کی تصویر دکھا
جوشِ وحشت میں نہ حدّاد تو زنجیر دکھا　　　ہاں مگر شانہ کی مجھے زلف گرہ گیر دکھا
عرش دکھلا تو جناں کی مجھے تعمیر دکھا
یاالٰہی کلسِ روضۂ شبیّر دکھا[1]

معلّم کے مذکورہ بالا اشعار میں 'دمِ اعجاز' اور 'یدِ بیضا' جیسی تلمیحات آئی ہیں۔ ان کی شعری لفظیات میں ادب اور مذہبی رچاؤ کا تقدس اور تغزل صاف جھلکتا ہے جو مندرجہ ذیل لفظیات سے واضح ہوتا ہے:

شاخِ قلم، شگوفہ، حورِ یزداں، نخلِ ایماں، معجز بیانی، تلمیذِ رحماں، ذاتِ سبحاں، بذل و احساں، صراطِ عشق، حبِّ احمدِ مختار، شربتِ دیدار، دلِ بیمار، جسمِ زار، ابروئے دلدار، قوسِ کعبہ، دستارِ فضیلت، قصرِ آسماں، یدِ بیضا، گرمئ طبع، سلسلۂ شعر، سحرِ دلکش، خامۂ تیز، خطِ تیغی، سایۂ شمشیر، غمِ شبیّر، جوشِ وحشت، زلف گرہ گیر اور کلسِ روضۂ شبیّر وغیرہ لفظیات فارسی تراکیب سے مزیّن ہیں اور ان سے معلّم کی شاعری میں اسلوب کی دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

ان کی سلاستِ بیان کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:۔

تو مرا شاہ میں تیرا گدا خداوندا　　　میں ترا بندہ تو مرا خدا خداوندا

میں تھا بیمارِ زلف و چشمِ احمد مرے نسخہ میں　　　رگِ سنبل عروقِ نرگس بیمار رہنا تھا

چاکِ سینہ ہے مرا مطلعِ صبحِ محشر　　　داغِ خورشید سے مشرق ہے بنا دل اپنا
شمع رو دیجئے پروانگی پروانہ صفت　　　مدعا عرض کروں بر سرِ محفل اپنا

---

(۱) کاخِ سخن: ص ۱۰

ہم نے حد سے بھی فزوں گوہر دنداں دیکھا — سرخیٔ لعل سے بڑھ کر لبِ جاناں دیکھا
زخم پر مرہم زنگار کو گریاں دیکھا — خندہ زن شورِ جراحت پہ نمکداں دیکھا
نافۂ مشک کجا سیرے کا معدن سمجھا — حلقۂ زلف میں جب جلوۂ افشاں دیکھا

غم نہیں دو پھول مرقد پر نہ اس گل نے چڑھائے — میری تسکین کو چراغِ گور تو گل ہو گیا

ماہ ہے اس مہروش کے آگے ایسا بے فروغ — بے ضیا جس طرح سے پیشِ مہِ تاباں ہے شمع

عارضِ گلرنگ جاناں کی مجھے کافی ہے دید — سیر کرنے گلشنِ کشمیر کی حاجت نہیں

معلّم نے "در بغل" کی ردیف میں جو غزل کہی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دھجیاں دامن کی جیب دشت جنوں میں اڑ گئیں
بھاگا مجنوں داب کر جیب و گریباں در بغل
میکدہ کے پاس آکر یوں بسے شیخِ حرم
جیسے جا معقول پائے نفسِ شیطاں در بغل
زہد اور اسلام بھاگے ہم بغل ہو کر وہیں
آگیا جب وہ عدوئے دین و ایماں در بغل
شاہد ابیات و معشوقِ مضامیں کے سبب
رکھتے ہیں دیواں معلّم کا سخنداں در بغل

راقم الحروف کو کارِ سخن کا جو نسخہ دستیاب ہوا ہے اس کے صفحہ ۶۰ پر ردیف "نون" کا مطلع ثانی ہے ؎

غمِ رسول میں آنسو بہانے والا ہوں — میں مفت قیمتی گوہر لٹانے والا ہوں

جس پر جان محمد دردؔ مرزا پوری نے اپنے قلم سے اس طرح تصحیح کی ہے؎

غمِ رسولؐ میں آنسو بہانے والا ہوں — بہت ہی قیمتی گوہر لٹانے والا ہوں

معلمؔ کا شعر ہے ؎

رگڑ کے سنگِ درِ مصطفےٰؐ پہ اپنی جبیں نوشتہائے مقدر مٹانے والا ہوں

اس شعر کی اصلاح دردؔ نے یوں کی ہے:

رگڑ کے سنگِ درِ مصطفےٰؐ پہ اپنی جبیں میں اپنی قسمتِ خفتہ جگانے والا ہوں

نوشتہائے مقدر مٹانا ناممکنات میں سے ہے۔ قسمتِ خفتہ جگانے میں معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ اسی غزل کا مقطع ہے ؎

وہ لاکھ روٹھیں معلمؔ تو مجھ کو کیا ہے غم میں پاؤں پڑ کے نبیؐ کو منانے والا ہوں

دردؔ نے اس کی اصلاح یوں کی ہے:

وہ روٹھ جائیں معلمؔ یہ شوق ہے اپنا میں پاؤں پڑ کے نبیؐ کو منانے والا ہوں

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اسقام کتابت کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ دردؔ مرزاپوری معلمؔ کے استاد نہیں رہے ہیں۔ قلمی تحریر کافی بعد کی ہے۔

معلمؔ نے ردیف "پانی" میں ایک غزل کہی ہے جس کے اشعار تہہ دار معنویت اور عصری حسیت کے حامل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جوشِ گریہ میں جب آنکھوں نے اچھالا پانی بحر سیراب ہوئے پا گیا نالا پانی

آہ و نالوں نے جو آنکھوں سے نکالا پانی ابر و طوفاں اٹھا کرنے لگا ژالا پانی

ساقیا خشک ہیں لب جلد پلا لا پانی مے نہ دیتا ہے تو دے ایک پیالا پانی

نہیں معلوم مرے دل کو چرایا کس نے ڈاکو اور چور تو بھیجے گئے کالا پانی

عکس جب عارضِ رنگیں کا معلمؔ پڑ جائے
ہو وے غیرت سے چمن میں گلِ لالہ پانی

کارِ سخن میں معلمؔ کا کہا ہوا ایک دوہا بھی ملتا ہے جس میں انھوں نے عشقِ رسولؐ کے جذبہ کا اظہار کیا ہے جس میں دو مصرعے پوربی کے اور دو مصرعے اردو کے ہیں:

یثرب وا کے دید کے کارن جیسرا تڑپت جائے
ہند میں رہ کر پردیسی یہ درشن کیونکر پائے

ہے تماشۂ کونین کے دروازہ پر بہرِ تعظیم میں سر اپنا جھکاؤں کس دن

کس کے کرم ہیں ایسے پاوے ویسے گرو کا آسیس
ہرے جیسے اس کے در پر لاکھوں نوائے سیس

معلم ایک پرگو شاعر تھے۔ حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور بذاتِ خود تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں کئی چیزیں گراں گذرتی ہیں۔ کئی جگہ انھوں نے جمع کی بجائے جمع الجمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

سیاروں میں روشنی ہے جب تک — اشجاروں میں تازگی ہے جب تک (ص ۳)
سیاروں کی گردشوں میں تو ہے — اشجاروں کی حکومتوں میں تو ہے (ص ۱)

معلم نے 'کہلانا' کی جگہ 'کہاکر' استعمال کیا ہے ؎

مرے آقا محمد مصطفےٰؐ ہیں اے معلم یں — غلام ان کا کہا کر اور کا کہلا نہیں سکتا
(ص ۷)

پہچان کی جگہ پچھانت کا استعمال کیا ہے/ املا کا فرق ؎

طریقے سے پچھانت کے جو خود کو جان جاتا ہے
خدا کی ماہیت کو بس وہی پہچان جاتا ہے (ص ۸۹)

'کاخِ سخن' میں معلم نے صنعتِ توشیح کا استعمال چار غزلوں میں کیا ہے؛

(۱) غزل بر صنعتِ توشیح کہ از ہر سر مصرع جیم و از ہر پائے مصرع حائے حطی نمودار گردد۔ مثلاً؛

جلوہ جو اس نے اپنا دکھایا علی الصبح — دریائے نور جوش میں آیا علی الصبح
(ص ۳۰)

(۲) غزل در صنعت توشیح کہ ہر سر مصرع خائے معجمہ بر می آید۔ مثلاً؛

خواہش نہ خلد کی نہ جناں کی ہوا پسند — ہے باغِ کوئے یار کی ہم کو فضا پسند

خواہش نہ حور کی نہ جناں کی ہوس مجھے　　مرغوب تو ہے اور ترا کوچہ ہوا پسند

خامۂ معلّم آج تیرا شاخ گل بنا
نقش و نگار گل ہے ہر اک دلربا پسند　　(ص ۴۴)

(۳) غزل در صنعت توشیح - اس میں بارہ اشعار ہیں۔ ہر شعر کے مصرع اوّل کے آغاز کے حروف بالترتیب جوڑ دیئے جائیں تو "سید عبدالغفور" اور مصرع اول کے آخر کے بالترتیب حروف سے " قادر خاں صاحب " اور مصرع ثانی کے آغاز کے حروف کی ترتیب سے " شیخ داؤد صاحب " بنتا ہے۔

معلّم کے یہاں درد و گداز اور نغمگی کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے اشعار ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں صنائع و بدائع کا استعمال بھی نہایت بے تکلفی کے ساتھ کیا ہے۔ جو اس دور کی اردو شاعری کے لیے باعث فخر سمجھے جاتے تھے۔

عبدالرحیم احسن

(ولادت ۱۸۵۴ء　　وفات ۱۹۳۶ء)

نام سید عبدالرحیم تخلص احسن۔ ولد مولوی عبدالکریم ۱۸۵۴ء میں اُڑیسہ کے ادبی اور علمی مرکز سونگڑہ میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی میں احسن کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ قطعات تاریخ کہنے میں احسن کو دست کمال حاصل تھا۔ کائی پدر میں شاہ نصیر جلال الدین بخاری کے مزار پر ایک کتبہ میں احسن کی ایک طویل منقبت درج ہے، بالو بیسی کے منشی غلام رسول کی وفات پر، عباس علی صوبے دار کی وفات پر، نوادہ کی مسجد کی تاریخ بنا پر، ملکہ وکٹوریہ کے جوبلی دربار کی تاریخ پر، جگن ناتھ پور سونگڑہ کی مسجد کی تاریخ بنا پر، جاگیردار منشی روشن محمد کی وفات پر، خاں صاحب سید غلام جیلانی کی وفات پر، بھدرک

کے زمین دار عبدالغنی عرف پنچو میاں کی وفات پر، جیرام پور کے حاجی ضامن علی ابن غلام جہانیاں کی وفات پر عبدالرحیم احسن کے کہے ہوئے قطعات تاریخ راقم الحروف کو دستیاب ہوتے ہیں۔ اپنی وفات سے ۹ ماہ قبل احسنؔ نے راقم الحروف کی ولادت پر مظفر اقبال کے تاریخی نام سے موسوم کیا تھا۔

مؤلف "آبِ خضر" نے احسنؔ سے متعلق لکھا ہے:

"عبدالرحیم احسنؔ (متوفی ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء)، عرصۂ دراز سے سونگڑہ اڑیسہ میں اردو فارسی کے کلچر کا مرکز رہا ہے۔ عبدالرحیم احسنؔ اسی سونگڑہ کی علمی فضا کی پیداوار ہیں۔ آپ کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ کٹک اور سونگڑہ میں موجود ہے۔ آپ کا کلام مجھے عرفان علی فدائی سونگڑوی کی بیاض سے ملا ہے۔"(۱)

نمونۂ کلام:

آمد و شدِ نفس کے ہے مدارِ زندگی ۔۔۔ کیا ٹھکانہ اس کا کیا ہے اعتبارِ زندگی
او گلِ تازہ دو روزہ حسن پر اپنے نہ پھول ۔۔۔ جادۂ مہلت سے خارج ہے بہارِ زندگی
تھے بہت خوش حال جب ملکِ عدم میں تھے مقیم ۔۔۔ پڑگئے جنجال میں ہم زیر بارِ زندگی
وہ تنک مایہ ہیں جن کو منزلت کا شوق ہے ۔۔۔ ہیچ ہے دنیا میں رہ کر افتخارِ زندگی
بارور ہوتے کبھی دیکھا نہیں نخلِ امید ۔۔۔ پھول سے محروم ہے اک مشتِ خارِ زندگی

فضلِ حق سے ہے مجھے کونین کی دولت نصیب
اس سے افضل اور کیا ہے یادگارِ زندگی

عبدالرحیم احسنؔ کے اکثر اشعار ایسے ہیں جو وجدان کو متاثر کرتے ہیں۔ جاذبیت، دلکشی اور تازگی سے لبریز ہیں۔ حُسنِ بیان اردو شاعری کا بڑا سرمایہ ہے جو احسنؔ کے یہاں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ احسنؔ کے مزاج میں جو قناعت اور درویشی ہے وہی اردو شعروادب کے مزاج کا لازمہ ہے۔ پیش نظر غزل کے مقطع میں احسنؔ نے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔ فضل حق ان کے فرزند ارجمند کا نام بھی ہے۔ اس رعایت سے

---

(۱) کرامت علی کرامت، آبِ خضر مطبوعہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۶

شعر کا رخ معنی قریب اور معنی بعید دونوں کی طرف مساوی ہے۔

کرامت علی کرامت نے لکھا ہے کہ "اڑیسہ کے شعرائے قدیم کی نعتیہ غزلیں بھی عام طور پر ان کی زندگی کے ذاتی تجربات کی پیداوار ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ احسنؔ کا گھر جل گیا تھا۔ جلتے ہوئے گھر کو دیکھ کر شاعر کی زبان سے یہ نعتیہ شعر بے ساختہ نکلا:

سوزشِ عشقِ احمد سے گر آگ لگی لگ جانے دو
دوستو ابرِ دیدۂ تر سے اشک کا مینہ برسانے دو " (۱)

عبدالرحیم احسنؔ کا شعری سرمایہ غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ قلمی نسخوں میں ان کی چند غزلیں اور "آبِ خضر" میں تین غزلیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی نعتیہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خاک پائے مصطفیٰؐ گر ہاتھ آجائے مرے
طاق پر رکھ دوں میں سیم و زر کو اور اکسیر کو

مصحفِ عارض کا رہتا ہے مجھے ہر دم خیال
قاریو پڑھتا ہوں میں والشمس کی تفسیر کو

زلف کا دیوانہ ہوں، دیکھو ہوتی بیعت نصیب
ہتھکڑی سے ہاتھ کو اور پاؤں سے زنجیر کو

دل ہوا ہے آپ کی مژگاں و ابرو کا شکار
یا نبیؐ فتراک میں رکھ لیجے اس نخچیر کو

سید عبدالستار عبدؔ

(متوفی ۱۹۳۶ء)

نام سید عبدالستار تخلص عبدؔ ولد سید عبدالغنی۔ بالیسر میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت کا پتہ نہ چل سکا۔ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے بالیسر ضلع اسکول سے انٹرنس پاس کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ ــ ۱۶ سال کی رہی ہوگی۔ اس طرح سے سنہ ولادت ۱۸۹۳ء

---

(۱) آبِ خضر: ص ۴

کے آس پاس ہونا چاہئے۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں کلکتہ کے پریزیڈینسی کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ پرائمری سے انٹرنس تک وظیفہ پاتے رہے۔ گریجویشن کے بعد ہائی اسکول میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ بعد میں کلکتہ یونی ورسٹی سے پرائیوٹ طور پر فارسی اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں عارضی طور پر راونشا کالج میں اردو کے لکچرر رہے۔

عبدالستار عبدؔ کے دادا مولوی سید افاض الدین چٹاگانگ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے مولوی پاس کرنے کے بعد آکر مستقل طور پر بالیسر میں قیام پذیر ہوئے۔ عبدالستار عبدؔ کے بھائی حاجی سید عبدالجبار شہر بالیسر کے بزرگ وکیل اور رئیس ہیں۔

۱۹۳۴ء میں عبدؔ کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ ستار' یا 'بہارِ عزیزی' کے نام سے ڈیمائی سائز کے ۳۲ صفحات پر کمالی پریس بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ میں شائع ہوا۔ مذکورہ کتاب کے صفحۂ ثانی میں عبدؔ نے لکھا ہے؛

"حضرات والاصفات کی خدمتِ فیض درجت میں گذارش خاکسار پریشان روزگار یہ ہے کہ بندۂ احقر نہ ناظم ہے نہ ناشر۔ فقط دل کی امنگ تھی کہ بذریعہ قلم صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہوگئی ...... لہٰذا ہر جگہ پر لغزش ہی لغزش اور لطف کیفیت کچھ بھی نہیں۔"(۱)

'نغمۂ ستار' میں سید عبدالستار عبدؔ کی چالیس نعتیہ غزلیں اور کتاب کے آخر میں 'مناجات عبدؔ' کے عنوان سے دس بند پر مشتمل ایک مناجات درج ہے۔

انیسویں صدی میں اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کا خاصہ فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ لوگوں کے انداز نظر اور طرز فکر میں تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں اور شعراء کے کلام میں مذہبی رچاؤ پر تغزل کا رنگ حاوی ہو رہا تھا۔ عبدؔ کا قیام تعلیمی سلسلہ میں طویل عرصہ تک کلکتہ میں رہا۔ وہاں انھیں اردو شعراء و ادباء کی صحبت نصیب ہوئی ہوگی۔ ان کا کلام سادگی اور پرکاری کا مجموعہ ہے۔ ان کی مناجات کے چند بند بطور نمونہ

---

(۱) سید عبدالستار عبدؔ ؛ نغمۂ ستار مطبوعہ ۱۹۳۴ء ؛ ص ۲

ملاحظہ فرمائیں؛

عاجز ہیں اور پریشاں کر رحم یاالٰہی — تو ہے کریم و رحماں کر رحم یاالٰہی
بندے ہیں ہم تو سلطاں کر رحم یاالٰہی — ہر درد کا تو درماں کر رحم یاالٰہی
کر رحم یاالٰہی، کر رحم یاالٰہی

خلقت ہے ساری یکساں تیری نظر میں یزداں — ہے سب پہ تو مہرباں پر سخت تیرا فرماں
ہر اک کا تو نگہباں، کافر ہو یا مسلماں — تیرا ہے ہم پہ احساں دے ہم کو امن و اماں
کر رحم یاالٰہی، کر رحم یاالٰہی

کوئی عیش کر رہا ہے تجھ سے مکر رہا ہے — کوئی غم میں مر رہا ہے دم تیرا بھر رہا ہے
تو صاحبِ ورا ہے اور نور سے بھرا ہے — تو ربّ دوسرا ہے تیرا ہی آسرا ہے
کر رحم یاالٰہی، کر رحم یاالٰہی

تو رہبروں کا رہبر سب سروروں پہ سرور — ہے تو غریب پرور تیرا ہے حکم برتر
باطن تو اور ظاہر ہر راز سے تو ماہر — بیکس ہیں ہم و مضطر کر فضل اپنا ہم پر
کر رحم یاالٰہی، کر رحم یاالٰہی

رکھ دین کی تو عزت مومن پہ بھیج رحمت — کر دور رنج و زحمت اے چشمۂ عبادت
اسلام پر ہے آفت دشمن پہ دے تو نصرت — تیری عجیب قدرت کرتے ہیں تجھ سے منت
کر رحم یاالٰہی، کر رحم یاالٰہی

آزاد کر اے قادر ہم کو تو قید غم سے — رکھیو نگاہ مولا ابلیس کے ستم سے
سرزد نہ سرکشی ہو ہرگز الٰہی ہم سے — عزت بچا ہماری محشر میں تو کرم سے
کر رحم یاالٰہی، کر رحم یاالٰہی

عبدؔ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

عاشق کو تو نے اپنا جلوہ دکھا کے مارا — دیوانہ وار بے خود در در پھرا کے مارا
جنگل میں لا کے ڈالا کہسار پر چڑھایا — لیلیٰ کی جستجو میں مجنوں بنا کے مارا
اے شمع رو نہ چھوڑیں جل کر بھی تیرا سایہ — گرچہ ہمیں ستم سے ناحق ستا کے مارا
بخشی کسی کو تو نے دنیا کی جاہ و دولت — خستہ جگر کو ہر دم تنکے چنا کے مارا

یہ عبدؔ کی شاعری کا تہذیبی پہلو ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا مشرقی اڑیسہ میں عبدالمجید بھونیاں حیاؔ کے بعد عبدالستار عبدؔ نے اردو شاعری کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اشرف علی کٹکی

اشرف علی کٹکی کے والد کا نام سید احمد علی تھا۔ خاندانی طور پر موضع گجپور متعلقہ بالوبیسی ضلع کٹک کے قدیم باشندہ تھے۔ اشرف علی کٹکی نے ۱۹۰۲ء میں کلکتہ کے برکتی پریس سے ۴۰ صفحات پر مشتمل ایک شعری گلدستہ 'اشرف انجمن' حصہ اول اور 'اظہار العشق' حصہ دوم شائع کیا تھا جس کا ایک قدیم نسخہ راقم الحروف کو کشنانند پور بالوبیسی کے شیخ تجمل علی فہمی کے توسط سے دستیاب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ کتاب کا پہلا فارم یعنی صفحہ ا سے صفحہ ۸ تک کلکتہ کے برکتی پریس میں طبع ہوا اور صفحہ ۹ سے ۳۸ تک کی کتابت میں بھی خاصہ فرق اور شستگی ہے۔ اشرف انجمن کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔

'اشرف انجمن' حصہ اول میں کل ۴۵ غزلیں شریکِ اشاعت ہیں جن میں ۱ سے اشرف علی کی ۴، اظہار علی کٹکی کی ایک اولاد مرتضیٰ کٹکی کی دو غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ باقی غزلیں اردو کے چند معروف وغیر معروف بیرونی شعراء کی ہیں۔

حصہ دوم 'اظہار العشق' میں اشرف کی چار ٹھمریاں اور ایک غزل کے علاوہ اولاد مرتضےٰ کٹکی کی ایک غزل اور دعائے خاتمہ ہے۔

اس طرح مذکورہ گلدستۂ سخن میں اشرف علی کٹکی کی کل پانچ غزلیں اور چار ٹھمریاں درج ہیں۔ اشرف کو یقیناً موسیقی سے دلچسپی رہی ہوگی اور اس شوق کے تحت جن جن شعراء کا کلام ان کے پاس رہا ہوگا۔ اپنے احباب کے اصرار پر (جیسا کہ دیباچہ مظہر ہے[1]) انھیں یک جا کر کے شائع کر دیا۔

اشرف علی کے مختصر حالات کے علاوہ اولاد مرتضیٰ کٹکی اور اظہار علی کٹکی

---

[1] اشرف علی کٹکی: اشرف انجمن مطبوعہ ۱۹۰۲ء، ص ۲

کے حالات کا کوئی سراغ نہ مل سکا نہ ان کی مزید کوئی تخلیق دستیاب ہوسکی۔ اشرف المین اور اظہار العشق میں سے تینوں حضرات کا جو کچھ کلام دستیاب ہوسکا پیش خدمت ہے۔ سب سے پہلے اشرف کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیوں نہ تڑپے دل بکوئے یار میں (کذا) ہیں گذرتے رات دن تکرار میں
بے قراری دل کی کہتا ہوں میں جب تب ہیں کہتے صبر کر اس کار میں
اے صنم تجھ کو خدا کی ہے قسم نیم جاں ہوں عشق کے آزار میں

ہے دوا داد جگر اشرف کا یہ
رکھ سمیٹ کر غنچۂ دیدار میں

مطلع میں اشرف نے کوئے یار کی جگہ بکوئے یار استعمال کیا ہے اور آخر میں 'میں' لے آئے ہیں۔ دوسرے شعر کے آخری مصرع میں جنس تانیث استعمال کیا ہے جس سے ذہنی سطحیت آشکارا ہے۔ چوتھے شعر کے مصرع اول میں دوا کے لئے 'کا' استعمال۔ ان تمام اسقام کے باوجود اواخر انیسویں صدی میں اڑیسہ کے مضافات میں اردو کی شکل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اشرف کے اشعار اور انداز بیان سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے رہے ہوں گے۔ لیکن معمولی شدھ بدھ کے ساتھ انھوں نے جو اشعار کہے ہیں اردو شاعری کی طرف ان کی دلچسپی اور اردو کے عوامی اثرات کے پھیلاؤ کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

اشرف علی کی ٹھمری کا نمونہ ملاحظہ ہو:[1]

سکھی ری موری من میں لگی ہے کھٹکی

انترا:

سپن میں موری آئے جو پیا لگے چومنے موری ہونٹکی۔ سکھی ری
چھاتیاں موری پکڑ دھری موری ایسی جوری گئیں ٹلکی۔ سکھی ری
سدھ بدھ موری نا رہی تھوڑی چٹ کر ڈالیں بھوئیں پٹکی۔ سکھی ری
گھگریا کھولے پیا رنگیلے رس رنگ رچاتے اشرف کٹکی۔ سکھی ری

---

(۱) اظہار علی کٹکی: اظہار العشق حصہ دوم: مطبوعہ ۱۹۰۴ء: ص ۳۴

سنیاں موری آج مانو تھوڑی بتیاں

انترا:

کا ہے روستے ہو مو کے جلاؤتے ہو — تم بن کیسے کاٹوں رتیاں ۔ سنیاں
منتی کرت ہوں پیاں پڑت ہوں — اشرف پیا لگو موری چھتیاں ۔ سنیاں

پیا چھائے رہے مدھوبن میں — کیوں نہ آگ لگے مورے تن میں ۔ پیا چھائے...
پیا سے بس نہ چلت ہے — ہوک اٹھت مورے تن میں ۔ پیا چھائے...
دیوار ہمارے جوبنا تکت ہیں — کیسے پھروں آنگن میں ۔ پیا چھائے...

مذکورہ بالا ٹھمریوں سے پتہ چلتا ہے کہ اشرف جے دیو، ودیاپتی اور بہاری سے متاثر ہے اور گیت گوند میں رادھا اور کرشن کے مابین عشق و محبت کے رموز و علامات سے بھرپور جو کیفیت ملتی ہے اس کی جھلک اشرف نے اپنی ٹھمریوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جسے جنسی اور جذباتی شاعری کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

اظہار علی کٹکی

اظہار کے حالات کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ اشرف انجمن حصہ اول مطبوعہ ۱۹۰۴ء میں اظہار کی صرف ایک غزل ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تخلیق دستیاب نہیں ہے۔ ان کے ہم عصر شعراء اشرف علی کٹکی اور اولاد مرتضیٰ کٹکی کے مقابلہ میں اظہار کے کلام میں پختگی اور ان کے اسلوب میں شائستگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نمونہ کے طور پر ان کی غزل ملاحظہ ہو:

یہ کس کی زلف کی ناگن نے اے دل مار ڈالا ہے
کہ کوسوں تک میری تربت پہ پھیلا کوڑیالا ہے

زمانہ کو صنم لہرا کے یک دم مار ڈالا ہے
بڑھائی ہے یہ ایک کاکل کہ تو نے سانپ پالا ہے
گرایا مصحفِ عارض کو ہم صورت کی نظروں سے
بجا ہے اے صنم خطِ سیاہ کا منہ جو کالا ہے
کیا ہے تازہ نخلِ غم کو ٹھنڈی سانس بھر بھر کے
بڑی محنت سے میں نے یہ شجر جاڑے میں پالا ہے
بہارِ باغ ہے چشم و خط و زلف و رخِ تاباں
وہ نرگس ہے وہ ریحاں ہے وہ سنبل ہے وہ لالہ ہے
خیالِ گیسوئے شبگوں سے رہتا ہے یہ دل روشن
اندھیرا جس کو کہتے ہیں بھرے گھر کا اجالا ہے
اے اظہار کرتا ہوں ذرا ہنس کے کہو پیاری
کہاں سے تم نے یہ ہر وقت کا غصہ نکالا ہے (۱)

جان محمد حازم

متوفی ۱۹۴۱ء

کرامت علی کرامت جان محمد حازم کے بارے میں لکھتے ہیں:
"منشی جان محمد حازم (متوفی ۱۹۴۱ء) آپ مولوی محمد حسن کے خلیفہ محمد سلطان صاحب راجی کے شاگرد تھے۔ "گلدستۂ گلزار" ایک کتاب مطبوعہ ۱۳۸۳ھ یا ۱۹۲۰-۲۱ عیسوی میں آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے۔"(۲)

---

(۱) اشرف علی کشکی: اشرف انجمن حصہ اول مطبوعہ ۱۹۰۴ء: ص ۲۴
(۲) آبِ خضر: ص ۱۶۶

حکیم عبدالرحیم راقم جو گیارہ سال کی عمر سے جان محمد حازم سے متعلق رہے اور ان کا زیادہ تر وقت حازم کی صحبت میں گذرا، ان کا بیان ہے کہ حازم کو اردو اور فارسی پر خاصی دسترس تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور عامل بھی۔ جان محمد حازم کے عہد میں کٹک کے بخشی بازار میں واقع گورنمنٹ پریس والی کوٹھی (جو ان دنوں ناخدا کوٹھی کہلاتی تھی) میں باقاعدگی کے ساتھ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جان محمد حازم ہر مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے اور لوگوں میں خاصے مقبول تھے۔

آب خضر میں گلدستۂ گلزار کا سنہ اشاعت جو ۱۳۸۳ھ درج ہے سہوِ کاتب ہے جس کا ثبوت مادۂ تاریخ کے مصرع سے فراہم کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

گلدستۂ گلزار کی کیا خوب ہے بہار — اشعار پر بہار ہیں سب اس کے گل عذار

مرغوب کیوں نہ ہووے گی عالم میں یہ کتاب — گل بوٹے اس کے خوب چکدار زیب دار

تاریخ کا خیال ہی حازم نے جب کیا

کیا خوب سنہ ہے تیرہ سو اڑتیس آشکار

راقم الحروف کو کرامت علی کرامت کے توسط سے 'گلدستۂ گلزار' کے آٹھ صفحات کا ایک جزء دستیاب ہوا ہے اور خالد رحیم کے توسط سے حازم کے دو نسخے دستیاب ہوتے ہیں جن میں سے ایک تو مطبوعہ ہے اور دوسرا حازم کا خود نوشتہ ہے۔ مؤخر الذکر سے حازم کا جو مطبوعہ نسخہ دستیاب ہوا ہے انداز کتابت اور تقطیع میں گلدستۂ گلزار سے جلی اور بڑا ہے۔ اس نسخہ کی سنہ طباعت کا پتہ نہیں چل سکا کیونکہ شروع کے ۱۴ صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔ صفحات ۱۵ سے لے کر ۳۰ تک خستہ حالت میں موجود ہیں لیکن اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اواخر انیسویں صدی یا اوائل بیسویں صدی میں شائع ہوا ہوگا۔ اس نسخہ میں حازم کے استاد مولوی سلطان راجی کی وفات پر ذیل کے عنوان سے ایک مرثیہ درج ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ صفحہ ۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۰ پر ختم نہیں ہوا بلکہ اگلے صفو/صفحات تک جاری رہا ہوگا اور اگلے صفحات نایاب ہیں۔ ویسے عبدالغفور کیسر پوری کے قطعۂ تاریخ کے مطابق مولوی سلطان راجی کا سنہ وفات ۱۳۱۴ھ ہے۔ اور حازم کے مجموعۂ گلدستۂ گلزار کا سنہ اشاعت ۱۳۳۸ھ ہے۔ سلطان راجی کی وفات پر حازم کے مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

روشنی جس سے وڑیسہ میں اٹھی یارو — آہ وہ چاند زمیں میں ہوا پنہاں افسوس
شرک وبدعت سے تھا معمور وڑیسہ بالکل — آپ آنے سے کئی پائے ہیں ایمان، افسوس
راہ حق دین نبی پر کئے قائم سب کو — کفر معدوم ہوا آپ سے ایک سال، افسوس
صابر وشکر میں تقویٰ میں نہ ثانی دیگر — اس طرح دیکھا نہ جاتا کوئی انساں، افسوس
انس وجن پیش ادب آپکے آتے تھے مدام — آہ وہ اٹھ گیا آداب کا ساماں، افسوس

اس طرح کوئی کہاں عالم وفاضل دیگر
جس کی تعریف ہوئی مکہ کے درمیاں، افسوس (۱)

مذکورہ بالا مرثیہ کے اشعار میں مستعمل حازم کی لفظیات میں اٹھی، غریباں، عالماں، مریداں، حکماں وغیرہ اڑیسہ کی اردو شاعری میں دکنی اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی اثرات کے تحت تانیث کی جگہ تذکیر کا استعمال بھی ہوا ہے۔ مثلاً آپ کا صورت وقد' 'شکر للہ کہ ان آنکھوں سے دیکھے صورت' یہاں دیکھی کے بجائے دیکھے استعمال کیا ہے۔

حازم کے اندر روایت پرست دینی جذبہ ہے اوران کے قصیدے، نعتیں اور قصیدے اسی روشنی پر گامزن ہیں۔ حازم نے اردو کے مرکز سے دور رہتے ہوئے بھی اپنے اردگرد کے ماحول سے رشتہ قائم رکھا ہے۔ لیکن ان کی زبان پر مقامی اڑیا زبان کا کوئی اثر نہیں ہے جس طرح ہمیں عبدالمجید بھونیاں حیا کی زبان میں نظر آتا ہے۔ اس کی خاص وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ شہر کٹک میں رہنے والے لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اڑیا بولنے سے عام طور پر گریز کرتے رہے ہیں بلکہ اڑیا زبان سمجھنے کے باوجود بولتے وقت اردو ہی بولا کرتے ہیں اور دور دراز مضافات میں بسنے والے لوگ اردو جانتے ہوتے بھی مقامی زبان سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اوران کی زبان پر مقامی زبان کے اثرات بڑی شگفتگی کے ساتھ در آئے ہیں اور گھل مل کر ان کی زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقاء میں ان تمام عناصر نے اہم رول ادا کئے ہیں۔ وسائل کی کمی کے باوجود اڑیسہ میں اردو شاعری کی قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔

---

(۱) اقتباس از مجموعۂ کلام حازم (کرم خوردہ نسخہ) صفحہ ۳۰

حازم کی مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

ابتر ہے حال میرا تو رحم کن رحیما
بندہ ہوں خاص تیرا تو رحم کن رحیما

بار گناہ سر پر بے حد ہوئی ہے یا رب
کب تک کہ غم رہوں سہتا تو رحم کن رحیما

جز تیرے در کے مولا جاؤں میں کس جگہ پھر
اور در کجا ہے میرا تو رحم کن رحیما

شیطاں کے مکر و فن سے رکھ باز مجھ کو یارب
حیراں ہوں اس سے مولا تو رحم کن رحیما

یارب یہ بندہ حازم سر کو جھکا کے ہر دم
کرتا دعا ہے ایسا تو رحم کن رحیما (۲)

محمد محسن

(متوفی ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۵ء)

نام محمد محسن اور تخلص بھی محسن، شمس الحق شمس معصوم پوری کے فرزند اور ظہور الحق ظہوری کے بھتیجے تھے۔ گھر پر عربی فارسی اور اردو کی تحصیل علم کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد کٹک کے راونشا کالجیٹ میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ پرائیویٹ طور پر بی۔ اے۔ پھر ایم۔ اے۔ کیا۔ راونشا کالج کٹک میں اردو اور فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد پبلک سروس کمیشن سے ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدہ کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا تو انھوں نے درس و تدریس کا شغل ترک کر کے سول سروس جوائن کیا۔ اس زمانہ میں کٹک کے کلکٹر مسٹر ایجرٹن تھے۔

کرامت علی کرامت نے لکھا ہے کہ:

"محسن نے ایجرٹن صاحب کی خدمت میں ایک طویل انگریزی قصیدہ بعنوان GLORY OF THE WEST طبع کر کے پیش کیا FULL MOON GLORIES

---

(۱) گلدستۂ گلزار، ص ۳۰

موصوف کی انگریزی نظموں کا ایک مختصر سا مطبوعہ مجموعہ ہے۔ موصوف نے قرآن شریف کی سورۂ فاتحہ اور سورۂ مزمّل کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ یوں تو محمد محسنؔ کا آبائی وطن قصبہ معصوم پور ضلع کٹک تھا۔ لیکن ان کی والدہ الہ آباد کی تھیں۔ محسن صاحب نے خود الہ آباد میں حیدر آباد کے ایک کلکٹر کی لڑکی سے شادی کی۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں وظیفۂ حسن خدمت لے کر تقریباً پانچ سال الہ آباد میں گذارے اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ خصوصاً الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ضامن علی کے زیر اہتمام اس اثناء میں جتنے بھی طرحی مشاعرے ہوتے ان میں بلا ناغہ انھوں نے شرکت کی۔" (۱)

محسنؔ کا خاندانی شجرہ

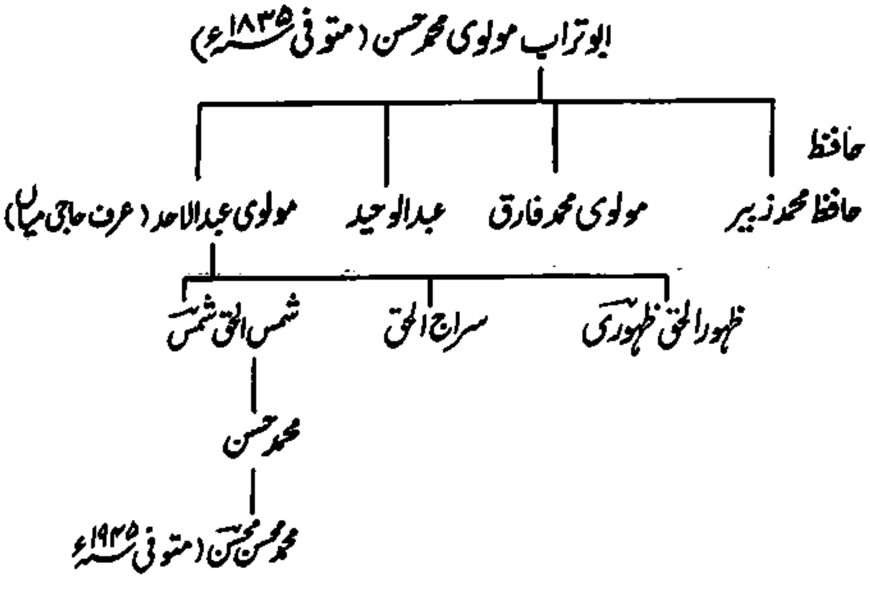

محسنؔ کے بھانجے مولوی عبدالمالک کے یہاں محسنؔ کی چند تخلیقات محفوظ تھیں

---

(۱) کرامت علی کرامت: "اڑیسہ کا نیّر تاباں، محمد محسن محسنؔ"؛ مطبوعہ ماہنامہ سب رس حیدرآباد؛ جنوری ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۱

لیکن ان کے گھر پر موجود کتابوں کے ذخیرہ میں راقم الحروف کو محسنؔ کے چند ذاتی خطوط کے سوا ان کا کوئی کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ ماہنامہ محشر بمبئی کے ایک شمارہ میں ان کی ایک طویل منقبت شائع ہوئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ محسنؔ کو زبان و بیان پر خاصہ عبور حاصل تھا اور قصیدہ کی زبان، لب و لہجہ اور آہنگ سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ مثال کے طور پر اس منقبت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

(حضرت امام حسینؓ کی یوم ولادت پر)

پھر مہِ نیمۂ شعباں ہے فلک پر تاباں — بخت پر اپنے ہے پھر یمن و سعادت نازاں
پھر ہوا عالمِ امکاں میں ترقی کا رواج — پھر ہر اک ذرۂ بے قدر بنا مہرِ جہاں
باغ اور راغ میں آثار نمو کا ہے نمود — نخل و بالیدگی میں ہو گئے محکم پیماں
دہر میں جوشِ مسرت سے ہے یہ محویت — دل سے کافور ہوا دغدغۂ سود و زیاں
باغِ عالم کی ہوا نے کیا مجھ پر وہ عمل — ہوا مسرور، ابھر ہی گئے دل کے ارماں
عالمِ قدس کی ہے سیر میرے مد نظر — طائرِ سدرہ سے تا سیکھ لوں اندازِ بیاں
فکرِ انشا ہے گو اک مرحلۂ جاں فرسا — لوں عطارد سے کتابت کے یہ سارے ساماں
شاخِ طوبیٰ کی ہے تجویز بہر خامہ — اور مرکب کے لئے مردمکِ حورِ جناں
عالمِ نور سے لوں عاریتاً کچھ تو بیاض — ہو وے قرطاس کا پھر مسئلہ مجھ پر آساں

ہے محمدؐ میرا محبوب، حسینؓ اس کی ہے جاں
جان جاں سے بھی ہے پیارا کوئی کہہ بالایماں (۱)

پیشِ نظر منقبت میں محسنؔ کے طرزِ فکر اور طرزِ ادا میں صوت و آہنگ کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ ان کی لفظیات میں عالمِ امکاں، ذرۂ بے قدر، مہرِ جہاں، باغ اور راغ، نخل و بالیدگی، دغدغۂ سود و زیاں، باغِ عالم، عالمِ قدس، طائرِ سدرہ، درسِ معنی، تلقین گہہ نیاز، فکرِ انشا، عطارد، شاخِ طوبیٰ، حورِ جناں، عالمِ نور، صفائے دل، اسپِ

---

(۱) محمد محسنؔ، قصیدہ مدحیہ بتقریب یوم ولادت حضرت امام حسین علیہ السلام، مطبوعہ ماہنامہ محشر بمبئی، بابت جنوری ۱۹۷۵ء

شجاعت، تمغۂ قرب، پاسِ ادب، رشکِ جہاں، عقبیٰ بوسی، عرصۂ دنیا، مرغانِ بہشتی وغیرہ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ محسن اپنے شاعرانہ وجدان کی پہنائیوں میں مست اور تخیل کی وسعتوں میں گم ہیں۔ ساتھ ساتھ مذہب وعقیدت کے اعلیٰ اقدار بھی میانہ روی کے ساتھ ان کے اشعار میں گھلتے جاتے ہیں۔ محسن نے جہاں حمد، نعت، منقبت کہی ہیں انھیں غزل گوئی پر بھی خاصی دسترس رہی ہے۔ ان کا شعری رویّہ صاف ستھرا اور کلاسیکل تھا۔ ان کے یہاں فکری بلندی اور حیرت آفریں انفرادیت ہو یا نہ ہو، ان کے اندازِ بیان میں تازگی اور شگفتگی کے ساتھ غزل کی جذباتی فضا قائم رہتی ہے۔ ان کا دھیما لہجہ، غزل کی لفظیات اور دلکش تراکیب، قدیم تہذیبی اور تمدنی روایت کو قائم رکھتے ہیں۔ صرف ان کے آخری دور کی چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہکشاں ہے وہ کہ گیسو پہ چنی ہے افشاں — خوب ساماں ہے یہ رہزنِ ایماں کے لئے
ارمغاں آبلہ پائی کا لئے پھرتے ہیں — وقفِ خدمت رہے ہیں ہم خارِ بیاباں کے لئے

خاک کے پتلوں سے امید نہ رکھو محسن
کنجِ مرقد ہی جگہ خوب ہے انساں کے لئے

دردوغم، رنج والم کی بھی رفاقت ہے خوب — راہرو کے لئے اک شانِ سفر دیتی ہے
لامکاں اپنے لئے کہئے اسے یا لاہوت — خوش نصیبی جو ہیں آپ کا در دیتی ہے
ہیں رنج والم آج مہماں شاید — ضیافت کو یاں لختِ جگر ہے

ہے اعجاز یا مری آہ رسا ہے
سراپا اثر ہے، اثر ہے، اثر ہے

اجل میں ہی نہیں مہماں لحد میں — غم و درد والم ساتھ آرہا ہے
یہ طفلِ اشک بہلیں گے بھلا کب — دلِ ناداں تو کیا بہلا رہا ہے

کرو زحمت، نہ بالیں پر تم آؤ
مرا دل کھنچ کے خود ہی آرہا ہے

زبان اور فن کے اعتبار سے محسنؔ کے یہاں بعض جگہوں پر خامیوں کا احتمال ہے لیکن اڑیسہ جیسے دورافتادہ علاقہ میں رہ کر بھی ادب کی عظیم روایتوں کا عرفان حاصل کرنا لائقِ تحسین ہے۔ محسنؔ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے عبدالمجید بھونیاں حیاؔ کی طرح اڑیا اور اردو زبان کے مشترکہ اشعار نہ کہے ہوں لیکن بنگلہ زبان میں انھوں نے غزلیں کہی ہیں اور ساتھ ساتھ اس کا اردو میں ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہندی میں بھی اشعار کہے ہیں اور ہندی و بنگالی کی ادبی روایتوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ انھوں نے ہندی کے دوہوں میں رادھا اور کرشن کے والہانہ پیار اور نسوانی نفسیات کی ضیائے محبت فروز کا کامیاب انعکاس کیا ہے۔ چند دوہے ملاحظہ ہوں:

گگری موری بھاری اتروں جمنا گھاٹ موکیسی
پتلی کمر لیکت ہے ، پاؤں میں توڑے پچھے بھاری
سکھیاں آؤ ہاتھ دھرو ، اتراؤ مورے گھاٹ
کام بنٹ کر جب آؤں گی دوں گی تو رہا ساتھی

سنسار کسی کا میت نہیں بیری ہے ، بیری ہے بیری
تو کے کارن پریت کرت ہے کہہ کر بھائی ، ہے بھائی
آج تمھارے باہو لاگت ، بولت تو ہے مورا ساتھی
کل جب جانے لگے گا تو پھر یہ سنگت تیرا نہ ساتھی

کرامت علی کرامتؔ محسنؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غرض کہ اردو فارسی بھاشا انگریزی اور بنگالی ان تمام زبانوں پر کم و بیش یکساں دسترس رکھنے والے اڑیسہ کے اس نیرّ تاباں پر اردو دنیا جس قدر ناز کرے کم ہے۔ محسنؔ معصوم پوری کی علمی قابلیت، ادبی بصیرت اور ہمہ گیر اور ہمہ جہت شعری صلاحیت کے پیش نظر ہم اپنے آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ع اب کہاں لوگ اس طبیعت کے؟" (۱)

---

(۱) کرامت علی کرامتؔ: اڑیسہ کا نیرّ تاباں، محمد محسنؔ محسنؔ، مطبوعہ سب رس حیدرآباد: جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۱۸

محسن نے اردو اور فارسی میں شعر کہتے وقت غزل کی جذباتی فضا کو میانہ روی کے آہنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور وہ تکرار و تطویل سے گریز کر کے کامیابی سے ہمکنار ضرور ہیں لیکن انھوں نے اپنے بنگالی اشعار کا جو منظوم ترجمہ کیا ہے اس میں کافی کھردرے پن کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کے مندرجہ ذیل دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کہتے ہیں راہِ محبت سہل ہے آرام دہ — کب یہ آساں تھی لغویات یہ کس کا کلام؟

جستجو کے بعد جانِ من، تمھارے در پہ آئے — ہے کرم کا در جز اس کے گر کوئی کہدے بھی نام

مذکورہ بالا دونوں اشعار کے مصرعہ ہائے اول میں جو سادگی اور سلاست ہے محض اس کی بنا پر یہ اشعار گوارا کہے جا سکتے ہیں۔ دونوں اشعار کے مصرعہ ہائے ثانی میں جو ثقالت، کھردرا پن اور الفاظ کی شکست و ریخت کا اندازہ ہوتا ہے شاعری کی تہذیبی روایت کے قطعی منافی ہے۔ لیکن اس فروگذاشت کے باوجود محسن کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف اس لیے نہیں آتا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی باریک بینی، دقت نظر اور فکری تہذیب میں ڈھلا ہوا لطیف تاثرات کا شاعرانہ اظہار ملتا ہے:

آرزوؤں کی مری کچھ ایسی پامالی ہوئی — حوصلہ کرنے کا اب تو حوصلہ جاتا رہا

بعد مدت آپ آئے گھر مرے، عید آ گئی — سارے شکوے مٹ گئے سارا گلہ جاتا رہا

سیاہ بختی کا دکھلائے بھلا کب تک سماں کوئی

سنائے شامِ غم کی کب تک ان کو داستاں کوئی

پڑے ٹکڑے تھے دل کے کچھ، لٹے راہِ محبت میں

کہیں لٹتا ہوا ایسا بھی دیکھے کارواں کوئی

پھول برسائے ہیں فطرت نے گلستاں کے لئے

ہو جنوں اب نہ پریشاں کسی ساماں کے لئے

سوزشِ غم آتشِ ہجراں اور الم کی یہ لویں
کنج مرقد میں کمی کیا ہے چراغاں کے لئے

صبحِ فرقت شامِ غربت اور شبِ تاریکِ ہجر
ہے یہی تفسیرِ بختِ عاشقِ ناکام کی
شیشۂ دل کے تو ٹکڑے ہم چنتے پھریں
اور پڑی ہے تجھ کو ساقی شیشہ کی اور جام کی
دور بھی تو دیکھ لیں صہبائے چشم یار کا
کھل ہی جائے گی حقیقت گردشِ ایام کی

نور علی انور

(ولادت ۱۸۶۰ء وفات ۱۹۵۰ء)

نام سید نور علی۔ تخلص انور ولد سید اسد علی۔ شہر کٹک کے اڑیا بازار میں پیدا ہوئے۔
مؤلف آب خضر نے انور کے بارے میں لکھا ہے:

"نور علی انور (متوفی ۱۹۵۰ء) آپ کے والد کا نام سید اسد علی تھا۔ آپ خود کو داغ کا شاگرد کہتے تھے۔ آپ عاشقانہ اور تصوفانہ رنگ میں غزلیں اور قصیدے کہتے تھے۔ نور علی انور، عبدالعزیز عاشق اور رفیع الدین خاں رفیع کا ایک مختصر مشترکہ مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں بمقام کٹک وفات پائی۔"(۱)

مؤلف آب خضر نے انور کے سنہ ولادت پر براہِ راست کوئی روشنی نہیں ڈالی بلکہ تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں موصوف کی وفات کا تذکرہ کیا ہے۔ مؤلف آب خضر کو انور کی

---

(۱) آب خضر، ص ۱۶۷

ہمسائگی کا شرف حاصل رہا ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف کے والد مرحوم رحمت علی رحمت سے انور کے قریبی مراسم رہے ہیں۔ اس طرح انور کے سنہ وفات اور ان کے عرصۂ حیات (تقریباً ۹۰ سال) کی روشنی میں انور کا سنہ ولادت ۱۸۶۰ء کے آس پاس ہوگا۔

انور پیشہ کے اعتبار سے حکیم تھے۔ کٹک کے اڑیا بازار میں ان کا مطب تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں ۵۶ صفحات پر مشتمل ایک شعری مجموعہ شائع کیا جس کا اتفاق سے ایک ہی نسخہ دستیاب ہے۔ اس نسخہ کے شروع کے چار صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔ لیکن آخر کے کل صفحات صحیح و سالم ہیں اور کئی باتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی چیز تو یہ کہ اس مجموعہ کا نام "چاندِ رمضان پیامِ عید" تھا جیسا کہ حکیم عبدالعزیز عاشق کے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے:۔

رسالہ خوب ہی لکھا حکیم انور نے ہے نکلا چاند ہے رمضان کا آج بجے ہلال
لکھی یہ مصرعۂ تاریخ طبع کی عاشق پیامِ عید ہے، گلدستۂ فروغ کمال

۱۹۲۶ء

۲۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔

۳۔ پیش نظر مجموعۂ کلام میں نور علی انور کے علاوہ ان کے دو معاصرین شعراء حکیم عبدالعزیز عاشق اور رفیع الدین خاکی غزلیں، قصیدے، منقبتیں اور چند نعتیں شریک اشاعت ہیں۔

۴۔ اڑیسہ کے ان تین شعراء کے علاوہ مندرجہ ذیل بیرونی شعراء کا کلام بھی اس مجموعہ میں شریکِ اشاعت ہے:۔

سیماب اکبرآبادی، شفق قادری، نیرنگ انبالوی، علامہ اقبال، داغ دہلوی، امیر مینائی، ذوق اور غالب وغیرہ۔

مذکورہ شعری مجموعہ کی غرضِ اشاعت جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے بالخصوص ماہِ رمضان میں سحری جگانے اور عید سعید کے موقع پر اظہارِ مسرت ہے۔ شہر کٹک میں زمانۂ دراز سے یہ روایت رہی ہے کہ ماہِ رمضان میں سحر خیز پارٹیاں مختلف محلوں میں رات کے پچھلے پہر گشت کرتی ہوئی رمضان سے متعلق خوش الحان نظمیں پڑھ کر لوگوں کو سحری کے لیے جگاتی ہیں۔

انور کی نعتیہ غزلیں اور نظمیں عصری حیثیت کا نمونہ ہیں۔ اس دور میں انور کا کلام

لوگوں میں مقبول رہا ہوگا جس کا بیّن ثبوت ان کے مجموعۂ کلام میں درج اشاعت نعتیہ نظموں، منقبتوں، رندانہ غزلوں اور ترانوں کے نظامِ فکر اور آہنگ سے ہوتا ہے۔ نور علی انور شاعری کے عوامی رجحان سے واقف تھے۔ انھیں فنِ موسیقی سے بھی یقیناً دلچسپی رہی ہوگی جس کی نشان دہی طرز بھیروں میں لکھی ہوئی ان کی دو غزلہ، خیال، ترانۂ رندانہ سے ہوتی ہے۔

'چاند رمضان پیام عید' ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۳ء سے اردو شاعری کا وہ دور شروع ہو چکا تھا جسے تجربہ کا دور کہا جا سکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک عالم گیر ہیجانی کیفیت چھائی رہی۔ اس کے بعد مزاجوں میں ایک طرح کا ٹھہراؤ سا آچلا تھا۔ اڑیسہ اردو کے مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے اردو تحریکات کے ڈانڈے براہِ راست اس سے جڑ نہیں سکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عصری حسیت کی آنچ آسان روی کے ساتھ وہاں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ اڑیسہ میں جہاں ذوقؔ، غالبؔ، امیرؔ مینائی، داغؔ دہلوی، اقبالؔ اور سیمابؔ اکبر آبادی جیسے مشہور و مقبول شعراء کے اثرات پھیل رہے تھے وہاں شفقؔ قادری عماد پوری، نیرنگؔ انبالوی اور حامد حسین حامدؔ جیسے کم معروف شعراء کی بھی پذیرائی ہو رہی تھی۔ جیسا پیشِ نظر مجموعۂ کلام میں مذکورہ بیرونی شعراء کے کلام کی اشاعت سے پتہ چلتا ہے۔

نور علی انورؔ نے مذکورہ بالا شعراء کے کلام سے موضوع کی مناسبت سے نظموں کا انتخاب کر کے پیشِ نظر مجموعہ میں شائع کیا جس کا مقصد یہ رہا ہوگا کہ ان شعراء کی عوامی مقبولیت مقامی شعراء کے اس مجموعۂ کلام کو عوام میں وقعتِ نظر عطا کرے۔

سید نور علی انورؔ کا کلام اڑیسہ کی ادبی، تہذیبی اور لسانی خصوصیات سے مملو ہے۔

نمونۂ کلام نور علی انورؔ

حشر میں کیا دیں گے ہم پیشِ خدا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ پاس کیا رکھا ہے میرے جز خدا کچھ بھی نہیں

کلمہ پڑھنا لاالٰہ اور الّا اللہ ہے ۔۔۔ یہ نہ کہہ دینا کبھی منہ سے خدا کچھ بھی نہیں

من و تو میں رہ گیا ہے پیچھے سارا قافلہ ۔۔۔ کشتیٔ عمر رواں ہے ناخدا کچھ بھی نہیں

بعد مرنے کے مرے روتے رہو تم حشر تک
آہ و نالہ شور ماتم کی صدا کچھ بھی نہیں

محمدؐ محمدؐ پکاروں میں بن میں محمدؐ بسا مرے دل کے چمن میں
ہوئے چاروں یکجا یاری کے فن میں محمدؐ تو ہیں جان بس پنج تن میں
ابا بکرؓ، عثمانؓ، عمرؓ اور حیدرؓ
شریکِ محمدؐ ہوئے انجمن میں

خود خدا تھا ازل میں خدا کے لئے میں تو بندہ بنا خود خدا کے لئے
ہستی اپنی کو میں نیست و نابود کر خود فنا ہوگیا میں بقا کے لئے
روک لے اب قلم کو زباں بند کر کھول منہ اپنا حمد و ثنا کے لئے
شب معراج میں خود خدا نے جہاں منتظر تھا حبیب خدا کے لئے
لامکاں پر گئے جس گھڑی شاہ دیں خاص خلوت تھی واں مصطفےٰؐ کے لئے
آپ ہیں آپ خود مل گیا وصل میں تھا خدا کا نہ بندہ خدا کے لئے
بھر دے انورؔ کا جنبل غنی جب تو ہے
کر کرم اپنے شیرِ خدا کے لئے

ہر عہد کا ادب اپنے سماج اور معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے۔ نور علی انورؔ جس ماحول میں سانس لے رہے تھے اس میں ہندی رجحانات حاوی تھے جن کی عکاسی نور علی انورؔ کی ترانۂ سحری، وداع رمضان شریف، عید مبارک، تلقین سحرخیزی، ترانۂ بقرعید، منقبت درشان عبداللہ شاہ بخاری (کاٹی پدر شریف)، منقبت حضرت غوث الثقلین اور کلام تصوفانہ جیسی منظوم تخلیقات سے ہوتی ہے۔

شیخ عبدالعزیز عاشقؔ

(متوفی ۱۹۵۵ء)

نام شیخ عبدالعزیز۔ تخلص عاشقؔ۔ شہر کٹک کے کیسر پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے

زمانۂ ولادت کا تعین "آب خضر" میں ان کے سنہ وفات اور وفات کے وقت ان کی عمر کے تناسب سے تقریباً ۱۸۷۵ء ہوتا ہے۔ عاشقؔ سے متعلق مؤلف آب خضر نے لکھا ہے۔

"شیخ عبدالعزیز عاشقؔ (متوفی ۱۹۵۵ء) آپ کو غزل، نعت اور قصیدہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ آپ نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں کٹک میں وفات پائی۔"(۱)

سید نور علی انورؔ کی طرح عبدالعزیز عاشقؔ بھی پیشہ کے لحاظ سے حکیم تھے۔ کٹک کے بالو بازار میں ان کا مطب تھا۔ اس طرح یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ عاشقؔ انورؔ کے ہمعصر، ہم مذاق اور ہم پیشہ شاعر تھے۔ نور علی انورؔ کے کلام کی طرح ان کے کلام میں بھی تصوف و تغزل کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انورؔ کے مرتبہ شعری مجموعہ میں عاشقؔ کی پانچ تخلیقات شریک اشاعت ہیں۔

راقم الحروف کو عبدالصمد واصف کے توسط سے عبدالعزیز عاشقؔ کی شعری تخلیقات کے متعدد مسودے حاصل ہوئے جو ان کی زود گوئی پر دلالت کرتے ہیں۔

اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقاء میں عبدالعزیز عاشقؔ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے ایک اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ اردو کے بیش بہا ادبی سرمایہ کو اڑیا زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا اور اردو کے تخلیقی رویّوں سے اڑیا قارئین کو روشناس کرایا۔ انھوں نے اڑیا زبان میں "قصۂ گل وصنوبر" اور "اندر سبھا" کا ترجمہ پیش کیا اور معاشرتی حالات پر متعدد نظمیں لکھیں جیسا کہ ڈاکٹر کرشن چرن بیہرا ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

"[illegible]"(۲)

---

(۱) کرامت علی کرامت: آب خضر مطبوعہ ۱۹۶۳ء؛ ص ۱۶۷

(۲) ڈاکٹر کرشن چرن بیہرا: شری جگن ناتھ اڑیا ساہتیہ (بزبان اڑیا) مطبوعہ ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۱۸

نمونۂ کلام حکیم شیخ عبدالعزیز عاشق

قصیدہ در مدح سید بخاری شاہ مقام کائی پدر

میں فقیر بے نوا تم صاحب توقیر ہو
تم ملو تو میری بہبودی کی کچھ تدبیر ہو

آپ کے دشت محبت میں چلا جاؤں گا میں
چاہے میرا ہر قدم پر خار دامن گیر ہو

آستان پاک کی گر خاک ہو جاتے نصیب
چشم عاشق کے لئے وہ سرمۂ اکسیر ہو

تم سے ہو جاتی ہیں حل اہل غرض کی مشکلیں
ہر مصیبت کے لئے تم ناخن تدبیر ہو

سید عبداللہ بخاری تم سے واقف ہے جہاں
تم اڑیسہ میں ولی اللہ بے شک پیر ہو

آپ کے در کی گدائی جس کو ہو جاتے نصیب
گلشن فردوس اس کے واسطے جاگیر ہو

ہوں مرادیں دل کی حاصل کیجئے حضرت دعا
آپ کی خدمت میں حاضر عاشق دلگیر ہو

مولا بخش خاں مولاؔ

(متوفی ۱۹۵۸ء)

مولا بخش خاں مولاؔ کا وطن شنکر پور شہر بھدرک تھا۔ مولاؔ صوفی مسلک شاعر تھے۔ بھدرک مغلیہ دور حکومت میں ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اڑیسہ میں یہ واحد مقام ہے جہاں اردو بولنے والے افراد کی تعداد مجموعی آبادی کا تقریباً ساٹھ فی صد ہے۔ اردو کا اولین ڈرامہ "مغل تماشہ" اسی شہر کے بنسی بلبھ گوسوامی نے لکھا تھا۔ مولا بخش مولاؔ نے اردو کے فروغ کے لیے خاصی جدوجہد کی ہے۔ ان کی غزلیات کا مجموعہ "کلیات مولاؔ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

دوسرا مجموعہ " اللہ کی رحمت اڑیسہ کی دولت " کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل نعت اور حمد کا ایک گلدستہ ۱۳۵۹ھ میں شائع ہوا۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ "مولا نامہ اعلیٰ نامہ" ہے جو اس وقت دستیاب نہیں ہے۔ ان کا چوتھا شعری مجموعہ "خدا کی عنایت بھدرک کی نعمت ہے"۔ ڈیمائی سائز کے ۱۶ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ ۱۹۵۵ء میں کلکتہ کے تاج پریس میں طبع ہوا۔ اس کے آخری صفحہ پر پروفیسر شکیل الرحمٰن (جو ان دنوں کشمیر یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں اور اس وقت بھدرک کالج میں صدر شعبۂ اردو تھے۔) کے تاثرات گذارش احوال واقعی کے تحت درج ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

" آپ ایک نہایت ہی بزرگ انسان ہیں اور جس عمر میں کام کرنا ناممکن ہے اس عمر تک آنے کے باوجود وہ اپنی زبان کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کا نور بھی جاتا رہا۔ لیکن بعض حقیقتوں کو دل کے نور سے دیکھتے رہے ...... مولا حضرت ذوالنون مصری کی طرح صرف یہ نہیں سوچتے کہ صوفی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب کچھ چھوڑ کر خدا کو لیا ہے بلکہ وہ اپنے ماحول سے بھی باخبر ہیں۔ ان کی نگاہیں بدلتی ہوئی حقیقتوں پر بھی ہیں۔ عشق رسولؐ سے اس حقیقت کو اور زیادہ قوت مل گئی ہے۔ انسان کے کردار کو حسین تر بنانے کے لیے ان کے سامنے ایک انسان کا کردار ہے۔ رسولؐ کی محبت ان کے سامنے انسان کا ایک عمدہ کردار پیش کرتی ہے۔ مولاؔ کی شاعری میں آب و گل کی باتیں بھی ہیں اور 'عقل کل' کی بھی۔ تصوف کی شان یہ ہے کہ انسان کو ترک دنیا کا خیال نہ آئے اور روح کی پاکیزگی بھی مکمل ہو جائے۔ ان کے یہاں دونوں باتوں کی کوشش ہے "۔(۱)

مولا بخش مولاؔ صوفی بزرگ تھے۔ سلسلۂ قادریہ سے نسبت تھی۔ رشد و ہدایت میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ اڑیسہ میں اردو زبان کی تبلیغ و اشاعت میں ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ شنکر پور میں ان کا عالی شان مزار ہے جہاں ترک و احتشام سے ان کی برسی منائی جاتی ہے اور قوال ان کا کلام پڑھتے ہیں۔

---

(۱) پروفیسر شکیل الرحمٰن؛ گذارش احوال واقعی؛ مطبوعہ برگرد پوش؛ خدا کی عنایت بھدرک کی نعمت از مولا بخش خاں مولاؔ؛ ۱۹۵۵ء

نمونۂ کلام مولابخش مولاؔ

حمد ذوالجلال

کون لکھ سکتا ہے حمدِ ذوالجلال — پست ہیں لکھنے میں سب صاحب کمال
حمد لکھنے میں قلم ہے سرنگوں — شان ہے تیری بڑی یا ذوالجلال
حمد کے اسرار جس پر کھل گئے — بس اسی کے ہاتھ کچھ آیا ہے مال
پاک دولت مانگ تو اللہ سے — مال ناجائز ہے مالِ بدخصال
پھنس گئے دنیا میں ناحق ہائے ہائے — حشر کے دن کا نہیں کچھ بھی خیال
ہے وہ مالک مالکِ روزِ جزا — نیک و بد کا کیا نہ ہوگا کچھ سوال

نام مولاؔ در حقیقت ایک غلام
ہو کرم تیرا تو وہ دیکھے جمال

توحید

عالم ناسوت میں کب تک تو ٹھوکر کھائے گا — راستہ ملکوت کا آخر نظر کب آئے گا
بوالہوس یہ تو مقام کوچ ہے تیرے لئے — جانے کب اپنا قدم جبروت میں ٹھہرائے گا
غرق ہو جائے گا جب تو بحر الا اللہ میں — منزل لاہوت کا پردہ ترا اٹھ جائے گا
مدرسے میں عشق کے لے درس حقانی اگر — عقدۂ ہاہوت تجھ پر تب کہیں کھل جائے گا

کو رباطن ہے سگِ دنیا کہو اسے
خود نمائی کو مٹا دے گر خدا کہلائے گا

غزل

ہم سربکف جو بیٹھے ہیں خود سر تیری گلی میں
مقتل کا دیکھتے ہیں منظر تیری گلی میں

اللہ رے چال تیری اے فتنۂ قیامت
ہوتا ہے روز برپا محشر تیری گلی میں

اس بحر میں جو ڈوبا نکلا نہیں ابھر کر
گم کردہ راہ خود ہے رہبر تیری گلی میں

ہم جس کو دیکھتے ہیں مستی میں جھومتا ہے
ساقی لٹا رہا ہے کوثر تیری گلی میں

آساں نہیں جو دیکھے تجھ کو کوئی مری جاں
تا عمر گر لگاتے چکر تیری گلی میں

للہ اب تو اپنا بندہ بنا لے ہم کو
مدت سے کھا رہے ہیں ٹھوکر تیری گلی میں

ہر حال میں تجھی کو سجدہ ہمیں روا ہے
جھکتا ہے آسماں کا جب سر تیری گلی میں

سودا یہی رہا گر زلف دوتا کا تیری
دیدے گا جان مولاؔ دلبر تیری گلی میں

رہا نہ کوئی رہے گا باقی خدا ہی ہے اور خدا رہے گا
فنا جو عشقِ خدا میں ہوگا وہی بہ شکل بقا رہے گا

مٹا دے اپنی خودی کو دل سے اگر طلبگار ہے خدا کا
اسی کی ہستی رہے گی باقی جو یادِ حق میں لگا رہے گا

کہاں ہیں جمشید اور دارا نہیں کسی کا ہوا گزارہ
یہ وہ سرا ہے کہ چار ہی دن یہاں پہ شاہ و گدا رہے گا

طلب ہے اس کی اگر تو خود کو مٹا دے راہِ وفا میں اے دل
نہ یار سے تو جدا رہے گا نہ یار تجھ سے جدا رہے گا

نثار حسنِ رسول ہوں میں تو غم نہیں کچھ مجھے ہے مولاؔ
پسِ فنا بھی یہ دامن اپنا کرم سے تیرے بھرا رہے گا

پیش نظر نمونۂ کلام اپنے لب و لہجہ کے اعتبار سے بہت ہی نمایاں طور پر صوفیانہ

مسائل کی ترجمانی اور اہلِ عقیدت کے سامنے ایک صوفی کی زبان سے اس کے تحت الشعور کے التہاب کو پیش کرتا ہے۔ یہاں فنا اور بقا کا لفظ محض لفظ نہیں بلکہ تصوف کی دو بڑی اصطلاحیں ہیں جو توضیحات میں بڑی معنویاتی پہنائیاں رکھتی ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں اور بالخصوص اڑیسہ جیسے دور دراز علاقے میں جس مذہبی اور تہذیبی تحریک نے بہت نمایاں طور پر حصہ لیا وہ تصوف کا ادارہ تھا۔ عوام کی رسائی مدرسوں تک نہیں فقیروں کے تکیوں اور صوفیوں کی خانقاہوں تک ہوتی ہے۔ اور معاشرتی سطح پر زبان کے بدلنے، ترقی کرنے اور ترویج پانے میں اس اعتبار سے یہ ادارہ نہایت اہم کردار ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولا بخش خاں مولا صوفی المسلک شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں تہہ در تہہ تصوف کی قندیلیں روشن ہیں اور ان کا تعلق خانقاہی نظام سے بھی استوار ہے۔ ان کے صدہا مرید ہیں جو گویا ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہیں۔ مولا کی باتوں میں ایک طرح سے جذب و کیف اور عشق و مستی کا سا عالم طاری رہتا ہے لیکن ان کی شاعری کا لب و لہجہ یہ بتلاتا ہے کہ وہ اپنا کلام مریدین کے حلقہ میں بھی پڑھ کر سناتے تھے اور انھیں مسائل تصوف کی تعلیم بھی دیتے تھے اور بغرض تلقین و تربیت اپنے اشعار سے بھی کام لیتے تھے۔

ان کی پہلی منزل 'حمد ذوالجلال' ہے لیکن اس کے لیے انھوں نے مثنوی کے بجائے غزل کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ کلام سیدھا سادہ ہے مگر جذبات عشق و عقیدت کی پرچھائیاں شروع سے آخر تک اس پر بکھری ہوتی ہیں۔ وہ اس حمد میں یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا کی حرص و طمع جائز نہیں۔ مانگنے اور طلب کرنے کی چیز تو پاک دل اور پاک نفس ہے جس کا حصول بغیر رحمت خداوندی کے ممکن نہیں۔ ذیل کا شعر ان کے تصورات کی ترجمانی کرتا ہے ؎

حمد کے اسرار جس پر کھل گئے
بس اسی کے ہاتھ کچھ آیا ہے مال

دوسری غزل جو توحید باری سے متعلق ہے وہ دراصل مسائل تصوف کی تشریح و تعبیر تو نہیں ہے مگر پانچ نہایت ہی اہم روحانی مقامات و مدارج کی توضیح اس میں موجود ہے۔ عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت، عالم لاہوت اور عالم ہاہوت۔ دلچسپ دلچسپ بات یہ ہے کہ عالم ناسوت اس دنیاوی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس

میں ٹھوکر کھانے کی بات سامنے آتی ہے ؎

عالم ناسوت میں کب تک تو ٹھوکر کھائے گا
راستہ ملکوت کا آخر نظر کب آئے گا

عالم ملکوت سیر روحانی کی ایک منزل ہے ۔اسی لیے اس کا تعلق نظر سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد روحانی ترقیات کا قدم عالم جبروت کی طرف بڑھتا ہے جہاں سالک لاالٰہ سے گذر کر الااللہ میں داخل ہوتا ہے ۔اسی لیے اسے منزل لاہوت کہا ہے ۔ ہاہوت ان سب سے بلند ایک مقام ہے جس تک انسانی ذہن یا روح کی رسائی صرف عشق کے اسرار اور الٰہیات کے رموز کو پانے کے بعد ہی ممکن ہے اور وہ بھی عقدہ کشائی کی حد تک ۔ اس نظم میں شاعر نے جن مقامات عالیہ کا ذکر کیا ہے وہ عام ہیں یعنی تصوف کی مخصوص مصطلحات کا ذکر بہت سے شعراء اور اہل تصانیف نے کیا ہے لیکن شاعر کی زبان قلم سے یہ جس انداز سے آیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان مقامات عالیہ کا ذہنی عرفان رکھتا ہے۔

مولوی رحمت علی رحمت

(ولادت ۱۸۹۱ء وفات ۱۹۶۳ء)

نام رحمت علی ، تخلص رحمت ، ولد شیخ برکت اللہ اور غنیمت بی بی ، جائے ولادت رسولپور پرگنہ سونگڑہ ، ضلع کٹک ۔ سال ولادت ۱۸۹۱ء ۔ مولوی رحمت علی نے ۱۹۱۲ء میں میٹرک کیا ، ۱۹۱۴ء میں ایف اے ، ۱۹۱۶ء میں بی اے اور ۱۹۱۸ء میں ایل ٹی کیا ۔ ۱۹۱۹ء میں مسلم سیمینری کٹک میں ریاضی کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر سال بھر بعد ۱۹۲۰ء میں ریاضی کے استاد کی حیثیت سے سمبل پور ضلع اسکول میں انھیں سرکاری ملازمت مل گئی ۔ وہاں ۱۹۲۸ء تک وہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ ۱۹۲۸ء میں ان کا تبادلہ پوری ضلع اسکول میں ہو گیا جہاں وہ ۱۹۳۵ء تک سرگرم عمل رہے ۔ ۱۹۳۵ء میں پریکٹسنگ ایم ای اسکول کٹک میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ ہوا جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر فائز رہے ۔ حکومت اڑیسہ

کی جانب سے ۱۹۴۷ء میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے ان کا پروموشن ہوا اور تقرر بالیسر میں ہوا۔ ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں گنجام پلینز (GANJAM PLAINS) برہم پور میں ڈی آئی کی حیثیت سے ان کا تبادلہ ہوا جہاں ۱۹۵۰ء تک مقیم رہے اور اسی سال ملازمت سے سبکدوش ہو کر کٹک آ گئے۔

مولوی رحمت علی رحمت اڑیسہ کے ماہر ریاضیات، اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز اور بلند فکر شاعر تھے۔ مؤلف آبِ خضر نے ان کے متعلق لکھا ہے:

"آپ کے کئی غیر مطبوعہ نثر پارے، جو مسودوں کی شکل میں ضخیم کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں بلاشبہہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ آپ کی اردو قواعد کی کتاب 'جواہر القواعد' کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو اس وقت نایاب ہے۔ آپ خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد اور اکبر الٰہ آبادی کی زبان و بیان سے زیادہ متاثر ہیں۔ آپ نے 'توبۃ النصوح' کا اڑیا زبان میں ترجمہ کیا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ آپ اڑیا اور انگریزی میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ اڑیا سرکار کے ذریعہ بورڈ آف پرائمری ایجوکیشن کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ آخری عمر میں مفلوج ہو کر ۷ راپریل ۱۹۶۳ء میں وفات پائی اور قدم رسول کٹک میں مدفون ہوئے۔"(۱)

ادق مسائل کئے ہیں میں نے اگرچہ جبر و مقابلہ کے
مگر یہ تثلیث کا معمہ دماغ میرا بیکار رہا ہے

"تثلیث" سے مراد "زاویہ کو تین حصہ کرنا" اور "خدا کو تین حصہ کرنا" دونوں لے سکتے ہیں۔ ان کے اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہستی کہاں سے آتے اگر نیستی نہ ہو — جاری ہوتے صفر سے قواعد شمار کے
صفر ہیں گرچہ ہم مردانگی میں — بڑھیں آگے تو دیں ہم کام دس کے

اس کا مطلب ہے کہ "۰" کے ساتھ "۱" ہو تو دس بن جاتا ہے۔

مگر نقطۂ موہوم سے پہنچے عدم کو وہ — ہمارا یہ تخیل جب کبھی پرکار ہو جائے
پرکار Compass or rounder یعنی تخیل کو اگر پرکار سے تشبیہ دیں

---

(۱) کرامت علی کرامت: آبِ خضر مطبوعہ ۱۹۶۳ء: ص ۱۶۷

اورذات کو نقطۂ تصور کریں تو یہ ساری کائنات کے دائرہ کا احاطہ کر سکتا ہے۔

زاویہ کی نہ ہو خدا کی ہو یہ نرالی مجسّمی دانی ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ پر کار اور اسکیل کے ذریعہ زاویہ کو تین حصہ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن خدا کو تین حصہ کرنا آسان ہے (جیساکہ عیسائی سمجھتے ہیں۔)

مولوی رحمت علی رحمتؔ کے تقریباً ہر شعر میں لفظیات، خیال اور اسلوب کے اعتبار سے جدت طرازی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں طنز و ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے:۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بھو دان یگیہ والے میرے دھان کھا گئے مچھلی ڈیپارٹ والے کنواں چھان کھا گئے

چلتا نہیں ہے ہاتھ کہ ماروں انھیں غلیل چھپّر کے کدّوؤں کو ہنومان کھا گئے

حلوہ پکا کے رکھ دیا جب بحرِ فاتحہ آخوند تمام کشمشیں چن چان کھا گئے

پالی تھیں ایک دربہ بطخ اور مرغیاں کم بخت ان کو عید کے مہمان کھا گئے

ہڈی کو چوس چاس کے پھینکا جو پیر نے نعمت سمجھ کے اس کو مریدان کھا گئے

اب راؤ، رائے، خان بہادر نہیں رہے
سب ٹائٹلوں کو اک شرِ یمان کھا گئے (۱)

دل میرا تارِ زلف میں جاکر اٹک گیا اس بے وفا کے پاس میں بھیجوں گا تار کیوں

تعلیمِ مشرقی سے ہوا فاقہ جب نصیب تعلیم مغربی پہ نہ کھائیں ادھار کیوں

سن سن کے تلخ گالیاں ہوتا نہیں میں گرم
کونین کھانے والوں کو آئے بخار کیوں

پوچھا جو میں نے ملتا ہے بوسہ بھی دھار پر کہنے لگے مفت کا سودا ہے دھار کیوں

لفظ "دھار" اُڑیسہ میں ادھار (قرض) کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ یہاں رحمتؔ

---

(۱) مولوی رحمت علی رحمتؔ کی صاجزادی بیگم طاہرہ حفیظ کے حافظہ سے ماخوذ۔

نے مقامی زبان کا استعمال کیا ہے۔

مولوی رحمت علی رحمتؔ کی بیاض ان کے فرزند کرامت علی کرامتؔ کے پاس محفوظ ہے جس میں ذیل کی غزلیں موصوف کی تحریر میں موجود ہیں۔

(۱)

مژگاں کی فوج آتی ہے باندھے قطار کیوں　　　دل ہے اماں پسند تو ہو کارزار کیوں
(اس غزل کے ۴۲ اشعار ہیں)

---

(۲)

مقام عبرت ہے گالیاں آج باپ بیٹے سے کھا رہا ہے
تُف ایسے اطوار مغربی پر کہ ہم کو حیواں بنا رہا ہے
(اس غزل کے ۳۰ اشعار ہیں)

---

(۳)

آتے ہی یاں میں موجبِ آزار ہو گیا　　　چلنے لگا تو دوش پہ بھی بار ہو گیا
(اس غزل کے ۲۵ اشعار ہیں۔)

---

(۴)

غمِ فراق کو سینے لگا رہا ہوں میں　　　نویدِ وصل سے دل کو رلا رہا ہوں میں
(اس غزل کے ۲۸ اشعار ہیں۔)

---

(۵)

موجِ حدوث بحرِ قدامت سے دور تھا　　　رخشندہ اس زماں بھی محمدؐ کا نور تھا
(اس غزل کے ۲۰ اشعار ہیں)

---

(۶)

مال و اسباب لٹا کر ہوئے دولت والے　　　ایسے بھی ہوتے ہیں دنیا میں سخاوت والے

(اس غزل کے ۱۱ اشعار ہیں۔)

---

(۷)

ہے مجھے خوف سدا ان کے بگڑ جانے کا　　　کہ بگڑتا ہے نشاں راز کے کھل جانے کا

(اس غزل کے ۱۵ اشعار ہیں۔)

---

(۸)

سوز نہاں کے فیض سے سینہ کو داغدار کر　　　حاجت ہو جبکہ شوب کی آنکھوں کو اشکبار کر

(اس غزل کے ۱۵ اشعار ہیں۔)

---

(۹)

ذات واجب نے جو خود بینی کا ساماں کیا　　　خلقِ اول کو تب آئینۂ امکاں کیا

(اس غزل کے ۲۰ اشعار ہیں۔)

---

(۱۰)

کام کی باتیں جو تھیں جب درج قرآں ہوگئیں　　　فلسفہ کی ساری بحثیں طاق نسیاں ہوگئیں

---

(۱۱)

زلف کو گرچہ حسینوں نے سنوارا ہوگا　　　سانپ کو ہاتھ لگائے کسے یارا ہوگا

(اس غزل کے ۲۰ اشعار ہیں۔ یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔)

---

(۱۲)

ہوئے پابند جب حرص وہوس کے   تو کیوں قابل نہ ہوں دارِ جس کے

(اس غزل کے ۲۱ اشعار ہیں۔ ۵ر نومبر ۱۹۵۰ء کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔)

---

(۱۳)

نہیں غم آج گر واں وصل سے انکار ہو جائے   ابھی اک دن یہی انکار پھر اقرار ہو جائے

(اس غزل کے ۱۷ اشعار ہیں۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۰ء کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔)

---

(۱۴)

آہ کیا دکھ بھری کہانی ہے   سن کے پتھر بھی جس کو پانی ہے

(اس غزل کے ۲۰ اشعار ہیں۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۵۱ء کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔)

---

(۱۵)

جینے کا لطف جانے وہ کیا جو مرا نہ ہو   مرنے کا لطف جانے وہ کیا جو جیا نہ ہو

(اس غزل کے ۲۱ اشعار ہیں۔ زیر صدارت فضل علی گورنر اڑیسہ، ۱۵ر فروری ۱۹۵۳ء کو ناری سیوا سدن، کٹک میں پڑھی گئی۔)

---

(۱۶)

یہ جاہ و ثروتِ دینار ہے مدنظر کب تک   رہے ہے تیری نظر میں نقشۂ شام وسحر کب تک

(اس غزل کے ۱۳ اشعار ہیں۔ ۷ر اپریل ۱۹۵۵ء کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔)

---

(۱۷)

گلشنِ عالم سے جب بادِ خزاں جانے لگی   کس نزاکت سے عروسِ نوبہار آنے لگی

(اس غزل کے ۱۹ اشعار ہیں۔)

---

(۱۸)

تسخیرِ قلب صاجو زورِ قلم سے ہے — نوکِ قلم سے ہے نہ کہ تیغ دودم سے ہے

(اس غزل کے ۱۳ اشعار ہیں۔ ۵ر دسمبر کے مشاعرہ میں سنائی گئی۔)

---

(۱۹)

گاہک ہیں ہم جناب دلِ داغ دار کے — نے جنسِ آبدار کے یا تابدار کے

(اس غزل کے کل ۳۳ اشعار ہیں۔ یہ غزل بزم ادب کٹک مورخہ ۸ر جنوری ۱۹۵۲ء کو پڑھی گئی۔ اس غزل کا مقطع تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ملاحظہ ہو۔)

منظرؔ، لطیفؔ، اصغرؔ و امجدؔ ہیں پیش رو
رحمتؔ ہیں معتقد ہم انھیں چار یار کے

---

(۲۰)

لب مرا خوف سے جو وا نہ ہوا — حرفِ مطلب کبھی ادا نہ ہوا

(اس غزل کے ۲۱ اشعار ہیں۔ ۲۶ر اگست ۱۹۵۶ء کو بزم ادب کٹک کے مشاعرہ میں پیش کی گئی)

---

(۲۱)

کچھ ہو بلا سے زار کو افشا کریں گے ہم — نے دار کی یا مار کی پروا کریں گے ہم

(اس غزل کے کل ۱۹ اشعار ہیں۔)

مولوی رحمت علی رحمتؔ کی بیاض میں ان غزلوں کے علاوہ دو سہرے بھی درج ہیں۔ جن میں سے پہلا سہرا ہے :-

وہ شان کا شوکت کا، ہے صلِ علیٰ سہرا — جو فرق ہمایوں پر، ہے آج بندھا سہرا

(اس سہرے کے کل ۱۷ اشعار ہیں۔)

دوسرا سہرا ہے:-

فضلِ خالق سے بندھا جو تیرے سر پہ سہرا   ہے گراں قدر یہ سہروں میں ہے بہتر سہرا

(اس کے کل ۱۳ اشعار ہیں۔)

یہ سہرا ۱۳ر جنوری ۱۹۶۳ء کو دیوان بازار کے محمد انور کی صاحبزادی تسلیم کی تقریبِ کتخدائی کے موقع پر دولہا شمشاد بخش ابن امام بخش کے لیے لکھا گیا تھا۔ کرامت علی کرامت کے مطابق یہ مولوی رحمت علی رحمت کی آخری شعری تخلیق ہے۔

دسمبر ۱۹۶۱ء میں کٹک کے ناری سیوا سدن میں "یوم جگر" منایا گیا تھا جس میں کلکتہ سے پرویز شاہدی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس میں مولوی رحمت علی رحمت نے یہ "نوحہ" سنایا تھا۔

نوحہ

جگر سے کہہ دو کرے نالہ اب جگر کے لئے   جگر جگر کے لئے ہے دِگر دِگر کے لئے
چہک رہا تھا جو بلبل ہمیشہ غنچوں پر   خموش ہو ہی گیا ہائے عمر بھر کے لئے
دکھائی راہِ وفا اس نے چلنے والوں کو   نہ رہ گیا کوئی محتاج اب خضر کے لئے
چمن کو لوٹ لیا اب خزاں کی فوجوں نے   رہا نہ ایک بھی پتہ ہرا شجر کے لئے
امیرؔ و داغؔ و جلالؔ و جلیلؔ و شاہ نصیرؔ   سبھوں کو کہہ دو کریں نوحہ اب جگرؔ کے لئے
قضا جو آنے کو چاہے تو آئے دم بھر میں   بہانہ کیا ہو کسی سے اگر مگر کے لئے

جگرؔ گیا ہے جہاں واں سبھوں کو جانا ہے
ہمیشہ تم رہو تیار اس سفر کے لئے

مولوی رحمت علی رحمت کو زبان و بیان پر کافی عبور حاصل تھا۔ موصوف بہت پرگو تھے اور ایک ہی زمین میں لمبی لمبی غزلیں کہہ ڈالتے تھے۔ یوں تو وہ شاعری میں اکبر الہ آبادی سے متاثر تھے۔ لیکن ان کے اسلوب میں انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کی عام غزل کی روایت سے ہٹ کر ہے۔ ان کا تصوف اور مذہبیات کا مطالعہ گہرا تھا۔ فلسفہ، منطق

اور دیگر علوم کو موصوف ناقص سمجھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ کہتے ہیں:۔

بڑی مشقت سے میں نے اپنا عقیدہ مضبوط کر لیا تھا
مگر یہ کم بخت فلسفہ آ عمارتِ دیں کو ڈھا رہا ہے
امامِ رازی سے پوچھا میں نے حقیقتِ علم کیا ہے حضرت
تو بولے یہ تو حجاب بن کر خدا کو مجھ سے چھپا رہا ہے
لگائی عینک جو فلسفے کی فضائے ایماں میں تیرگی تھی
سنی جو گوشِ صفا لگا کر نقیبِ یزداں بلا رہا ہے

صوفی نے آکے پھونک دی وہ بات کان میں
جس سے کہ سارا فلسفہ بے کار ہو گیا

ارسطو آکے سیکھ لے مری حکمت
ہوا سے شیشۂ دل کو گلا رہا ہوں میں

پڑھ کے بر سو فلسفہ تاریک دل کو کر چکا
صحبتیں اہلِ وفا کی رہبرِ جاں ہو گئیں

اسرارِ دیں سمجھنے کے قابل نہ بن سکا
علم فلاسفہ پہ مجھے گو عبور تھا

کام کی باتیں جو تھیں جب درجِ قرآں ہو گئیں
فلسفہ کی ساری چیزیں طاق نسیاں ہو گئیں

اونچ کی فلسفہ لیتا بہت تھا
جو مذہب آگیا حضرت جی کھسکے

فلسفے کو یہ نہ سمجھو کہ یہ ہے امن پسند
اسی کم بخت نے مذہب کو ابھارا ہو گا

مولوی رحمت علی رحمتؔ علم ریاضی کے استاد تھے۔ اس لیے کہیں کہیں ان کے اشعار میں علمِ ریاضی کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً:۔

رحمت علی رحمت کے مندرجہ ذیل اشعار میں طنز کے عناصر ملاحظہ ہوں :۔

مقام عبرت ہے گالیاں آج باپ بیٹوں سے کھا رہا ہے
تف ایسے اطوارِ مغربی پر کہ ہم کو حیواں بنا رہا ہے

نہ کیوں کریں عورتیں کچہری نہ کیوں بنیں مرد گھر میں آیا
" بدل گئی ہے روش پرانی نیا زمانہ اب آ رہا ہے "

یہ واعظوں کی نصیحتوں سے دل اپنا اکتا گیا ہے یارو
چلو جی جائیں ذرا اُدھر بھی کہ واں پہ قوال گا رہا ہے

جو چند قطراتِ اشکِ حسرت گرائے آنکھوں پہ ان کی میں نے
حکیم بن کے وہ بولے سرکہ شراب کا کیوں لبنا رہا ہے

حاصل ہی کیا جو مل گیا تم کو خطاب سَر — سَر وہ ہے جو خوشی سے سَردار ہو گیا
اس کج روی پہ میرے ہیں حیران سب طبیب — عیسٰی کو دیکھتے ہی میں بیمار ہو گیا

یہ احمقی ہے کہ کنٹرول کے زمانے میں — " چراغ شام سے پہلے جلا رہا ہوں میں "

بن سکے کون خریدار ترا اے جاناں — دام اک خال کا تیرے جو بخارا ہو گا

بہالے وہ اگر تو یہ اڑا لے — برابر ہیں اثر مے و چرس کے
وہ دیکھو جا رہا ہے چور رحمت — ذرا باندھو کمر کو اس کی کس کے

جسے معشوق کے کام و دہن کو شاد کرنا ہو
تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ آچار ہو جائے

تمھاری زلف میں جاناں مری داڑھی اگر الجھے
کشاکش میں وہیں بازی ٹگ آف وار ہو جائے

تل کے اپنا کلیجہ رکھ دیتا — مرے گھر میں مگر توا نہ ہوا
ہو گیا درد پیدا ٹانگوں میں — آپ کا ناچنا بجا نہ ہوا
کاٹ کر میرے سر کو کہتے ہیں — مری تسبیح کا یہ دانہ ہوا

مولوی رحمت علی رحمت کے کلام میں تصوف کی چاشنی ملاحظہ ہو:۔

حسنِ ازل کو شوق ہوا اپنی دید کا — خلقت کے آئینہ میں نمودار ہو گیا
بے چارہ بے قصور تھا جس نے کہا تھا حق — قاضی کے فیصلہ پہ وہ سنگسار ہو گیا

سنتے تھے وہ ہماری رگِ جاں سے ہیں قریب — دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو کوسوں ہی دور تھا
مصروف خواب تھا مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی — جاگا تو گوشہ گوشہ میں شورِ ظہور تھا

زنگ سے آئینہ کی صورتیں اشیاء کی بنیں — جنس اور فصل کو تب فارقِ عنوان کیا
نور نے جبکہ بتدریج کیا سب سے نفوذ — اس کا جوہر تو اسے لعل بدخشان کیا

پتھر میں اور دل میں ہے نسبت قریب کی — اِس میں خواص نور کے اور اُس میں نار کے

عصیاں کی کوئی حد ہے نہ رحمت کی کوئی حد — اُس کے عوض میں اِس کو خریدا کریں گے ہم

ذیل کے اشعار میں سوز و گداز کا عنصر ملاحظہ ہو:۔

غمِ فراق کو سینے لگا رہا ہوں میں — نویدِ وصل سے دل کو رلا رہا ہوں میں
گداز ہوتے ہی دل، آنکھ ہو گئی نمناک — یہ دیکھو آگ سے پانی بنا رہا ہوں میں

عشق تھا پہلے دوا دل کی مگر کچھ دن ہوتے　　لذتیں درد و الم کی دل کا درماں ہوگئیں

رحمتؔ شوریدہ گر قائل تقدیر ہے
پھر یہ شکوہ کیوں کہ تدبیریں پریشاں ہوگئیں

جس درد کی دوا ہو اسے درد کیوں کہیں　　اس درد کے نثار کہ جس کی دوا نہ ہو

بہا کر اشک آنکھوں سے دلوں کو بخشو شادابی
رہے گی آب پاشی گر، شجر ہوں گے ثمر کب تک

مولوی رحمتؔ علی رحمتؔ کا کلام تصوف، تغزل اور طنز و ظرافت کے عناصر کا مرکب ہے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد اور اکبرؔ الٰہ آبادی سے کافی حد تک متاثر تھے۔ اودھ پنج کے مطالعہ نے ان کی طبیعت کو طنز و ظرافت کے عنصر سے سرشار کیا۔ مذہب ان کے لیے مشعل راہ ہے اور فلسفہ و منطق گمراہی کا ریگ راز۔ ان کے کلام میں طنز کی تیز دھار ہے۔ وہ معنوی لحاظ سے الفاظ کے تانے بانے میں الجھتے نہیں ہیں بلکہ سیدھی سادی روز مرّہ کی زبان میں طنز کی نشتریت کو قائم رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

ہڈی کو چوس چاس کے پھینکا جو پیر نے　　نعمت سمجھ کے اس کو مریدان کھا گئے

امجد نجمی

(ولادت ۱۸۹۹ء　　وفات یکم فروری ۱۹۷۴ء)

امجد نجمی پال لہرا کے دیوان محمد یوسف کے خلف رشید تھے۔ ۲۹ ر اکتوبر ۱۸۹۹ء کو اپنے آبائی مکان محلہ بخشی بازار میں پیدا ہوئے۔ جب سن شعور کو پہنچے تو حسب روایت بڑے لاڈ چاؤ سے بسم اللہ ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میں گئے اور اس کے بعد مقامی

رومن کیتھولک مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ دسویں کے امتحان کے لیے کٹک کے پیارے موہن اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانہ میں طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل ہوئی۔ ابتدا میں زیادہ تر توجہ غزل پر مرکوز رہی۔ اپنے محلہ کی پلٹن مسجد کے پیش امام مولوی حبیب اللہ تسنیم ؔ جے پوری سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ شروع میں امجد تخلص کرتے تھے۔ تسنیم کے مشورہ سے نجمی ؔ تخلص اختیار کیا۔ سال بھر بعد تسنیم ؔ نے امامت ترک کرکے پیشۂ تجارت اختیار کرلیا اور رنگون چلے گئے۔

مالک رام نے لکھا ہے :-

"نجمی ؔ کو اقبال سے بہت عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ بذریعہ خط و کتابت اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ لیکن اقبال نے حسب معمول ٹال دیا اور لکھا کہ سب سے بہتر استاد اساتذہ کے کلام کا مطالعہ ہے۔ آپ بھی یہی کریں۔ اب نجمی ؔ نے اپنا نام صیغۂ راز میں رکھ کر اپنے والد سے اصلاح لینا شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں انھوں نے رحمت علی رحمت ؔ (والد کرامت علی کرامت فوت ۱۹۶۳ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ بعد کو جب فارسی میں کہنے کا شوق ہوا تو اس میں حافظ شمس الدین احمد شمس ؔ منیری (صدر شعبۂ عربی و فارسی پٹنہ کالج) سے مشورہ کیا۔" (۱)

یہاں ایک بات کے اختلاف کی گنجائش ہے کہ نجمی ؔ نے اپنے فارسی کلام پر یقیناً حافظ شمس الدین احمد شمس ؔ منیری سے استفادہ کیا لیکن اس زمانہ میں شمس ؔ منیری صدر شعبۂ عربی و فارسی پٹنہ کالج نہیں تھے بلکہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک ان کا قیام کٹک میں تھا اور وہ راونشا کالج کٹک میں ہی لکچرر تھے۔ اس وقت نجمی ؔ کی عمر ۲۴ سال کی تھی اور دونوں میں کافی قریبی مراسم تھے جیسا کہ راقم الحروف سے خود شمس منیری مرحوم نے پٹنہ میں کہا تھا۔

نجمی ؔ کی تکمیل تعلیم سے قبل ترک موالات اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ نجمی ؔ بھی اسی ریلے میں بہہ گئے اور مختلف جلسوں میں اپنی اور دوسروں کی سیاسی نظمیں سنانے لگے۔ بالآخر ایک بار گرفتار ہوگئے۔ جب جیل سے رہائی نصیب ہوئی تو سیاسی تحریک کی لے کچھ مدھم ہوچکی تھی۔ اہل خاندان نجمی ؔ کے لیے متفکر

---

(۱) مالک رام؛ وفیات: مطبوعہ تحریر دہلی جلد ۸ شمارہ ۴ ص ۵۹

تھے۔ ان کے والد نے انھیں اپنے چھوٹے بھائی محمود شریف کے پاس رانچی بھیج دیا جو وہاں کسی دفتر میں کلرک تھے اور وہاں ان کا کچھ کاروبار بھی تھا۔

۱۹۲۲ء امجد نجمی اور اڑیسہ کی اردو تحریک کے لیے بہت اہم ہے۔ اسی سال نجمی رانچی سے کٹک آ گئے۔ انھیں کٹک کے محکمہ ریلوے میں ملازمت مل گئی اور انھوں نے شہر کٹک میں بزم ادب کی بنیاد ڈالی جس کے زیر اہتمام باقاعدگی کے ساتھ ماہانہ طرحی مشاعرے ہونے لگے۔ پھر جب نجمی صاحب کا خردہ روڈ تبادلہ ہو گیا تو وہاں انھوں نے ینگ مسلم کلب قائم کیا اور ڈراموں اور تمثیل کی طرح ڈالی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ڈراموں کے میدان میں آغا حشر کا طوطی بولتا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے آغا حشر کے متعدد ڈرامے اسٹیج کئے جن میں خود اداکاری بھی کی اور ہدایت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پھر خود ڈرامے لکھنے لگے۔ اسی زمانہ میں ان کے چار ڈرامے "بدنصیب بادشاہ"۔ "کامیاب تلوار"۔ "کشور کا نتا"۔ اور "انصاف کا کوڑا" خردہ روڈ میں اسٹیج ہوتے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور ان کے مسودے نجمی اکیڈمی میں محفوظ ہیں۔

۱۹۳۸ء میں امجد نجمی کا تبادلہ خردہ روڈ سے والٹیر ہو گیا۔ وہاں انھوں نے چند احباب کے تعاون سے ۱۹۴۰ء میں آل آندھرا اردو مجلس قائم کی جو ہنوز قائم ہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ اردو مجلس کے صدر رہے۔ اردو مجلس کے زیر اہتمام باقاعدگی کے ساتھ مشاعرے ہوا کرتے تھے اور کئی کل ہند اردو کانفرنسوں کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ یہیں ۱۹۵۱ء میں انھیں "نجم الشعراء" کے خطاب سے نوازا گیا۔

والٹیر میں قیام کا زمانہ نجمی صاحب کی ادبی تربیت، کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے دوران قیام ہی نجمی صاحب نے اردو افسانے بھی لکھے اور متعدد مضامین بھی۔ ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر وہ کٹک آ گئے۔ اس وقت ان کی قائم کردہ بزم ادب سیاسی ہنگاموں کا شکار ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے کٹک آنے کے بعد "بزم سخن اڑیسہ" کی بنا ڈالی۔ اس وقت ان کی شاعری عروج پر تھی۔ وہ بزم سخن کے بانی تھے اور بقیہ حیات مذکورہ بزم کے صدر رہے۔

امجد نجمی کا اولین شعری مجموعہ "طلوع سحر" جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اور اس نے اڑیسہ کو ایک اردو علاقہ کی حیثیت سے ساری اردو دنیا کے ساتھ مربوط و منسلک

کر دیا۔ اس شعری مجموعہ کے مطالعہ کے بعد نیاز فتح پوری جیسے سخت گیر نقاد نے امجد نجمی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

" میں کبھی اس کی توقع نہ کر سکتا تھا کہ سرزمینِ اڑیسہ سے کبھی ایسا شاعر ابھر سکتا ہے جس کو اگر شمالی ہند کی صفِ شعراء میں بٹھا دیا جائے تو اس کی آواز سن کر ہم " توز خاصگان ماتی " کہنے پر مجبور ہوں۔"(۱)

مالک رام نے وفیات کے باب میں نجمیؔ صاحب کے متعلق لکھا ہے :۔

" ...... ان کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی لیکن انھوں نے محنت اور مطالعہ سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ بعض بزرگوں کی صحبت نے بھی مدد کی۔ بالآخر ان کا اردو کے قادر الکلام شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور میں اڑیسہ کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "طلوعِ سحر" (کٹک سنہ ۱۹۶۱ء) اور " جوئے کہکشاں" (کٹک سنہ ۱۹۶۹ء) نظم و نثر کا بہت سرمایہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ انھیں سنہ ۱۹۷۱ء سے ضیق النفس کی شکایت تھی۔ یہ بڑی گھلا دینے والی بیماری ہے۔ اس سے بہت نحیف و زار ہو گئے۔ ۲۱ر جنوری سنہ ۱۹۷۱ء(۲) کی شب میں ایک مشاعرہ سے واپس آتے ہوئے سردی لگ گئی۔ جاڑوں کا زمانہ، دمہ کے مریض اور اس پر انفلوئنزہ اور دردِ سر۔ اسی میں بروز جمعہ یکم فروری سنہ ۱۹۷۴ء دن کے ٹھیک ایک بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جمعہ کی نماز شروع ہونے سے پہلے خطیب نے حاضرین سے ان کی صحت کی دعا کے لیے درخواست کی تھی۔ اتنے میں یہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، تو نماز کے بعد ان کی مغفرت کی دعا کے لیے کہا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جمعہ کی فضیلت سے فیض یاب ہونے کے لیے فوری تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا۔ ان کے سب احباب کو اطلاع بھی نہیں دی جا سکی۔ اس کے باوجود جنازے کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ قدم رسولؐ (درگاہ بازار) کٹک میں قبل مغرب دفن ہوئے۔"(۳)

---

(۱) نیاز فتح پوری؛ تقریظات؛ طلوع سحر مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ء۔
(۲) کتابت کی غلطی ہے۔ سنہ ۱۹۷۴ء ہونا چاہیئے۔ ح ن۔
(۳) مالک رام؛ وفیات؛ مطبوعہ تحریر دہلی جلد ۸، شمارہ ۴، ص ۶۱

امجد نجمی کی وفات پر کئی لوگوں نے قطعات تاریخ کہے ہیں جن میں سے انیس امام کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے ؎

انیس! کیا کہوں تاریخ پردہ داریٔ دوست
بڑا ستم ہے حجابِ دل و نظر ہوتا

۱۹۷۴ء

فیاض گوالیاری نے کہا ؎

ہے دعائے مغفرت، فیاض! تاریخ وفات
"امجد نجمی ہو جزوِ شاخسارِ خلد" کہہ

نجمی صاحب کی شادی اپنے منجھلے چچا شیخ محمد یعقوب کی صاحبزادی زیب النساء سے ہوئی تھی۔ اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں جن میں سے دو چھوٹے بیٹے محمد رفیع اور محمد وسیع بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئے۔ نجمی صاحب کی حیات میں بڑے بیٹے محمد شفیع اور بڑی بیٹی نجمہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ نجمی صاحب دوسری تین بیٹیوں زینت، سعیدہ اور شاہدہ کی شادی کے لیے متفکر رہا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں لیکن سوء قسمت سے شادی کے چند ہی سال بعد ان کی بیٹی زینب طویل علالت کے بعد فوت ہو گئیں۔

امجد نجمی کا نام اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور اردو تحریک کی علامت ہے۔ انھوں نے نظم، غزل، مسدس، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مستزاد، شہر آشوب، سہرہ، نوحہ، نعت، حمد، منقبت، گیت، نظم معرّیٰ، آزاد نظم، غرض کہ تقریباً تمام قدیم وجدید اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور تفنن طبع کے لیے اپنی شاعری میں ظرافت کے پھول بھی کھلائے ہیں۔ البتہ رباعی یا قطعہ کہنے کی طرف ان کی طبیعت کبھی مائل نہیں ہوئی۔ کچھ اہل نظر انھیں غزل کا شاعر سمجھتے ہیں تو کچھ نظم کا۔ حالانکہ غزل کی تنگ دامانی نے انھیں نظم کی طرف مائل کر دیا تھا لیکن ان کے آخری دور کے کلام میں نظموں کی بہ نسبت غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اس دور میں انھوں نے جو بھی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں پابند نظموں کے مقابلہ میں نظم معرّیٰ کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے

کلام کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے حیاتِ انسانی اور اس کے پیچ وخم کی پوری تاریخ کا عرفان حاصل کیا اور اپنی دانشورانہ بصیرت اور بالغ نظری سے شاعری کا حق ادا کیا۔ انھوں نے تمدن ومعیشت کی نمائشی اقدار کے پیمانہ سے شاعری کی پیمائش نہیں کی بلکہ ادراک اور بصیرت سے اپنے مشاہدات کو بروئے کار لاکر دورِ جدید کے انسان کو زندگی کے المیوں سے باخبر کرنے کی کوششیں کیں۔

امجد نجمی غیر اردو علاقہ میں رہ کر بھی نصف صدی تک دادِ سخن دیتے رہے اور اپنے خونِ جگر سے عروسِ اردو کی مانگ سجاتے رہے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ افسانے لکھے اور ڈرامے بھی۔ رپورتاژ لکھے اور مکالمے بھی۔ تنقیدی مضامین لکھے اور انشائیے بھی۔ انھوں نے اڑیسہ کے اردو اسٹیج کو سنوارا اور نکھارا۔ خود اداکاری کی اور ہدایت کاری بھی۔ صوبہ اڑیسہ کے واحد ادبی مجلّہ "شاخسار" کے ذریعہ انھوں نے اپنی صحافت کے جوہر بھی دکھائے اور اسے پوری اردو دنیا کے سامنے ایک غیر جانب دار ادبی جریدہ کی حیثیت سے پیش کیا جس نے کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ جدید شعروادب کی بھی بھرپور نمائندگی کی۔

کرامت علی کرامت نے لکھا ہے :۔

"یوں تو پوری ادبی دنیا امجد نجمی کو ایک مسلم الثبوت شاعر اور ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے جانتی تھی لیکن شاخسار میں جب عبداللطیف عارف کے نام ان کے خطوط شائع ہونے لگے تو ادبی حلقوں میں ان کا امیج ایک ایسے عالم متبحر کی حیثیت سے ابھرا جس کی مثال ہندوستان بھر میں مشکل سے ملے گی ...... بہر حال یہ مکاتیب اپنی انفرادیت کی وجہ سے ابوالکلام آزاد اور منٹو کے خطوط کے بعد بیسویں صدی کی مکتوب نگاری میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔"(۱)

"طلوعِ سحر" امجد نجمی کی نظموں کا مرقع تھا لیکن "جوئے کہکشاں" میں نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں کے گل بوٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ امجد نجمی نے دونوں اصناف کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ برتا ہے۔ اور دونوں اصناف میں حیرت آفریں طور پر اپنی نفسیاتی کیفیت برقرار رکھی ہے۔ امجد نجمی کی شاعری کی اہم خصوصیت جو ان کی نظم اور غزل دونوں کا مشترک

---

(۱) کرامت علی کرامت: امجد نجمی عصریت اور ابدیت کے آئینہ میں: اضافی تنقید: ص ۳۲

اثاثہ ہے۔اس کے بارے میں سید حرمت الاکرام لکھتے ہیں:۔

" ان کے یہاں نظم اور غزل کی فضاؤں میں ایک نوع کی ہم آہنگی ملتی ہے اور یہ دونوں اصناف ان کے شہرِ سخن کے دو دروازے بن جاتے ہیں جو مختلف رخوں پر واقع ہونے کے باوجود ایسے ماحول کی جانب رہنمائی کرتے ہیں جہاں مناظر و مظاہر کی رنگا رنگی تو ہو سکتی ہے مگر اصل فضا بڑی حد تک ایک ہے۔" (۱)

امجدؔ نجمی کی غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

التفاتِ اوّلیں کی بات ہی کچھ اور ہے — مجھ تک ان کے بزم میں اب دورِ جام آیا تو کیا
اے ہجومِ نامرادی اے وفورِ یاس و غم — عشق میں کچھ لطفِ سعیِ ناتمام آیا تو کیا

آرزوئے دِل ابھی تک تشنۂ تفسیر ہے
تجھ کو نجمیؔ شیوۂ حسنِ کلام آیا تو کیا

رنگ و غنا کچھ نہیں چنگ و نوا کچھ نہیں — زندگی انسان کی غم کے سوا کچھ نہیں
مان لیا میں نے یہ، ننگ ہے میرا وجود — تیری مشیت تھی یہ، میری خطا کچھ نہیں

دل بھی ہمارا عجب محشرِ خاموش ہے
شور فغاں کچھ نہیں آہ و بکا کچھ نہیں

ضمیر پاک، خیال بلند، ذوق لطیف — بس اور اس کے سوا جوہرِ خودی کیا ہے؟
بجا کہ فرطِ جنوں نے ہمیں کیا رسوا — جمالِ یار میں آخر یہ دلکشی کیا ہے؟

عطا کیا تھا جو ذوقِ نمود اس دل کو
تو ہر قدم پہ یہ رنگِ شکستگی کیا ہے؟

امجدؔ نجمی مجموعی طور پر عزم و عمل اور رجائیت کے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن سے قنوطیت کی نشان دہی ہوتی ہے:۔

---

(۱) سید حرمت الاکرام: دیباچہ: جوئے کہکشاں: مطبوعہ ۱۹۶۹ء: ص ۹

حکایتِ غم پنہاں ہے ہر خوشی اپنی　　　کہ ایک دردِ مسلسل ہے زندگی اپنی
رنگ و غنا کچھ نہیں چنگ و نوا کچھ نہیں　　　زندگی انسان کی غم کے سوا کچھ نہیں

امجد نجمی نے اپنے دور میں اردو کی ہر تحریک کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے زمانہ میں ترقی پسندوں کا ساتھ دیا اور جدید شعری رجحانات کے دور میں جدید شعری رویّہ کا خیر مقدم کیا ہے لیکن کسی بھی جماعت کے ساتھ ان کی مقلدانہ وابستگی رہی ہے نہ کسی تحریک کی انھوں نے پیشوائی کی ہے۔ان کی وابستگی ہر تحریک کے ساتھ فنکارانہ سطح پر رہی۔ وہ جوشؔ، فراقؔ، حفیظؔ جالندھری اور شادؔ عارفی وغیرہ کے ہم عصر ہیں لیکن ان کے معاصرین میں کسی نے جدید شاعروں کو قابل اعتناء تصور نہیں کیا۔ لیکن امجد نجمی کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک کا رجحان روایتی شاعروں کی طرف تھا تو دوسرے کا جدید حیثیت کی طرف۔ ایک طرف ان کے ذہن و شعور کی جڑیں ماضی کی روایات میں پیوست تھیں تو دوسری طرف ان کی سیمابی کیفیت اور مضطرب طبیعت انھیں ہر طرح کی پابندی سے آزاد کر کے کشمکش اور جدوجہد کی سنگلاخ زمین سے گوہر معنی حاصل کرنے پر اکسا رہی تھی جس کے نتیجہ میں ان کی ایسی نظمیں وجود میں آئیں جو جدید شعری سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں:۔

ابھی باقی ہے وہی رنجِ فراق
وہی وحشت وہی آشفتہ سری
وہی افکار پریشاں وہی یاس و حرماں
وہی دھوکہ وہی خوابوں کا فریب
آہ محرومِ اثر
دردِ محرومِ علاج
ابھی باقی ہے شبِ تارِ حیات
ابھی باقی ہے وہی رنجِ فراق

(نظم: پیاسا)

عارضِ شب پہ مچلتی ہے بہارِ گیسو
یا شبِ تار نے بکھرا دیئے تارِ گیسو
زلفِ شب آکے رکی شب کی کمر تک گویا
یونہی لہراتی رہے گی یہ سحر تک گویا
برقعِ ابر میں تاروں نے چھپائے چہرے
رات کے سر پہ سیاہی کے بندھے ہیں سہرے
اب کہاں ماہِ منوّر کی وہ زرّین قبا؟
رات نے اوڑھ لی سر تا بقدم کالی ردا
در و دیوار سیہ، سایۂ گلزار سیاہ
ڈالی ڈالی ہے سیہ، پھول سیہ، خار سیاہ
قمقمے راہ کے یوں جلتے ہیں مدّھم مدّھم
شبِ تنہائی میں جیسے کوئی وقفِ ماتم

(نظم: شبِ طولِ الم)

امجد نجمی کا دامن فن کارانہ دانشمندی کے ساتھ زندگی کے پختہ شعور سے بھی مملو ہے جس کی مثال ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے دی جا سکتی ہے۔

گر ہمیشہ رہتا روشن آفتابِ زندگی — زندگی کو پھر کہاں ملتا خطابِ زندگی
مت سمجھ اس کو کہ ہے یہ چشمۂ آبِ بقا — الحذر غافل کہ یہ بھی ہے سرابِ زندگی
یادِ موت اک چاشنی ہے اسکی تلخی کے لئے — ورنہ کڑوی زہر سے بھی ہے شرابِ زندگی
زندگی اک خواب ہے بیدار ہو اس خواب سے
ملتی ہے بعد فنا تعبیرِ خوابِ زندگی

امجد نجمیؔ نے خارجی طور پر دوسروں کے غم میں شریکِ درد ہونے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ الم نصیب غمزدوں کا دلی اضطراب اپنے شعور کی تہوں میں محسوس کیا ہے جس کی مثال ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے دی جا سکتی ہے۔

تو حسن بن کے چمک یا شباب بن کے چمک | تو غم زدوں کا دلی اضطراب بن کے چمک
برسنا ہے تو برس بارشِ کرم بن کر | کسی کے سر پہ نہ برق عذاب بن کے چمک

امجد نجمی کے اس جذبۂ یک دردی سے متعلق کرامت علی کرامت کا کہنا ہے :-

"امجد نجمی کی شاعری کوئی پیغبری نہیں ہے لیکن ان کی شاعری ہماری اس عظیم تہذیبی روایت کا حصہ ضرور ہے جو सर्वे भवन्तु सुखिनः सर्वे संतु निरामया سے شروع ہو کر کبیر، نانک، غالب، اقبال اور ٹیگور کے یہاں سراپا انسانیت کا درد بن جاتی ہے..... جو شئے دوسرے شعراء کے یہاں ہمدردی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے وہی شئے امجد نجمی کے یہاں یک دردی EMPATHY کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ منفرد رویّہ انھیں اپنے ہم عصروں میں امتیازی حیثیت ہی نہیں عطا کرتا بلکہ ان کے بقائے دوام کی ضمانت بھی پیش کرتا ہے۔"(۱)

اس میں شک نہیں کہ امجد نجمی نے کلاسیکل ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں داغ اور امیر مینائی کا بول بالا تھا۔ وہ فطری طور پر ان سے متاثر ہوئے لیکن یہ اثرات ان کی ابتدائی دور کی غزلوں تک ہی محدود ہیں کیونکہ بعد میں ادبی شعور کی پختگی کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری کے تانے بانے اقبال سے جوڑے جس کے نتیجہ میں ان کی اکثر نظموں میں اقبال کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

امجد نجمی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے سید حرمت الاکرام رقم طراز ہیں :-

"غزل یا نظم امجد نجمی کی شاعری موضوعات کی تازگی وگیرائی اور جذبہ و فکر کی شدت و لطافت کے علاوہ تجربات کی وہ آنچ بھی رکھتی ہے جو کھوکھلے الفاظ میں روح پھونکتی ہے۔ انھوں نے دل کے لہو سے جو تابناک نقوش بناتے ہیں وہ انھیں اردو کے قدآور شعراء کی فہرست میں نمایاں تر اور بلند تر مقام دیتے ہیں۔"(۲)

۱۹۶۱ء سے امجد نجمی کو حکومت اڑیسہ کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف

---

(۱) کرامت علی کرامت : امجد نجمی ، مطبوعہ آج کل نئی دہلی ؛ بابت اگست ۱۹۷۴ء

(۲) سید حرمت الاکرام : دیباچہ ۔ جوئے کہکشاں ، جنوری ۱۹۷۹ء ؛ ص ۱۹

کے طور پر بقید حیات ادبی وظیفہ ملتا رہا۔ پرجاتنتر پر چار سیتی کٹک کی طرف سے انھیں اعزاز نامہ عطا کیا گیا۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "جوئے کہکشاں"، اُتکل یونی ورسٹی کے ایم اے اردو میں داخل نصاب ہے۔ "طلوع سحر" پر اڑیسہ ساہتیہ اکیڈمی سے انعام واکرام حاصل ہوا اور "جوئے کہکشاں" پر یوپی اکیڈمی کی جانب سے انعام عطا کیا گیا۔ "امجد نجمیؔ کی حیات اور ادبی خدمات" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر سید مسیح اللہ مسیحؔ (مرحوم) نے رانچی یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ امجد نجمیؔ کی یادگار کے طور پر شہر کٹک میں نجمی لائبریری اور نجمی اکیڈمی بھی قائم ہے۔

امجد نجمیؔ کی آخری غزل[(۱)]

چاند اُگتا ہے تو اُگنے دیجیے اسے ہر طرف چاندنی اپنی پھیلائے گا
اُجلی راتوں کی یہ دل کشی دیکھ کر کوئی تو آئے گا کوئی تو آئے گا

زندگی کیا ہے بازی ہے شطرنج کی جس کے مہروں کی رفتار ہے پیچ بھی
چوک اس میں اگر تجھ سے کچھ ہوگئی مات کھا جائے گا مات کھا جائے گا

ساقیٔ دلربا میری سن لے ذرا چاہتا ہے وہ جتنی تو اس کو پلا
رند بدمست ہو کر کرے بھی تو کیا تیرے گن گائے گا تیرے گن گائے گا

کہہ دو ارباب دار و رسن سے یہی، طاقت ضبط کافی ہے مجھ میں ابھی
ورنہ میں بھی اٹھاؤں جو بانگِ انا شور مچ جائے گا شور مچ جائے گا

دشت میں اس کی ہو یا چمن میں بسر اس کا شیرازہ جائے گا اک دن بکھر
لاکھ شبنم رکھے اس کو تازہ و تر، پھول مرجھائے گا پھول مرجھائے گا

یہ خلوص ایسا گل ہے جو کھلتا نہیں، آج کل یہ کسی میں بھی ملتا نہیں
اک حقیقت ہے یہ اس حقیقت کو تو کیسے جھٹلائے گا کیسے جھٹلائے گا

---

(۱) پیش نظر غزل کٹک کے شیشو بھون میں ڈاکٹر سید سیف اللہ کی رہائش گاہ پر منعقدہ مشاعرہ کے لیے امجد نجمی نے اپنی وفات سے تین دن قبل کہی تھی جو ان کی حیات شاعری کا آخری اثاثہ ہے۔

کیا کہا آج وہ میرے گھر آئیں گے؟ بخت خفتہ مرے اب سنور جائیں گے
چپکے چپکے کہو، ہولے ہولے کہو، کوئی سن پائے گا کوئی سن پائے گا

حسن والوں کا اتنا نہ پیچھا کریں، خواہش دید اتنی نہ موسیٰ کریں
برق گر جائے گی ہوش اڑ جائیں گے طور جل جائے گا طور جل جائے گا

وہ سنے گا نہ ہرگز کسی کی یہاں، وہ تو گویا ہے اک آفت ناگہاں
یار و محفل میں ناصح کو آنے نہ دو سب کا سر کھائے گا سب کا سر کھائے گا

سو برس بھی یہاں تو جئے گا اگر ایک دن باندھنا ہوگا رختِ سفر
اپنی اس زندگانیٔ فانی پہ تو کتنا اترائے گا کتنا اترائے گا

جھونکے بادِ صبا کے یہ خوشبو میں تر کالے کالے یہ بادل کے پیغامبر
نجمی تیرے لئے مژدۂ جانفزا کوئی تو لائے گا کوئی تو لائے گا

باب سوم

اڑیسہ میں اردو نثر کا ارتقاء

اڑیسہ ایک ایسا صوبہ ہے جہاں ہمیشہ سے مختلف تہذیبوں کی آمیزش ہوتی رہی ہے۔ اوراس آمیزش کی وجہ سے یہاں کی زبان وادب میں کئی خصوصیات پیدا ہوئیں۔ افغانوں اور مغلوں کے دور حکومت میں جب فارسی زبان کا رواج ہوا تو یہاں کے عالموں نے نہ صرف فارسی زبان میں مہارت پیدا کی بلکہ اسے شعری اظہار کا مؤثر وسیلہ بھی بنایا۔ جب اڑیسہ میں اردو کی آمد اور اس کے اثر ورسوخ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو مدتوں سے فارسی کی جگہ لے چکی تھی۔ اردو ایک عوامی زبان تھی جسے ہر مذہب وملت کے لوگ بہ آسانی سمجھتے تھے۔ اس طرح اردو کے متعلق جو معلومات فراہم ہوتی ہیں اڑیسہ کے دور دراز علاقوں تک اس کے تہذیبی عمل کی نشان دہی کرتی ہیں اور بہ نظر غائر دیکھا جائے تو کٹک ضلع میں جاج پور، بنجھار پور، بری، بردا، برہم بردہ، بالیا پال، سوجن پور، راجندر پور، مرزا پور، دھرم شالہ، منگل پور، متی ناتھ پور، چھٹا، قائمہ، نیول پور، درپن گڑھ، باتو، بالی چندر پور، چار ننگل، التی، دھان منڈل، سونگڑہ، کندرہ پاڑہ، لشچنت کوٹی، صالح پور، بہوگرام، معصوم پور، سونگڑہ، بلبھ پور، بالیا، رامکا پور، شکر پور، پدم پور، سات باٹیا، تینداکوڑہ، بالوبیسی، تل پاٹک، بارہ پور، اڑنگ، چاچھنا، جگت سنگھ پور، گتو بست، راوترا پور، کوریتی، ہلدی گڑیہ، سوکندہ، جے پور، دولت پور، تلدہ، تیپودہ، ڈیرہ بسی، کٹیا، بابو گاؤں (دیتوڈنگ)، اڑنگ، سندری موتہہ، ایاس، پھاچھنہ،

ڈول گرام، اولابر، آل، چودہ گلاٹ، کھنڈی پور، مونگ باڑی، تاراکوٹ، ڈولی پور، سپاریا، ساسندہ، مطیع آباد، پانی کوئیلی، سگڑی، راج کنیگا، ناندول، شبلنگ، اسریشور، شکر پاڑہ، مرزاپور، اوسنگ، چکنیا، کوجنگ، اگڑ سا، پہراج پور، رگھوناتھ پور، صادی پور، جھنکڑ، نیالی، پنا مونڈائی، مارشاگھائی اور پاٹ کورہ، چودوار، سات باٹیا، دس باٹیا وغیرہ۔

پوری ضلع میں بھونیشور، جدوپور، نیاگڑھ، رسول پور، خان پور، لتاہرن، بھنڈاگھر کٹکتا، بگت پور، مالاساہی، فقیر پاڑہ، کالاپاچن، نیالی، پیپلی (پیر پلی) دھوبست، بن مالی پور، گوندپور، گوپ، نیما پاڑہ، بسلی پاڑہ، جٹنی، خردہ، فتح گڑھ، دانو گھیر، مکند پرشاد، بان پور، جدوپور، پوری وغیرہ۔

بالیسر ضلع میں بالیسر، بستہ، جلیسر، روپ، بھوگرائی، بالیاپور، چنڈی پور، جسی پور، رمنا، باسودیو پور، ہلدی، پدا، سورو، بتیڑہ، بری، اڑاہاٹ، رگھوناتھ پور، ڈگر پاڑہ، رانجھ، سال پور، بونت، مالتیریا، رام چندر پور، اگر پاڑہ، بردہ، گھنٹ گڑیا، بھدرک، کاؤپور، گوندپور، بسنتیا، کادوبرنگ، سبرنگ، اندرائی، ڈول ساہی، علی نگر، پیرہاٹ، تیہڑی، مرزاپور، ماندپور، اندریہ، متو، کودوکانتی، بالی گاؤں، چاندبالی، گوجی درّہ، بشن پور، بے تال، سجھ پور، دھام نگر، سعید آباد، گوڑی پوکھر، دوبل، بہودرّہ، بیانگ، قادرلین۔

کیونجھر ضلع میں آنند پور، جھونپڑہ، رام چندر پور، سوسو، چمپوا، بڑہل، جوڈا وغیرہ۔

اور میور بھنج ضلع میں باری پدا، بینت تنی، سولیا پاڑہ، بنی سنگھا، رائے رنگ پور، بادام پہاڑ، بسوئی، گوروماہی سانی، ترنگ، کرنجیا، جسی پور، ٹھاکرمنڈا، اودلا، کھونٹا۔

ڈھینکانال ضلع میں ڈھینکانال، کاماکھیانگر، بھوبن، تال چیر، انگول، ہندول، آٹھ ملک۔

بودھ ضلع میں پھول بانی، جی اودے گیری۔

بلانگیر ضلع میں بلانگیر، لوئی سنگھا، سون پور، بیرمہاراج پور، ٹٹلاگڑھ، کانٹا بانجی، پٹناگڑھ،

کالاہانڈی ضلع میں کوراپٹ، جے پور، مالکان گیری، امرکوٹ، نورنگ پور، رائے گڑھ،

گون پور۔

گنجام ضلع میں برہم پور، سرڈا، بھنج نگر، آسکا، پارلاکھمنڈی، چھترپور وغیرہ۔

سمبل پور ضلع میں سمبل پور، کوچنڈا، برلا، ریگالی، برگڑھ، لائکرہ، جھارسون گڑھ، بالی جوڑی، برپالی، برج راج نگر، بادام پور، دیوگڑھ، ریڑھاکھول، ہیراکود، اتابیرہ، سوہیلا وغیرہ۔

سندر گڑھ ضلع میں راج گانگ پور، راؤرکیلا، بیر متر پور، سندر گڑھ، راس پترہ، بن ڈیگا، کھٹکور، بہل، کلنگا، بونائی گڑھ، رام پور، ہیم گری، بڑگاؤں، رائی بوگا، لیباری پاڑہ، بسرا، بانکی وغیرہ۔(۱)

اڑیسہ کے ان دور دراز تک بکھرے ہوئے علاقوں میں مدت مدید سے اردو کے چراغ روشن ہیں۔

جہاں تک اردو نثر کے ارتقاء کی بات ہے چند ہی لوگوں کے نام سامنے آتے ہیں، جن میں مولوی محمد سلطان راجی، شیخ غلام غوث، مولوی رحمت علی رحمت، مولوی عبدالرشید نقاد، امجد نجمی، پنڈت لکشمی نرائن مصرا، شیخ حبیب اللہ، نورالہدیٰ، سید منظر حسن دسنوی، کرامت علی کرامت، یوسف جمال، محمود بالیسری، یوسف پرویز، شیخ نبین اللہ، ظہیر اللہ نور، اطہر عزیز اور عبدالرزاق راہی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مولوی محمد سلطان راجیؔ

مولوی سلطان راجیؔ نے اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقاء میں اہم حصّہ لیا اور خاص طور پر مذہبی امور، جمعہ اور عیدین کے لیے ایک ہزار نوسو ستر اشعار پر مشتمل ۹۲ منظوم اردو خطبے لکھے۔ اور عید میلاد النبیؐ کے بارہ دنوں کی محفل میلاد چار ہزار پانچ سو تراسی اشعار پر مشتمل

---

(۱) اڑیسہ میں اردو کے ارتقاء کی تحقیقی مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں راقم الحروف کو مذکورہ بالا مقامات میں سے بیشتر میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ح ن

بارہ مجلسیں "مہتاب المجالس" کے نام سے تصنیف کیں۔ عام طور پر ایک ایسے شاعر کے لیے جو اپنے شاعرانہ وجدان کی پہنائیوں اور تخیل کی وسعتوں میں گم رہتا ہو، سنجیدہ نثر لکھنا امر مشکل ہوا کرتا ہے۔ لیکن مولوی محمد سلطان راجی کے سامنے مذہبی اور تہذیبی ارتقاء کی راہیں تصوف کے مدارج سے ہو کر گذرتی تھیں۔ ان کے سامعین راسخ العقیدہ، وحدانیت پرست اور دل کی گہرائی سے عاشق رسول تھے۔ اور ان کے قارئین کا حلقہ مذہبی رجحانات اور تصوف کا گرویدہ تھا۔ چنانچہ مولوی سلطان راجی نے نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے بیشتر آج نایاب ہیں۔ بڑی تلاش اور جستجو کے بعد راقم الحروف کو ان کی صرف تین کتابیں دستیاب ہو سکیں۔

۱۲۸۴ھ میں ان کی ایک کتاب "فصیح الحلال والحرام" مدراس کے مطبع مظہر العجائب سے شائع ہوئی تھی جس کے سرورق پر "از تالیفات مخزن الفضائل والمراتب مولوی محمد سلطان صاحب ساکن کٹک" درج ہے۔ مذکورہ عبارت سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ اس سے قبل بھی مولوی محمد سلطان راجی کی کتابیں شائع ہو چکی ہوں گی ورنہ "از تالیفات" نہ لکھا جاتا۔ ۶۰ صفحات پر مشتمل "فصیح الحلال والحرام" میں راجی نے آیات قرآنی کی روشنی میں حلال اور حرام کی حدود واضح کی ہیں۔

مولوی سلطان راجی کی دوسری کتاب "معرفت خدا و رسول" ہے۔ اس کتاب سے ایک خاص بات کی نشان دہی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ۱۲۸۷ھ ہجری مطابق ۱۸۶۷ء میں شہر کٹک میں اردو کا لیتھو پریس قائم ہو چکا تھا۔ کیونکہ یہ کتاب مطبع مظہر النصائح کٹک میں ۱۲۸۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا موضوع خدا اور رسولؐ کی درک و معرفت حاصل کرنا ہے۔ افہام و تفہیم کے لیے آیات قرآنی سے حوالے دیئے گئے ہیں۔

مولوی سلطان راجی کی ملفوظات میں جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس سے اڑیسہ میں اوائل انیسویں صدی میں مستعمل اردو زبان کی نشان دہی ہوتی ہے اور اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اردو کی املا اس زمانہ میں کس طرح لکھی جاتی تھی۔ نمونہ کے طور پر "معرفت خدا و رسول" کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ترجمہ۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول ہیں اللہ کے۔ اے مؤمنو! خوب جانو کہ خدا و رسول کی ذات کو معلوم کرنا اصل

ایمان ہی ۔اب سنو خدائی تعالےٰ کے ذاتِ پاک کو معلوم کرو کہ یہی ہی ۔ حَیٌّ عَلِیْمٌ قَادِرٌ مُّرِیْدٌ مُّتَکَلِّمٌ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ یعنی اللہ تعالیٰ زندہ ہی ۔زندگی اس کی غیر مخلوق ہی ۔اپنے سے آپ ہی ۔برابر ہی ۔قدیم ہی ۔باقی ہی ۔لافنا ہی ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مخلوق ہی ۔خدا کے پیدا کرنے سے ہی ۔مگر زندگی جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ویسی کسی اور مخلوق کی نہیں۔ اگرچہ دوسرے انبیاء علیہم السلام اپنے قبروں میں زندے ہیں نماز پڑتے ہیں بحکم حدیث شریف اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قبر شریف میں ایسے زندے ہیں کہ تمام امت کی حاجت روائی کرتے ہیں مشکل کشائی کرتے ہیں اگرچہ فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے سب کی حاجت روائی کرتا ہی "(۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے مولوی سلطان راجی کے ذہنی اور جذباتی رویوں کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنے ماحول کے عام مذہبی اور تہذیبی معتقدات کو غیر شعوری طور پر اپنا لیا ہے۔

"معرفت خدا و رسول" میں اردو املا کی جو شکل سامنے آتی ہے اس عہد کے اردو چلن سے زیادہ مختلف نہیں ہے ۔مثلاً یائے مجہول کی جگہ یائے معروف کا استعمال اور تذکیر و تانیث کا جو فرق سلطان راجی کی تحریروں میں رونما ہوتا ہے وہ علاقائی اثرات کی وجہ سے ہے کیونکہ اڑیسہ کی عام بول چال کی روزمرہ میں قواعد کے مطابق تذکیر و تانیث کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا جس کی مثالیں مذکورہ بالا عبارت سے بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) انبیاء علیہم السلام اپنے قبروں میں زندے ہیں ۔(قبروں کا بطور تذکیر استعمال۔)
(ب) خدا کے ربوبیت کا علم۔ (ربوبیت کا بطور تذکیر استعمال۔)
اِملا:۔ پڑتے بجائے پڑھتے۔
ہی بجائے ہے۔

"معرفت خدا و رسولؐ" کی زبان اگرچہ روزمرہ بول چال کی زبان نہیں ہے لیکن اس عہد کی ادبی زبان کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ عربی اور فارسی لفظیات کی کثرت کے باوجو

---

(۱) مولوی محمد سلطان راجی: معرفت خدا و رسول مطبوعہ ۱۲۸۶ھ در مطبع مظہر النصائح کٹک: ص ۲

اسلوب جاندار اور طرز تحریر عمدہ ہے۔ فارسی ترکیبوں اور مذہبی لفظیات نے معتقدات کی نئی جہتیں تلاش کی ہیں اور کئی جگہ مقامی اثرات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ اسلوب اور لفظیات کا رشتہ ماحول اور معاشرت سے اور ان کے سوا ان مقاصد سے جڑا ہوتا ہے جو لکھنے اور کہنے والے کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ مذہبی نثر ہے اور خدائی صفات کے بیان سے تعلق رکھتی ہے جس کا پس منظر الوہیت ہے، روحانیت ہے اور اسی کے ساتھ متصوفانہ ہے۔ اسی لیے اس کتاب کا عنوان بھی "معرفت خدا و رسول" ہے اور اس میں خدا کی ان صفات کا ذکر ہے جس کے ساتھ وہ ازلی اور ابدی ہے اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں جاری و ساری ہے۔ اس اعتبار سے صاحب تحریر نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ناگزیر تھے۔ لیکن ترجمہ کی زبان نسبتاً بہت سادہ اور سلیس ہے۔ اس کی سلاست اور روانی اس کی مقصدیت سے وابستہ تقاضے کی تکمیل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ مصنف 'اے مؤمنو!' کہہ کر ان عوام کو خطاب کرتا ہے جو اس کے حلقۂ تربیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عالم نہیں ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ان میں عام پڑھے لکھے لوگ بھی ہوں لیکن جو لوگ بھی رہے ہوں وہ ان الفاظ کو جانتے اور ان کے معنی کو پہچانتے ہیں۔

چونکہ اس طرح کی کتابیں عربی اور فارسی میں ہوا کرتی تھیں اور ان ہی کو سامنے رکھ کر ان کے مطالب عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اس لیے تحریر میں ترجمہ کا سا انداز آجانا ایک ناگزیر صورت ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بیشتر اس طرح کی کتابیں جو ترجمہ اور تلخیص کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں ایسے ہی اسلوب نگارش کی نمائندگی کرتی ہیں۔

مصنف نے اپنے موضوع پر بعض اہم کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اس ضمن میں "مدارج النبوت" کا ذکر کیا ہے۔ اس تحریر کا مطالعہ اس پہلو سے بھی کیا جانا چاہئے کہ اس میں حضور اکرمؐ کی ذات سے جن صفات عالیہ کو متعلق کیا گیا ہے اس طریقۂ رسائی سے ہم مصنف کے مخصوص علمی اور روحانی نقطۂ نظر سے بھی واقف ہو جاتے ہیں اور یہ جان سکتے ہیں کہ اڑیسہ میں روحانی اداروں کا فروغ کس طور پر ہوا اور ان کے ذریعہ عوام کی ذہنی تربیت میں کن وسائل و مسائل سے کام لیا گیا اور وہ کون لوگ تھے جن تک یہ بات پہنچ رہی تھی جس میں بزبان قلم یہ باتیں کی گئی ہیں۔

محمد یوسف

محمد یوسف کا تفصیلی تذکرہ باب دوم میں آچکا ہے۔ یوسف صاحب نے اردو میں تین ناول لکھے لیکن وسائل کی کمی کی بناء پر شائع نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنے فرزند امجد نجمی کے نام متعدد اصلاحی اور ادبی خطوط لکھے تھے جنھیں امجد نجمیؔ نے "نکہتِ باغِ یوسف" کے نام سے مرتب کیا۔ یہ قلمی نسخہ ایکسر سائز بک (۱۸ x ۲۳ سینٹی میٹر) ۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۱ سے صفحہ ۵ تک امجد نجمی کی تمہید ہے۔ صفحہ ۶ سے صفحہ ۴۸ تک محمد یوسف کے ۴۲ خطوط، صفحہ ۴۱ سے صفحہ ۶۵ تک اردو کلام اور صفحہ ۶۶ سے صفحہ ۷۱ تک فارسی کلام ہیں۔

تمہید میں امجد نجمیؔ رقمطراز ہیں:۔

" یہ خطوط جو اس کتاب میں اکٹھے کیے گئے ہیں میرے والد مرحوم کے ہیں جن کو آپ نے نہ کسی غیر مقام سے لکھا تھا اور نہ جن میں کسی کی مزاج پرسی یا اپنی خیر و عافیت کے متعلق کوئی ذکر ہے بلکہ جو ایک ہی مکان کے دو منزلہ سے جواب اور شرح کے بطور لکھ کر میرے نیچے کے کمرہ میں جہاں میں رہتا تھا بھجوا دیئے جاتے تھے۔ ان کی تحریر کا زمانہ ۱۹۱۹ء ہے۔"(۱)

اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں امجد نجمیؔ اپنی غزلیں ایک دوست کے توسط سے بغرضِ اصلاح والدِ محترم کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ یوسف صاحب اصلاح کے ساتھ ساتھ نوٹ کے طور پر خط لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ تمام خطوط علمی اور ادبی ہیں اور اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقا کے باب میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک خط میں جناب یوسف لکھتے ہیں:۔

"حمید.......

نجمیؔ کون ہے مجھے معلوم نہیں۔ اس کو میں نہیں پہچانتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص حضرت آتشؔ و حضرت ناسخؔ کا دیوان دیکھا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کی غزل میں ان حضرات کے کلام کی خوبو معلوم ہوتی ہے۔ مشق و مہارت سے درست

---

(۱) محمد یوسف: نکہت باغِ یوسف، مرتبہ امجد نجمیؔ: قلمی نسخہ ۱۹۲۶ء

ہو جائے گا بشرطیکہ پرانے پرانے اساتذہ کا کلام ہمیشہ دیکھا کرے اور اس پر لکھے۔ ان حضرات کی لمبی لمبی غزلیں ان کے دیوانوں میں بھری پڑی ہیں۔

پرانے استادوں کا کلام تو آج کل نہیں رہا۔ ایک حضرت میرؔ ہیں جنہوں نے اردو شاعری دہلی، لکھنؤ وغیرہ بلکہ تمام ہندوستان میں پھیلائی۔ ان کے کلام میں پرانے الفاظ اور دکنی محاورے بہت ہیں جو آج کل کے نئی روشنی والوں کے پاس متروک ہیں۔ ذوقؔ کا کلام بھی بہت اچھا ہے۔ صاف بول چال تو ادھر کو نکلی۔ پرانے استادوں میں حکیم مومنؔ خاں، ذوقؔ، غالبؔ اور نئے استادوں میں داغؔ، جلالؔ، شمشاد وغیرہ ہیں۔ حضرت ذوقؔ تو شاہ ظفرؔ کے استاد تھے اور امیرؔ و داغؔ کے بھی رہ چکے ہیں۔ اب ادھر کو نئے شاعروں کی بھر مار ایسی ہو گئی ہے کہ راستے کے ڈھیلوں کے برابر ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ زبردستی کی شاعری کرنا قدر دوں کے آگے اپنی قدر گنوانا ہے۔ ازیں سبب ہم نے آج کو بیس بائیس سال ہوئے شعر گوئی چھوڑ دی ہے۔

انشاء اللہ خاں کا کلام لٹ پٹی دستار کے مانند ہے۔ کلام وہ اچھا جو بول چال اور بامحاورہ ہو۔ آمد اور آورد کا فرق صبح بیان ہو چکا۔ سوداؔ بھی ایک پرانا شاعر تھا۔ ان تمام استادوں کے دواوین جو میرے پاس تھے۔ اب نہیں ہیں۔ شاید امجد نے رکھے ہیں۔

تم کو شاعری کا شوق ہے تو پرانا کلام دیکھو اور معظم کے شاگرد رشید سنبھل پور میں بن بیٹھو۔ معظم صاحب کہتے تھے ان کے والد کا تخلص مجرمؔ تھا۔ ہمارے باپ دادا اور نانا یہ سب شاعر تھے۔ ان کا کلام اب نہیں رہا۔ عبداللہ یعنی بابا کا لڑکا شاعر ہو گا۔ وہ ابھی سے اڑیا زبان میں تک بندی کرتا ہے۔"(۱)

محمد یوسف کے مندرجہ ذیل خط اور اس کے اسلوب سے ان کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے:۔

"حمید۔۔۔۔۔۔

مؤلف کتاب محاورہ نے جو شعر چھاتی پر پتھر رکھ لینے کی مثال میں دیا ہے وہ کسی استاد

---

(۱) خط نمبر ۲ نکہت باغ یوسف، ص ۹

کا نہیں معلوم ہوتا۔ مؤلف کا خود ساختہ ہوگا جو زبردستی ٹھونس ٹھانس کر کہا گیا ہے۔ چھاتی پر پتھر رکھ لینے کا حکیم مومن خاں کا ایک شعر ہے جو مجھے اب یاد آیا۔ امجد کے پاس مومن کا دیوان ہے، منگا کر دیکھ لو۔ مگر مومن کا کلام سمجھنا کوئی آسان کام نہیں۔ مومن کا شعر یہ ہے ؎

رکھ لیویں گے پتھر مگر ان سنگدلوں کو
چھاتی سے لگانے کی تمنّا نہ کریں گے

پہلے مصرع میں معلوم نہ ہوگا کہ پتھر کہاں رکھ لیں گے۔ یہاں چھاتی پر حذف ہے۔ مثال میں کسی استاد کا کلام ہوتا تو مزہ دیتا۔ دیکھو امیر اللغات میں تمام استادوں کے کلام سے ہر محاورہ لبریز ہے۔ امیر اللغات کی پہلی جلد امجد کے پاس ہے۔ دوسری چھ سات جلدوں پر پانی پھر گیا یعنی گم شد۔ اب نایاب ہے۔ ملے بھی تو قیمت زیادہ سے زیادہ۔ مگر روپیہ کس کے پاس ہے جو اب منگائیے۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ ہاں تمھارے ایسے نئے شاعر کو ضرورت ہو تو منگا لو۔ میں بھی ذرا اپنی آنکھیں روشن کرلوں۔"(۱)

"حمید......

غزل دیکھ کر امجد کے ہاتھ واپس کردی گئی۔ شاعری کچھ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے۔ شاعری کو سحر حلال بلکہ علم لدنّی کہتے ہیں۔ آدمی سراپا خیالات کا پتلا بن جاتا ہے۔ کھانا پانی اچھا نہیں لگتا۔ مشق و مہارت اور تحریر و مطالعہ سے خیالات کی پختگی ہوتی ہے۔ شعر خود بخود القاء اس کے دل میں ہوتے ہیں جن کو وہ طرحی مصرعے خیال کرکے ان پر غزل لکھنے تیار ہو جاتا ہے۔ اس مشق و مہارت اور تحریر و مطالعہ سے زبان میں آمد پیدا ہوتی ہے اور طبیعت چھلانگ مارنے لگتی ہے کہ کب ذرا فرصت ملے اور غزل لکھ ڈالوں۔ اس کے لئے ایک دم سے فرصت کی زندگی چاہئے۔ وساوس سے فرصت دنیا میں کب کس کو ملتی ہے اور خاص کر ہم ایسے لوگوں کو۔ بے فکری کے زمانہ میں حیدرآباد کے نواب کا ایک مصرعۂ طرحی ؏

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

آیا تھا تو ایک دن میں ہم نے دو سو سے زیادہ شعر لکھ ڈالے تھے اور خواب میں بھی یہ شعر

---

(۱) خط نمبر ۷، نگہت بارغ یوسف: ص ۱۱

ندا گورِ غریباں سے یہ آئی
علم آباد کی منزل کڑی ہے

کہتا ہی تھا کہ میرے نوکر نے آکر اٹھایا کہ فلاں شخص تو کر مر گیا۔ چلو خیر.......
افیون کی طرح یہ بڑی منحوس چیز بھی ہے پھر عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتی ۔"(۱)

محمد یوسف نے ذیل کے خط میں جلن کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے فرزند امجد نجمی کو لکھا تھا:۔

"امجد........

جہنم جلنے کے یہ معنی ہیں کہ جب خداوند کریم گنہگار کو بخش دیتا ہے تو جہنم اس سے رشک کرتا ہے کہ یہ گنہگار میرے حصہ میں کیوں نہیں آیا اور بہشت میں کیوں داخل کیا گیا۔ مجھ میں آتا تو ٹھیک تھا۔ یہ سبب ہے کہ بہشت سے جہنم رشک کرتا ہے۔ یا یوں سمجھو یہ جلنا محاورہ ہے جیسے وہ مجھ سے جلتا ہے گویا اس کو مجھ سے دلی بغض یا دشمنی یا عداوت ہے کہ وہ مجھکو دیکھ نہیں سکتا یعنی خدائے قدوس جس کو بخش دیتا ہے وہ بہشت میں داخل کیا جاتا ہے تو جہنم اس کو دیکھ کر جلتا ہے یعنی رشک کرتا ہے۔ اپنی ناکامی کسی کو گوارہ نہیں۔ ازیں سبب بہشت کامیاب ہوتا ہے تو جہنم اس کو دیکھ کر جلتا ہے۔ پہلا مصرعہ صاف ہے۔ معنی و مطلب لکھنا درکار نہیں ۔"(۲)

شیخ غلام غوث

(ولادت ۱۸۸۴ء وفات ۱۹۶۰ء)

شیخ غلام غوث قصبہ راؤترا پور ضلع کٹک میں ۸ ردسمبر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۱ پشت اوپر ان کا خاندان لکھنؤ کے نواح میں واقع ایک گاؤں بدیہہ سے شہنشاہ اکبر کے عہد میں فوجی

---

(۱) خط نمبر ۸، نگہت باغِ یوسف، ص ۱۲
(۲) خط نمبر ۱۰ : ایضاً : ص ۱۳

کی حیثیت سے اڑیسہ میں وارد ہوا۔ آخری پشتیں قصبہ راوتراپور میں مقیم ہیں۔ شیخ غلام غوث نے ۱۹۰۶ء میں کلکتہ یونی ورسٹی کے زیر اہتمام راونشا کالجیٹ اسکول کٹک سے انٹرنس امتحان پاس کیا اور کسب معاش کے لیے ڈاک خانہ میں بطور کلرک ملازمت کا آغاز کیا اور حسن صلاحیت کی بنا پر ترقی کرکے پوسٹل انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ کچھ عرصہ تک کٹک کے جنرل پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر بھی رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوکر طویل عرصۂ حیات کے بعد ۲۹ اپریل ۱۹۶۰ء کو کٹک میں وفات پائی اور قدم رسولؐ میں مدفون ہوئے[1]

شیخ غلام غوث کی نثری تصنیفات میں (۱) نبیؐ العربی۔ حضورؐ کی سیرت پاک۔ (۲) محرم پر ایک کتابچہ اور (۳) شہادت حسین پر ایک مسودہ دستیاب ہے۔ ویسے شیخ غلام غوث مسلم گزٹ اور دوسرے اردو اخبار و رسائل میں بھی لکھتے رہے ہیں۔

"نبی العربی" پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک کے مختصر حالات پر مبنی ڈیمائی سائز کے ۶۸ صفحات پر مشتمل ایک نثری تصنیف ہے جو ان کے برادر کلاں مولوی شیخ منصور بی اے۔ بی ایل۔ سکریٹری انجمن اسلامیہ راوتراپور ضلع کٹک کے زیر اہتمام کاشی رام (سابق نول کشور) پریس لاہور میں ستمبر ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔

دیباچہ میں مولوی منصور رقمطراز ہیں:-

> "عام فہم اردو زبان میں آں حضرتؐ کی سوانح عمری کا ایک مختصر رسالہ اس ملک اوڑیسہ کے عوام الناس اور خصوصاً مدرسوں کے کم سن طلباء کی خدمت میں پیش کرنے کا خیال بہت روز سے میرے دل میں گذرا تھا۔ اسی عرصہ میں میرے برادر عزیز مولوی شیخ غلام غوث صاحب نے آنحضرتؐ کی زندگی کے حالات پر ایک مختصر مضمون اردو زبان میں لکھ کر میرے پاس روانہ کیا۔ اس کی زبان سلیس اور عام فہم ہے اس لئے میں اپنے دلی مدعا کو پورا کرنے کے خیال سے اس مختصر رسالہ کو شائع کرکے ناظرین کے پیش نظر کرتا ہوں اور ذات باری سے مجھ کو امید واثق ہے کہ یہ اپنی اصلی غرض کو پورا کرے گا

---

(۱) ماخذ: راقم الحروف کے نام شیخ انور حسین ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ سینٹرل اکسائز اینڈ کسٹم (خلف غلام غوث مرحوم) کا خط مورخہ ۸ ۱۲/۸۴ ء

اور عام اردوداں برادران اہل اوڑیسہ اور طلباء مدارس اس سے فیض حاصل کریں گے۔"(۱)

شیخ غلام غوث کے اسلوب نگارش کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

"آپ کو ابتدا ہی سے رؤیاء صادقہ نظر آیا کرتے تھے۔ رات کو جو خواب میں دیکھتے دن کو ویسا ہی وقوع میں آتا تھا۔ آپ کے ہر فکر و خیال میں خدا ہی کا تصور رہتا تھا۔ نکلتے ہوئے آفتاب، برستے ہوتے پانی اور اگتی ہوتی روئیدگی میں آپ کو خدا ہی کی ہستی و قدرت نظر آتی تھی۔ دریا کی موج، بادل کی گرج و طیور کی نغمہ سرائی میں حمد الٰہی و وحدانیت ہی کی آواز آپ کو سنائی دیتی تھی۔ سنسان بیابان جنگلوں میں ویرانے شہروں کے خرابات میں خدا کے غضب کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ آپ کی طبیعت غور و فکر کی طرف بہت ہی مائل رہتی تھی اور تنہائی میں بیٹھ کر خدا کا دھیان کرنا آپ کو بہت پسند تھا۔ آپ دل ہی دل میں سوال کیا کرتے تھے کہ میں کون ہوں؟ دنیا کیا ہے؟ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اور موت کیا ہے؟"(۲)

"حضور انور رسول مقبول محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے وہ دس سال جو مدینۂ منورہ میں گذرے اہم واقعات سے پر تھے۔ مکہ معظمہ میں آنحضرتؐ کی زندگی کا اکثر حصہ اشاعت اسلام اور لوگوں کی اخلاقی اصلاح میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن مدینہ پہنچنے کے بعد ان کاموں کے سوا اور بہت سی دوسری مہمات کی انجام دہی بھی آنحضرتؐ کے ذمہ ہو گئی۔ اس وقت مسلمانوں کے دشمن اور بھی بڑھتے گئے۔ ان کی طرف سے متواتر سازشیں، حملے اور لڑائیاں یکے بعد دیگرے ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لئے ان کا مقابلہ کرنا پڑا جن میں معرکہ آرائی کی تدبیروں کا تمام بار افکار آنحضرتؐ ہی پر تھا۔"(۳)

"آنحضرتؐ مکارم اخلاق و محاسن اعمال کا نمونۂ کامل تھے۔ آپ انسانی قویٰ کی تربیت

(۱) شیخ غلام غوث : نبی العربی مطبوعہ ۱۹۱۹ء : کاشی رام پریس لاہور : ص ۲

(۲) شیخ غلام غوث : نبی العربی مطبوعہ ۱۹۱۹ء ، ص ۹

(۳) ایضاً ایضاً ، ص ۳۳

میں اعلیٰ مراتب طے کر چکے تھے اور جسمانی اور روحانی ترقیوں اور فتوحات کے سرچشمہ سے سیراب ہو چکے تھے۔ کمالات نبوت کے تمام مدارج آپ پر ختم ہو چکے ہیں۔ آپ نے کافروں سے جس قدر لڑائیاں کیں وے صرف دشمنوں کے مظالم سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے تھیں۔ آپؐ نے جبراً کسی کو مسلمان نہیں کیا........ دنیا میں اسلام جو پھیلا ہے وہ صرف وعظ و نصیحت کے ذریعہ ہوا ہے۔ آپؐ نے سخاوت، شجاعت، ہمدردی، امانت، استقلال، ہمت، فصاحت، فہم، حلم و عفو وغیرہ تمام انسانی کمالات میں ایسی بے نظیر مثالیں قائم کی ہیں کہ اس کا زندہ نمونہ دنیا کے تمام لوگوں کے لئے آئینہ رہنما ہے۔ مسلمان تو آں حضرتؐ کو خدا کا برگزیدہ نبی مانتے ہیں مگر بڑے بڑے عالی دماغ غیر متعصب عیسائیوں نے اب تک جو آنحضرتؐ کی پاک زندگی پر رائے زنی کی ہے .... آپ کو نبیؐ برحق قرار دیتے بغیر نہیں رہ سکے۔"(۱)

"نبی العربی" کے ناشر نے دیباچہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسلوب کی حد تک صحیح ہونے کے باوجود غلام غوث کی زبان اور ان کی لفظیات میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات کے ساتھ فارسی ترکیبوں کا وافر استعمال ملتا ہے اور کہیں ایسے بھی الفاظ آتے ہیں جو موقع محل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً:۔

(الف) .... اس طرح حضورؐ کے دم قدم کی برکت سے سب فساد دفع ہو گیا اور لوگ بہت خوش ہوتے۔ (ص ۸)

(ب) وادیٔ مکہ کے گرم ریت میں لٹا دیتے اور ان کی چھاتی پر پتھر کی سلیں رکھ دیتے۔ (ص ۱۶)

(ج) حضرت عثمانؓ کو ان کے چچا کھجور کی صف میں لپیٹ کر باندھ دیتے اور نیچے سے دھواں دیتے۔ (ص ۱۷)

(د) وہ عنقریب دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں جا داخل ہو گا اور اس کی جورو بھی جو لکڑی بجھائی کرتی پھرتی ہے۔ (ص ۲۰) (لگائی بجھائی ہونا چاہئے۔ ح ن)

(ر) یثرب پر پہنچ کر آپ نے شہر کے باہر ایک گاؤں میں جس کا نام قبا ہے قیام فرمایا۔ (ص ۳۲)

(ز) لوگ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر قبا میں پہنچے۔ (ص ۳۲)

(س) یہاں سب آدمیوں کے ساتھ آپ نے نماز جمعہ ادا کی اور ایک شیریں پر درد وخطبہ

---

(۱) شیخ غلام غوث:۔ نبی العربی مطبوعہ ۱۹۱۹ء:۔ ص ۶۵

پڑھا۔ (ص ۳۲)

(ش) ...... اوراسلام کے دشمنوں کی مدافعت کے لئے مجبوراً میان سے تلواریں نکال لیں۔ (ص ۳۵)

(ص) اکثر آنحضرتؐ لڑائیوں میں خود شریک ہوتے اوراسلام کی ترقی میں اپنی جان و صال فدا کرتے (ص ۳۴) [1]

فارسی تراکیب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(الف) آپؐ نے دعا کے ساتھ اپنا لبِ دہن مقامِ درد پر لگادیا۔ (ص ۳۰) [2]

(ب) مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ڈیڑھ ہزار مہاجر و انصار بخیالِ طوافِ خانۂ کعبہ روانہ ہوئے۔ (ص ۴۷)

(ج) علاوہ اس کے آپؐ نے اور والیان ملک کو بھی دعوت اسلام دی جن میں سے اکثروں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ (ص ۵۰)

(د) نکلتے ہوئے آفتاب، برستے ہوئے پانی اور اگتی ہوئی روئیدگی میں آپ کو خدا ہی کی ہستی و قدرت نظر آتی تھی۔ (ص ۹)

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ غلام غوث نے زبان کی شگفتگی اور روانی کی طرف زیادہ توجہ نہ دے کر موضوع کو زیادہ سے زیادہ جاندار اور پر اثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم نبی العربی کے اظہار و بیان کو اس عہد کے تناظر میں دیکھا جائے تو زبان کا استعمال قابل قدر کہا جاسکتا ہے۔ اور جیسا کہ کہا گیا ہے موضوع کی تنگ دامنی کے پیش نظر زبان میں مزید لطافت چاشنی اور بوقلمونی کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ یہ کتاب اس دور میں اُڑیسہ کی اردو نثری تصنیفات میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء میں اہم رول ادا کرتے ہوئے تہذیبی سلسلوں کو روشن کرتی ہے۔

---

(۱) 'جان و مال' ہونا چاہئے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ ح ن

(۲) لعاب دہن ہونا چاہئے۔ ح ن

مولوی رحمت علی رحمت

مولوی رحمت علی رحمت کا تذکرہ بالتفصیل پچھلے باب میں آچکا ہے۔ مولوی صاحب موصوف ایک پرگو شاعر اور صاحب طرز نثر نگار گذرے ہیں۔ ان کی نثری نگارشات میں "رفیق العقل" قابلِ اعتنا، ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ قلمی نسخہ جو ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے مولوی صاحب کے خلف رشید کرامت علی کرامت کے پاس محفوظ ہے۔ یہ تصنیف ۱۹۱۴ء کی ہے جس زمانہ میں مولوی رحمت علی انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اس تصنیف میں عقلی دلائل کی روشنی میں اسلامی اصول کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

ان کے اسلوب تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"یہ عیب نکالنا کہ خدا نے کیوں بدی کو پیدا کیا، بجائے اس کے کہ خدا کی ذات میں نقص لازم کردے الٹا خدا کی قدرتِ بے پایاں کا پتہ بتا رہا ہے۔ سچ ہے، جب تک دو چیزیں آپس میں نسبت نہ دی جائیں ایک کی فضیلت دوسرے پر سمجھ میں آ نہیں سکتی۔ دو متضاد صفتوں سے چیز کی وقعت نظر میں زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا میں اگر سب ایک ہی رنگ اور شباہت کے ہوتے تو اس کے بنانے والے کا کمال ظاہر نہیں ہوتا۔ دنیا میں جتنے آدمی ہیں سب اگر ایک صورت رکھتے تو صورت کی قدر ہی نہیں رہتی اور خوب صورتی کسی چیز کا نام نہیں رہتا لیکن اختلاف صورت اور شکل ہمارے ذہن کو ہر وقت خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم لوگ بعض جانور کی آواز سے وجد میں آجاتے ہیں اور بعض جانور کی آواز سے نہایت پریشان ہوتے ہیں، یہاں تک کہ کان میں انگلی ٹھونس لیتے ہیں۔ بلبل کی آواز کو ہم ہرگز اچھی نہیں کہہ سکتے جب تک نہ ہم اس آواز کو کوّے کی کرخت آواز سے نسبت نہ دیتے۔ غرض چیزوں کی اچھائی اور برائی کی شناخت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ خدا نے بدی پیدا کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس میں بدی پیدا کرنے کی ایک قوت ہے اور اگر بدی پیدا کیا نہ ہوتا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ خدا میں ایک قوت کی کمی ہے تو وہ کامل کب ٹھہر سکتا ہے۔ کیونکہ کامل اسی کو کہتے ہیں کہ جس میں ذرّہ بھر نقص نہ ہو۔

دنیا میں اگر فقط نیکی ہی ہوتی تو لوگوں کو یہ خیال کرنے کا موقع ملتا کہ ہر چیز بذاتِ خود قائم ہے کسی کا اس پر تصرف نہیں ہے۔ پہلے یہ اعتراض کہ خدا نے کیوں ایسا کیا اور کیوں ایسا نہ کیا سراسر کفر ہے اور جب خیال کفر انہ ٹھیرا تو دوسری باتوں کا کیا ٹھکانہ؟ آدمی پوچھ سکتا ہے کہ خدا نے کیوں ہم کو پیدا کیا؟ ہم خدا کو خوشامد کرنے گئے تھے؟ خدا ہمیں ایسے لغو اور باطل خیالات سے محفوظ رکھے۔

خدا نے ہم لوگوں کو انعام دینے کے لئے پیدا کیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جب آدمی محنت نہیں کرتا، تکلیف نہیں جھیلتا، لڑائی میں فتح حاصل نہیں کرتا۔ دشمن کو مار نہیں ہٹاتا تب تک وہ انعام کا مستحق نہیں ٹھیرتا۔

خدا نے انسان کو دو مختلف قوتوں کے اندر چھوڑ دیا ہے۔ ایک نیکی کا رجحان اور ایک بدی کا رجحان۔ اب انسان کو اختیار ہے کہ وہ دونوں قوتوں میں سے جس کی طرف چاہے ہو جائے۔ اگر وہ نیکی کی طرف داری کرے تو نیک اجر پائے اور اگر بدی کی طرفداری کرے تو بدا اجر پائے۔ بندہ نیک ہو کر خدا کی ذات میں کچھ صفت نیک نہیں لگا دیتا اور برا ہو کر خدا کی ذات میں نقص بھی نہیں لگا سکتا۔ ہم بدی کا ایک پہلو یوں لے سکتے ہیں کہ دنیا میں خدا نے کسی چیز کو برا پیدا نہیں کیا لیکن اس چیز کی اچھائی یا برائی جائز یا ناجائز طریقۂ استعمال پر منحصر ہے۔ کم سن لڑکا نہ گنہگار کہلا سکتا ہے نہ عابد اور متقی۔ اس کی فطرت نہایت سادی ہوتی ہے۔ جب اس فطرت سے استعمال کرنا سیکھتا ہے تب ہم اس کو نیک یا بد کہا کرتے ہیں۔ (چنانچہ) اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا نام بدی ہے۔"(۱)

اس تحریر میں جو عقلیت پسندی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ ایک منطقی طرز اظہار پیدا ہوا ہے بلکہ یہ انداز نظر سرسید کے اثرات کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ جس طرح ہم سرسید کی نثر کو سادہ اور علمی نثر کے ارتقا میں ایک اہم نشان راہ قرار دے سکتے ہیں، یہی صورت اُڑیسہ یا مشرقی علاقوں کے لیے اس نثر کی بھی ہے۔ اس میں جتنے بھی الفاظ لائے گئے ہیں وہ اپنی جگہ پر ضروری ہیں اور ان سے مناسب حدود میں بحث کو پھیلانے اور مسائل کو پیش کرنے کا علمی کام لیا گیا ہے۔ خود یہ بحث بھی اس ذہنی طریقۂ رسائی کی طرف اشارہ ہے جو جذبات

---

(۱) مولوی رحمت علی رحمت: رفیق العقل: قلمی نسخہ ۱۹۱۳ء: ص ۲۱۶ تا ۲۱۹

اوراحساسات کے لاوے سے گذر کر سنجیدگی، سادگی اور سلاست کی طرف آرہا ہے۔ اس سے اردو نثر کو نیا لب ولہجہ اختیار کرنے میں مدد مل رہی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد جو سرسید کے معاصرین میں ہیں ان سے مؤلف کی ذہنی وابستگی کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ انھوں نے "توبۃ النصوح" کا اڑیا میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں سرسید اور ان کے معاصرین کی تصانیف موجود رہی ہیں۔ شعروسخن میں وہ اکبرالٰہ آبادی کے پیرو تھے۔ ان تاریخی سچائیوں کا اثر ان کے ادبی اسلوب میں بھی موجود ہے۔ ایسے کچھ لوگ ضرور رہے ہوں گے جن کے خیالات کا جائزہ اور جن کے اعتراضات کا جواب اس تحریر میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں دو تین مقامات کو چھوڑ کر کہیں بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ مصنف معیاری اردو پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔

اس ضخیم کتاب (۴۲۳ صفحات) میں شروع سے آخر تک جذباتی رویّہ کے بجائے علمی طریقۂ گفتگو سامنے آتا ہے اور اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء میں یہ تصنیف اس اعتبار سے بطور خاص اہم قرار دی جاسکتی ہے کہ اس کی نثر علمی نثر ہے۔ جس پر ادبیت کی وہ گہری چھاپ نہیں جو اس کا رشتہ منطقی اسلوب سے توڑ کر اسے رومانوی اسلوب یا پھر کلاسیکی طریقۂ نگارش سے قائم کردے جس میں الفاظ کی بہتات اور بسا اوقات مترادفات کی بھرمار ہوتی تھی۔

مولوی عبدالرّشید نقّادؔ

(ولادت ۱۸۹۸ء)

مولوی عبدالرشید نقّادؔ کے والد کا نام عبدالغنی تھا۔ وطن جولاساہی شہر کٹک۔ نقّادؔ کی تاریخ ولادت ان کے والد کی ڈائری میں تحریر شدہ عبارت کے مطابق ۱۱ر ربیع الاول ۱۳۱۶ھ روز چہارشنبہ بوقت شب اندازی دو گھنٹہ بتاریخ دہم ماہِ اگست ۱۸۹۸ء ہے۔ نقّادؔ کے والد کی یہ ڈائری مولوی عبداللطیف عارف کے پاس محفوظ ہے۔ مؤلف آبِ خضر نے نقّادؔ کی تاریخ ولادت ۴ر اپریل ۱۸۹۸ء[1]

---

(۱) کرامت علی کرامت، آبِ خضر ۱۹۶۳ء: ص ۱۶۸

لکھی ہے جو مذکورہ ڈائری کی تحریر کے پیش نظر غلط ہے۔ نقاؔد کی ولادت اپنے ننیہال بہراج پور ضلع کٹک میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوتی۔ میٹرک تک کی تعلیم سعید سیمنری کٹک میں حاصل کی۔ مدرسہ سلطانیہ کٹک اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے عربی زبان وادب اور مذہبی علوم میں درس عالیہ حاصل کیا اور بہار مدرسہ اکزامنیشن بورڈ سے فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ مدرسہ سلطانیہ کٹک میں ملازمت کا آغاز ہوا۔ کچھ دنوں کے لیے سعید سیمنری کٹک میں بھی مدرس رہے لیکن اسکول میں درس وتدریس کی فضا راس نہ آئی اس لیے سیمنری کی ملازمت ترک کرکے پھر سے مدرسہ سلطانیہ میں مدرس اول کے فرائض مدت تک انجام دیتے رہے۔ اور بالآخر یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور عربی ادب میں نقاد کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی صدیقہ (صدنو) (زوجہ حافظ میر ممتاز علی) ہیں۔ بیوی کے انتقال کے بعد عقد ثانی کیا۔ دوسری بیوی سے عبدالوحید، عبدالاحد، عبدالحی، عبدالصمد اور عبدالشہید پانچ اولاد نرینہ باحیات ہیں۔ نقاؔد شخصی زندگی میں نہایت قناعت پسند صوفی بزرگ ہیں۔ اردو شعروادب اور صحافت سے انھیں خاصی دلچسپی رہی ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب اور صحافی ہیں۔ ان کی شاعری کے باب میں کرامت علی کرامت لکھتے ہیں:

"اقبال نے غزل کے قالب میں جو روح پھونکی تھی، اس کی خوب صورت پیروی عبدالرشید نقاؔد کی غزل گوئی میں نظر آتی ہے۔ اس لیے نقاؔد کے کلام میں قنوطیت کے بجائے رجائیت پائی جاتی ہے۔ فراریت کے بجائے نئی زندگی اور نئی توانائی پائی جاتی ہے۔ نقاؔد اپنے عزم وعمل پر پوری طرح یقین واعتماد رکھتے ہیں اور عقل کو دل کے مقابل میں ناقص تصور کرتے ہیں۔"(۱)

مولوی عبدالرشید نقاؔد نے کٹک سے اردو کے ایک ہفت روزہ "دورجدید" کا اجراء کیا تھا جس میں عام طور پر صوبائی خبریں اور خاص طور پر مسلمانوں کے معاشی وسماجی مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ ہفت روزہ کٹک کے لکشمی نرائن پریس سے ٹائپ کے حروف میں طبع ہوا کرتا تھا لیکن نامساعد حالات کی بناء پر چند شماروں کے بعد اس کی اشاعت معرض التوا میں چلی گئی۔

---

(۱) کرامت علی کرامت: آب خضر ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۔ ۱۷

نقادؔ نے اردو نثر میں طنز و مزاح کا مشکل صنف اپنایا۔ انتہائی خارجی متانت اور سنجیدگی کے باوجود انھوں نے حالاتِ حاضرہ کی خامیوں کا جو عمیق مشاہدہ کیا اس کے اظہار و بیان میں طنز و ظرافت کا انداز اپنایا۔ انھیں اپنی زبان و بیان پر خاصی دسترس حاصل ہے۔ "بزم ادب" اور "بزم سخن" کی محفلوں میں انھوں نے اپنے بیشتر نثری خاکے سنا کر محفل شعروادب کو زعفران زار بنایا ہے۔ لیکن ان کی قناعت پسند طبیعت چھپنے چھپانے کی طرف مائل نہ ہوئی اور نتیجہ کے طور پر اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء کے باب میں مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں راقم الحروف کو مولوی عبدالرشید نقادؔ کی نگارشات حاصل کرنے کے لیے بڑی سخت کوشش کے بعد ان کے چند قلمی مرقعے حاصل ہو سکے جو ہنوز محروم اشاعت ہیں۔

نقادؔ کی نثری تخلیقات میں "تعلیم نسواں"، "ہماری شاعری" اور "تنقید" جیسے مضامین نے مقبولیت اور داد و تحسین حاصل کی۔ انھوں نے مرقع نگاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ آج تک لوگوں کے ذہن میں نقادؔ کے خاکوں "پریمی کا پاجامہ"، "پاجامے کی عید" اور "برتھ کنٹرول" کے اثرات باقی ہیں۔

نقادؔ کی مزاح نگاری کے باب میں اسماعیل آذر لکھتے ہیں:۔

"مولوی عبدالرشید نقادؔ ایک سنجیدہ شاعر ہی نہیں بلکہ طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ انھوں نے مزاح نگاری نظم و نثر دونوں میں کی ہے۔ اڑیسہ میں آپ کی شہرت سنجیدہ شاعری سے نہیں بلکہ مزاحیہ شاعری اور طنزیہ مضمون نگاری سے ہوئی۔ ان کے پاس شعری سرمایہ سے زیادہ نثری سرمایہ پایا جاتا ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ کی بہتات نے آپ کے قلم سے بے شمار قہقہے اگلوائے۔"(۱)

نقادؔ ایک صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں علامتی اور رمزیہ اسلوب کے باوجود حقیقت کی واضح نشان دہی ہوتی ہے اور ان کی شگفتہ بیانی قاری کو فکری رویوں میں الجھائے بغیر دروں بینی کے عمل سے آشنا کرتی ہیں۔ نقادؔ اپنے مخصوص انداز میں مسئلۂ خیر و شر، نیکی اور ایثار کی تلقین اور فرد کی نفسیاتی کشمکش کی عکاسی سماجی حالات کے تناظر میں کرتے ہیں۔

---

(۱) اسماعیل آذر: کٹک کے چند مزاح نگار مطبوعہ سوئنیر بزم سخن بتقریب آل انڈیا مشاعرہ بابت ۱۳راگست ۱۹۷۷ء: ص ۳۳

نقّادؔ کا ایک خاکہ پیشِ نظر ہے "پریمی کا پاجامہ" جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :۔

"پریمی" سے ہماری مراد وہ "پریمی" نہیں جو پریمی ہے ۔ کیونکہ آج کل ہر بچہ ، بڑا ، جوان ، ادھیڑ بلکہ ہر بوڑھا اور کھوسٹ بھی پریمی ہے اور پریمی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارتی منڈیوں میں پریم جیسی انمول جنس کے برابر کسی اور شئی کی گرم بازاری نہیں پائی جاتی ۔ جہاں دو نظریں چار ہوئیں ، پریم کا دھارا بہہ نکلا ۔ غرض ہر چلتا پھرتا پتلا پریمی ہے ۔ اس لئے ہماری مراد پریمی سے صرف "پریمی" ہے ۔"(۱)

یہاں نقّادؔ کا یہ بیان کہ "پریمی سے ہماری مراد وہ پریمی نہیں جو پریمی ہے" دراصل ایک مخصوص شخصیت کی طرف اشارہ ہے جو اتفاق سے ہے اور پریمی اس کا تخلص ہے ۔ اس کردار کا عام لباس دھوتی اور کرتا ہے لیکن مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے احباب کے اصرار پر پاجامہ سلواتا ہے اور اسے ایک ہم سفر تھیلے میں رکھ لیتا ہے ۔ مشاعرہ گاہ میں پہنچ کر جو حالات سامنے آتے ہیں نقّادؔ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو ۔

"کیپیٹل میں جا کر ایک ایسے مقام پر دم لیا جہاں اترنے والوں پر بھوک سوار ہو جاتی ہے ۔ بھلا بھوکوں کے سامنے کھانا ہو تو آدمی خدا کو بھول جاتا ہے ۔ چہ جائے کہ پاجامہ اور اس کے ازار بند کو یاد رکھے ۔ اور ادھر کھانے کی ہاہی ختم ہوتی ...... پریمی پاجامہ کو تو بھول گئے لیکن ازار بند کے لئے بے چین ہو گئے ۔ اور ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اس وقت پاجامہ سے زیادہ ازار بند کی ضرورت تھی ۔ ادھر مشاعرہ کا وقت قریب ہوتا جا رہا تھا ۔ بھاگ کر ایک رسّی بیچنے والی کی دکان پر پہنچے اور اس سے ایک ٹکڑا رسّی کا طلب کیا ۔ دکاندار نے کہا آخر کتنے لمبے ٹکڑے کی ضرورت ہے ؟ پریمی پھر اپنے آپ کو ٹٹولنے لگے ۔ ان مشورہ دینے والوں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آخر پریمی کو پاجامہ بنانا ۔ لاحول ولا ۔ پاجامہ پہنانا تھا تو اتنا کرم بھی کر دیتے کہ ازار بند کا ناپ بتلا دیتے یا نوٹ ہی کرا دیتے ۔ نہ ساتھ میں کوئی پاجامہ پوش ہے کہ چپکے سے دریافت کر لیں ۔ آس پاس دیکھتے ہیں تو جینٹلمین ہی جینٹلمین نظر آتے ہیں ۔ پریمی صاحب بڑے شش و پنج میں پڑ گئے کہ کتنی لمبائی بتائی جائے ! ایک ایک کی کمر دیکھتے ہیں اور اندازہ لگاتے ہیں ۔ گھبراہٹ میں اپنی کمر کا خیال نہ رہا اور

---

(۱) عبدالرشید نقّادؔ ، پریمی کا پاجامہ ، قلمی نسخہ ، ص ۱

کہہ دیا کہ بھائی پانچ ہاتھ کا کوئی ٹکڑہ دے دو۔ دکان سے ازار بند لے کر پریمی اپنی فرودگاہ پر آئے اور جلدی سے پاجامہ نکالنے کے لئے تھیلی تلاش کی تو وہ ندارد۔ ذہن پر زور ڈالنے پر معلوم ہوا کہ پاجامہ جس بیگ میں تھا وہ تو المتخلص تاباںؔ کے سپرد تھا۔ تاباں کو تلاش کرنے لگے۔ کسی نے کہا کہ سامنے کسی کوارٹر میں رفع حاجت کی غرض سے تشریف لے گئے ہیں۔ پریمی اس کوارٹر کی جانب لپکے اور ایک کھڈ میں ایسے گرے کہ جیسے افیمی پاخانہ کی کھڈی پر سے اونگھتے ہوئے گرتے ہیں۔"(۱)

نقادؔ کی تحریر میں طنز کی گہری نشتریت ہے۔ وہ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں پتہ کی بات کہہ جاتے ہیں لیکن کہیں کہیں ان کی تحریر غیر ضروری طوالت کا شکار بھی ہو جاتی ہے اور اس پر انشائیہ کا رنگ غالب آ جاتا ہے۔ پھر بھی وہ الفاظ کی معنویت اور اس کی تہہ داریوں میں مزاح کی چاشنی پیدا کرتے ہوئے اپنی مخصوص طرز نگارش پر گرفت رکھتے ہیں۔ نقادؔ اپنی تحریروں میں مقامی الفاظ کا بھی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

''اِدھر پریمی صاحب اس کھال کے اندر ڈھیر ہیں۔'' کھال اُڑیسہ میں 'کھڈ' کے معنی میں مستعمل ہے۔

نقادؔ کا دوسرا فکاہیہ مضمون ہے'' پاجامے کی عید''۔ یہ پاجامہ وہی ہے جسے پریمی نے ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے سلوایا تھا لیکن اسے جس دوست کے تھیلے میں رکھا تھا عین موقع پر وہ تھیلا لے کر کہیں چلے گئے اور پریمی نے بغیر پاجامہ کے ہی مشاعرہ پڑھا۔ اب وہی پاجامہ ہے اور عید کی تقریب'' پاجامہ کی عید'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''....... یہی وجہ تھی کہ رمضان شریف کا چاند دیکھ کر لوگ خوش ہو رہے تھے اور پریمی فاصلہ ناپ رہے تھے کہ عید ابھی اتنی دور ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ درمیان میں روزے گلے پڑ رہے تھے کیونکہ پریمی کے لئے روزے رکھنے اتنے ہی آسان تھے جتنے روزوں کا کھا لینا۔ البتہ رمضان اور عید کے چاندوں کا فاصلہ اس لئے ناپ رہا تھا کہ اگر عید کے آنے میں دیر لگی تو پاجامہ بجائے پریمی کے چوہے پہننا شروع کر دیں گے اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ چنانچہ پاجامہ جو دل عاشق کی طرح سمٹا سمٹا یا رکھا ہوا تھا جب کھولا

---

(۱) عبدالرشید نقادؔ، پریمی کا پاجامہ، قلمی نسخہ، ص ۱

گیا تو معلوم ہوا کہ پریمی کے وہم میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا کہ چوہا ہی رہا ہوگا۔ ممکن ہے کسی بلّی نے نہایت ادب سے پاجامہ کے ایک خاص مقام پر تہہ خانہ کے دروازے کی طرح ایک چھوٹا سا سوراخ بنا دیا تھا۔ پریمی کو افسوس تو ہوا ہی مگر ساتھ ساتھ یہ شرم بھی محسوس ہونے لگی کہ اگر کسی رفوگر کے پاس رفو کرنے کے لئے پیش کیا جائے تو مقام مخصوص میں سوراخ کی کون سی معقول وجہ بیان کی جاسکتی ہے؟"(۱)

پریمی اپنا پاجامہ رفو کرنے کے بعد دھونے کی غرض سے ایک دھوبن کے حوالہ کرتے ہیں اور رمضان کی آخری شب اس سے پاجامہ وصول کرنے پہنچتے ہیں۔ دھوبن سے دوران گفتگو اس کا نام پوچھتے ہیں تو دھوبن جواب دیتی ہے :۔

" بابو جی! اصل نام تو میرا رکسونا ہے لیکن لوگ مجھے پیار سے لکسی (LUX) کہا کرتے ہیں۔"

نقاد نے دھوبن کا نام رکسونا صابن کی رعایت سے رکسونا لکھا اور جب لکس کی مقبولیت عام ہوئی تو اسے لکسی کے تخلص سے نواز دیا۔ لکسی پریمی کا پاجامہ لینے کمرہ کے اندر جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد خالی ہاتھ واپس آتی ہے۔ دھوبن اور پریمی کا مکالمہ نقاد کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

رکسونا:۔ " بابو جی! میں نے تو اس پر کوئی نشان نہیں دیا تھا۔ کئی پاجامے اور بھی بے نشان پڑے ہیں۔ اب میں پہچان نہیں سکتی کہ ان میں آپ کا کون ہے؟"

پریمی:۔ اہا! تم نے غور نہیں کیا۔ اس میں ایک پیدائشی نشان ہے۔ تم دیکھو جس پاجامہ میں سوراخ پر رفو ملے وہی پاجامہ میرا ہے۔"

رکسونا:۔ " آخر وہ نشان پاجامہ کے کس مقام پر ہے؟ پورا ہی پتہ بتا دیجئے نا۔"

پریمی:۔ " تم جانتی ہو کہ مسلمانوں کا قبلہ پچھم کی جانب ہے۔ تم ٹھیک پورب کی جانب کمرے کچھ نشیب میں ڈھونڈ لینا۔"

رکسونا:۔ (اپنی ادبیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔) سوراخ کا پتہ بتانے میں بھی آپ نے شاعری سے کام لیا ہے۔ سیدھے سادے یوں کیوں نہیں کہتے کہ ہوا کے رخ پر اگر سوراخ ہو

---

(۱) عبدالرشید نقّاد: پاجامہ کی عید، قلمی نسخہ، ص ۲

تو وہ میرا پاجامہ ہے ۔ لیکن اس سوراخ کا ہوا ہی کے رخ پر رہنا کچھ ضروری بھی نہیں۔ کسی وقت پانی کے رخ پر بھی آجانا ممکن ہے ۔ اب ہوا کے لحاظ سے موسم کا بدلنا کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں۔"(1)

دوسروں پر طنز کے تیر برسانا آسان ہے اور ظرافت کے گل بوٹے کھلانا باعثِ مسرت سہی لیکن اپنا خاکہ اڑانا نہایت مشکل امر ہے۔ لیکن عبدالرشید نقاد نے خود کو بھی نہیں بخشا ہے۔ ایسی صورت حال میں ان کا طنز وظرافت نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے ۔ خود پر لکھے ہوئے ایک خاکہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ہم نقاد کو تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ ایک شعر گو شاعر ہے۔ اگرچہ شعر فہمی کسی مصلحت کی بناء پر اس سے کوسوں دور رکھی گئی ہے، علاوہ کہ ارباب بزم ادب مرحوم اور احباب بزم سخن سلمہ تک اس سے واقف ہیں کہ ؎

نہ شعر و سخن سے ہے کچھ رابطہ
نہ فہم سخن سے ہے کچھ واسطہ

بس اسی عیب کو سخن دانوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے ایک دن فارسی اشعار کا مطالعہ کر رہے تھے کہ کم از کم ان ہی شعراء کے خیالات اردو کا موزوں جامہ پہنا کر بزم میں پیش کر دیا جائے تو 'واہ واہ' اور 'خوب خوب' کی مفت کی دولت سے یعنی ہولے سے تو اپنی جھولی بھر جائے گی۔ دوسری طرف یہ ہوگا کہ نقاد بزم کے آئندہ جلسہ مشاعرہ تک نقاد رہ جائے گا۔ اچانک ایک صاحب ہمارے بیت الخلاء میں آدھمکے یعنی جس گھر میں ہم تنہا فکر سخن میں ایسے مگن تھے جیسے کوئی رشوت خور جج یا مجسٹریٹ مقدمات کے فیصلے لکھنے میں مصروف رہتا ہے۔ ہمیں ان صاحب سے واسطہ بھی رہا ہے، مگر اجنبیت کا۔ حلیہ سر سے پاؤں تک بالکل شاعرانہ۔ لمبی گردن، اونچی ناک اور دبلے پتلے جیسے ہمارے نجمی صاحب ۔ رنگ میں نہ کرامت صاحب کی طرح بالکل کرشماچاری اور نہ حفیظ اللہ صاحب کی طرح بالکل اندرا گاندھی۔ قد ایسی جیسے مظہر امام صاحب کی۔ چال میں حافظ درد کی طرح مستانہ پن، مگر چلن بالکل صوفیانہ، چہرہ پر ایمان داروں کی سی حیا۔ کے

---

(1) عبدالرشید نقاد: پاجامہ کی عید: قلمی نسخہ، ص 9

آثار۔ مسکراہٹ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے اپنی نہیں بلکہ خالد رحیم سے ادھار لی گئی ہے۔ رنگ کی تعریف کے ساتھ ڈھنگ میں نہ ایسے بے تکلف جیسے رونق اور نہ ایسے منقبض اور سمٹے ہوتے جیسے واصف ، دانت نہ عام شعراء کی طرح اسٹینڈرڈ سائز کے اور نہ پرکچی کی طرح اسپیشل سائز کے کہ دونوں لبوں کے درمیان ہند پاک کی کشیدگی ٹھنی ہوئی ہے۔ ریش مبارک سے چہرہ منور تو تھا مگر دائیں بازو سے نظارہ کرنے والوں کو وہ واصف نظر آتے تھے اور بائیں بازو والے حزب مخالف کو ضمیر کا دھوکہ ہوتا تھا۔ آتے ہی نہایت بلند آواز سے "السلام علیکم" کا نعرہ بلند کیا تو ہم نے بھی بے تکلف آواز میں اتنی ہی بلندی پیدا کر کے جواباً عرض کیا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" تا کہ سلام اور جواب سلام میں آواز کا تناسب اور توازن قائم رہے اور پھر فوراً ہی آپ نے پوچھا :۔ "آپ ہی نقاد ہیں؟" ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم ان صاحب کے اس سوال پر ایسے سہم گئے جیسے کوئی منسٹر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ سے سہم جاتا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ ہمیں اپنے نقاد ہونے میں کچھ شبہہ پڑ گیا بلکہ اس لئے کہ جی ہاں کہنے کے بعد کلام یا کلام پر تبصرے کی فرمائش ہوئی تو ہماری پوزیشن ہی کرکری ہو کر رہ جاتی گی۔ اگرچہ ہم نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر فوراً یہ طے کر لیا کہ اگر ضرورت پڑی تو نجمی صاحب کی کوئی غزل یا کرامت صاحب کا کوئی تبصرہ اپنی نقادیت کی دلیل میں بطور نمونہ پیش کر دیں گے۔ سرقہ کا الزام تو توارد کے دعوےٰ سے ہی بہ آسانی دفع ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے اس خیال کے آتے ہی ہماری ہمت میں جان پڑ گئی اور ہم نے ہمک کر کہا معاف کیجئے گا اگر ہم نقاد نہیں تو کیا کوئی بھاؤں یا میاؤں نقاد ہو سکتا ہے ؟ آپ نقاد ہی سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا آپ ہی نقاد ہیں !"[1]

پیش نظر خاکہ میں مولوی عبدالرشید نقاد نے صرف اپنی دروں بینی کا نمونہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ شہر کٹک میں اردو کے دبستان سے جڑے ہوتے ایک مکمل عہد سے متعلقہ تمام افراد کی سیرت و شخصیت کا کنایاتی تعارف بھی پیش کر دیا ہے۔ ان کے اسلوب پر انشائیہ کا رنگ غالب ہے لیکن بعض جگہوں میں رطب و یابس سے گریز کی شعوری کوشش کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی عبدالرشید نقاد کی نثر اور ان کا اسلوب نگارش اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء

---

(۱) عبدالرشید نقاد: ہماری شاعری: قلمی نسخہ: ص ۱—۲

کا زندہ ثبوت پیش کرتا ہے۔ کاش کہ انھوں نے اپنی تحریر و تخلیقات کی حفاظت کی ہوتی۔ اور انھیں زیور طباعت سے آراستہ کیا ہوتا تو اڑیسہ میں اردو کی آنے والی نسلوں کے لئے نشان منزل کا پتہ چلتا۔

امجد نجمی

(ولادت ۱۸۹۹ء وفات ۱۹۷۴ء)

امجد نجمی کا تفصیلی تذکرہ اس سے قبل کے باب میں آچکا ہے۔ نجمی صاحب اڑیسہ میں اردو کی آبرو رہے ہیں۔ اردو شاعری میں انھوں نے درجۂ امتیاز حاصل کیا تو نثر نگاری میں بھی اپنی اعلیٰ فن کارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ نجمی صاحب نے اڑیسہ کے اردو اسٹیج کو اپنی فنکاری سے سنوارا اور آغا حشر کے طرز پر متعدد ڈرامے لکھے جن میں "بدنصیب بادشاہ" اڑیسہ میں بار بار اسٹیج ہوتا رہا ہے۔ دراصل یہ ڈرامہ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خاں کے زوال کی کہانی ہے جسے نجمی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں قلمبند کیا تھا۔ اس ڈرامہ کو اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے قانون کے تحت پولیس سپرنٹنڈنٹ نے ۱۹۳۳ء میں پرمٹ عطا کیا۔(۱)

---

(۱) متعلقہ پرمٹ کی نقل: Letter No. 2366/E Permit Dated the 11th April 1933

from the Superintendent of Police, PURI (On tour) to the President, YOUNG MUSLIM CLUB, B.N.Rly. Khurda Road, Jatni, P.O. PURI.

"With reference to the office letter No. 2634/V dated 4.4.1933, I return herewith the Urdu Drama entitled "BADNASIB BADSHAH" written by Amjad Najmi and have no objection if it is being staged.

S.A. [illegible]
S.P. [illegible]

اس ڈرامے کے کردار ہیں:۔ امان اللہ خاں (بادشاہ افغانستان)، سردار محمود طرزی (وزیر سلطنت۔ مغرب پرست پارٹی کے لیڈر)، سردار شیر احمد خاں (مذہبی پارٹی کے لیڈر)، حبیب اللہ عرف بچہ سقہ (کوہ دامن کا ڈاکو)، ملّا شور بازار (کابل کے مذہبی پیشوا)، سردار عنایت اللہ خاں (شاہ امان اللہ کے بھائی)، جنرل نادر خاں (سلطنت کے ایک وفادار مشیر۔ بعد میں بادشاہ)، سردار ہاشم خاں (شاہ نادر کے وزیر)، افضل خاں (بچہ سقہ کا دوست)، رفیع حیدر خاں (منصرم باغات)، شمشیر یار خاں (کابل کا ایک رئیس)، تیس مار خاں (شمشیر یار خاں کا ملازم)، ملکہ ثریا بیگم (شاہ امان اللہ کی زوجہ)، حریفہ خانم (شمشیر یار خاں کی بیوی)، حبیبہ خانم (رفیع حیدر کی لڑکی)۔

فل اسکیپ سائز کے ۷۰ صفحات پر مشتمل "بدنصیب بادشاہ" کا مسودہ کرامت علی کرامت کے توسط سے حاصل ہوا۔ نجمی صاحب کو ڈرامہ نگاری میں کامل دسترس حاصل تھا۔ شاہ امان اللہ کا اپنی ملکہ کے ساتھ ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:۔

"امان اللہ:۔ کیوں پیاری ملکہ! آج تمھارے چہرے پر یہ بے موقع اداسی کیوں چھائی ہوئی ہے اور یہ صورتِ زیبا کی کلی بے طرح کیوں مرجھائی ہوئی ہے؟

نصیب دشمناں کچھ رنج کے آثار پیدا ہیں تمھاری صورتِ زیبا سے جو بالکل ہویدا ہیں
پریشاں دیکھ کر تم کو یہ دل سینے میں مضطر ہے سبب کیا وجہ کیا آخر طبیعت کیوں مکدر ہے؟

ثریا بیگم:۔ سبب کچھ ایسا زیادہ نہیں لیکن ہاں رات میں مجھے ایک بھیانک خواب نظر آیا ہے جس کا اثر ابھی تک میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

وہ خوفناک بھیانک ڈراؤنا منظر کہ جس سے ہو گئے ماؤف مرے قلب و جگر
ابھی تک اس کا اثر ہے دماغ پر باقی نشاں ہنوز خزاں کے ہیں باغ پر باقی

امان اللہ:۔ ملکہ تم بہت کمزور طبیعت کی معلوم ہوتی ہو۔ خواب کی بے اصل باتوں سے اثر پذیر ہو کر اپنا چین کھوتی ہو۔ خواب کیا ہے؟ نیند کی حالت کا ایک دماغی اضطرار ہے۔ خواب کے منظروں کو اتنی اہمیت دینا بالکل بے کار ہے۔

لوگ یاں کہتے ہیں جس کو خواب ہے نیند کی حالت کا پیچ و تاب ہے
قوتِ تخیل کا سیلاب ہے یہ اسی دریا کا اک گرداب ہے
لیکن اس کی اصلیت کچھ بھی نہیں اصلیت یا اہمیت کچھ بھی نہیں

ملکہ ثریا:- نہیں میرے سرتاج! پھر بھی خواب کی بعض باتیں بالکل سچ ہوتی ہیں۔
امان اللہ:- اور بعض باتیں محض کچی ہوتی ہیں۔ اچھا بیان تو کرو کہ تم نے کیا دیکھا؟
ملکہ ثریا:- کہنے کے لئے میری طبیعت جھجکتی ہے۔ خاکم بسر میں نے دیکھا کہ آپ اپنی مرضی
و خوشی سے اپنا تاج کسی دوسرے شخص کو پہناتے ہیں اور خود اپنا وطن چھوڑ
کر کسی دور دراز ملک کو نکل چلنے پر تیار ہو جاتے ہیں ؎

خدا جانے جفا کاریٔ چرخِ پیر کیسی ہو؟ نہیں معلوم اب اس خواب کی تعبیر کیسی ہو؟

امان اللہ:- ہا ہا ہا اگر تعبیر ایسی ہی ہو تو ازیں چہ بہتر؟ ؎

بچے گی جان میری سلطنت کی جان جوکھم سے
حکومت کی گراں باری سے اور اک فکرِ پیہم سے

یہی مرضی خدا کی ہے تو ہو گا اس سے کیا بہتر
کہ کم ہوں گا نہ میں رتبے میں ابراہیمؑ ادھم سے (۱)

امجد نجمی کی نثر نگاری اور ادبی اہمیت کا دوسرا پہلو ان کی خطوط نگاری ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر اہم ادبی خطوط لکھے ہیں جن کا مجموعہ "صریرِ قلم" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں خود مرتب کیا لیکن "صریرِ قلم" کتابی شکل میں شائع نہ ہونے کے باوجود اس کے بیشتر خطوط ماہنامہ شاخسار کٹک اور رہنمائے تعلیم دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ شہر کٹک کے دانشور اور عالم مولوی عبداللطیف عارفؔ کے نام نجمی صاحب نے بہت ہی اہم ادبی خطوط لکھے ہیں جن کا مطالعہ تہہ دار معلومات تک ذہن کی رسائی کرتا ہے اور صاحبِ رسالہ کے ادبی اور معاشرتی رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ اپنے اسلوب پر نجمی صاحب کی گرفت مضبوط ہے۔ چند خطوط بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:-

امجد نجمی کے خطوط مولوی عبداللطیف عارف کے نام

کٹک

۱۸راگست ۱۹۶۴ء

مجی و مشفقی ! سلام علیک۔

ایک شعر ملاحظہ ہو ملاّ ترابی بلخی کا ہے ؎

برسنگ رخنہ شد از بس گریستم بے تو　　ز سنگ سخت ترم من کہ زیستم بے تو

مرزا داغ کہتے ہیں ؎

موم ہوتا ہے مری آہ سے پتھر لیکن　　سنگ دل ایک ترا دل کہ پگھلتا ہی نہیں

دیکھئے وہاں جوش گریہ سے پتھر میں سوراخ ہوگیا اور یہاں وفورِ آہ سے پتھر موم ہو کر پگھل گیا۔

دونوں کا شکوہ یا دعویٰ اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی ایک ہجران نصیب عاشق کی سخت جانی کو جس طرح ترابی نے " زسنگ سخت ترم " کہہ کے واضح کیا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔ پانی کے متواتر بہاؤ سے پتھر کا شق ہو جانا عین مشاہدہ ہے۔ جیسا کہ اڑیا میں کہاوت ہے

اسی طرح داغ کے شعر میں بھی آہ جانگداز سے پتھر کا پگھل جانا بالکل ممکنات میں سے ہے۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ شعر کے لئے بقول ملٹن سادگی، اصلیت اور جوش کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ تینوں باتیں فارسی اور اردو کے مذکور بالا شعروں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پھر نہ جانے ہماری مشرقی شاعری " گل و بلبل " کے نام سے متہم ہو کر موردالزام کیوں ہے ؟ یہ صرف مغرب کی کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔ بہرحال فارسی شاعر آتش قندھاری کا ایک شعر اور سنئے۔ کہتا ہے ؎

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن　　بیا در کشتیِ چشم نشیں و سیر دریا کن

کیا معنی آفرینی کی ہے واللہ ! سن کر روح میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سرشک کا رفتہ رفتہ دریا ہو جانا اور پھر اس دریا میں محبوب کو سیر کی خاطر دعوت دے کر آنکھوں کی کشتی مہیا کر دینا یہ شاعر کا کمال ہے۔ شعر پڑھتے جائیے اور سر دھنتے جائیے اور معترضوں کو ان

کی سخن ناشناسی کی آگ میں بھونتے جاتے ہیں۔
نجمی۔(۱)

کٹک: ۳۱؍ اگست ۱۹۶۴ء۔

جنابِ عارفِ معروف
کو نجمی ظلوم و جہول کی طرف سے سلام پہنچے۔

ہمارے شعر و ادب میں واعظوں، زاہدوں، پیروں اور شیخوں پر جو لتاڑ اور رلے دے کے تنقیدی اشارے کثرت سے پائے جاتے ہیں، اس کا ذمہ دار خود یہی گروہ زہاد و شیوخ ہے۔ اپنی تقدس مآبی پر ان حضرات کو اس قدر غرّہ ہوتا ہے کہ عوام تو عوام یہ خواص کو بھی بسا اوقات انگشت ششم سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کے یہی حقارت آمیز اور کم بینی کے جذبۂ تنفر نے ان کو رفتہ رفتہ اعتراضات کا نشانہ بنا کر "یہ چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند" کا فتویٰ ان پر چسپاں کر دیا۔ تنگ نظری، خود بینی یا بندگانِ خدا کو چشم حقارت سے دیکھنے کا جذبہ صرف ہمارے ہی نہیں دوسرے مذاہب کے بھی یکسر منافی ہے۔ سچ تو یہ ہے بقولِ ذوق ؎

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھئے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

مولنا ابوالقاسم گرگانی نے فردوسی طوسی کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ ان کا اعتراض تھا کہ فردوسی عمر بھر مجوسیوں کی مدح سرائی کرتا رہا (مراد شاہنامہ سے ہے)۔ اسی شب کو انھوں نے خواب دیکھا کہ فردوسی کو فردوس اعلیٰ میں ایک مقام عطا ہوا ہے۔ دریافت کہ یہ درجہ تم نے کیسے پایا؟ فردوسی نے جواب دیا، صرف اس توحیدی شعر پر ؎

جہاں را بلندی و پستی توئی　　ندانم چۂ ہر چہ ہستی توئی

نفحات الانس میں حضرت مولنا عبدالرحمٰن جامی لکھتے ہیں کہ مشائخ میں سے ایک بزرگ سعدیؔ کے منکر تھے۔ ایک رات انھوں نے دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھول دیئے

---

(۱) امجد نجمی کے خطوط، عبداللطیف عارف کے نام مطبوعہ مشعل کٹک۔ شمارہ نمبر ۳۹، ۴۰، ۱۹۷۳ء: ص ۱۷۔

دیئے گئے ہیں اور ملائکہ نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہو رہے ہیں۔ پوچھا، یہ کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا، یہ سعدی شیرازی کے لئے تحفے ہیں کہ انھوں نے ایک شعر کہا ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی درگاہ میں مقبول ہوگیا ہے۔ اور وہ مشہور شعر یہ ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں ؎

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اسی طرح حافظؔ شیرازی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو متعصب علماء نے ان کے جنازے کی نماز پڑھانے سے انکار کیا۔ شاہ منصور بھی جنازے میں شریک تھا۔ اس نے سبب دریافت کیا۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ حافظ کا کلام ملحدانہ ہے۔ اس لئے ان کے جنازے کی نماز جائز نہیں۔ بادشاہ نے کہا، اس کا کیا ثبوت ہے؟ انھوں نے کہا، کلام منگایا جائے تو ہم الحاد ثابت کر سکتے ہیں۔ اسی وقت ان کی غزلوں کے مسودے طلب کئے گئے۔ پہلا ہی ورق جو اٹھایا گیا تو اس میں یہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظؔ
کہ گرچہ غرقِ گناہست میرود بہ بہشت

اس تائید غیبی کو دیکھ کر سب دم بخود ہو گئے اور بلا چوں وچرا جنازے کی نماز ادا کی۔ اسی دن سے خواجہ کا نام "لسان الغیب" رکھا گیا۔ دیکھا آپ نے اسی لئے کہتے ہیں ؎

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

گنہگار نجمیؔ (۱)

کندراپاڑہ ضلع کٹک کا ایک سب ڈیویژن ہے جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی اچھی خاصی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کسی طرح کی ادبی یا ثقافتی تحریک نہ تھی۔ کٹک کے اظہرالدین صاحب کا قیام ملازمت کے سلسلہ میں چند سال تک کندراپاڑہ میں رہا۔ اظہرالدین صاحب

---

(۱) امجد نجمی کے خطوط مولوی عبداللطیف عارف کے نام: مطبوعہ شاخسار کٹک: شمارہ نمبر ۳۹/۴۰ سنہ ۱۹۶۲ء: ص ۱۷

ایک فعال شخصیت کے حامل تھے۔ اپنے دوران قیام انھوں نے وہاں ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا، مشاعرے منعقد کروائے اور لوگوں میں معاشرتی سطح پر ثقافتی تحریک پیدا کی۔ اس ضمن میں امجد نجمی کا مندرجہ ذیل خط ملاحظہ ہو جو انھوں نے مولوی عبداللطیف عارف کے نام لکھا ہے؛

کٹک

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۴ء

عارف پر جوش

کو سلام مے نوش

کل اطہر الدین صاحب آئے تھے۔ جلسہ کی کامیابی پر میں نے ان کو مبارک بادی پیش کردی۔ بڑے خوش تھے۔ فرمانے لگے، وہاں لوگوں میں کافی جوش و خروش ہے۔ شبِ قدر میں ''پڑھائی گھر'' کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا جس کے شبلنگ کے حاجی صاحب رضامند ہو گئے ہیں۔

کیندرا پاڑہ کے جلسۂ مشاعرہ اور محفل دعوت دونوں کی کامیابی کا سہرا درحقیقت صاحب موصوف کے سر ہے۔ اس سے پہلے بھی میں ان کے خلوص سے متاثر ہوا ہوں۔ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ کام کے آدمی کام کرنے میں برق اور نکتہ چیں حرف گیری میں غرق۔ ایسے پرخلوص انسان دو چار اور نکل آئیں تو سمجھئے کہ ہمارا بیڑا پار ہے۔

جلسہ کی ہر کارروائی از بائے بسم اللہ تا تائے تمت یعنی سعادت صاحب کے خطبۂ استقبالیہ سے لے کر اور صاحب کی اختتامی تقریر تک نہایت شاندار رہی۔ پھر ہمارے نائب صدر راجہ میاں کا تحریری خطاب گویا نورٌ علیٰ نور ہو گیا۔ ضحیٰ صاحب نے مشاعروں کی افادیت پر جو کچھ برجستہ ارشاد فرمایا، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت مدلل اور مثبت تھا۔ صدر جلسہ نے اردو کی عالم گیر شہرت پر جو چند باتیں کہیں، وہ بڑے کام کی تھیں۔ خصوصاً بنگالی ادبی کانفرنس کے ساتھ مشاعرہ کا موازنہ تو بڑا لطف دے گیا۔

اب شعراء کے کلام پر مختصر سا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

جلال الدین بزرؔ کے قطعات اچھے تھے اور غزل بھی خوب۔ اچھی طبیعت پائی ہے۔

جنوںؔ (نور محمد) اپنے جنوں میں پختہ کار نکلا۔ یعنی شعراء کے بھیڑ بھڑکے میں گھس کر آخر اپنی غزل محفل میں جڑ ہی دی۔ میاں ذوقؔ (قادر شریف) اس دفعہ کافی سنجیدہ اور متین نظر آرہے تھے۔ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر اہل مشاعرہ سے خراج تحسین وصول کر ہی لیا۔ راقمؔ (حکیم عبدالرحیم) نے بھی دو چار شعر پر داد لے ہی لی۔ شاکرؔ (رحمٰن کریم) گو چیٹ پٹی تھی مگر پڑھنے کا انداز نرالا نہ تھا، اس لئے کچھ داد بھی ملی کچھ بے داد بھی۔ بہارالدین ریاضؔ کی نظم " وہ آتے " اور خالد رحیم کی نظم "حسن معصوم" اپنے انداز کی چیزیں تھیں، نکھری ستھری اور سلجھی ہوتی۔

ضمیر خاں ضمیرؔ کی نظم مثلث کو ان کا انداز ترنم محفل میں لے اڑا، ایسا کہ انھوں نے سب کا دل موہ لیا۔ خصوصاً صدر جلسہ تو ان کے گرویدہ بن گئے۔ ہر بند کافی مؤثر تھا۔ حافظ دردؔ (رفیق) نے بھی اپنے کئی شعر پر واہ واہ کا ٹیکس وصول کر لیا۔

حیدر نایابؔ کی مے نوشی اور "بے پئے کی مدہوشی" نے ساری محفل کو مست کر دیا۔ مرادؔ صاحب کے تخیلات اس دفعہ گہرائی لئے ہوتے تھے۔ قادر بخش سلیمؔ (راجہ میاں) ہمیشہ سے محفل میں "ناصح مشفق" کا فرض انجام دیتے آئے ہیں اور اس دفعہ تو اور او نچے اڑے۔

آپ نے تو ماشاءاللہ غضب ہی ڈھادیا۔ ایسا جوش، ایسی امنگ، یہ ولولہ، یہ Force (زور) اس سے پہلے آپ میں میں نے کم دیکھا۔ محفل میں آپ کے مسدس کی پذیرائی خوب رہی۔ سامعین پر آپ ایسا چھا گئے تھے کہ محفل مشاعرہ میں ایک سماں بندھ گیا تھا۔ میں خود بھی مبہوت سارہا۔ واہ، شاباش، آفریں، ماشاءاللہ، صل علیٰ! میراگیت گویا سنت کبیر داس کا دوہا تھا اور بس۔ اب رہے میاں صمد خاں پریؔ، تو ظالم نے اپنے مزاحیہ اشعار سے جملہ خواص وعوام کو مسخر کر لیا۔ گویا مشاعرے کے اسٹیج پر کلاؤن (مسخرہ) کا پارٹ ادا کیا۔ بزم میں اہل نظر سے بڑھ کر تماشائی زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے بھی چندے تماشے کا لطف آگیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو مذاق مذاق میں بڑے کام اور پتے کی باتیں کہہ گیا۔ الغرض ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کی طرح ہر شاعر نے اپنے اپنے رنگ کے اشعار محفل میں پیش کر کے اہل کیندراپاڑہ میں ایک نئی روح پھونک دی جس کا اثر تادیر قائم رہے گا۔ وہاں کا کاروان ادب، اب جادہ پیما ہو تو کچھ عجب نہیں۔ خیر کچھ بھی ہو۔

ہمتیں اپنی جواں ہیں تو جواں ہے اردو

نجمی (۱)

پیش نظر خط میں نجمی صاحب نے اردو کے تقریباً تمام اہم ہم عصر شعراء کا تذکرہ کر دیا ہے۔ ان شعراء میں سے نور محمد جنوں اور رحمٰن کریم شاکر اب اڑیسہ کے کاروانِ اردو کو داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ جلال الدین بدر جادۂ شعروادب سے کنارہ کش ہو کر معاشی بحران میں اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ کیندرا پاڑہ میں اردو کی ادبی اور ثقافتی تحریکوں کے بانی اظہر الامین بھی پچھلی دہائی سے اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کر چکے ہیں۔
اب دنیا میں زر کی کیا اہمیت ہے اس ضمن میں ذیل کے خط سے نجمی صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:۔

کٹک

۸ رمئی ۱۹۶۶ء

براہِ اوچہ می باز یم نے دینے نہ دنیا تے
دلے داریم واندوہے کہ داریم و سودائے

ڈیئر مولانا صاحب!

سلام علیک

مزاج گرامی؟

تونگری اور مفلسی پر آج کی ژولیدہ بیانی ملاحظہ ہو۔
فارسی میں پیسے کو 'پولِ سیاہ' روپئے کو 'پولِ سفید' اور اشرفی کو 'پولِ سرخ' کہتے ہیں۔ اور بازارِ دنیا میں جتنی رونقیں ہیں، جتنی چہل پہل اور رجو ہاہمی ہے وہ سب انہی پولوں کی بدولت ہے۔ امریکی زبان میں پیسہ Almighty Dollar

---

(۱) امجد نجمی کے خطوط مولوی عبداللطیف عارف کے نام، مطبوعہ ماہنامہ شاخسار کٹک۔ بابت اپریل ۱۹۷۲ء؛ ص ۳ ــ ۴۔

یعنی کارساز مجازی کہلاتا ہے۔ ہمارے یہاں مثل ہے، جس کے پاس زر ہے وہ ور ہے۔ اور جس کے پاس اشرفی ہے وا شراف ہے۔ حسب نسب، شرافت، نجابت، خاندان، پاندان، اگالدان یہ سب پرانے زمانے کے چونچلے ہیں۔ عمر خیّام کہتا ہے ؎

گویند کہ مرد را ہنر می باید　　　یا نسبت عالی پدر می باید
ایں روز چناں شدٗ است کہ نوبت ما　　　کیں ہا ہیچ ہست، زر می باید

دیکھا آپ نے زر کی ہمہ گیری؟ راقم الحروف نے بھی کسی وقت کہا تھا ؎

دعویٰ شرافتِ نسبی کا فضول ہے　　　دنیا کو اب تو صاحب زر کی تلاش ہے

غرض زر، زیور، پونجی، توڑا، دھن دولت، مال و متاع، زمین جاگیر، کھیتی باڑی، کوٹھا بھاڑی، یہ سب کیا ہیں؟ زینۃ الحیوۃ الدنیا لیکن ان کو زینۃ الحیوۃ الاٰخرۃ بھی کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ لقمۂ لطیف اور کسوت نظیف کے ساتھ ساتھ قوتِ جود اور قوتِ سجود جیسی کہ تونگروں اور امیروں کو میسر ہے وہ غریبوں اور ناداروں کو کہاں حاصل ہے؟

خداوند روزی بحق مشتغل　　　پراگندہ روزی پراگندہ دل

زر علیہ السلام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان معجزہ یہ ہے کہ وہ پردہ پوش بھی ہے اور حاجت روا بھی۔

اے زر تو نۂ خدا ولیکن بخدا　　　ستّار العیوب و قاضی الحاجاتی

اہل فرنگ کا نعرہ ہے:-

Money, Money and Money
Brighter than sunshine
Sweeter than honey.

پیسہ، پیسہ اور پیسہ
سورج سے بڑھ کر چمکیلا
شہد سے زیادہ میٹھا

اس لئے پندِ پیرِ دانا آپ کو بھی یہی ہے بقولِ شاعرے ؎

خوک باش وخرس باش یا سگِ مردار باش
ہر چہ باشی باش لیکن احمدکے زردار باش

لاکھ باتوں میں یہی ایک بات وزنی ہے۔ اب تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالئے تو نہایت ہی ظلمت آگیں اور مہیب ہے یعنی افلاس، تنگ دستی، ناداری، محتاجی، بے زری، غریبی اور مفلسی، پناہ بخدائے عز وجل۔

مفلسی سب وقار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے

قولِ پیغمبر ہے اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ ناداری دونوں جہاں میں روسیاہی ہے۔ غریب تیرے تین نام جھوٹا، پاجی، بے ایمان۔ بے چارے غریب کی نہ گھر میں کوعزت ہے نہ باہر۔ نہ یاروں میں اس کی کوئی وقعت ہے نہ دلداروں میں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ننگا اور ظاہر ہے کہ ننگا کیا نہائے اور کیا نچوڑے۔ غریب کو منہ مانگی موت بھی نہیں ملتی ؎

گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ — بآب زمزم وکوثر سپید نتواں کرد

وہ ستو کھا کے شکر کرتا رہتا ہے، تو پھر اللہ میاں اس کو پلاؤ قورمہ کیوں کھلانے لگے تھے۔ اس کا فقر بسا اوقات کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے جیساکہ کسی بے زر دل جلے شاعر نے کہا ہے ع

بے زری کرد بمن آنچہ بہ قاروں زر کرد

کسی امیر کبیر نے اپنے مصاحب سے پوچھا کہ بتاؤ میرے ہاتھ کے بال کیوں جھڑ گئے ہیں؟ کہا، حضور! دیتے دیتے۔ پوچھا، تمھارے ہاتھ پر بھی بال ندارد ہیں، یہ کیوں؟ کہا، مالک! لیتے لیتے۔ پھر پوچھا، اچھا، جو نہ دیتے ہیں اور نہ لیتے ہیں ان کے ہاتھ پر بال کیوں نہیں ہیں؟ کہا، حضور! افسوس کرتے کرتے کہ ہائے نہ دیا نہ لیا۔ اور ہم اسی زمرہ میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ ہمارے پاس نہ دین ہے نہ دنیا۔ لے دے کے ایک دل اور ایک سر ہے۔ دل غموں سے بھرا ہے اور سر میں دنیا بھر کا سودا ہے۔ اب ہم اس کی راہ میں خرچ کریں تو کیا کریں ؎

براہِ او چہ می بازیم نے دینے نہ دنیائے
دلے داریم واندوہے سرے داریم وسودائے

ے

کوڑی کے سب جہان میں نقش ونگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
نجمی ــ (۱)

پیش نظر خط میں نجمی صاحب نے زندگی کی تلخ کامیابیوں کا مشاہدہ ذاتی حالات کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کی زندگی خوشحال اور خوشگوار کبھی نہ رہی لیکن اس کے باوجود قناعت اور شکر کے دامن پر ان کی گرفت ہمیشہ مضبوط رہی ہے۔ نجمی صاحب کے ۱۴ خطوط شاخسار کٹک میں اور ۳۵ خطوط ماہنامہ رہنمائے تعلیم دہلی میں بالاقساط شائع ہوتے۔

کرامت علی کرامت نے ان خطوط کے سلسلہ میں لکھا ہے :۔

"بقول اقبال شاعر کے لٹریری اور پرائیوٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے شعراء کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔ لہٰذا ہم قارئین شاخسار کی دلچسپی کے لئے جناب عبداللطیف عارف ہیڈ مولوی سعید سیمنری کٹک کے نام حضرت امجد نجمی کے خطوط قسط وار شائع کر رہے ہیں۔ یہ خطوط نجی نہیں بلکہ خالص ادبی ہیں اور اپنے اندر معلومات کا پیش بہا خزانہ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کا زمانہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک کے عرصہ کو محیط ہے۔ میری رائے میں ان خطوط کو ہمارے ادب کے بہترین انشائیہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔" (۲)

---

(۱) امجد نجمی کے خطوط عبداللطیف عارف کے نام ؛ مطبوعہ رہنمائے تعلیم دہلی ؛ بابت مئی ۱۹۷۸ء ؛ ص ۱۱ ــ ۱۲۔

(۲) امجد نجمی کے خطوط عبداللطیف عارف کے نام ؛ مطبوعہ شاخسار کٹک شمارہ نمبر ۳۹/۴۰ ۱۹۶۳ء ؛ ص ۱۵۔

پنڈت لکشمی نرائن مصرا

پنڈت لکشمی نرائن مصرا کا تعلق سمبلپور سے تھا۔ وہ وہاں کے ایک مہذب برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۹۲۱ء میں سمبلپور ضلع اسکول کے دسویں درجہ میں زیر تعلیم تھے کہ مہاتما گاندھی کے ترک موالات کے نعرہ پر لبیک کہا اور یہیں سے ان کی باقاعدہ تعلیم اختتام پذیر ہوئی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء یعنی آزادیٔ وطن تک اس ۲۶ سال کے عرصہ میں انھوں نے ہر قومی تحریک کا ساتھ دیا، ہر ستیہ گرہ میں شریک رہے اور اس ۲۶ سال کے عرصہ میں ۱۷ سال قید و بند میں گذارے۔ قید و بند کی عزلت نشینی میں انھوں نے اردو سیکھی۔ اپنے ذوق اور لگن کی بنا پر انھوں نے اردو، ہندی، اڑیا، بنگلہ، سنسکرت اور انگریزی زبانوں میں خاصی دسترس حاصل کی۔ وہ اُڑیسہ کے ایک بے مثال مقرر تھے۔ میدان سیاست میں انھوں نے اپنی شناخت قائم کر لی تھی اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لے کر عوامی مقبولیت سے ہمکنار رہے۔ مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کی ادبی اور عوامی خدمات کی تعریف کی ہے۔

پنڈت لکشمی نرائن مصرا اڑیسہ اسمبلی کے رکن تھے۔ انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی صد سالہ تقریبات منعقدہ سمبلپور میں آخری بار تقریر کی اور اس کے چند دنوں بعد بھلائی میں رابندر ناتھ ٹیگور کی صد سالہ برسی میں شرکت کے لئے جھار سو گڑھ سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے اور دوران سفر ہی قتل کر دیئے گئے۔

ان کی شخصیت دو حیثیتوں سے قابل ستائش اور لائق عزت تھی۔ اول تو ان کی انسانی رواداری جسکے نتیجہ کے طور پر اپنے مذہبی معتقدات کا پورا پورا احترام کرنے کے باوجود وہ دیگر مذاہب سے مغائرت نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک سچے موحد، سچے خدا پرست اور صحیح معنوں میں حق بیں و حق شناس انسان تھے۔ ایک طرف ان کے سامنے شری بھگوت گیتا کی تعلیمات تھیں تو دوسری جانب قرآن کریم، فلسفۂ اسلام اور سیرت نبیؐ کا غائر مطالعہ اور موازنہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں مذاہب کی تعلیمات میں بڑی

حد تک یکسانیت اور ہم آہنگی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں کا واحد مقصد ایک ہی ذات حقیقی کی عبودیت و عبدیت کا اعتراف ہے۔ اگرچہ ان مذاہب کے راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل مقصود ایک ہے۔ یہی مطمع نظر پنڈت لکشمی نرائن مصرا کو اپنے معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔

دوسری خوبی جس نے پنڈت لکشمی نرائن مصرا کو اردو داں ارباب ذوق سے روشناس کرایا، اردو سے ان کا غیر معمولی جذبۂ محبت ہے۔ اس جذبۂ محبت نے انھیں اردو کے حلقہ میں خاصی مقبولیت عطا کی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کی اردو تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :-

"پنڈت لکشمی نرائن مصرا صاحب ایم۔ ایل۔ اے (اڑیسہ) بڑے ذہین شخص ہیں۔ انھوں نے اردو جیل میں سیکھی اور جیل ہی سے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور مطالعہ کے لئے اردو کی بعض کتابیں طلب کیں۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے اردو میں اتنی اچھی استعداد پیدا کرلی...... یہ جیل خانہ کی برکت ہے۔ ایسی قید بہت مبارک ہے۔"(۱)

پنڈت لکشمی نرائن مصرا نے اپنے دقیق مطالعہ اور عمیق مشاہدہ سے اردو میں بھگوت گیتا اور قرآن کریم کے تقابلی مطالعہ پر ایک کتاب "بھگوت گیتا" لکھی جو انجمن ترقی اردو ہند (حیدرآباد) کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ ۱۲۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے آغاز میں اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب نے لکھا ہے :-

"وہ اڑیا زبان کے مشہور اہل قلم ہیں اور اب یہ کتاب ثابت کرے گی وہ اردو میں بھی اتنے ہی اچھے مصنف ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو سیکھنا مشکل ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کا یہ فریب ٹوٹ جائے گا اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام زبانیں قابل فہم اساس رکھتی ہیں۔"(۲)

کتاب کے آغاز سے قبل علی شبّیر حاتمی نے لکھا ہے :-

"ہم نہایت فخر کے ساتھ اس اردو دوست اور اردو نواز ہندو ادیب کی اس

---

(۱) پنڈت لکشمی نرائن مصرا؛ بھگوت گیتا؛ تعارف از مولوی عبدالحق ؛ ص ۸ ۔
(۲) پنڈت لکشمی نرائن مصرا؛ بھگوت گیتا؛ پیش لفظ از ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب؛ ص ۷۔

گراں مایہ تصنیف کو ہدیۂ قارئین کرتے ہوئے متوقع ہیں کہ پنڈت جی کے روادارانہ خلوص و محبت، اسلام دوستی، اتفاق واتحاد انسانی، اخوت و یگانگت باہمی کے جذبۂ نیک کی قدر کرتے ہوئے ان کی اولین پیش کش کو قبولیت کا درجہ عطا کریں گے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اردو کی خدمت اس سے زیادہ بہتر طریق پر انجام دینے کی تڑپ اپنے دل میں پیدا کر سکیں۔"(۱)

پنڈت لکشمی نرائن مصرا کی "بھگوت گیتا" میں مشتمل پہلا مضمون "مخزن توکل" ہے جس میں انھوں نے بھگوت گیتا اور قرآن کریم کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور دونوں مذاہب کے فلسفہ میں قدر مشترک کی نشان دہی کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذہبی معتقدات میں توکل الٰہی کی اہمیت پر فلسفۂ مذہب کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ بھگوت گیتا کا ماحصل جو ہے قرآن کریم کا بھی وہی ہے۔

پیش نظر "بھگوت گیتا" کا مطالعہ اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء کی چند اہم کڑیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگرچہ یہاں پنڈت لکشمی نرائن مصرا کی اردو نثر میں عربی اور فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی بنا پر سادگی اور چاشنی کا فقدان ہے لیکن اس کے باوجود ایک غیر اردو نثر کے ارتقاء کے باب میں ایک ایسے فرد کی تحریر اہمیت رکھتی ہے، جو نہ اہل زبان ہے نہ صاحب قلم بلکہ اس کی اولین کوشش نشان منزل کا پتہ دیتی ہے۔ اس ضمن میں "مخزن توکل" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"بہر کیف ہمیں یہ ذہن نشیں کر لینا ہے کہ قرآن کریم اور شریمد بھگوت گیتا کا اشارہ ایک ہی اہم ترین طرز توکل کی جانب ہے چاہے اسے آپ اسلام کہتے یا آتم سمرپن یوگ کے طویل نام سے پکار دیتے۔ اسی اشارۂ الٰہی کی موافقت یعنی اطاعت کے بعد انسان کامل بنتا ہے ......
غرض جس بندۂ الٰہی کا دل صاف و شفاف ہے اور جو زندگی کی ہر ساعت میں یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ ہر طرح کی قوت کا مرکز ذات خداوندی ہے اور یہ کہ جو کچھ روئے زمین و آسمان میں ہوتا ہے وہ ثبوت مشیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسے اس انکساری کے سہارے امر مذکور محض آسان و قدرتی ہے۔ برعکس اس کے جو انانیت سے خود کو قوی سمجھتا ہے بے فہمی

---

(۱) بھگوت گیتا: مصرا: ص ۶

ودھوکہ بازی کو عقلمندی قرار دے کر اصلی بیخ دین کو تسلیم کرنے کے عوض اسے بھول جانا بہتر خیال کرتا ہے اس بدبخت کے لئے دشوار ترین ہے۔ مؤخرالذکر انسان برائے نام انسان ہے۔ چونکہ ابلیسانہ ساحری سے مسحور ہوکر وہ انسانیت کے نصب العین کو یعنی اقبال الٰہی کو نظر انداز کردیتا ہے اور وہ راہ راست سے علیحدگی اختیار کرکے بھٹکتا پھرتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات خوف کھاکر وہ اللہ کا نام لے بھی لیتا ہے۔ مگر ماحول تو کل اس سے بہت دور رہا کرتا ہے۔ یہی صورت حال ہے۔ چاہے یہ ہندو کہلانے والے کی زندگی میں ظہور پذیر ہو یا مسلمان سمجھے جانے والے میں۔''(۱)

پیش نظر اقتباس سے کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ ایک ایسے شخص کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے جس کی مادری زبان اڑیا ہے اور جو زبان اردو کے باب میں نوآموز ہے۔ اول تو انھوں نے ایک نہایت سنجیدہ موضوع پر اظہار خیال کیا ہے جس میں خیالی باتوں کی کوئی وقعت ہوتی ہے نہ تخیل اور جذبے کے رنگ محل کی چھب کاری، لیکن اس کے باوجود انھوں نے حقیقت کے مرقعات اور مذہبی حیثیت کو معتبر لفظیات سے نوانا ہے اور یہی ان کے اسلوب کی خوبی اور ان کے عرفان کی دلیل ہے۔

''بھگوت گیتا'' کے باب دوم میں ''عدم تعصب کی فوقیت'' کے زیر عنوان مذہبی یکجہتی کے عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''ہم بخوبی ذہن نشیں کرلیں کہ زمین و آسمان میں سبھی ایک ہی دین الٰہی کے فرمانبردار ہیں۔ اور فقط اتنا ہی کرلینے پر ہمارے دل سے سارے ابلیسانہ یعنی تعصبانہ آثار کافور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پس کسی بھی فرقہ پرست کے لئے یہ دعویٰ درست نہیں کہ فقط اسی کے پاس سناتن دھرم یا دین اسلام ہے اور دوسرے مذہب کے پیروؤں کے پاس سناتن دھرم یا دین اسلام نہیں ہے۔ ہر ایک فراخ دل ہندو کو اصطلاحی معنی میں اسلام کے نام سے موصوف مذہب عظیم کی صحت و فوقیت کے متعلق تخیل مشتبہ کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دینے سے قطعی باز رہنا چاہئے۔ اور محض احترام کے جذبات کی بناء پر پیغمبر اسلام کی رسالت کو اور نیز قرآن کریم کو غیر مخلوق آسمانی کتاب یعنی قول الٰہی قرار دینا

---

(۱) پنڈت لکشمی نرائن مصرا: بھگوت گیتا، ص ۲۱۔

چاہیئے۔ راست اسلام کے پاک مقصد اور مراد سمجھنے والے فراخ دل مسلمین سے بھی تہ دل سے ویدا ور بھگوت گیتا کو اقوال الٰہی میں شمار کرتے ہیں اور کرشن جی وغیرہ کو پیغمبر مانا کرتے ہیں۔"(۱)

مصرا جی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جیل میں اردو سیکھی تھی۔ ممکن ہے مولانا آزاد سے وہ تبادلۂ خیال کرتے رہے ہوں اور ساتھ ساتھ ان کی مذہبی نثر کو بھی پسند کرتے رہے ہوں اور ان کی بعض تصانیف اس زمانہ میں یا اس کے بعد ان کے مطالعہ میں رہی ہو۔ اس لئے کہ جو اردو نثر مصرا جی نے لکھی ہے وہ محض کچھ دنوں سیکھنے سے نہیں آسکتی۔ اس کے لئے کہ فارسی زبان اور ایک حد تک عربی سے واقفیت ضروری ہے یا پھر ایسی تصانیف کا نسبتاً کثرت سے مطالعہ کیا ہو جو اسلوب نگارش کے تعین اور الفاظ پر قدرت حاصل کرنے میں مدد دے سکے۔

مشکل ادبی اسلوب ہمارے یہاں زیادہ تر مذہبی کتابوں ہی میں ملتا ہے یا پھر ایسی ادبی کتابوں میں جن کی پیش کش کے وقت اعلیٰ طبقہ کی علمی اور ادبی نفسیات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ بھگوت گیتا بھی ایک فلسفیانہ مذہبی موضوع ہے جس پر گفتگو کے وقت سنسکرت لفظیات کا سہارا ضروری ہو جاتا ہے یا پھر عربی و فارسی الفاظ سے مدد لینا۔ اس میں ان کے طبعی رجحان کو بھی بہت کچھ دخل ہو جس کا اندازہ اس کتاب کے موضوعات سے ہوتا ہے۔ ورنہ مخزن توکل، عدم تعصب کی فوقیت، پیغمبر اسلام کی غیر معمولی شخصیت، عقل اور عمل، دھرم یدھ یا جہاد اور شہادت اور استدراک کے باب میں سیر حاصل مضمون آفرینی مشکل ہوتی۔

سادہ نثر سے لے کر علمی نثر تک اور علمی نثر سے لے کر ایک خشک اسلوب کے ساتھ لکھی جانے والی مذہبی نثر تک کے جو نمونے مذکورہ بالا کتاب میں ملتے ہیں وہ اپنے دائرۂ اثر و نفوذ کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اور اڑیسہ میں اردو نثر کی ارتقائی تاریخ کے تنقیدی مطالعہ میں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) پنڈت لکشمی نرائن مصرا: بھگوت گیتا، ص ۳۰

شیخ حبیب اللہ

(ولادت ۱۹۰۹ء)

شیخ حبیب اللہ کی ولادت بلاسپور (مدھیہ پردیش) میں ہوئی۔ سرٹی فیکیٹ کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ۹ راکتوبر ۱۹۰۹ء ہے۔ ان کے والد شیخ محبوب ریلوے میل سروس میں ملازم تھے۔ حبیب اللہ صاحب شیر خوار تھے کہ ان کے والد کا تبادلہ جھارسونگڑہ (اڑیسہ) ہوگیا۔ جھارسونگڑہ ریلوے اسٹیشن سے متصل اس زمانہ میں ایک نوآبادی تھی جہاں بیشتر اہل یوپی اور مارواڑی سکونت پذیر تھے۔ یہ نوآبادی مقامی اڑیا دیہاتوں سے یک قلم الگ تھلگ ہے جہاں کی حاوی زبان اردو ہے۔

حبیب اللہ صاحب کی تعلیم یوپی کے اساتذہ کے یہاں ہوئی اور ماحول اہل زبان کا ملا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انفلوئنزہ کی وبا نے مرگ انبوہ کا عالم پیدا کر دیا۔ ان کی والدہ اور بڑی اس وبا کی نذر ہوگئیں۔ صرف تین بھائی زندہ بچ گئے۔ والدہ کی رحلت کے وقت حبیب اللہ صاحب کی عمر ۹ سال تھی۔ چند سال کے بعد ان کا چھوٹا بھائی بھی چل بسا۔

حبیب اللہ صاحب کی تعلیم منظم طریقہ پر نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھتے تھے لیکن مڈل اسکول پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں سنبل پور ضلع اسکول میں ان کا داخلہ ہوا۔ ان کے اساتذہ میں مولوی رحمت علی رحمت، مولوی ابرار بخش اور مولانا اکرام رسول جیسے نامور مدرسین تھے۔ ہائی اسکول ہی کے زمانہ میں شیخ حبیب اللہ عالمگیر، نیرنگ خیال، ادب لطیف، ہمایوں، ساقی اور نگار وغیرہ ادبی رسائل کا سنجیدہ مطالعہ کرتے تھے۔ ان رسائل کے مطالعہ سے حبیب اللہ صاحب کو افسانہ نگاری کی تحریک ملی۔ اسی زمانہ میں مولوی عبدالسلام احمری پنجاب سے عربی و فارسی کے فاضل ہو کر آئے۔ ان کا تقرر سنبل پور ضلع اسکول میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے ہوا۔ شیخ حبیب اللہ پر مولوی عبدالسلام کے تبحر علمی اور اخلاق حسنہ کی گہری چھاپ پڑی۔

اس زمانہ میں کلام اقبال کی دھوم تھی۔ اردو کے تقریباً تمام رسائل اور جرائد اقبال پر خاص نمبر نکال رہے تھے۔ بے شمار کتابیں اقبال کے محاسن کلام پر شائع ہو چکی تھیں جو حبیب اللہ صاحب کے لئے اقبال فہمی کا وسیلہ بنیں۔

حبیب اللہ صاحب کو مضمون نویسی کا شوق قیام سنبل پور سے ہی شروع ہوا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے رسالہ 'المنصور' (کٹک) میں مضمون لکھا تھا۔

چونکہ ان کے والد نے نوعمری (۱۵ سال کی عمر) میں ہی ان کی شادی کرادی تھی، اس لئے میٹرک کے بعد ہی ۱۹۲۹ء میں انھوں نے سب انسپکٹر آف پولیس کی ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۳۰ء میں حبیب اللہ صاحب کا تقرر کٹک میں ہو گیا۔ یہاں آنے کے بعد مطالعہ کا ذوق نکھرنے لگا۔ انھوں نے ہفتہ وار ہند کلکتہ میں لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے ابتدا میں ہارڈی کے 'میئر آف کینٹربیری' کی تلخیص اردو میں شائع کی۔ اسی زمانہ میں ان کا ایک افسانہ 'دھوکہ' رسالہ آج کل دہلی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مضامین نویسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے روسی اور انگریزی افسانوں اور ناولوں کے ترجمہ کی طرف توجہ مبذول کی اور ڈرامے بھی لکھے۔ یہ تمام ترجمے اور تخلیقات ہفتہ وار ہند کلکتہ، پیام مشرق دہلی، صبح امید بمبئی اور ملک کے دوسرے اردو جرائد میں شائع ہوئیں۔

۱۹۷۱ء سے شیخ حبیب اللہ اقبال پر سلسلہ وار مضامین لکھ رہے ہیں جو فروغ اردو لکھنؤ اور ملک کے دیگر مؤقر ادبی جرائد میں طبع ہو رہے ہیں۔ اوائل عمری میں ان کی تصنیفات عمر خیام، سچی محبت، رہبر اور نجمہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

اپنے ایک مضمون "مذہب" میں حبیب اللہ صاحب رقمطراز ہیں:۔

"اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو مذاہب عالم کا مرکزی تصور ایک ہی نظر آئے گا۔ مذاہب میں اہنسا، عدم تشدّد بھی ہے۔ تشدّد بھی۔ وحدانیت بھی ہے اور شرک بھی۔ نراکار کا عقیدہ بھی ہے اور تجسم کا بھی۔

دیوی دیوتا اور فرشتے ہر جاندار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی وہ انسانی صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی وحشی وطیور کی شکل میں۔ البتہ اسلام نے اوہام وظنون اور دقیانوسی تصورات کا سدّباب کر دیا ہے۔ مگر بعض باتیں اب بھی سائنس دانوں کی نظروں میں کھٹکتی ہیں......... حیوانات اللہ تعالیٰ کی نظر میں اتنے مؤقر ہیں کہ قیامت کے دن ان سے

گنہ گاروں کو پکڑوانے کا کام لیا جائے گا۔ آپ معترض ہو سکتے ہیں کہ گنہ گاروں کی نشان دہی کے لئے جانوروں کی کیا ضرورت ہے؟ مگر یہ بھی تو یاد رکھئے کہ گنہگار کی شخصیت ذلیل ہوتی ہے اور ذلیل کو ذلت ملتی ہی ہے۔ اس لئے ان کے لئے جانور مامور ہوگا۔ جس طرح آج کل مجرموں کو پکڑنے کے لئے کتوں کو پولیس لگا دیتی ہے اور کتے بڑی آسانی سے مجرموں کو پکڑ لیتے ہیں۔"(۱)

اُڑیسہ میں اردو کے نثر نگاروں میں شیخ حبیب اللہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ عام طور پر تکرار و تطویل سے گریز کرتے ہوئے داخلی احتساسی معنی تک پہنچتے ہیں۔ ان کے پچاسوں مضامین ملک کے مؤقر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے افسانے لکھے ہیں اور ڈرامے بھی، ناولٹ لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ غیر ملکی زبانوں کے ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ پیش کیا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل مضامین نے اصحاب علم و دانش سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ شیخ حبیب اللہ کا نام اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء میں نشان منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ حبیب اللہ کی مطبوعات

(۱) مذہب۔ (۲) علامہ اقبال۔ (۳) آسمان (آسمان سے متعلق مختلف سائنسدانوں کے نظریات کا تجزیہ۔) (۴) مولانا آزاد کی شاعری۔ (۵) ماہ و سال کی درازیٔ عمر۔

---

(۱) شیخ حبیب اللہ؛ مذہب؛ مطبوعہ اقبال آسنسول؛ جلد ۶ سنہ ۱۹۷۲ء؛ ص ۲۹۔

(۱) شیخ حبیب اللہ؛ مذہب؛ اقبال آسنسول؛ جلد ۶ سنہ ۱۹۷۲ء؛ ص ۲۹۔

(۲) ایضاً۔ مطبوعہ شاخسار کٹک شمارہ ۶ سنہ ۱۹۶۸؛ ص ۲۰۔

(۳) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ۔ بابت فروری سنہ ۱۹۷۳ء، ص ۱۴۔

(۴) مطبوعہ شاخسار کٹک؛ شمارہ ۴ – ۵ سنہ ۱۹۶۸ء؛ ص ۳۶۔

(۵) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ، بابت جنوری سنہ ۱۹۷۳ء؛ ص ۱۴۔

(۶) تنقید۔
(۷) سائنس زبردست سراغ رساں (فورن سک سائنس)۔
(۸) مولانا آزاد اور عرفانی ترجمان القرآن۔
(۹) اکبر اور جہانگیر کا مذہب۔
(۱۰) غالب کی محبوبہ۔
(۱۱) ضعیفی میں الیٹنٹ۔
(۱۲) رحمۃ الناس مدر ٹریسا (مدر ٹریسا کی حیات اور ان کی انسانی خدمات کا عمیق جائزہ۔
(۱۳) پریم چند پر اقبال کا اثر۔
(۱۴) کارل مارکس اور اقبال۔
(۱۵) اقبال کا تصور مومن۔
(۱۶) اقبال اور ڈاکٹر تاراچرن رستوگی۔
(۱۷) ابلیس کی مجلس شوریٰ۔
(۱۸) غالب اور اقبال۔
(۱۹) قمری کفِ خاکستر۔
(۲۰) میں کون ہوں کیا ہوں۔
(۲۱) کلام اقبال کی تشریحات۔
(۲۲) ابلیس اقبال کی نظر میں۔
(۲۳) اقبال کی پیشین گوئیاں۔
(۲۴) اقبال کی عقیدتمندی۔

حوالے:

(۶) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ: بابت اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۲۴۔
(۷) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ: بابت نومبر ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۳۔
(۸) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ؛ بابت مارچ ۱۹۷۸ء؛ ص ۲۳۔
(۹) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ: بابت اکتوبر ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۱۔
(۱۰) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ، بابت فروری ۱۹۸۰ء: ص ۲۲۔
(۱۱) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ، بابت اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۲۹۔
(۱۲) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ، بابت جنوری ۱۹۸۱ء؛ ص ۳۰۔
(۱۳) فروغ اردو۔ مارچ ۸۱ء ص ۲۴۔
(۱۴) فروغ اردو۔ مارچ ۸۰ء ص ۲۰۔
(۱۵) فروغ اردو۔ جون ۸۳ء ص ۶۔
(۱۶) فروغ اردو۔ مئی ۸۳ء ص ۱۳۔
(۱۷) فروغ اردو۔ دسمبر ۸۱ء ص ۱۲۔
(۱۸) فروغ اردو۔ اکتوبر ۷۹ء ص ۳۰۔
(۱۹) فروغ اردو۔ فروری ۸۱ء ص ۲۰۔
(۲۰) فروغ اردو۔ اگست ۷۶ء ص ۲۷
(۲۱) فروغ اردو۔ مئی ۷۹ء ص ۵۔
(۲۲) فروغ اردو۔ نومبر ۷۷ء ص ۱۴۔
(۲۳) فروغ اردو۔ جون ۷۴ء ص ۲۰۔
(۲۴) فروغ اردو۔ جولائی ۷۲ء ص ۹۔

(۲۵) تاج محل۔

(۲۶) اقبال پر زرتشت کا اثر۔

(۲۷) یہ ہیں اقبال۔

(۲۸) اقبال اور یورپی مفکرین۔

(۲۹) غالب، اقبال اور فسانۂ دل۔

(۳۰) غالب، اقبال اور روداد عشق۔

(۳۱) اقبال اور دریوزہ گری۔

(۳۲) غالب، اقبال اور پروردگار۔

(۳۳) اقبال، غالب اور زندگی۔

(۳۴) گیتانجلی پر فلسفۂ قرآنی اور اقبال کا اثر۔

(۳۵) حافظ اور اقبال۔

(۳۶) اقبال اور تصور باری تعالیٰ۔

(۳۷) قسمت کا دھنی (ڈرامہ)۔

(۳۸) عشق باز (ڈرامہ)۔

(۳۹) شہید محبت (ڈرامہ)۔

(۴۰) دھوکہ (افسانہ)۔

(۴۱) حسن برہم (افسانہ)۔

(۴۲) ایکٹریس (افسانہ)۔

(۴۳) ہاؤدنی۔

(۴۴) زن قحبہ۔

(۴۵) جگن ناتھ آزاد اور اقبال۔

(۴۶) مقام زن۔

حوالے:

(۲۵) فروغ اردو۔ اکتوبر ۷۵ء ص ۳۳

(۲۶) فروغ اردو۔ اکتوبر ۷۴ء ص ۱۳۔

(۲۷) فروغ اردو۔ جون ۷۳ء ص ۹۔

(۲۸) فروغ اردو۔ اپریل ۷۳ء ص ۱۵

(۲۹) فروغ اردو۔ جولائی اگست ۷۲ء ص ۳۳۔

(۳۰) فروغ اردو۔ مارچ ۷۲ء ص ۵۔

(۳۱) فروغ اردو۔ جون ۷۱ء ص ۱۶۔

(۳۲) فروغ اردو۔ دسمبر ۷۲ء ص ۵۔

(۳۳) فروغ اردو۔ مارچ ۷۵ء ص ۱۸۔

(۳۴) فروغ اردو۔ جولائی ۷۵ء ص ۲۲۔

(۳۵) فروغ اردو۔ دسمبر ۷۵ء ص ۱۳۔

(۳۶) فروغ اردو۔ ستمبر ۸۳ء ص ۵۔

(۳۷) ہند کلکتہ۔ ۱۹۴۰ء

(۳۸) ہند کلکتہ ۱۹۳۰ء

(۳۹) قلمی نسخہ۔ مسودہ راقم الحروف کے پاس ہے۔

(۴۰) آج کل دہلی۔ ۱۹۴۲ء

(۴۱) آج کل دہلی۔ ۴۲ء

(۴۲) ہند کلکتہ۔ ۱۹۳۶ء

(۴۳) قلمی نسخہ۔

(۴۴) قلمی نسخہ

(۴۵) صبح امید بمبئی۔ اگست ۴۴ء ص ۵۔

(۴۶) صبح امید بمبئی۔ ستمبر ۴۷ء ص ۱۴۔

(۴۷) چاند سلطانہ۔
(۴۸) اسلام اور جمالیات۔
(۴۹) قدیم و جدید۔
(۵۰) پریم چند میری نگاہ میں۔
(۵۱) قصۂ قدیم و جدید۔
(۵۲) حسن و عشق۔
(۵۳) قومی یک جہتی۔
(۵۴) بیتی باتیں اور شیخ حبیب اللہ۔

شیخ حبیب اللہ کا انداز تحریر اس وقت کے ادبی تناظر میں ملاحظہ ہو:۔
ڈاکٹر عابد حسین کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے ذہنی اخلاق بالیدگی پیدا ہونا محال سی بات ہے۔اس ضمن میں شیخ حبیب اللہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے بعض باتوں پر مصنف سے اختلاف ہے۔ اسلام کی بنیاد کلمۂ طیبہ پر ہے۔ خدا اور رسولؐ پر ایمان۔اسلام کبھی نہیں کہتا کہ سائنس کی باتوں کو نہ سنو۔ سیاسی عقائد پر غور و خوض نہ کرو۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ سائنس سے مرعوب ہو کر قرآن کا بطلان نہ کرو۔ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں اور بیشتر ظن تخمین پر مبنی ہوتے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ قائم ہے۔آیات قرآنی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی کے حقائق سے بہرہ ہونے کے لئے چشم بینا کی ضرورت ہے۔ جو مطالعۂ قرآن سے حاصل ہوتی ہے۔ زندگی نام صرف نازنین بتان خود آرا سے محبت نہیں ہے۔ افسوس! شعرائے اردو بس محبت کے ایک ہی پہلو کو لے کر جنسی شاعری کرتے ہیں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ گنج گراں مایہ ہے۔اس کا ہر دقیقہ گلستاں بہ کنار اور نشاط آگیں ہے۔ اسے گنوا دینا اہل بصیرت کا شیوہ نہیں ہونا چاہئے۔ جس کے پلے یقین محکم نہیں وہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ غالب کے پاس یقین محکم تو کجا، کوئی یقین ہی نہیں تھا۔ لاریب ناداری انسان کو کافر بنا دیتی ہے۔ مگر زندگی یعنی وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔اس کی گاڑی تیز رفتار ہے۔اگر عزم راسخ اور عقابی روح انسانوں کے دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی سرشت میں کوکبی اور مہتابی جو پوشیدہ ہے جلوہ ریز

(۴۷) صبح امید بمبئی۔جون ۷۴ء ص ۷۔
(۴۸) صبح امید بمبئی۔ دسمبر ۷۴ء ص ۳۸۔
(۴۹) صبح امید بمبئی۔ جولائی ۷۴ء ص ۶۷۔
(۵۰) طلسم حرف کھنڈوہ۔ شمارہ ۴-۸۲ء ص ۷۔
(۵۱) صبح امید۔ جنوری ۸۲ء ص ۷۔
(۵۲) صبح امید۔ جنوری ۷۴ء ص ۲۹۔
(۵۳) صبح امید۔ اپریل ۷۵ء ص ۱۷۔
(۵۴) صبح امید بمبئی۔ فروری مارچ ۷۵ء ص ۱۷۔

ہو جائے۔ اردو کیا عربی و فارسی میں بھی ایسی شاعری نہ تھی جسے ہم یورپی شاعری کے ہم پلّہ کہہ سکتے ہیں۔" (۱)

کسی بھی شاعر یا ادیب پر تبصرہ کرنے سے قبل تمہید کے طور پر شیخ حبیب اللہ عبارت آرائی کرتے ہیں اور پھر مصنف کی ادبی خصوصیات و کمال کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنی اس عبارت آرائی کے ذریعہ وہ ذاتی فیصلے بھی کرتے ہیں۔

زبان کی چاشنی اور ردو بست سے اکثر مصنف کی ادبی خصوصیات ان کی عبارت آرائی کی نذر بھی ہو جاتی ہے۔ تاہم انھوں نے غالب اور اقبال کے بارے میں بہت سے بنیادی سوالات بھی اٹھاتے جاتے ہیں جن سے شاعر کے تصورات اور میلانات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ انھوں نے زبان کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں اور ناولٹ میں ایک منفرد لب و لہجہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کا ڈرامہ "نشۂ دولت" اس عہد کی آمریت اور طبقۂ خواص عیش و عشرت، حکمرانی اور اس کے دائرۂ عمل میں عوامی استحصال کی منظر کشی کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس وقت کی ابھرنے والی جمہوری قدروں کے ہمنوا ہیں اور آمریت کے تمام وسائل اور عملداری کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے اس رویہ سے انسان دوستی اور عوامی جذبوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

(۱) شیخ حبیب اللہ: اقبال، غالب اور زندگی؛ مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ: اپریل ۱۹۷۵ء: ص ۲۲۔

باب چہارم

(الف)

اُڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے

اُڑیسہ کے اردو اسٹیج نے آپیرا کی شکل میں ترویج اور نشوونما حاصل کی۔ اُڑیسہ میں خالص اردو آپیرا کی تاریخ کے اگرچہ روشن دلائل نہیں ملتے لیکن اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اڑیا زبان کے ساتھ مل کر یہ آپیرے مغلیہ دور حکومت سے ہی فروغ پا رہے ہیں۔ اڑیا زبان میں جو پالا اور جاترے ان دنوں مقبول عام ہیں دراصل انھیں مغلوں کے دورِ حکومت میں ہی فروغ حاصل ہوا۔ اڑیسہ کے میلوں اور معاشرتی تقریبات میں جو تماشے ہوتے ہیں ان میں مغلیہ دور کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے اڑیا شاعر برج ناتھ برجینا نے سمر ترنگ (۱۷۹۰ء) میں ڈھینکا نال کے راجاؤں کے کارنامہ ہائے جنگ وجدل کو رزمیہ انداز میں نظم کیا ہے جس کے باب چہارم کا کچھ حصہ خالص اردو میں ہے جس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ اڑیا آپیرا کی نشوونما میں بھی اردو نے حصہ لیا ہے۔ اڑیسہ میں ناٹکوں کی تخلیق و تعمیر میں فوک ڈرامہ کی دو ضمنی اصناف نے مخصوص رول ادا کیا ہے جن میں سے ایک "پالا" ہے اور دوسرا "دس کاٹھیا"۔ لوک ناٹیہ کی یہ اصناف ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں میں پائی نہیں جاتیں۔ "پالا" کے آغاز کے بارے میں پروفیسر گرجا شنکر رائے کا کہنا ہے :-

''مسلمانوں کو فتح اُڑیسہ کے بعد اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی باہمی سماجی بیٹھک کے طور پر ''مجلس'' کا رواج عام ہوا۔ ان مجلسوں میں تفریح کی غرض سے رقص و سرود کا اہتمام ہونے لگا۔ مسلمانوں کے اثرات سے ایک طرف ''پالا'' کا آغاز ہوا اور دوسری جانب جاترا۔''(۱)

ہندو مسلم یک جہتی کے تصور کو لے کر پالا کی تخلیق عمل میں آئی۔ اگرچہ تیرہویں صدی کے اوائل میں بنگال پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اس کے باوجود تقریباً دو ڈھائی سو سال بعد مسلمان اُڑیسہ پر قابض ہوتے۔ اڑیسہ کے آخری حکمراں راجہ کج پتی موکوند دیو کی شکست کے بعد ۱۵۶۸ء میں اڑیسہ افغانوں کے دخل میں آیا۔ بنگال اور اڑیسہ دونوں صوبوں میں مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ بہت ہی قریبی تعلقات رہے۔ مسلمان چونکہ یہاں مستقل قیام کی خواہش رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ خیرسگالی تعلقات قائم کرنا چاہا۔ ہندوؤں نے بھی گرم جوشی کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ہندو مسلم تہذیبی یک جہتی کی کوششیں ہونے لگیں۔ ہندوؤں کی طرف سے ستیہ اور ''پیر'' کے اشتراک سے ستیہ پیر پالا وجود میں آیا۔ دراصل بنگال میں اس رجحان کا آغاز ہوا اور اُڑیسہ میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ پالا بھی یہاں کی سماجی زندگی میں داخل ہو گیا۔ پھر بھی مقامی اثرات کے پیش نظر بنگال کے پالا سے اڑیسہ کا پالا مواد اور ہیئت کے لحاظ سے مختلف تھا۔

پالا میں سنگیت کے علاوہ معمولی رقص اور کسی حد تک اداکاری کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس میں چار کردار ہوا کرتے ہیں۔ پالا عام طور پر کسی کے گھر ولادت کی تقریب پر یا کسی سماجی اجتماع کے موقع پر منعقد کیا جاتا تھا۔ پالا میں بنگلہ اور اڑیا دونوں زبانوں کا مشترکہ استعمال ہوا کرتا ہے۔

دس کاٹھیا میں دو کردار سامنے آتے ہیں جن کے ہاتھوں میں لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ہوتے ہیں۔ اس صنف میں مکالمے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اداکاری بھی ہوتی ہے۔

---

(۱) گرجا شنکر رائے: اوڑیا ناٹیہ کلا؛ مطبوعہ ۱۹۶۷ء؛ ص ۲۷۰۔

مغل تماشا

لوک ناٹیہ کے ایک صنف کے طور پر پچھلے دو سو سال سے بھدرک میں "مغل تماشا" عوامی دل بستگی کا سامان اور ہندو مسلم تہذیبی یک جہتی کی سبیل پیش کرتا رہا ہے۔ اس کے مصنف بنسی بلبھ گوسوامی (ولادت ۱۷۲۰ء) حقیقی معنوں میں فن کے رسیا تھے۔ عوامی جاتراؤں اور پالاؤں میں جس زمانہ میں منظوم مکالمے پیش کئے جا رہے تھے بنسی بلبھ گوسوامی نے نثری مکالموں کا آغاز کیا۔[1]

کرداروں کی مناسبت سے زبان کے استعمال میں بنسی بلبھ گوسوامی نے کافی جدت برتی ہے۔ مغل تماشا کے مرکزی کردار مرزا صاحب کے لئے فارسی اور مختلف سطح کے خادموں کے لئے اردو، ہندی اور بنگلہ۔ زمیندار، حجام، پیادہ اور گوالن کے لئے اڑیا زبان کا استعمال کیا ہے۔

"مغل تماشا" اٹھارہویں صدی کی تصنیف ہے اور ایسے شخص کی اُردو تصنیف ہے جس کی مادری زبان اُڑیا تھی۔ جس طرح ہندی کی سب سے عظیم اور قدیم تصنیف "پدماوت" اردو رسم الخط میں ہے۔ اب سے قبل تک کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا ڈرامہ ایدل جی جمشید جی کھوری کا "خورشید" گجراتی رسم الخط میں ہے۔ انشاء کی "رانی کیتکی" ہندی ہونے کے باوجود فارسی رسم الخط میں ہے۔ بابا فرید گنج شکر، وارث شاہ اور گرو نانک شاہ تمام تخلیقات پنجابی زبان میں ہونے کے باوجود فارسی رسم الخط میں ہیں۔ مغل تماشا بھی اردو ڈراما ہونے کے باوجود اڑیا رسم الخط میں ہے۔ جو پچھلی دو صدیوں سے اڑیسہ کے عوام کی دل بستگی کا سامان فراہم کرتا رہا ہے اور ہندو مسلم تہذیبی یک جہتی کی روایت بن چکا ہے۔

ہندوستانی ڈرامہ کی کل ہند روایت مختلف علاقوں میں وہاں کی عوامی تہذیب اور عوامی بولیوں کے امتزاج سے ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے۔ ڈرامہ کی تکنیک اور پیش کش کے طریقوں پر بھی علاقائی روایات اثرانداز ہوتی رہی ہیں۔ ان کے زیر اثر جو فنی

---

(۱) ہیمنت کمار داس: اوڑیا ناٹکو روپی کا شودھارا، مطبوعہ ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۲۔

شاہکار پیدا ہوئے۔ ان کو عام طور پر یا تو سرے سے ادب کے دائرے میں شامل نہیں کیا گیا یا پھر ان کی پذیرائی بہت بعد میں ہوتی اور انھیں متعلقہ علاقائی زبان کے ادب میں جگہ مل گئی۔ حالانکہ یہ کوششیں محض علاقائی نہیں تھیں بلکہ ایک وسیع تر ہندوستانی بین علاقائی ڈرامہ کی روایت کا حصہ تھیں۔ مثال کے طور پر مراٹھی میں تماشا تکنک نفس مضمون اور انداز پیشکش کے اعتبار سے ایک واضح شکل اختیار کر گیا ہے۔ اسی طرح بنگال میں جاترا ہے۔ اسی روایت کا ایک حصہ اڑیسہ میں "مغل تماشہ" کی شکل میں وقوع پذیر ہوا ہے جو وسیع تر ہندوستانی روایت کا ایک حصہ ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اردو ڈرامہ ان علاقوں میں زیادہ مقبول ہوا ہے، جہاں کے رہنے والوں کی اکثریت اردو رسم الخط سے ناواقف تھی۔ مثلاً اردو ڈرامے کا فروغ پہلے مہاراشٹر میں پھر بنگال میں ہوا۔ اس لحاظ سے اردو ڈرامے کو صرف رسم الخط کے آئینے ہی میں نہیں پہچانا جا سکتا بلکہ اردو زبان کی صرفی اور نحوی ساخت، اس کی تلمیحات، روایات اور اس کی ادبی چاشنی سے شناخت کیا جا سکتا ہے چاہے تھیٹر کی ضرورتوں کی بناء پر اسے کسی بھی رسم الخط میں کیوں نہ لکھا گیا ہو۔ "مغل تماشا" اس کی ایک مثال ہے۔

اردو نے پورے ہندوستان گیر پیمانے پر تھیٹر کو فروغ دیا اور اس کی روایت مختلف مقامی روایات میں ضم ہو گئی۔ اردو نے ان علاقوں کی بولیوں کے الفاظ آزادانہ طور پر اختیار کئے اور ان کے ساتھ شیر و شکر ہو کر دور دور تک پھیلتی گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے قیام اور استحکام کے نقطۂ نظر سے مغل تماشا نے اہم رول ادا کئے ہیں۔ وسیع النظری، رواداری اور مذہبی یک جہتی کے تصور کو لے کر "مغل تماشا" کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ ہندو مسلم دونوں مذہب کے لوگوں کے اس تماشا میں مساوی اشتراک سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھدرک کے شیو مندر کے سامنے "مغل تماشا" کا انعقاد اور اس میں مسلم اداکاروں کی شرکت اور شیو وندنا ہندو مسلم اتحاد کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور ایک بات مزید واضح ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں دونوں مذاہب میں تنگ نظری کا گذر نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مغل تماشا اسٹیج کرنے کے لئے صرف شیو مندر کے سامنے کی جگہ مخصوص نہ ہوتی یا دوسری صورت میں مسلمان مندر کے سامنے اس تماشا میں عملی طور پر شرکت نہ کرتے۔ مغل تماشا اس دور کی سماجی زندگی کا آئینہ دار ہے اور اسی وجہ سے اسے تاریخی دستاویز کی

حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔

مغل تماشا کا اسٹیج

جس طرح منشی امانت کی اندر سبھا کے لئے کوئی عمارت تعمیر نہیں کی گئی، وہ زیادہ تر کھلے میدان میں اور کبھی کسی مکان کے کشادہ صحن میں کھیلی جاتی تھی، ایک وسیع شامیانہ لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے نیچے بیچ میں کافی جگہ چھوڑ کر ایک طرف راجہ اندر کے لئے ایک سجا ہوا تخت اور پریوں کے لئے کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں اور تین طرف تماشائیوں کے لئے تخت بچھا دیئے جاتے تھے۔ کوئی باقاعدہ اسٹیج نہ ہوتا تھا۔ وہی صحن یا میدان کے بیچ چھوٹی ہوئی جگہ اسٹیج کا کام دیتی تھی۔[1] اسی طرح مغل تماشا کے لئے بھی دو سو سال کے اس طویل عرصہ میں نہ کوئی عمارت تعمیر کی گئی نہ کوئی مستقل اسٹیج، بلکہ بھدرک کے کنواس استنقیا، شاہ پور، گرد پور، چھڑاک محلہ، سنگت اور باتکا بازار میں شیو مندر کے سامنے کھلی فضا کا اسٹیج Open air stage ہوا کرتا ہے۔ اسٹیج پر پردہ کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ ایک طرف تخت بچھا کر یا مٹی سے مرتفع کر کے ایک پنڈال بنایا جاتا ہے جس پر مرزا صاحب کے بیٹھنے کے لئے کرسی رکھ دی جاتی اور رنگ برنگے پھولوں، رنگین کاغذ اور کپڑے کے پارچوں سے مزین کر دی جاتی ہے۔

مغل تماشا میں ناظرین تین طرف بیٹھتے ہیں۔ مرزا صاحب کے تخت کے سامنے ذیلی کرداروں کی اداکاری کے لئے جگہ خالی رہتی ہے۔ اسٹیج کے ایک طرف سازندے اور گلوکار بیٹھتے ہیں۔ اوپر ایک وسیع شامیانہ تان دیا جاتا ہے۔ اس میں فانوس اور رنگ برنگ کے پھول آویزاں ہوتے ہیں۔

مغل تماشا کے رقص، موسیقی اور نغمے خصوصیت کے حامل ہیں۔ قدیم ہندوستانی اسٹیج میں جس طرح ایک خاص جگہ میوزک آرکسٹرا کے لئے بنائی جاتی تھی جہاں سے رقص اور گانوں کے ساتھ یا ڈرامہ کے خاص خاص ساکت موقعوں پر ساز بجائے جاتے تھے اور ان سازوں کو وادیہ اور آرکسٹرا کو تپ کہا جاتا تھا۔[2] اسی طرح مغل تماشا میں بھی سازندوں اور گلوکاروں

---

(۱) مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج اور اندر سبھا، ص ۱۰۶۔

(۲) ڈاکٹر صفدر آہ، ہندوستانی ڈراما مطبوعہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۔

کے لئے ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ سازندوں کا ساتھ دینے والے جو گلوکار ہوتے ہیں انھیں "آسوَرودالا" کہا جاتا ہے اور سازندوں کو پادیہ کہا جاتا ہے۔

رقص و سرود کی فراوانی، کھلا اسٹیج، اداکاری کے اصول اور ناظرین کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جاتے تو مغل تماشا کو Folk Theatre کا درجہ دیا جا سکتا ہے لیکن اس ضمن میں جو چیز آڑے آتی ہے وہ عوامی ادب کا داستانی روپ ہے جبکہ مغل تماشا ایک مخصوص فرد کی ذاتی تخلیق ہے جو منصۂ شہود پر آکر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سوائے استثناء کے "مغل تماشا" کے عوامی ناٹک ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بنگال اور اڑیسہ کے "لیلا جاترا"، گجرات کے "بھوائی"، اتر پردیش اور راجستھان کی "نوٹنکی"، پنجاب کی "نقل" اور تامل ناڈو کے "ٹیرو گتّو" کو جب لوک ناٹیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے تو مغل تماشا کو بھی اس ضمن میں شمار کئے جانے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے۔

مغل تماشا کو عوامی ناٹک تسلیم کیا جائے تو اس کے زمانۂ تصنیف کے پیش نظر یہ تمثیل، گیتی ناٹیہ یا جاترا کا ابتدائی روپ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اٹھارہویں صدی میں ڈرامے کے ارتقاء کا سورج جرمنی میں طلوع ہوا اور اس فلسفہ خیز زمین نے ۱۷۲۹ء میں لیسنگ Lessing جو بیک وقت عظیم مفکر اور بے عدیل ڈراما نگار تھا۔ دوسری طرف بنسی بلبھ گوسوامی کی ولادت ۱۷۲۸ء میں اڑیسہ میں ہوئی۔ منشی امانت لکھنوی کا سنہ ولادت ۱۸۱۱ء ہے۔ اندرسبھا کا زمانۂ تصنیف ۱۸۵۰ء ہے اور مغل تماشا کا زمانۂ تصنیف تقریباً نصف صدی پیشتر اس طرح سے "مغل تماشا" کو اردو کا اولین ڈراما کہا جا سکتا ہے۔

"مغل تماشا" اور "اندرسبھا" اردو میں ڈراما کا لفظ آنے سے قبل تھیں اور کمرشیل نہ تھیں۔ یہ تمام چیزیں لوک سطح پر تھیں۔ یہ لٹریچر کا وہ حصہ ہے جو عوام سے تعلق رکھتا ہے اور ان کا آرٹ لٹریچر رقص و موسیقی سب اس میں داخل ہے۔ اس لحاظ سے یہ ہماری اس عظیم الشان روایت کا حصہ ہے جو روایت سنسکرت ڈراموں سے ٹوٹ کر لوک ناٹکوں کے مختلف روپ میں بکھر گئی تھی۔

اڑیسہ میں اردو ڈراموں کے فروغ پر روشنی ڈالتے ہوتے کرامت علی کرامت نے لکھا ہے:۔

"انیسویں صدی میں کالامیاں شنکر پوری کی ایک اوپیرا پارٹی معرض وجود میں آئی۔ اس تماشا کے مصنف اسرار بہراج پوری تھے جنھوں نے اپنے تماشا میں اردو اور اڑیا زبان مشترکہ طور پر پیش کر کے عوامی دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ان تماشوں کا اکثر حصہ مزاحیہ ہوتا تھا۔ یہ تماشے اڑیسہ کے ہندو اور مسلم عوام میں اس قدر مقبول ہوئے کہ گاؤں گاؤں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس تماشا کی عوامی مقبولیت کا اس بات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک صدی گذر جانے کے باوجود آج بھی قدیم لوگوں میں اس تماشا کے مزاح کی چاشنی باقی ہے اور اس کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے ؎

چل چل جاتا ہے بفاتی
مختصر چلم لے کے ساتھی[1]

اس کے علاوہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی کورنیتھن تھیٹریکل کمپنی وغیرہ نے اڑیسہ کے مختلف مقامات پر اپنے ڈرامے اسٹیج کئے اور اپنے کمال فن سے ناظرین کا دل موہ لیا۔ بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۱ء کے دوران متعدد بار اڑیسہ آئی ڑیسہ کے مختلف علاقوں میں منشی امانت کی "اندرسبھا" اور آغا حشر کا "خون ناحق" وغیرہ اسٹیج کیا۔ مذکورہ تھیٹریکل پارٹی کی اڑیسہ میں آمد، مختلف علاقوں میں طویل قیام اور اردو ڈرامے اسٹیج کرنے کی وجہ سے اڑیسہ کے اردو اسٹیج کی تاریخ میں قابل ذکر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سب سے پہلی چیز سامنے آئی درپن کے راجہ جن کا خاندان بنیادی طور پر کشمیری ہے اور زمانۂ دراز سے ان کے خاندان میں اردو فارسی کا چرچا رہا ہے۔ کٹک کے چاندنی چوک میں اپنی ایک تھیٹر کمپنی قائم کرلی اور اپنی کوٹھی کے سامنے وسیع لان میں (آج جہاں درگا منڈپ بنا ہوا ہے۔) ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک اردو ڈرامے اسٹیج کرتے رہے جس میں متعدد بار اندرسبھا بھی پیش کی گئی۔

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں رپن تھیٹر (سابق کرزن تھیٹر) نے شہر کٹک میں ڈھائی ماہ تک اردو ڈرامے پیش کئے جس میں آغا حشر کا "اسیر حرص" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ تھیٹر ۱۹۱۱ء میں بھی کٹک آیا اور "راجہ ہریش چندر" بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

---

(۱) کرامت علی کرامت: اڑیسہ کا اردو اسٹیج، مطبوعہ ہفت روزہ آثار کلکتہ ۱۹۶۱ء۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں بھی پارسی ریپن تھیٹر کٹک آیا اور اس مرتبہ "اندر سبھا" "ہمایوں بادشاہ" وغیرہ ڈرامے اسٹیج کئے۔ اڑیسہ میں باہر سے آنے والی تھیٹر کمپنیوں کی سرگرمی سے کٹک کے نوجوان طلباء میں ڈراما کا ذوق پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے اعظم خاں بازار میں ایک اردو ڈرامہ اسٹیج کیا تھا جس میں مرحوم محمد ساجد اور ہدایت اللہ وغیرہ نے رول ادا کیا تھا۔

اسی زمانہ میں کٹک کے علاوہ اڑیسہ کے دیگر علاقوں میں بھی اردو ڈرامہ کی تحریک چل نکلی۔ ۱۲—۱۹۱۱ء میں سمبل پور میں آغا حشر کا ڈرامہ "خوبصورت بلا"، "اسیر حرص" وغیرہ اسٹیج ہوتے تھے جن کی ہدایت ڈاکٹر احمد اللہ بیگ رائے پوری نے دی تھی۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی پھر سے تین ماہ کے لئے کٹک کے میونسپل گراؤنڈ میں آکر خیمہ زن ہوئی۔ اس کے منیجر دادا بھائی ٹھونٹی تھے (جن کا تذکرہ ناٹک ساگر میں بھی آیا ہے۔) دادا بھائی ٹھونٹی نے اسیر حرص میں چنگیز کا رول ادا کیا تھا اور پہلوان کلکتوی نے ویلین کا رول کیا تھا۔ رحمت النساء ڈرامہ کی ہیروئن تھی۔ اس کمپنی کے اکثر اداکار مسلمان تھے۔ تین مہینے تک ان کا قیام کٹک کے بخشی بازار میں واقع یوسف ملا کی کوٹھی میں تھا۔ تین مہینے کے دوران قیام اس تھیٹریکل پارٹی نے اسیر حرص، مرید شک، سفید خون، خون ناحق، خوبصورت بلا وغیرہ کے علاوہ ہریش چندر، اندر سبھا اور مہابھارت کا ایک ایکٹ بڑے اہتمام سے اسٹیج کیا تھا۔

بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی کے زیر اثر نورالہدیٰ شاد عرف ہدیٰ میاں کلکتہ سے تعلیم حاصل کرکے کٹک آگئے تھے اور کلکتہ میں انھیں آغا حشر کاشمیری، آغا محمود کاشمیری اور میر محمود طرزی وغیرہ کی صحبت حاصل رہی۔ کٹک آتے ہی انھیں اردو ڈرامے اسٹیج کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ نورالہدیٰ شاد اور امجد نجمی کی باہمی کاوش سے کٹک میں "مسلم ڈراماٹک ایسوسی ایشن" قائم ہوا۔ اس زمانہ میں حافظ شمس الدین احمد شمس منیری (مرحوم) راونشا کالج کٹک میں شعبۂ قانون کے لکچرار تھے۔ انھوں نے مذکورہ ایسوسی ایشن کی صدارت قبول کی۔ اور جب تک کٹک میں رہے اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں نورالہدیٰ شاد کی ہدایت کاری میں پہلی بار آغا حشر کا ڈرامہ "سلور کنگ" کٹک کے قدیم ترین اسٹیج واقع جگن ناتھ بلبھ میں پیش کیا گیا۔ نورالہدیٰ شاد نے اس ڈرامے میں موسیقی بھی دی تھی۔ امجد نجمی اس ڈرامے میں معاون ہدایت کار تھے۔ اس ڈرامہ کے

اداکاروں میں ثناء اللہ، کفایت اللہ، علی حسن (اوسلی میاں)، عبدالرشید خاں، جاج پوری، منصور بیگ، عبدالجبار، رحیم بخش وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ مسلم ڈرامائک ایسوسی ایشن نے اسی اسٹیج پر "خوبصورت بلا" بھی پیش کیا تھا۔

۱۹۲۴ء میں منشی قادر علی کی سرپرستی میں دوسری ڈرامائک پارٹی معرضِ وجود میں آئی۔ قادر علی خود ہدایت کار بھی تھے اور موسیقار بھی۔ اس پارٹی کے ڈرامے بال مکھ کے اسٹیج پر پیش کئے جاتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں امجد نجمی کا تبادلہ خردہ روڈ ہوگیا جہاں وہ گیارہ سال تک رہے۔ وہاں انھوں نے اپنی ذاتی کاوش سے اسٹیج کی تحریک پیدا کردی۔ خود اسٹیج کرافٹ میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء تک انھوں نے آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے سلور کنگ، خوبصورت بلا، یہودی کی لڑکی، بن دیوی، خراب بستی وغیرہ اور ماسٹر ابراہیم محشر کے ڈرامے "آتشیں ناگ" کے علاوہ اپنے دو ڈرامے امان اللہ (بدنصیب بادشاہ) اور کامیاب تلوار بھی اسٹیج کئے۔ ان دنوں وہاں اڑیا اور تیلگو میں جتنے ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تھے وہ قدیم مذہبی اور اساطیری قصوں پر مبنی ہوا کرتے تھے۔ لیکن امجد نجمی نے اردو ڈراموں میں تاریخی، سیاسی اور سماجی عناصر کو بحال رکھا۔ ان کے ڈرامے "بدنصیب بادشاہ" میں افغانستان میں امان اللہ کے زوال اور سیاسی پالیسی کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح کامیاب تلوار میں مصطفےٰ کمال پاشا کا عروج اور نوجوان ترکوں کے جذبۂ ایثار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس عہد میں اڑیسہ کے اردو اسٹیج کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ عوام اردو ڈرامہ دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہاں اردو اسٹیج نے ڈراموں کے روپ میں ایسے واقعات پیش کئے جو اس وقت سیاسی دنیا میں عمل پذیر ہو رہے تھے۔ اڑیسہ کے اردو اسٹیج کو مقبول عام بنانے میں کئی مشکلیں درپیش تھیں لیکن امجد نجمی نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لے کر اچھے انداز سے ڈرامے پیش کئے کہ عوام میں ان کی مقبولیت دن بہ دن بڑھنے لگی۔ اڑیسہ میں اردو زبان کی مقبولیت اور بقا کے سلسلہ میں اردو اسٹیج اور امجد نجمی دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔

اسی زمانہ میں خوردہ روڈ میں باغ علی کی سرپرستی میں اور ایک ڈرامہ پارٹی معرضِ وجود میں آئی تھی جس سے اردو اسٹیج کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس پارٹی نے جو اردو ڈرامے پیش کئے ان میں "خداداد دست" کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء تک کا زمانہ جنوبی اڑیسہ میں اردو اسٹیج کے لئے خاصا سازگار رہا۔ برہم پور (گنجام) میں عبداللہ خاں کی ہدایت میں آغا حشر کے ڈرامے "صید ہوس" "اسیر حرص" وغیرہ وہاں اسٹیج ہوتے تھے جس کی وجہ سے علاؤالدین اور عبدالرؤف جیسے اداکار ہردلعزیز ہوگئے۔

۱۹۲۹-۳۰ء میں کورینتھن تھیٹر نے کٹک میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل بکاؤلی وغیرہ ڈرامے اسٹیج کئے۔ یہ تمام ڈرامے مشن روڈ پر واقع مدھوپور ہاؤس کے سامنے فرانسس ہال میں اسٹیج کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اسحاق کمپنی نے بھی اسی ہال میں یہودی کی لڑکی اور سلور کنگ وغیرہ اسٹیج کئے۔

۱۹۳۴-۳۵ء میں بھدرک کی ریلوے کالونی میں امجد نجمی کا ڈرامہ "بدنصیب بادشاہ" اسٹیج ہوا تھا۔ اس ڈرامہ کے لئے خوردہ روڈ سے ڈرامہ پارٹی بھدرک آئی تھی۔ اس طرح مغل تماشہ کے شہر بھدرک میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہوتی۔ امجد نجمی کی پارٹی نے کلکتہ کے شالیمار میں بھی "سلور کنگ" اسٹیج کرکے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں نورالہدیٰ شاد کی ہدایت میں آغا حشر کا ڈرامہ "خواب ہستی" بیناپانی کلب واقع چھوا بازار کٹک میں اسٹیج ہوا تھا جس میں سیٹھ ابراہیم ایوب، غیاث الدین احمد، ثناءاللہ، کفایت اللہ اور وزیر پہلوان نے خاصے کامیاب رول ادا کئے تھے۔

اڑیسہ میں اردو اسٹیج کی پیش رفت میں نورالہدیٰ شاد کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب امجد نجمی کا تبادلہ آندھرا پردیش ہوگیا تو نورالہدیٰ شاد نے پوری تن دہی اور لگن کے ساتھ اردو اسٹیج کو عوام میں مقبول کرنے کا بیڑہ اپنے سر لیا اور بقیہ حیات اردو اسٹیج سے متعلق اور سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب کہ ان کے ایک ڈرامہ کا فائنل ریہرسل ختم ہوچکا اور صرف اسٹیج پر پیش کیا جانا ہی باقی تھا کہ مرگِ ناگہاں نے اڑیسہ کے اردو اسٹیج سے نورالہدیٰ شاد کو ہمیشہ کے لئے جدا کردیا۔

نورالہدیٰ شاد کی صحبت میں لطف الباری اداکاری کی جانب مائل ہوتے۔ اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں سے ایک پیشہ ور اداکار بن گئے۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک اڑیسہ تھیٹریکل کمپنی میں باقاعدگی کے ساتھ کام کیا جس کے زیر اہتمام اکثر اڑیا ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے اڑیا کے مشہور ڈرامہ نگار کوی چندر کالی چرن پٹنائک کے شاہکار ڈرامہ "بھارت" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن اڑیسہ تھیٹریکل کمپنی بند ہوجانے کی وجہ سے یہ ڈرامہ اسٹیج کی زینت

نہ بن سکا۔

لطف الباری کے بھائی حفظ الباری نے بھی چند اردو ڈراموں میں اداکاری کی ہے۔ اور چند ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کی ہے۔

امجد نجمی نے والٹیر (آندھرا پردیش) کے دوران قیام "انصاف کا کوڑا" اور "کشور کا نتا" دو ڈرامے لکھے۔ "انصاف کا کوڑا" پہلی بار خوردہ روڈ میں ۱۹۴۷ء میں اسٹیج ہوا۔ اس ڈرامہ کا پلاٹ سیاسی ہے اور جس کے کردار چرچل، ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن وغیرہ ہیں۔ اس میں ہندو مسلم اتحاد پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب ڈرامہ ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد اڑیسہ کے اردو داں طبقہ میں ڈرامہ کا ذوق و شوق بڑھنے لگا۔ ۱۹۵۱ء میں ہمایوں قدر بیگ کے اسٹیج بمقام اعظم خاں بازار کٹک میں اویس ارسلاں کی ہدایت میں ایک ڈرامہ "رات کے گیارہ بجے" اسٹیج ہوا جس میں یوسف احمد (ایڈوکیٹ) نے بھی رول کیا تھا۔

بعد میں کلنگا آرٹ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے سکریٹری ایم اے احمد نے ایسوسی ایشن کی طرف سے "انمول ہیرا" پیش کیا۔ اس کے ڈائریکٹر امجد نجمی اور ہیرو حفظ الباری حافظ تھے۔ گلوریا راؤت اس کی ہیروئن تھیں۔ ان کے علاوہ عبدالغنی، عبدالستار، ہارون رشید، وزیر پہلوان، بے بی طاہرہ اور انیما پدمنی نے بھی رول ادا کئے تھے۔ گلوریا اور انیما کی مادری زبان اڑیا ہونے کے باوجود انھوں نے صاف اور شستہ لہجے میں اردو کے مکالمے ادا کئے تھے۔ محمد یعقوب اس ڈرامہ میں میوزک ڈائریکٹر تھے اور حامد احمد نے آرکسٹرا دیا تھا۔

روشن لال ملہوترہ جو اس سے قبل بمبئی کی فلموں میں کام کر چکے تھے، ان کی زیر ہدایت امجد نجمی کا ڈرامہ کشور کا نتا ۱۹۵۲ء میں کٹک کے جنتا تھیٹر میں اسٹیج کیا گیا جس میں ہیرو کا رول برجیندر گری اور ہیروئن کا رول گلوریا راؤت نے ادا کیا۔ چونکہ اس ڈرامے کی زبان سلیس اردو تھی اس لئے اسے کٹک میں اسٹیج کئے گئے تمام ہندی ڈراموں کے مقابلہ میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

ہمایوں قدر بیگ کی سرپرستی میں ۱۹۵۶ء میں "اڑیسہ آرٹ ایسوسی ایشن" وجود میں آیا۔ اس کی جانب سے ۱۰ اور ۱۱ ستمبر ۱۹۵۶ء کو آغا حشر کا ڈرامہ "یہودی کی لڑکی" کٹک میں اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامہ میں ریتا پالت نے ڈیسیا کا رول ادا کیا تھا۔ نرنجن ست پتھی نے ہدایت دی تھی۔ اور محمد یعقوب نے موسیقی دی تھی۔ اس ہال کے مالک کا کہنا تھا کہ اس سے قبل کسی اڑیا ڈرامے نے ایسی مقبولیت نہیں حاصل کی تھی۔

۱۹۵۰ء میں "یوناٹیڈ نیک آرٹسٹس ایسوسی ایشن" کے زیر اہتمام یوسف پرویز کا ڈرامہ "منزل" ان پورنا تھیٹر کے اسٹیج میں پیش کیا گیا تھا۔ ہدایت سُریش راؤت نے دی تھی۔ اداکاروں میں بھگوتی گھوش، مانک مترا، عبدالغنی، جگن ناتھ، ہگلو ریا راؤت، سمرتی رائے اور بے بی رائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس ڈرامے میں نغمے کرامت علی کرامت کے تھے اور موسیقی اویس ارسلان کی تھی۔ اس ڈرامے کے بیشتر اداکاروں کی مادری زبان اڑیا ہونے کے باوجود انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اردو میں اپنے مکالمے ادا کیے۔ یوسف پرویز نے منزل کے علاوہ "آن" اور "زندہ اسکیلٹن" بھی لکھے ہیں جو اسٹیج نہیں ہو پائے۔

۱۹۵۸ء میں خورہ روڈ میں امجد نجمی کی ہدایت میں ایک اردو ڈرامہ "آنسو" اسٹیج ہوا۔ اور بعد میں وہاں یوسف پرویز کا "منزل" بھی پیش کیا گیا۔

۱۹۵۹ء میں نورالدین احمد کا "نافرمان لڑکا" کٹک کے ان پورنا تھیٹر میں اسٹیج ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ ڈرامہ کیندرا پاڑہ میں بھی اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ڈرامہ "زندگی اور طوفان" بھی لکھا ہے۔

اردو کے معروف شاعر ظہیر اللہ نور نے بھی چند ڈرامے لکھے اور ان دنوں وہ بڑے پراجکٹ کے فلم کی کہانی لکھ رہے ہیں۔

اُڑیسہ کے اردو اسٹیج سے لے کر فلموں کی ہدایت کاری تک ایک نام نہایت جانا پہچانا آتا ہے؛ محمد محسن۔ محسن ۱۴ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کھٹبن شاہی کٹک میں پیدا ہوئے۔ اسکول کی طالب علمی ہی کے زمانے سے انھیں اداکاری کا شوق رہا ہے۔ حفظ الباری نے جب ڈرامہ "نیک پروین" پیش کیا تو اسے دیکھ کر محسن کو ڈراموں میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ بعد میں کٹک کے ان پورنا تھیٹر میں جب "یہودی کی لڑکی" پیش کیا گیا تو محسن نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا۔ یہیں سے محسن نے اپنے اسٹیج کیریر کا آغاز کیا۔ نرنجن ست پتھی کے ایک ڈرامہ "پرتاپ رودر دیو" میں محسن نے ایک پرتگیز کا رول ادا کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب کے ڈرامہ "پرتیبھا" میں بھی کام کیا۔ کاہنو مہانتی کے ڈرامہ "جھونپا" میں اسماعیل کا رول ادا کیا۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ تین سال تک بند رہا اور ڈراموں کی اداکاری میں مگن رہے۔ راونشا کالج سے ۶۷-۱۹۶۶ء میں بہترین اداکاری کا ایوارڈ حاصل کیا۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں ڈرامہ ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے۔ راونشا کالج کے زمانۂ طالب علمی ہی میں محسن نے کٹک

کے انّ پورنا تھیٹر میں دو اردو ڈرامے "انسان اور فرشتہ" اور "پگھلتے پتھر" پیش کئے۔ دراصل انسان اور فرشتہ جدوناتھ داس مہاپاترا کے اڑیا ڈرامہ "بھولی ہوئی نا" "[illegible]" کا اردو ترجمہ تھا اور "پگھلتے پتھر" آنند شنکر رائے کے اڑیا ڈرامہ "سمادھی" کا اردو روپ تھا۔

انسان اور فرشتہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دس دن تک شہر کٹک کا انّ پورنا تھیٹر ہاؤس فل چلتا رہا۔ جبکہ شاید ہی کسی اڑیا زبان میں یہ تھیٹر ہاؤس فل چلا ہو۔ اڑیا ڈراموں کا ترجمہ محمد محسن نے کیا اور مسودہ پر اصلاح و تہذیب فرحت زیدی نے دی۔ محسن نے خود ہدایت بھی دی اور مرکزی کردار بھی خود ادا کیا۔

اس ڈرامہ کے پروڈکشن کے وقت محسن کے ذہن میں مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ احباب کے بروقت تعاون سے M Y C A کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور اسی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام "انسان اور فرشتہ" پیش کیا گیا جس میں محمد محسن کے علاوہ اقبال خاں منّا (فوٹو گرافر)، عین شمیم، عبدالریان وغیرہ نے بھی اہم رول ادا کئے "پگھلتے پتھر" مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن کی دوسری پیش کش تھی جس میں مذکورہ بالا افراد نے ہی رول ادا کئے تھے۔

تقریباً ۲۵ اڑیا ڈراموں میں ڈائریکشن دینے کے بعد محسن نے اردو ڈراموں کی طرف توجہ مبذول کی اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنا پر انھوں نے *Stage Craft* کا خاص خیال رکھا۔

۱۹۷۶ء سے محسن کی فلمی زندگی کا آغاز ہوا۔ کٹک میں متعدد فلموں میں اداکاری اور ان کی ہدایت کے بعد محسن بمبئی چلے گئے اور وہاں راج شری پروڈکشن کی فلم "سہیلی" میں معاون ہدایت کار رہے اور اسی پروڈکشن کی دوسری فلم "نیا" میں معاون ہدایت کار کے علاوہ رول بھی ادا کیا۔ محسن نے اب تک بہت سی فلموں میں ہدایت دی ہے اور متعدد فلموں میں اداکاری کی ہے لیکن اڑیسہ کے اردو اسٹیج کی ترقی میں ان کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔

افسانہ

اڑیسہ میں اردو افسانوں کی ابتدا شیخ حبیب اللہ کے افسانوں سے ہوتی ہے۔ ان سے قبل جن لوگوں نے کچھ لکھا ہوگا وہ یا تو اشاعت سے محروم رہے یا ان کے قلمی نسخے دست برد زمانہ کی نذر ہوگئے۔ شیخ حبیب اللہ کے افسانے دھوکہ (مطبوعہ آج کل دہلی)، حسن برہم (مطبوعہ ہفتہ وار ہند کلکتہ)، درماندہ رہرو (مطبوعہ آج کل دہلی) اور ایکٹریس (مطبوعہ ہفتہ وار ہند کلکتہ) اپنے زمانہ میں مقبول ہوئے تھے۔

شیخ حبیب اللہ

شیخ حبیب اللہ کو اس بات کا احساس شدت کے ساتھ تھا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اس لئے انھوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت اور تصور پسندی کے خیالات سے گریز کر کے ادب کے خارجی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ انھوں نے متعدد مغربی افسانوں کا اردو میں ترجمہ بھی پیش کیا۔ لیکن افسانہ نگاری کی دنیا میں وہ اپنی شناخت قائم نہ کر سکے۔ انھوں نے اقبال شناسی کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کردی اور اقبالیات پر مضامین لکھنے میں اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا۔

سید منظر حسن دسنوی

سید منظر حسن دسنوی شیخ حبیب اللہ کے ہم عصر ہیں۔ ان کا تعلق اور ان کی ذہنی تربیت بہار میں ہونے کے باوجود اڑیسہ میں اردو کی ترقی و ترویج میں ان کی سرگرمیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ولادت فروری ۱۹۱۴ء کو دسنہ ضلع نالندہ (بہار) میں ہوئی تھی[1]۔ ۱۹۴۵ء میں منظر صاحب کا تقرر کٹک کے راونشا کالج میں بہ حیثیت اردو لکچرر ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں وہ راونشا کالج سے ریٹائر ہوئے اور شہر کٹک کے اڑیا بازار میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

---

(۱) پروفیسر سید حسن، ہفت اختر، مطبوعہ صنم (بہار نمبر) بابت ۱۹۵۹ء۔ پٹنہ۔

منظر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ انھوں نے شاعری بھی کی اور چند ادبی مضامین بھی لکھے جن میں سے عربی اور فارسی کے اثرات (مطبوعہ شاعر بمبئی)، اُڑیسہ اور اردو (مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ)، اقبال اور نیٹشے (مطبوعہ پیام مشرق دہلی)، اُڑیا ادب (مطبوعہ آج کل دہلی)، اڑیا ڈرامہ (مطبوعہ شاعر بمبئی)، ادب میں ڈرامے کا مقام (مطبوعہ شاعر بمبئی)، فیضی کی شاعری (مطبوعہ پیام مشرق دہلی) اور بنگالہ اور اُڑیسہ میں فیروز شاہ کی سرگرمیاں (مطبوعہ راونشاو تین کٹک) شائع ہو چکے ہیں۔

منظر صاحب کے بارے میں پروفیسر سید حسن رقمطراز ہیں:-

"منظر صاحب نے دستہ کے ادب نواز اور علم پرور فضاء میں پرورش پائی ہے اور بچپن ہی سے ادب کے مطالعہ اور علم کی خدمت کا شوق رہا ہے۔ پٹنہ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں وہ بزم ادب کے پرجوش اور سرگرم کارکن تھے اور اس کے مقابلوں میں شرکت کرتے تھے۔ بی۔اے۔ کی ڈگری لینے کے بعد انھوں نے مضمون نویسی کا آغاز کیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے کچھ افسانے لکھے جو رسالہ فطرت راجگیر، ندیم گیا اور رسالہ ساقی دہلی (ثم کراچی) میں شائع ہوئے۔ ان کی مضمون نویسی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ان کے افسانے پیام مشرق دہلی میں شائع ہوتے ہیں۔ اب انھوں نے علمی مضامین کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔ ایک بہت عمدہ معلوماتی مضمون اڑیا ادب کے متعلق رسالہ "آج کل" دہلی میں حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ منظر صاحب کو شاعری سے بھی شوق ہے۔ طبیعت کا رجحان زیادہ تر غزل کی جانب ہے۔ ان کا کلام دہلی کے پرچوں میں شائع ہوتا ہے۔"[1]

منظر حسن کے افسانے نفرت کا رشتہ، ساتفسٹ کی بیوی، مصور کی شہرت، ندیم گیا اور فطرت راجگیر میں شائع ہو چکے ہیں۔ کٹک آنے کے بعد وہ پیام مشرق دہلی میں مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ پیام مشرق میں مطبوعہ افسانوں میں "اس کا پیشہ" "گرفتار الفت صیاد" "انتخاب" اور "دوراہے پر" کا شمار ان کے اچھے افسانوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کئی انگریزی اور ہندی افسانوں کا اردو میں ترجمہ بھی پیش کیا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اردو کے افسانوی ادب میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں بنائی۔

---

(۱) پروفیسر سید حسن: ہفت اختر: مطبوعہ صنم پٹنہ: بہار نمبر ۱۹۵۹ء۔

خواجہ بدیع الزّماں

خواجہ بدیع الزّماں کی عملی زندگی کا آغاز اڑیسہ سے ہوا۔ان کا تقرر بھدرک کالج میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا۔بھدرک کے دوران قیام انھوں نے اڑیا زبان سیکھی اور اڑیا ادب سے بھی واقفیت حاصل کی۔انھوں نے ملک کے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا اور اپنے افسانوں کو رومانی اور داخلی حصار سے نکال کر زندگی کے افادی پہلو سے روشناس کرایا۔ان کی تخلیق "ایک چوہے کی موت" اڑیسہ کے ماحول سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا تقرر بھی بھدرک کالج میں بحیثیت اردو لکچرر ہوا۔ انھوں نے نہ صرف بھدرک کالج میں اردو کا ماحول پیدا کیا بلکہ شہر میں بھی اپنی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ کرکے اردو کی فضا کو بہتر اور مستحکم بنانے کی کوشش کی۔اسی زمانہ میں انھوں نے بھدرک کے ماحول سے متعلق متعدد افسانے لکھے اور مقامی کرداروں کا نہایت ہی واضح کلوزاپ پیش کیا۔ ان کے قیام اڑیسہ کے دوران لکھے ہوئے افسانوں میں "سالندی کے کنارے" اور "باسی ہڈی" خصوصیت کے ساتھ مقبول عام ہوئے۔ اور اب بھی قارئین کے ذہن میں ان کا نقش باقی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کے ان افسانوں کے کردار اڑیسہ کے ہی پروردہ ہیں۔ انھیں عوامی زندگی کا عمیق مشاہدہ ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے انفرادی اور خارجی پہلوؤں کو اجاگر کرکے تلخ اور حسین لمحات کا بہترین امتزاج پیش کیا ہے۔

محمود بالیسری

اڑیسہ کے اردو افسانے کی تاریخ میں محمود بالیسری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تقریباً پچھلی تین دہائیوں سے وہ اردو میں افسانے اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھ رہے ہیں۔ راقم الحروف کے نام ایک خط میں اپنے ادبی سفر کا جائزہ یوں پیش کرتے ہیں:-

"ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر میرے مضامین اور افسانوں کا آغاز ۱۹۵۵ء سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ میرا پہلا مضمون "اڑیسہ میں اردو" غالباً ۱۹۵۵ء میں پیام مشرق میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد شکیل الرحمٰن صاحب جواب سرینگر یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اس وقت بھدرک کالج میں تھے، انھوں نے میری ہمت افزائی کی اور وقتاً فوقتاً میرے افسانے بیسویں صدی دہلی، معاون کلکتہ اور دیگر رسائل میں چھپتے رہے۔ شکیل الرحمٰن صاحب کے جانے کے بعد تین چار سال تک میں خاموش رہا اور پھر کرامت علی صاحب کا شاخسار منظر عام پر آنے پر دوبارہ میری ادبی سرگرمی بڑھ گئی۔ مضامین اور افسانے ملک کے مختلف رسائل میں پھر سے شائع ہونے لگے۔"(۱)

محمود بالیسری کو کبھی بھی مستقل ادبی ماحول نہیں ملا۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں ٹریننگ کے سلسلہ میں دس ماہ کے لئے ان کا قیام کٹک میں رہا۔ وہاں حفظ الباری حافظ، کرامت علی کرامت اور دیگر اردو نواز شاعروں اور ادیبوں کی صحبت نے محمود بالیسری کے ادبی ذوق کو مہمیز کیا اور انھوں نے دوسرے احباب کے اشتراک عمل سے کٹک کے درگاہ بازار میں "اقبال میموریل لائبریری" کے قیام میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ بھدرک کے دوران قیام پروفیسر شکیل الرحمٰن کی سرپرستی میں انھوں نے بھدرک میں بھی اقبال لائبریری کے قیام میں حصہ لیا۔ فقیر موہن کالج بالیسر سے محمود بالیسری نے گریجویشن کیا۔ وہاں بھی اپنے دوست غلام قادر خاں کے اشتراک عمل اور مولوی عبدالحلیم صاحب کی نگرانی میں "بزم اخلاق لائبریری" کے قیام میں حصہ لیا جو اب بھی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

ملازمت کے سلسلہ میں محمود کا تقرر ایسے علاقوں میں ہوتا رہا جن میں سے اکثر و بیشتر مقامات پر اردو کا ماحول نہیں ہوتا۔

مدیر شاعر نے محمود بالیسری کے بارے میں لکھا ہے :-

"محمود بالیسری (شیخ محمود) شہر بالیسر اڑیسہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ محبوب مدت دراز سے شہر بارپیدا میں مقیم ہیں۔ بچپن ہی سے اردو سے لگاؤ تھا۔ اسکول میں مضمون نگاری میں انعامات ملتے تھے۔ اسکول کی تعلیم کے بعد فقیر موہن کالج بالیسر سے بی۔ اے۔ پاس

---

(۱) محمود بالیسری کا خط بنام حفیظ اللہ نیولپوری، از مقام الموناڈہ : مورخہ ۶ فروری ۱۹۷۶ء

کیا۔ کچھ دنوں جگدل "چشمۂ رحمت ایم ای اسکول" میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ ان دنوں سرکاری ملازم ہیں اور محکمۂ امداد باہمی میں کام کر رہے ہیں۔ ادب برائے زندگی کے حامی ہیں۔ اپنے افسانوں میں گرد و پیش کی زندگی کے عام واقعات پیش کرتے ہیں۔ اڑیا ادب کے اساسی رجحانات سے با خبر ہیں اور اردو کے مراکز سے دور ہوتے ہوئے بھی اردو زبان و ادب کے فروغ میں کوشاں رہتے ہیں۔ اردو کی ادبی تحریکوں سے با خبر ہیں۔"[1]

محمود بالیسری کی ایک کہانی "بھارت جو بک گیا"[2] شائع ہوئی تو کچھ لوگوں نے انھیں ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ کر دیا اور یہی ردّ عمل ان کے افسانہ "جوکر"[3] کی اشاعت پر بھی ہوا تھا۔ لیکن محمود کو نہ ترقی پسند تحریک سے واسطہ ہے اور نہ جدیدیت کے رجحان سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہیں لیکن انھیں اس بات کا اعتراف ہے کہ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے اور اسی محور کے گرد ترقی پسند ادب گھومتا رہتا ہے۔ محمود کے افسانوں کا جھکاؤ بھی اسی طرف ہے کیونکہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ان کی کہانیاں اڑیا ماحول کی مرہون منت ہیں۔ اور ان کی کہانیوں کے کردار اڑیسہ کی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اڑیسہ کے جنگل و پہاڑ ہیں، اڑیسہ کے آبشار اور جھرنوں کی گنگناہٹیں ہیں اور اڑیا ادب کی گہری چھاپ بھی۔

محمود بالیسری کے بیسوں افسانوں نے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کی ہے۔ ان کے اسلوب نگارش کے نمونہ کے طور پر ان کی کہانی "فری انڈیا کا گلاب" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"فری انڈیا کا معنی آزاد ہندوستان نہیں ہے۔" فری انڈیا" صرف ایک نام ہے۔ ہندوستان آزاد نہ ہوا ہوتا تو بھی "فری انڈیا" ہی رہتا۔ اس شہر کے ریلوے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی فری انڈیا۔ فری انڈیا کی آواز کانوں میں پڑتے لگتی ہے۔ یہ آواز ہوتی ہے بعض ٹیکسی ڈرائیوروں کی۔ اس پر آپ کو تعجب ہوگا لیکن اپنے رکشہ والے سے دریافت کیجئے گا تو معلوم

---

(۱) شاعر بمبئی، قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۸۵

(۲) بھارت جو بک گیا مطبوعہ گنگ و جمن کان پور بابت دسمبر ۱۹۷۵ء

(۳) جوکر، شاعر بمبئی قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۲ء

ہوگا کہ فری انڈیا اس شہر کے آخری سرے پر واقع ایک بڑھتی ہوئی آبادی والا کاروباری علاقہ ہے۔ یہ بستی ملازمت کی تلاش میں آنے والوں اور ملازمت سے برطرف کئے گئے لوگوں کو پناہ دیتی ہے۔ یہ لوگ شہر میں مکان ڈھونڈ کر مایوس ہوجانے پر "فری انڈیا" کا رخ کرتے ہیں اور فری انڈیا اپنے آغوش میں انھیں جگہ دیتی ہے۔

فری انڈیا کے ان آدی باسی قلیوں اور مزدوروں کے سماج میں ستیّہ امّا بھی تھی۔ ستیّہ امّا ایک کالی کلوٹی بدصورت عورت تھی۔ اس کے چہرے پر متعدد داغ اور دھبّے تھے۔ اس کی شخصیت کچھ بھی نہ تھی۔ ماحول رنگ روپ اور بات چیت پر اس کے ہنسنے کا انداز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک آوارہ مزاج عورت ہے لیکن واقعی ایسا نہ تھا۔ انسان کے ظاہری لباس کو دیکھ کر باطن کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ ستیّہ امّا کوئی آوارہ عورت نہیں ایک سماج سیویکا اور اسکول کی استانی تھی۔"[1]

"فری انڈیا کا گلاب" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو مکروہ صورت ہونے کی وجہ سے بری طرح احساس کمتری کا شکار ہے اور اس کے ذہن پر یہ وہم طاری ہے کہ وہ بدصورت ہے اس لئے گھر والے اسے پسند نہیں کرتے۔ چودہ سال کی عمر میں جبکہ وہ دسویں جماعت کی طالبہ تھی کروپ نامی ایک شخص کے بہکاوے میں پڑ کر اڑیسہ آجاتی ہے۔ کروپ ہر طرح سے اس کا استحصال کرتا ہے تب وہ کروپ کے شکنجہ سے فرار ہوجاتی ہے لیکن اپنے وطن نہیں جاتی بلکہ جمشید پور کے ایک اسکول میں ملازمت اختیار کرلیتی ہے اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھتی ہے اور بالآخر گریجویشن کرلیتی ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ کردار اور لوگوں کے فلاحی کاموں میں اپنے بے لوث ایثار کی بنا پر لوگوں میں اپنا ایک مثالی IMAGE قائم کرلیتی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جب فرقہ وارانہ فسادات نے اس شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو ستیّہ امّا نے فری انڈیا میں رہنے والوں کے ایک جلسہ میں کھڑی ہوکر یہ اعلان کیا کہ اگر یہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تو وہ آگ میں جل کر مر جائے گی۔ تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کا عفریت اب اس جگہ نہ آئے گا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ستیّہ امّا کی وجہ سے "فری انڈیا" فرقہ وارانہ فسادات سے بچ گیا۔

---

(۱) محمود بالیسری؛ فری انڈیا کا گلاب؛ مطبوعہ آج کل نئی دہلی؛ بابت جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۳۹۔

یک بیک ستیہ اماّ کے کردار میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ درس وتدریس کے فرائض میں بھی اس سے تساہل سرزد ہونے لگتا ہے جس کی وجہ محض یہ تھی کہ بارہ سال کے بعد کروپ پھر اس کی زندگی میں لوٹ آتا ہے۔ اس طویل مدت میں وہ مرد کے سایہ تک سے وہ خود کو محفوظ رکھتی۔ لیکن جب جوئے میں اپنا کل اثاثہ ہار کر اور اپنی ملازمت کھو کر کروپ انتہائی خستہ حالت میں اس کے پاس آتا ہے۔ ستیہ اماّ جس نے اسے شروع سے ہی اسے چاہا تھا اسے سہارا دیتی ہے۔
کہانی کا نقطۂ عروج مصنف نے ستیہ اماّ کے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :۔

"باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ آدھی رات کو جب میری نیند ٹوٹی تو میں نے دیکھا کہ کروپ اپنے بستر پر بیٹھا رو رہا ہے۔ میں قریب جا کر اسے دلاسہ دینے لگی۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور بچّوں کی طرح روتا ہوا مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ اس نے میرے ہاتھوں کو اسی طرح دبائے رکھا۔ کمرہ میں صرف ہم دونوں تھے۔ میں نہیں جانتی کہ کیا ہوا۔ میرے تمام رنج و غم جیسے مٹ گئے ہوں۔ جسم آگ کی طرح سلگ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔"[1]

جذبات کی رو میں بہہ کر ستیہ اماّ جس مقام پر پہنچی وہاں پہنچ کر وہ اپنی نظروں سے خود گر جاتی ہے اور سوچتی ہے "جن لوگوں نے مجھے دیوی کی طرح پوجا ہے انھیں میں کیا منہ دکھاؤں گی؟" اور نتیجتہً وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

یوسف پرویز

یوسف پرویز کے افسانوں میں اڑیسہ کے معاشی اور سماجی حالات کی عکاسی، پراگندگی اور پریشان حالی کی صاف عکاسی ہوتی ہے۔ یوسف پرویز کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔ لیکن ان کے افسانوں کا جھکاؤ اڑیسہ کے ستم زدہ لوگوں کی بے کسی اور بے بسی کی طرف خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یوسف پرویز نے متعدد افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں۔ انھوں نے طبقاتی کشمکش کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں افسانے لکھے ہیں۔
انھوں نے اپنے افسانہ "مجبور اور بے بس" میں معاشی بدحالی اور بے بسی کی نہایت واضح تصویر

---

(۱) محمود بالیسری؛ فری انڈیا کا گلاب؛ مطبوعہ آج کل نئی دہلی؛ بابت جنوری ۱۹۶۷ء؛ ص ۴۰۔

کشی کی ہے۔ معاشی بحران کا شکار ہو کر ایک عورت اپنے جسم کا سودا کرنے پر مجبور ہو گئی ہے لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ اسے کوئی گاہک ملے یا نہ ملے، اس علاقہ کے دادا (غنڈہ) کو نذرانہ پیش کرنا ہی ہے۔ یوسف پرویز کے الفاظ میں افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کون ہے۔ میں نگیندر کو کھینچ کر لے آیا۔ ہم پیدل چلتے رہے اور اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ آگے چل کر دیکھا کہ ایک قدآور شخص کھڑا ہے۔ رنگ سیاہ، چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں، آنکھیں سرخ انگارہ سی تھیں۔" لا جلدی سے نکال۔"

"جگن ناتھ جی کی قسم ہے لالو۔ آج اب تک ایک بھی گاہک نہیں آیا۔ ایک روپیہ پر بھی کوئی راضی نہیں ہوتا، تجھے کہاں سے دوں۔" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم رنڈیوں کے ڈھکوسلے۔" اس نے بگڑ کر کہا اور وہ اسے سمجھانے لگی۔

"تو جہنم میں جا۔ کل صبح اگر تو نے روپئے نہیں دیئے، بھگوان قسم تن سے کپڑے اتروا کر بیچ بجار میں ننگا نہ گھمایا تو میرا نام لالو نہیں۔"

اب مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ اس کے لئے ہمدردی تھی لیکن ایک غریب کلرک کی ہمدردی سے کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ اس کو لالو کے پنجہ سے چھڑا نہیں سکتا۔ پھر ہمدردی کس کام کی۔ وہ مجبور تھی اور میں بے بس۔"(1)

یوسف پرویز کے دوسرے افسانہ "شکست" کا موضوع بھی بھوک، افلاس اور بدحالی ہے۔ یہ بیڑی ساز مزدوروں کے المیہ کی کہانی ہے جن کے کندھے دن بھر بیڑیاں بناتے رہنے کی وجہ سے جھک جاتے ہیں اور ان کی گردنیں بھی سامنے کی طرف کسی قدر جھکتی چلی جاتی ہیں۔ دن بھر کی سخت محنت مزدوری کے باوجود جنھیں دو وقت سکون کے ساتھ روٹی میسر نہیں ہوتی اور ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے نہایت ہی ادنیٰ خواب تک پورے نہیں ہو پاتے۔

محمد عبدالرزاق راہی

راہی کی ولادت ۱۰ر جون ۱۹۳۶ء کو مغربی بنگال کے آبادہ میں ہوئی۔ عرصۂ دراز سے

---

(۱) یوسف پرویز: مجبور اور بے بس: مطبوعہ شاخسار کٹک: جلد ۱ شمارہ ۱: ۱۹۶۵ء۔

وہ جھاڑ سوگڑہ میں مقیم ہیں۔ میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی ہے۔ افسانہ نگاری کے شوق نے ان کو جذبۂ عمل سے سرشار کیا۔ ان کے افسانوں میں خاص طور پر "مجسمہ" "گونگی" اور "خوشبو" قابل ذکر ہیں جو ماہنامہ "پرواز" لدھیانہ میں شائع ہوئے۔ "میں اکیلا" کے عنوان سے ان کا ایک افسانہ ماہنامہ "فیروز" ناگپور میں بھی شائع ہوا۔ ان کے دو ناول "کارواں گذر گیا" اور "دھوکا" رچنا پرکاشن میرٹھ سے شائع ہوئے۔ "کارواں گذر گیا" دوسری بار پرتکشا کے نام سے ہندی میں بھی شائع ہوا۔ اس وقت ان کے پاس چار ناولوں کے غیر مطبوعہ مسودے، چارمینار، ٹھوکر، آج کا انسان اور سو سال پہلے موجود ہیں۔

راہی اپنے افسانے اور ناولوں میں سماجی مسائل پیش کرتے ہیں اور ان مسائل کے حل کی طرف واضح اشارہ بھی کرتے ہیں۔

یوسف جمال

یوسف جمال اُڑیسہ میں اردو کے ادبی سفر میں ایک معروف نام ہے جو صرف اڑیسہ کی جغرافیائی حد بندیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندوپاک کے اردو قارئین کے لئے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ یوسف جمال کی ولادت ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء کو چکردھر پور میں ہوئی۔ عہدِ طفلی میں ان کا خاندان اڑیسہ کے راج گانگ پور میں آکر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوا۔ یوسف جمال نے اپنے شعور کی آنکھیں سرزمین اڑیسہ میں ہی کھولیں اور یہیں ان کے ذہن و شعور کی پرورش ہوئی۔

یوسف جمال کی پہلی کہانی "پاگل" تھی جو "پرواز" لدھیانہ میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح یوسف جمال کی مطبوعہ کہانیوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۴ء کے وسط میں ہوا ہوگا۔ پھر ان کے افسانے "تصویر مسکرا رہی تھی"[2]، "انسان"[3]، "اندھیرا اجالا"[4]، "نئی زندگی"[5]، "مبارک ماں"[6]، "سنگِ در"[7]، "خون کے رشتے"[8]، "چراغ کی

---

(۱) پرواز لدھیانہ، اگست ۶۴؛ ص ۲۸
(۲) " " اکتوبر ۶۴؛ ص ۵۹
(۳) " دیوالی ایڈیشن ۶۴؛ ص ۶۷
(۴) فلم ستسار بمبئی؛ اپریل ۶۵؛ ص ۱۵
(۵) پرواز لدھیانہ؛ جون ۶۵؛ ص ۸۸
(۶) " آزادی ایڈیشن؛ ۶۵؛ ص ۲۸
(۷) " جنوری ۶۶؛ ص ۵۵
(۸) " بیساکھی ایڈیشن ۶۶؛ ص ۳۴

بھیک [1]۔ کشمیری ٹوپی [2]۔ قربت اور فاصلہ [3]۔ فضائے بسیط [4]۔ سوکھی گھاس اداس کلی [5]۔ پاگل کون [6]۔ شیشہ کی تلوار [7]۔ پتھر، گلی گلی [8]۔ اور جب پردہ اٹھا [9]۔ میں کی کھوج [10]۔ تراشیدہ جملے اور میں [11]۔ لمحۂ فکر [12]۔ نتیجہ [13]۔ وراثت [14]۔ خون کی صلیب پر لٹکی سوچ [15]۔ ملک کے مختلف ادبی جرائد و اخبارات میں شائع ہوئے۔

مارچ ۱۹۶۸ء سے مارچ ۱۹۷۳ء تک یوسف جمال کا کوئی مطبوعہ افسانہ دستیاب نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اس دوران افسانے لکھے ہوں اور کسی وجہ سے وہ اشاعت سے محروم رہے ہوں۔ لیکن اس عرصہ میں ان کے دیگر علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین مسلسل اشاعت پذیر ہوتے ہیں اور اڑیسہ میں اردو ادب کے ارتقاء میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔

یوسف جمال نے ایک طرف تو ملک گیر پیمانہ پر اردو کے مقتدر ادیبوں کا عمیق مطالعہ کیا اور اپنے اردگرد کے ماحول اور اس کے معاشی اور سماجی پہلوؤں پر بھی خاصی نگاہ رکھی۔ انھوں نے اپنے ذہن کو جغرافیائی حد ں میں محبوس ہونے نہیں دیا اور نتیجہ کے طور پر بین الاقوامی سطح پر جو ادبی تحریکیں او جحانات مروج ہوئے ان سے انھوں نے اثر قبول کیا۔ انھوں نے تحلیل نفسی کے ساتھ جدید رجحانات اور نظریات سے متاثر ہو کر افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں ایک طرف سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کا ذکر ہے تو دوسری طرف انسان کی کسمپرسی، تنہائی اور داخلی کرب کا گہرا احساس ملتا ہے۔ ان کے یہاں تجربات اور مشاہدات کی بدولت اظہار و بیا ں میں تیکھا پن بھی آگیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کہیں کہیں

---

(۱) پرواز لدھیانہ: اگست ۶۶؛ ص ۸۵
(۲) 〃 ستمبر ۶۶؛ ص ۳۰
(۳) خاتون مشرق دہلی، ستمبر ۶۶: ص ۳۲
(۴) شاخسار کٹک: جلد ۱ شمارہ ۴: ص ۲۵
(۵) 〃 جلد ۱ شمارہ ۲؛ ص ۳۰
(۶) خاتون مشرق دہلی، نومبر ۶۶: ص ۱۸
(۷) دو ماہی شاخسار کٹک: جلد ۲ شمارہ ۴؛ ص ۴۰
(۸) جلد ۴ شمارہ ۳؛ ص ۵۸
(۹) واقعات ڈائجسٹ دہلی، اپریل ۷۳؛ ص ۴۸
(۱۰) معمار آرمور حیدرآباد؛ نومبر ۷۴؛ ص ۵
(۱۱) مفاہیم گیا؛ جدید کہانی نمبر ۷۴؛ ص ۱۴۱
(۱۲) 〃 〃
(۱۳) 〃 〃
(۱۴) 〃 〃
(۱۵) 〃 〃

رومان اور حقیقت کا سنگم بھی ملتا ہے۔

اپنے تخلیقی افسانوں کے علاوہ یوسف جمال نے ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے متعدد شاہکار افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے یہ ترجمے ملک کے مختلف اہم ادبی رسالوں میں شائع ہوتے ہیں اور ان افسانوں نے اردو قارئین کو دوسری زبانوں کے معاصر ادیبوں سے مربوط و منسلک کیا ہے۔ ان افسانوں میں انیردھ پنردسو کا مراٹھی افسانہ، ریس کا گھوڑا "[1] محمد حلیم عبداللہ کا عربی افسانہ، رشتوں کا جال،"[2] لاسکین کی روسی کہانی، سوغات "[3] جگدیش مہانتی کی اڑیا کہانی، پلاٹو کی چھلانگ سے راحتوں کی گرفت تک "[4] فان ڈو کی ویت نامی کہانی، جوہی کے پودے "[5] عبداللہ کی ملیشیائی کہانی، دروازہ اور ہتھکڑی،"[6] لیورد کامنسکی کی روسی کہانی، گرافو فائل "[7] قابل ذکر ہیں۔

یوسف جمال نے اڑیا کے معاصر ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو قارئین کو اڑیا افسانے کے جدید تر رجحانات سے روشناس کرانے کی بھی کدوکاوش کی ہے۔ ان کے ان ترجموں میں بینا پانی مہانتی کا افسانہ، آخری رنگ "[8] جگدیش مہانتی کا افسانہ، تبدیلی "[9] کرشنا بھوئیاں کا افسانہ، سائنفر"[10] اکھیل پتی کا افسانہ، فرار "[11] وشور نجن کا افسانہ، نامرد "[12] پونا نندی کا افسانہ، اندھیری رات کی صلیب میں لٹکی ہوئی سوچ "[13] بینا پانی مہانتی کا افسانہ، چھوٹی بڑی ہتھیلیوں میں گھرا ہوا آدمی"[14] اور بلرام راؤت کا، اوزار کے جھولے سے تیل کی کڑھائی تک "[15] ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

ان افسانوں کے علاوہ یوسف جمال نے یوسف الشرونی کے مصری افسانہ، سہارا "[16]

---

(۱) شاعر بمبئی ۷۳؛ ص ۲۱
(۲) معار آرمور ۷۴؛ ص ۲۹
(۳) نشانات مالیگاؤں: ستمبر ۷۵؛ ص ۴۱
(۴) آہنگ گیا: اکتوبر ۷۵: ص ۴۳
(۵) تحریک دہلی: جنوری ۷۶: ص ۲۹
(۶) 〃 مئی ۷۶؛ ص ۲۷
(۷) گل نو حیدرآباد، جنوری ۷۶؛ ص ۴۱
(۸) مورچہ گیا، ۲۵ دسمبر ۷۶: ص ۸
(۹) مورچہ گیا، دسمبر ۷۶، ص ۸
(۱۰) 〃 〃
(۱۱) 〃 〃
(۱۲) سب رنگ بمبئی، فروری ۷۷؛ ص ۲۷
(۱۳) الفاظ علی گڑھ، دسمبر ۷۶؛ ص ۵۳
(۱۴) تحریک دہلی سلور جوبلی نمبر ۷۸؛ ص ۶۲
(۱۵) 〃 جنوری ۷۹؛ ص ۱۹
(۱۶) شیبا بمبئی: اپریل ۷۷؛ ص ۲۹

ایڈورڈ اسپلینیکس کے روسی افسانہ، میرا ہمسایہ،[1] جیکوبی کے فرینچ افسانہ، ضرورت،[2] خلیل جبران کا افسانہ، دو دانشور،[3] اور اسٹیفن سنس کے اسپینی افسانہ، خدا کے نام ایک خط،[4] باٹرش بیول کی جرمنی کہانی کا ترجمہ، پیشہ،[5] اور ایشور چندر کے ہندی افسانہ، زنگ،[6] کا بھی کامیاب ترجمہ اردو میں پیش کیا ہے۔ ان افسانوں کے علاوہ یوسف جمال نے R.L.Stevenson کے شہرۂ آفاق ناولٹ Treasure Island کا بھی ترجمہ کیا جو "شیطانی جزیرہ کا سفر" کے عنوان سے فلم ویکلی کلکتہ میں مسلسل نو قسطوں میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر شیریں پروین

شیریں پروین شیل بالا ویمنس کالج کٹک میں اردو کی لکچرر ہیں۔ ان کی تعلیمی زندگی کا بیشتر حصہ اردو کے نامور افسانہ نگار اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کی صحبت و قربت میں گذرا۔ شیریں کے افسانوں میں مقامی ماحول اور کرداروں کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ وہ کہانی کی تکنیک سے بخوبی واقف ہیں اور اپنے عمیق مشاہدہ کی روشنی میں فنی چابک دستی کے ساتھ اپنے افسانوں کو نقطۂ ارتکاز تک پہنچاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں "پچھتاوا" اور "باسی روٹی" ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ "پچھتاوا" میں شیریں نے ایک ایسی عورت کی کہانی پیش کی ہے جو بے مثال حسن قیامت خیز شباب اور فتنہ انگیز ذہانت رکھتی ہے۔ اس کردار کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے کسی بھی سطح تک جا سکتی ہے۔ اپنی ذہانت اور جنسی کشش سے وہ متعدد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر ان کی آشفتہ سری اور مخلصانہ جذبات کا استحصال کرتی ہے اور ان کے سہارے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ زندگی کے ارتقائی منازل کی طرف بڑھتے ہوئے وہ ماضی کی طرف نگاہ واپسیں نہیں ڈالتی نہ ان بہی خواہوں اور جاں نثاروں کے ایثار کا اس کے دل میں کوئی احساس باقی رہتا ہے۔ اس کہانی کا اہم ذیلی کردار سرور ہے جو اس عورت (مرکزی کردار) کے والد سے بھی بڑی عمر کا ہے۔ وہ اس

---

(۱) سریر در بھنگہ، ص ۶۰
(۲) ،، ص ۶۱
(۳) ،، ص ۶۱
(۴) سریر در بھنگہ، ص ۶۲
(۵) شاعر بمبئی: دسمبر ۷۸، ص ۶۳
(۶) تحریک دہلی، نومبر ۷۶، ص ۳۷

حسینہ کی محبت میں اس بری طرح گرفتار ہوتا ہے کہ اپنی بیوی بچوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور اپنی ساری زندگی درِ معشوق پر گذار دیتا ہے۔ لیکن اس عورت کو سرور سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ محض حصول مقاصد کے لئے وہ سرور کا استحصال کرتی ہے اور "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کے اصول پر گامزن ہے۔ بالآخر اس کی عمر دورِ خزاں میں پہنچتی ہے۔ اور اس وقت کوئی اس کا شریکِ حیات ہے نہ شریکِ غم۔ نوکر چاکر بھی اس سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں اور بالآخر سوائے کفِ افسوس مل کر پچھتانے کے کچھ بھی اس کے ہاتھ نہیں آتا۔

ڈاکٹر نسیمہ بیگم

نسیمہ بیگم بخشی جگ بندھو کالج بھوبنیشور میں اردو کی لکچرر ہیں۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی انھیں افسانہ نگاری کا شوق رہا ہے۔ اگر انھیں مناسب علمی ماحول نصیب ہوا ہوتا تو یقیناً وہ افسانوی ادب میں اپنی شناخت قائم کر چکی ہوتیں۔ انھوں نے متعدد افسانے لکھے ہیں جن میں سے بیشتر خاتونِ مشرق دہلی اور دوسرے علمی اور ادبی رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ نسیمہ نے ترقی پسند افسانوی ادب پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کے افسانوں پر ترقی پسندی کی چھاپ ہے۔ وہ ذاتی طور پر اپنے اسلوب نگارش میں عصمت چغتائی سے متاثر ہیں۔ انھوں نے کئی اہم اڑیا افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو عصری آگہی دہلی اور زبان و ادب پٹنہ میں شائع ہوئے۔

اسلام احمد اسلام

اسلام جدید رجحان کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ولادت ۲۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو کلنگا (اڑیسہ) میں ہوئی۔ انھیں بچپن سے ہی گھر کا ادبی ماحول نصیب ہوا۔ ان کے والد گھائل فریدی اڑیسہ کے ایک معروف شاعر ہیں۔ اسلام کے بھائی افضال بیدار بھی شاعر ہیں اور ان کے چچا ابرار احمد ابرار طنز و مزاح کے ایک معروف شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ یوسف جمال کی صحبت میں اسلام کے ادبی ذوق کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں میں پاگل، انسانیت، قول مرداں، کھوٹا سکہ، میزان، پتھر، منحوس خبریں، فیصلہ، گدڑی میں لعل، ان داتا، مجرم کون، پہاڑی بابا

اور شادی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

اسلام کی کہانیاں بہت ہی مختصر لیکن بھرپور ہوتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کا ایک افسانہ ملاحظہ ہو۔

"انسانیت"

وِکٹر بیمار تھا۔ اس کی مالکن اسے کار میں لئے برق رفتاری سے ہسپتال کی جانب جا رہی تھی۔ اس کی کار شہر کے مشغول ترین علاقہ سے گذر رہی تھی۔ کار کی رفتار حد سے تجاوز کر رہی تھی۔ یکایک ایک بڑھیا کار کی زد میں آ گئی اور ایک دل خراش چیخ سے فضا کانپ اٹھی۔ اس نے کار روک لی۔ بوڑھی کی چیخ سن کر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ کار سے اترتے ہوئے بولی۔" معاف کیجئے گا! میرے پیارے وِکٹر کی طبیعت خراب تھی اور میں پریشانی کے باعث توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بوڑھی کو چوٹ آ گئی۔ دیکھئے نا بے چارہ وِکٹر کتنا بیمار ہے!"

لوگوں نے کار میں جھانک میں دیکھا تو ایک کتا آنکھیں موندے سیٹ پر آرام سے پڑا تھا۔

کشور جہاں

کشور جہاں راونشا کالج کٹک میں اردو کی لکچرر ہیں۔ اڑیسہ کی اردو ادبی سرگرمیوں میں ان کا نام بالکل نیا ہے۔ اِدھر انھوں نے اُڑیا کے متعدد اہم ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اڑیا ادب کا اردو میں بہت سارے اصحاب علم و دانش نے ترجمہ کیا ہے لیکن کشور جہاں کا ادبی ذوق اور ان کی علمی صلاحیت ان کے خوش آئند مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے اڑیا کے ایک معروف افسانہ نگار رتنا کر چینی کی کہانی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو " وہی آدمی" کے عنوان سے آج کل نئی دہلی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مصنف کی اصل کہانی سے قطع نظر ترجمہ کی سلاست اور زبان و بیان کے فطری انداز نے اس کہانی کو ترجمہ کے احساس سے بری کر دیا ہے۔ اس کے مطالعے سے دور دور تک پتہ نہیں چلتا کہ یہ ترجمہ ہے۔

کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

" واقعہ بہت پرانا ہے !

اس وقت غالباً میں نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ سورج کو گھڑی تصور کر کے دیہات کے گرد آلود راستے سے اسکول جاتے وقت روزانہ مزدوروں کے ایک سردار سے سابقہ پڑتا تھا جو سونے کے مصنوعی دانت لگائے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ باقی تمام یادیں دھندلا چکی ہیں۔ پہولی، پرمود اور مایا دھر کی وہ گہری دوستی بھی ماند پڑ چکی ہے۔ راستہ کے کنارے وہ گنے کی کیاریاں، شبنم آلود بیری اور کلتھی کے سبز کھیت، ہوا کے ساتھ سرسوں کے پھولوں کا کمر لچکائے ناچنا اور قلقل کی آواز سے بہتی ہوئی نہر سے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا لہروں لہروں جھانکنا۔ یہ سب چیزیں اب خواب سی معلوم ہو رہی ہیں۔"(۱)

اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء میں اس نوعیت کی افسانوی نثر یقینی طور پر اہمیت کی حامل ہیں جس میں اڑیسہ کا ماحول اور وہاں کی منظر کشی کے ساتھ " بیری" اور "کلتھی" جیسے مقامی الفاظ " ماش" اور " اڑد" کی جگہ استعمال کئے گئے ہیں۔

اس کہانی کا دوسرا اقتباس کردار نگاری پر مضبوط گرفت کا مظہر ہے:۔

"تصویروں میں بھگوان کا چہرہ بہت خوب صورت لگتا ہے۔ وہ ہر وقت سجے سجاتے رہتے ہیں۔ تصویروں میں ان کا چہرہ ہمارے کلاس کے گوپیا کی طرح نظر آتا ہے۔ گوپیا کو سب بدھو کہتے تھے۔ اس کا چہرہ لڑکیوں جیسا تھا۔ پرمود اور مایا دھر وغیرہ اس کے ساتھ بڑا مذاق کیا کرتے تھے۔ پرمود ہمارے درمیان ایک کھرا مرد معلوم ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کلاس میں سب کے سامنے گوپیا کا منہ چوم لیا۔ کتنا لفنگا ہے وہ! سب کانا پھوسی کرنے لگے کہ یہ گندی بات ہے۔ لڑکیوں میں تو کچھ زیادہ کھسر پھسر ہونے لگی تھی۔"(۲)

مصنف نے لڑکیوں کی نفسیات کا جو عمیق مشاہدہ پیش کیا ہے کشور جہاں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

"........ پرمود نہ جانے اور بھی کیا کچھ بکنے لگا جو میری سمجھ سے باہر تھا لیکن لڑکیاں

---

(۱) رتنا کر چینی، کشور جہاں، وہی آدمی مطبوعہ آج کل نئی دہلی، فروری ۱۹۸۴ء، ص ۴۰

(۲) 〃 〃 〃 〃 〃

سب کچھ سمجھ گئیں۔ لڑکیاں شاید پہلے سیانی ہوجاتی ہیں۔ پرمود کی باتیں سن کر لڑکیاں نیچی نگاہ کرکے آپس میں باتیں کرنے لگیں لیکن رازدارانہ انداز میں........

میں اس وقت سوچتا تھا پتہ نہیں کیتکی بھی کیسی عورت ہے۔ وہ تو دن بھر چاروں طرف گھومتی پھرتی ہے۔ وہ رات کو اس شخص کے پاس کیوں آتی ہے؟ کیا رات کو کسی کے پاس جانا خراب بات ہے؟ اب اور اسکول سے دیر سے نہیں لوٹوں گا۔ اسکول بند ہوتے ہی گھر لوٹ آؤں گا۔ ساتھی آئیں یا نہ آئیں۔ اندھیرا ہوجانے سے اگر میں خراب ہوگیا تو؟"(۱)

ایک بے سہارا نوجوان بیوہ جس پر سب کی بری نظریں لگی ہوئی ہیں اس کا کتنا واضح کلوز اپ اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

"ہشش! وہ کتنی گندی نظر آرہی تھی۔ پھٹے کپڑوں کو ایک ہاتھ سے سینے پر مضبوطی سے پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھڑی پکڑ کر دوڑتے ہوئے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں سے اس کا بدن جھانک رہا تھا۔ ایسے گندے منظر کو اور بھی گندا کرتے ہوئے پرمود کہنے لگا۔

"ارے دیکھ اس کی فیڈنگ بوتل نظر آرہی ہے!"

سردار کام کرکے کھڑا ہوگیا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں کیتکی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کسی بیل پر بیٹھے ہوئے بوڑھے گرگٹ کی طرح وہ ایسے سر ہلا رہا تھا جیسے این سی سی کے بچوں کو پریڈ کرنا سکھا رہا ہو۔ اس کے بعد اچانک خاموشی........"(۲)

اس کہانی کا اختتام ذیل کی عبارت پر ہوتا ہے۔

"اس واقعہ کو بیس سال سے زیادہ گذر چکے ہیں۔ آج سوچ رہا ہوں، کاش اس سردار سے ایک مرتبہ اور ملاقات ہوجاتی تو اس کے قدموں کی خاک اپنی پیشانی پر ملتا۔ ہوسکتا ہے کہ اڑیسہ کے کسی گمنام خطے میں وہ کڑی دھوپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کررہا ہو۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوگا تو مزدوری کا کام کرتا ہوگا اور اتنا

---

(۱) وہی آدمی: مطبوعہ آج کل نئی دہلی: فروری ۸۴ء: ص ۴۱

(۲) " " " "

ہی مستعد ہوگا۔"(۱)

کشور جہاں کی اگرچہ کوئی طبع زاد کہانی سامنے نہیں آئی لیکن ترجمہ کے فن میں ان کی صلاحیت خوش آئند مستقبل کی ضمانت ہے۔

شیخ مبین اللہ

شیخ مبین اللہ فقیر موہن کالج بالیسر میں اردو کے لکچرر ہیں۔ اُڑیا زبان کے متعدد شاہکار افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرکے انھوں نے ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع کردیا ہے انھوں نے جن افسانوں کا ترجمہ پیش کیا ہے ان میں سے زیادہ تر نفسیات اور جنسیات کے موضوع پر لکھے گئے جدید افسانے ہیں۔ ان کے ترجمہ کئے ہوئے ایک افسانہ "موم کا گھر" کا اقتباس پیش ہے جس سے ان کی نثری صلاحیت اور معیار زبان کا اندازہ لگایا جاسکے گا:۔

"اف! انتظار کی گھڑیاں کتنی جاں گسل ہوتی ہیں۔
یہاں کوئی نہیں آتا۔
کوئی حادثہ بھی پیش نہیں آتا۔
رات! رات بھی جلد ختم نہیں ہوتی۔
صرف خوف۔ خوف سے خون ابل رہا ہے اور پانی بن جاتا ہے۔
خوف کے خول سے درد کا کیڑا مونچھ نکالے جھانک رہا ہے۔
دل میں درد۔ سر میں درد۔
یہاں۔ وہاں۔ یہاں۔ وہاں۔

خوف موت ایک سیاہ فام گدھ میں تبدیل ہو جائے گی۔ چہار دیواری سے نیچے اُتر آئے گی۔ کہنے لگے گی "ہینڈز اپ!" لیکن اس وقت تک خون کا جلوس نکل چکا ہوگا۔

امین اور آرا نے محسوس کیا کہ دیوار کے نیچے دب جانے پر ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں ہیں۔ اسی لمحہ سے درد انھیں ستانے لگا۔ درد کی شدت سے دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کہنے لگے کہ مقررہ موت کا لمحہ

---

(۱) وہی آدمی، مطبوعہ آج کل نئی دہلی: فروری ۱۹۸۴ء ص ۴۳۔

بھی آگیا، لیکن کسی کی آواز تک نہیں نکلی۔ کسی کو خوف زدہ کر نہیں پایا۔ یالونٹوں نے ان کے سینے چھید دیئے اور دھرتی کے رخ پر خون کے سرخ فوارے پھوٹ پڑے۔

آسمان سے وہ لوگ اپنے بے رنگ چہروں کو دیکھ کر پہچان نہیں پارہے تھے۔"[1]

مبین صاحب کا اڑیا زبان وادب کا مطالعہ وسیع ہے۔ انھیں ترجمہ کا خاصہ تجربہ ہے۔ لیکن ان کے اسلوب میں سلاست کے بجائے کہیں کہیں ثقالت کی چھاپ نظر آتی ہے۔

راقم الحروف نے بھی کم وبیش ۲۵ افسانے لکھے ہیں اور تقریباً اتنی ہی تعداد اڑیا، ہندی، بنگلہ، انگریزی اور تیلگو افسانوں کے اردو ترجموں کی ہے۔ یہ تمام افسانے وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ پہلا طبع زاد افسانہ "پگلی" تھا جو ماہنامہ "صبح نو پٹنہ" میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے افسانوں میں آخری کرنیں، موم کی مریم، گیلا چاند، نجم السحر، سریتا، یادوں کا پگھلتا ہوا جسم، بحر العلوم، چناؤ اور ہاتھ کی لکیریں وغیرہ مقبول افسانے ہیں۔

ابتدائی دور کے افسانوں میں دیہات کی زندگی اور جابرانہ نظام کے ہاتھوں مزدوروں کا استحصال اور زندگی کے داخلی کرب کی گہری چھاپ ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانوں میں راقم الحروف نے اردو کی جدید تحریک سے اثرات قبول کئے اور اس دور کی کہانیوں میں رمز وعلامت کی تہہ داریاں سامنے آئیں۔

افسانوں کے علاوہ اڑیسہ کے ادب، معاشرت اور ثقافت کے تناظر میں جو مضامین راقم الحروف نے لکھے ہیں ان میں سے بیشتر آج کل نئی دہلی میں شائع ہوئے اور باقی دوسرے رسائل میں۔

طاہرہ حفیظ

اڑیسہ میں اردو کے تخلیقی ادب میں جن خواتین نے حصہ لیا انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ طاہرہ حفیظ خاموش طبیعت کی ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کی تعلیم واجبی سی ہے۔ انھوں نے نہ کسی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی پرائیوٹ طور پر تعلیمی مدارج طے کئے۔ لیکن ان

---

(۱) بیناٹی پٹنایک: شیخ مبین اللہ: موم کا گھر (افسانہ)، مطبوعہ تحریک نئی دہلی: بابت نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۴۱

کے مزاج میں شاعرانہ رچاؤ اور طبیعت میں ادبی لگاؤ ضرور ہے۔

انھوں نے اپنے شوہر کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء کی اہم کڑیاں ہیں۔ ان کے خطوط کا مطالعہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اردو کے مرکز سے دور رہ کر بھی اس چراغ خانہ میں اردو زبان وادب سے جو والہانہ لگاؤ ہے اُڑیسہ میں اردو کے روشن مستقبل کی بشارت ہے۔ راقم الحروف کو ان کے اکسٹھ ذاتی خطوط حاصل ہوتے ہیں جو بھدرک سے لکھے گئے تھے۔ ان خطوط کا زمانہ تحریر اکتوبر ۱۹۸۰ء سے ستمبر ۱۹۸۴ء ہے۔

چند خطوط کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

بھدرک

۲۹ مارچ ۱۹۸۴ء

دلبر جانی! سدا مہکتے رہو۔

آپ کا طویل خط ملا۔ خط کیا ہے شعلہ ہے اور شبنم بھی۔ جواب لکھوں تو کیا لکھوں۔ بڑی دیر سے سوچ میں گم ہوں۔ بھائی جان کی حرکت پر مجھے افسوس ہے۔ غیروں کی محبت اپنوں میں نہیں۔ ارے بھئی ہم لوگ ہوتے مفلس۔ زر ہوتا تو ہمارا منہ تر ہوتا۔ ایک طرف ریحان بھائی اور دوسری طرف افضل بھائی۔ قدر کس کی، ڈر کس کا ہے۔

بابو کا پیغام مبارک ہو۔ وہاں پر جہیز کا سوال اٹھانا ممکن نہیں۔ خود سے جو دیں گے وہی قبول کرنا ہوگا۔ لڑکی شمع کو پسند ہے تو پھر کیا۔ غالباً آپ نے بھی دیکھی ہے۔ بابو کو لکھئے کہ وہ سونے کی انگشتری اور اچھی سی قیمتی ساڑی وہیں سے بھیجیں۔ گھر سے کوئی بھی جاکر پہنا آئے گا۔ چُنّو کی موجودگی میں شادی کا انتظام کیجئے تو بہتر ہوگا۔ مگر وقت بہت گڑبڑ ہے۔ آپ کو فرصت نہیں۔ دیکھئے جو خدا کو منظور ہوگا وہی بہتر ہوگا۔

آپ کا بھیجا ہوا ابّا جان کا خط پائی۔ پہلی تاریخ تو ابھی باقی ہے مگر آپ نے تصویر کا بہانہ خوب بنا کر مجھے فول بنایا۔ البین کی سردی ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ببی کے لئے آپ کیا کیا نہ سوچ کر کام کر رہے ہیں۔ حمید اور زین الدین کے ساتھ رہ کر بچہ میرا انسان بن جاتا۔ انسان تو ہے ہی مگر قابل ضرور بن جاتا۔ مگر اس کی محنت تشفی بخش نہیں ہے۔ آپ گھر میں ہوتے تو کچھ ڈر اس کے دل میں ہوتا۔ مجھے ڈرنے والے بچے نہیں ہیں۔ من موجی کار بار ہے۔ اور کیا بتاؤں میرے مایوس دل میں خدا خوشی کا دن دکھلا دے۔

بس یہی دعا۔ کرتی رہتی ہوں۔

ریحان بھیا کے ہاتھ چشمہ بھیج رہے ہیں، بہت شکریہ۔ پڑھتے وقت یا لکھتے وقت ضرورت پڑتی ہے۔ ہر وقت کون لگائے پھرے۔ غزل نماز پڑھ رہی ہے۔ اس لئے جائے نماز ضرور بھیجنا کیونکہ ایک ہی جائے نماز ہے۔ مغرب کی نماز قضا ہو جاتی ہے۔

قمران زچگی کے لئے تیار بیٹھی ہے، اور کیا کرے گی۔ ان لوگوں سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔

اور کیا تحریر کروں؟ زین الدین اور حمید کے لئے دعائیں۔

تیری یاد میں ڈوبی ہوئی

طاہرہ حفیظ

(۲)

بھدرک

۱۱ر اپریل ۱۹۸۴ء

ڈیئر حفیظ! سلام و عقیدت۔

آج کی ڈاک سے آپ کا خط ملا۔ بڑے افسوس کی بات کہ میرا ۲۸ر مارچ کا تفصیل سے لکھا ہوا خط آپ کو نہیں ملا۔ مجھے تو اس خط کے جواب کا انتظار تھا۔ مجھے آپ کی طرف سے بدگمانی ہو چلی تھی کہ آپ میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ آپ کو یہ لکھنے والی تھی کہ خاموش کیوں ہو۔ ستارو، امید کے سہارو! کیا ہوئی ہم سے خطا، یہ تو بتاؤ ذرا۔

ریحان بھائی اسکوٹر لے کر جاتے وقت جو میں ڈر رہی تھی وہی ہوا۔ بے چارے راستہ میں گر پڑ کر رات کے گیارہ بجے گھر پہنچے۔ پیر میں تھوڑا زخم آگیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اللہ بڑا مہربان ہے ورنہ زیادہ کچھ ہو جاتا۔

آج تنخواہ ملی۔ عزیز حسن واقعی عزیز ہیں۔ اپنی تنخواہ سے پانچ سو لاکر گھر میں دے گئے تھے کہ ہم لوگوں کو پریشانی ہو جائے گی۔ بہت بہت شکریہ ان کا۔

آپ کا خط پڑھ کر ببی کو سنادی۔ اس کا دل ہے دہلی میں جا کر ٹیسٹ دینے کے لئے مگر سب رہا ریزلٹ پر۔ بچے کا تو بچنا چھوٹا نہیں ہے۔ عزیز بھائی کا گھر بننا شروع ہو گیا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ ببی پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے۔ کرنا چاہتا ہے۔

بی۔اے۔ میں داخلہ میں بات پسند کیا نہیں۔ اب سوچ میں ہے۔ اللہ حافظ ہے کیا کیا جائے۔
ریحان بھائی سے گھڑی مل گئی ہے۔ حمید صاحب اور زین الدین کے لئے دعائیں۔

جواب کے انتظار میں
آپ کی طاہرہ حفیظ

(۳)

بھدرک
۱۴ اپریل ۱۹۸۴ء

محترم ساتھی! سلام والفت

آپ نے لکھا میں ظالم ہوں۔ ظلم اس نے کیا جس نے میرا خط چرایا۔ صرف تھوڑی سی سیریل کی مہک نے خط کو غلط راستہ دکھایا۔ افسوس ہے جو میں نے اس خط میں لکھا آپ پڑھ نہ پائے۔ اور میں آپ کو بدگماں سمجھی، آپ مجھے ظالم ٹھہرائے۔ نہ تیرا قصور ہے نہ میرا قصور۔

آپ کے خط کے ساتھ بھائی جان کا خط ملا۔ ایک فکر جو زندگی میں لگ گئی۔ دلہا بھائی کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا ۳ اپریل کو۔ وہ ابھی بھونیشور میڈیکل میں تین ہفتے رہیں گے۔ آپ انھیں فوراً خط لکھ کر خیریت دریافت کیجئے اور مجھے بھی وہاں کا پتہ لکھ کر معلوم کرائیے تاکہ میں بھی ان کی خیریت پوچھوں۔ دل لگا ہوا ہے، خدا انھیں صحت یاب کرے اور عمر دراز کرے۔ آمین۔

آپ کا بھیجا ہوا چشمہ تھوڑا سا لوز ہے۔ بوبی کے لئے لنگی اب تک آئی نہیں۔ آپ بھیج دیں گے تو بہت بہت شکریہ۔ ساتھ میں غزل کے لئے ایک دو پٹہ بھی دیں گے۔ بوبی اکنامکس میں ایم۔اے۔ کرے گا۔ پہلے خط میں غلط لکھ دی ہوں۔ خدا اسے پڑھنے میں دل لگا وے۔ دعا تو کروں گی اور کیا کر سکتی ہوں۔ آپ بھائی جان کی تعریف لکھتے جائیے اور سنتی جاؤں پڑھتی جاؤں۔

جواب کے انتظار میں
آپ کی طاہرہ حفیظ

(۴)

بھدرک
۲۳ فروری ۱۹۸۴ء

اے جانِ آرزو! سلامت رہو۔
کس دن دعا نہ مانگی ہم نے تمھاری جاں کی! خط کے ساتھ تصویر اور انکم ٹیکس کا فارم بھی مل گیا۔ پرانی تصویر دیکھ کر ماضی کی یادوں میں کھوگئی۔ وہ دیوانگی کا عالم آپ کا، وہ شرمائی ہوئی زندگی میری۔ فردا کے تصور میں موتی پرونا........

"م" آپا کا پیغام مبارک ہو۔ آپ نے ان کے والد کو بہت اچھا جواب دیا۔ بہت ہی پیارا جواب۔ سن کر دل خوش ہوگیا۔ مگر آپ وہاں جانا بند کیوں کردیئے؟ ڈر رہے ہیں کہیں پیار نہ ہوجائے۔ یہ افواہ شاید "ش" کی طرف سے ہے۔ آپ کا رومی کے ہاں جانا بند کیوں ہے؟ قاسمی صاحب اپنی بیگم کو لے آئے، بہت اچھا کیے۔ دلّی کی رنگین دنیا میں تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔

حمید کب سے اپنے بھائی بہن کو دہلی لائے ہوتے ہیں؟ مستقل رہیں گے یا پھر چلے جائیں گے؟ فی الحال یہاں ہلچل مچا ہوا ہے۔ "ق" کا چھ ماہ کا حمل۔ اس کا کہنا ہے کہ "ل" کی طرف سے ہے۔ "ل" کے بھائی وغیرہ اسے مارتے ہیں کہ تو جھوٹ بول رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بڑے دُکھ کی بات ہے۔

انکم ٹیکس کا فارم قاسمی صاحب کو بھیج دیا گیا ہے۔ حسن صاحب تو نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ قاسمی صاحب کو خط لکھئے۔ وہ کہہ رہے ہیں بڑے جھنجھٹ کا کام ہے۔ بہرحال دیکھا جائے گا۔

ارے جانِ تمنا! وعدۂ کشمیر سے دل شاد و آباد ہے۔ ریحان بھائی کے ساتھ جانے کے لئے لکھا تو ہے۔ چُنّو اگر ساتھ گئیں تو کوشش کروں گی مگر وہ لوگ ہوائی جہاز سے گئے تو میری کیا بساط ہے؟ دوسری بات یہ کہ بوبی کا امتحان ختم نہ ہونے سے وہ نہیں چھوڑے گا۔ گرمی میں بہت لوگ کشمیر تو جایا کرتے ہیں مگر سنا گیا ہے بلکہ پڑھا بھی گیا ہے کہ اگست ستمبر میں بہت ہرا بھرا رہتا ہے۔ آپ کا visa ہوتے وقت شاید دسمبر یا جنوری ہوجائے گا

اس وقت جانا ناممکن ہے۔ آپ کے خط سے پتہ چلا کہ دہلی میں سردی باقی ہے۔ رات میں آپ کافی محنت کرتے ہیں اور تمام دن آپ کا کیا کام رہتا ہے؟ رات میں آپ کو ضرور بھوک لگتی ہوگی؟ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ یہ وقت آپ کا بہت یادگار وقت ہے۔ خط لکھنے میں اگر دیر ہو جائے تو اسے میری بے رخی نہ سمجھنا۔ خط لکھتے وقت آنکھوں میں پریشر پڑتا ہے۔ کبھی بچے قلم غائب کر دیتے ہیں۔ وہی رات کا انتظار۔ خواب دیکھی کہ آپ TV خرید رہے ہیں۔ کیا سچ ہے؟

البین بہت یاد کرتی ہے۔ بولتی ہے" بہت غصہ لگتا ہے۔ ابّی جان کب سے گئے ہیں آتے نہیں ہیں۔" بچّے سب خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں۔

خدا حافظ

آپ کی طاہرہ حفیظ

(۵)

بھلارک

۶؍مارچ ۱۹۸۴ء

ڈیئر صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ کی طبیعت کے لئے بے حد پریشان تھی۔ آپ سے خط ملا تو تشفی ہوئی۔ آپ آنے کے لئے لکھ دیئے تھے اس لئے یہاں کچھ انتظار بھی تھا۔ خیر! خدا آپ کو صحت کے ساتھ رکھے، آمین! آپ کا کام کہاں تک گیا؟ تنخواہ مل گئی ہے۔ ابّا جان کو روپیہ بھیج دیا جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوئیے۔ آپ کے جانے کے بعد اس گھر کو کنٹرول میں لانے کے لئے مجھے دو مہینہ لگ جاتا ہے۔ قرض کا بلّہ اس قدر بڑھ چڑھ کر رہتا ہے کہ کیا بتاؤں؟ آپ کو تو معلوم ہی ہے، میں لکھوں گی تو جرم میں گرفتار ہو جاؤں گی۔ خدا برکت دے کہ ہر فرض پورا ہو۔

ریحان بھیا کے ہاتھ چشمہ بھیج دیں گے تو بہت بہت شکریہ۔ کیونکہ لکھنے پڑھنے وقت آنکھوں میں پریشر پڑتا ہے۔ تکلیف ہو جاتی ہے۔

ساغر نظامی کی رحلت کی خبر ریڈیو سے معلوم ہوئی۔ آج امّاں جی کی برسی ہے۔

زخم جگر ہرے ہیں۔ وہ دنیا اب کہاں۔ الیاس کو بخار آگیا تھا ابھی خدا کا فضل ہے اور سب خیریت سے ہیں۔

بچوں کی پڑھائی کی طرف سے میرے دل میں خوشی نہیں۔ کوئی ٹھیک مطابق پڑھ نہیں رہے ہیں۔ اس لئے دل میرا مایوس رہتا ہے۔

حمید کے بھائی بہن دہلی میں ہیں یا چلے گئے؟ معراج صاحب، سنی وغیرہ اب کہاں ہیں؟ بابو کی شادی پھر کہاں ٹھیک ہو رہی ہے؟

آپ کے جواب کی منتظر

طاہرہ حفیظ

طاہرہ حفیظ کے مذکورہ بالا خطوط نفسیاتی مطالعہ کا وافر مواد فراہم کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر بے ساختہ اور بے ریا ہے۔ زبان میں سادگی اور شیرینی کے ساتھ ساتھ اور ایک خصوصیت یہ ہے کہ طاہرہ کے خطوط میں جہاں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق اور جذبات کی فراوانی کا عکس ملتا ہے۔ ساتھ ساتھ ان کی اردو پر اڑیسہ کے لہجے اور قواعد کی گہری چھاپ ہے۔ طاہرہ نے انتہائی بے تکلف پیرایۂ بیان میں بھی شائستگی اور شستگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھوں نے مذکورہ بالا خطوط میں اپنی زندگی کا جو کلوزاپ پیش کیا ہے اس کا اثر دیرپا اور گداز ہے۔

اگر طاہرہ حفیظ جیسی خواتین کو رابطہ کی زبان میں شائستگی کی بات کرنی پڑے اور اس کا تعلق انفرادی زندگی سے موڑ کر سماج کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو ان کی آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ اس طرح کہنا پڑتا ہے کہ طاہرہ کی خفتہ ادبی صلاحیتیں مستقبل میں اڑیسہ کی خواتین کے لئے ادبی ذوق کی نشو و نما کی ضامن ہوں گی۔

باب چہارم

(ب)

اُڑیسہ میں اُردو صحافت

اُڑیسہ میں اُردو صحافت کی تاریخ نصف صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔

ماہنامہ المنصور

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اُڑیسہ میں اردو کے تہذیبی اور علمی مرکز سونگڑہ سے مولوی محمد عمر کی ادارت میں "ماہنامہ المنصور" کا اجرا اڑیسہ میں اردو صحافت کا پہلا قدم تھا۔ مولوی محمد عمر کی تعلیم اترپردیش کے اسلامی مدارس میں ہوئی۔ ان کے اندر زبان و ادب کے ارتقاء کا جذبہ موجزن تھا کہ گوناگوں مسائل کے باوجود انھوں نے سرزمین اڑیسہ سے المنصور جیسے ایک اردو ماہنامہ کا اجراء کیا۔ چونکہ یہ اڑیسہ کا واحد ادبی، ثقافتی اور مذہبی رسالہ تھا اس عہد کے عام مسائل کی نشان دہی کرنا اور ان کا حل تلاش کرکے عوام کو صورت حال سے روشناس کرانا گویا کہ اس رسالہ کا نصب العین تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اڑیسہ اردو کے مراکز سے دور ہونے کے باوجود اس کے مرکزی شہروں اور نواحی علاقوں میں لوگوں کے درمیان اردو کا ادبی اور تہذیبی ذوق فروغ پا رہا تھا۔ اور عوام کے اندر سیاست سے خاصی دلچسپی پیدا ہو رہی تھی۔ ابتدائی دور میں ہر نئے رسالے کے لئے انتہائی صبرآزما حالات سامنے آتے ہیں۔ طرح طرح کی پیچیدگیوں سے گذر کر جریدہ قاری کے ہاتھوں میں آتا ہے۔ اگر کسی جریدہ کے مدیر میں صحافت کا ذوق اور حالات و مشاہدات کی روشنی میں حقائق کا ٹھوس

تجربہ ہو تو اس رسالہ کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کے قارئین کا حلقہ بڑھ جاتا ہے لیکن "المنصور" چند شماروں تک ہی محدود رہا اور اس کے قارئین کا حلقہ بھی وسائل کی کمی کی بنا پر وسیع نہ ہوسکا۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود "المنصور" کے جو شمارے منظر عام پر آئے اڑیسہ میں اردو کی صورت حال اور سماجیاتی و تہذیبی تناظر میں ترسیل و ابلاغ کے باب میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔

اس زمانہ میں کٹک میں باقاعدگی کے ساتھ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس رسالہ میں مذہبی مضامین، خبریں، مشاعروں میں پیش کیا گیا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

اڑیسہ میں اردو کا پہلا لیتھو پریس "مطبع مظہر النصائح" تھا جس میں مولوی محمد سلطان راجیؔ کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ مولوی محمد سلطان راجیؔ کے منظوم اردو خطبوں کا مجموعہ "مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا۔ ان کی دوسری کتاب "معرفت خدا و رسولؐ" اسی پریس میں ۱۲۸۷ھ میں شائع ہوئی۔ اور ان کی تیسری کتاب "مہتاب المجالس" اسی پریس سے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جس پریس سے اردو کی پہلی کتاب ۱۲۸۶ھ میں اور آخری دستیاب شدہ کتاب ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوئی ہو تو یہ پریس کم از کم ۱۸ سال تک طباعت کے کام انجام دیتا رہا لیکن اس دوران میں کسی رسالہ یا جریدہ کی اشاعت کی جانب کسی نے توجہ نہ دی اور اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ دور مذکور میں اردو صحافت کی جانب کسی کی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

ہفتہ وار مسلم گزٹ کٹک

ہفتہ وار مسلم گزٹ کی اشاعت سے اڑیسہ میں اردو صحافت کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ مسلم گزٹ "بلٹز" سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ اس اخبار کے مدیر سید فضل الرحمٰن قاسمی تھے اور یہ اخبار کٹک کے "کشمی نارائن پریس" میں اردو ٹائپ سے چھپتا تھا۔ "مسلم گزٹ" کی حاصل شدہ کاپیوں میں پہلی کاپی جلد ۱ شمارہ ۳۲ ہے جو کٹک سے ۶ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ یوم پنجشنبہ مطابق ۱۷ جون ۱۹۳۷ء کو شائع ہوا ہوگا۔ یہ اخبار ہلکے مٹیالے رنگ کے نیوز پرنٹ کاغذ پر اڑیسہ میں اردو صحافت کی تاریخ میں اردو کی واضح طباعت کی اعلیٰ نشانیاں پیش کرتا ہے۔ اخبار کا ٹائٹل ذیل کے مطابق ہوا کرتا تھا۔

مسلمانانِ اڑیسہ کا واحد ترجمان

مسلم گزٹ

شرح قیمت		اشتہار
سالانہ تین روپیہ ششماہی دو روپیہ سہ ماہی ایک روپیہ فی پرچہ ایک آنہ	ایڈیٹر:۔ سید فضل الرحمٰن قاسمی	دینے والے حضرات براہ راست منیجر سے معلومات حاصل کریں۔

جلد ۱ | کٹک یوم پنجشنبہ ۷ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۷ جون ۱۹۳۷ء | نمبر ۳

مسلم گزٹ کے زیر نظر شمارہ میں جہاں ۱۷ شاہ سرخیوں کے تحت صوبہ اور بیرون صوبہ کی اہم معلوماتی خبریں ہیں وہیں عرب ممالک کے دوسرے ممالک کے ساتھ خارجی تعلقات اور مغربی ممالک کے اساسی حالات پر تبصرہ بھی ہے۔ اس شمارہ کا اداریہ خصوصی توجہ اور اہمیت کا حامل ہے جو اخبار کے مدیر کی دور اندیشی اور حالات حاضرہ کے تناظر میں ان کے مشاہدات اور علمی بصیرت کی نشان دہی کرتا ہے۔

مسلم گزٹ کے زیر نظر تیسرے شمارہ میں اُڑیسہ میں "ینگ مسلم ایسوسی ایشن" کے قیام اور اس کی تنظیم کے بارے میں اداریہ ہے۔ یہ ماضی کی ایک ایسی قومی شاہراہ ہے جس پر ۵۰ سال کی طویل مدت کے بعد آج کٹک کے مسلم نوجوانوں کی قائم کردہ "مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن" گامزن ہے۔

اداریہ کا آغاز ذیل کے سطور سے ہوتا ہے:۔

"اس دور اختلاف میں جب کہ مسلمانوں کا شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا ہے۔ ان کے کالجوں سے لے کر یونیورسٹی تک، اسکول سے لے کر مدرسہ و مکتب تک، اسمبلی سے لے کر کونسل ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپل بورڈ تک، غرض کہ مسلمانوں کا کوئی ایسا ادارہ، کوئی ایسی انجمن یا کمیٹی نہیں جہاں اختلاف و نفاق کا مادّۂ فاسد موجود نہ ہو۔ حقیقتاً ادارہ و انجمن کے قیام کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ انسانی افراد کو یا خاندان آدم کو ایک زنجیر نظام میں جکڑ دیا جائے۔ یہی نظام قوموں میں اتحاد خیال و اتحاد آرا پیدا کرتا ہے جس سے وہ پستی سے نکل کر بام عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔۔

ہم ان نوجوانوں کے عزم پر، جو اس کی بناء میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لئے ہیں تہ دل سے شکریہ پیش کرتے ہیں اور دعاء کرتے ہیں کہ خداوند کریم انھیں اپنے ارادہ میں استحکام کے ساتھ استقلال عطا فرمائے۔ ہمارے سامنے اس انجمن کے دوسرے جلسہ کی کارروائی موجود ہے، گو ہمیں بعض تجاویز میں تضاد کا شائبہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی ہم ان کے عزم کی داد دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ تجاویز صرف زینت دفتر ہو کر نہ رہیں بلکہ ان میں عمل کی جلا بھی پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی کہیں گے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے حلقۂ بہی خواہان کو وسعت دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نوجوان شریک ہوں۔ اس کی شاخیں اڑیسہ کے ہر ہر ضلع میں قائم ہوں۔ اس کا مرکزی دفتر صوبہ کے مرکزی شہر میں ہو۔ مگر سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن کو باعمل بنایا جائے۔ ہم یہ بھی کہیں گے کہ اس کا بھی وہی حال نہ ہو جیسا کہ اور ہندوستانی انجمنوں کا ہوتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اتحاد خیال اور اتحاد آرا ہونا چاہئے۔"(1)

اس شمارہ کا دوسرا اہم مضمون "مسلمانوں سے دو دو باتیں" کے زیر عنوان پیش کیا گیا ہے اس مضمون کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ سماج میں غلط رسم و رواج کی پابندی اور جنون کی حد تک تقلید نے قوم کی معاشی حالت تباہ کر رکھی ہے۔ مضمون کے آغاز میں مدیر نے لوگوں کی توجہ سماجیاتی سطح پر اتفاق و اتحاد کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی ہے اور موضوع سخن کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے عوام کی مفلسی کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس عظیم مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

زیر نظر شمارہ میں اُڑیسہ کے معروف قومی رہنما اور اردو کے پرگو شاعر مولانا سید برکت اللہ برکت کی ایک نظم "مسلم گزٹ سے سرگوشی" کے عنوان سے شریک اشاعت ہے۔ اس طرح مسلم گزٹ میں مقامی و بیرونی خبروں کے علاوہ قومی و بین الاقوامی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور اس میں لازمی طور پر ادبی گوشہ بھی ہوا کرتا تھا۔ مسلم گزٹ کے ہر شمارہ کی

---

(1) اقتباس از اداریہ ہفتہ وار مسلم گزٹ، بابت ۱۷ر جون ۱۹۳۷ء؛ جلد ۱ شمارہ ۳؛ ص ۲۔

قیمت صرف ایک آنہ ہوا کرتی تھی۔اس کی طباعت صاف اور واضح، مضامین دلچسپ، خبریں معلوماتی اور مسائل توجہ طلب ہوا کرتے تھے۔آخری صفحہ پر چند اشتہارات بھی شریک اشاعت ہوا کرتے تھے جن میں سے ایک اردو کے "کتب خانہ رحیمیہ درگاہ بازار کٹک" کا، دوسرا "لکشمی نارائن پریس" کا اور تیسرا "ایس ایس بک اسٹال شیخ بازار / بالو بازار کٹک" کا ہوتا تھا۔

چونکہ مولانا سید برکت اللہ برکت اڑیسہ میں اردو کے کاروان کو داغ مفارقت دے کر اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر چکے ہیں اور ان کا شعری اثاثہ ان کے ورثاء کی عدم توجہی کی وجہ کی بنا پر دستیاب نہیں ہے۔ مسلم گزٹ میں مطبوعہ ان کی مندرجہ ذیل نظم قابل توجہ ہے جس سے شاعر کی قادر الکلامی، پرگوئی اور فکری بلندی کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ عام طور پر مسلم گزٹ کے ہر شمارہ کے صفحۂ اول پر اڑیسہ کے معروف و معتبر شعراء کا کلام شائع کیا جاتا تھا۔مولانا سید برکت اللہ کے ساتھ ساتھ عبدالحلیم نقیب سونگڑوی کی تخلیقات بھی مسلم گزٹ کی زینت بنتی تھیں۔شیخ غلام غوث (مصنف "نبی العربی") اور ان کے فرزند ارجمند شیخ انور حسین (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ آف سنٹرل اکسائز اینڈ کسٹم) کے مضامین بھی مسلم گزٹ میں اشاعت پذیر ہوتے تھے۔

مسلم گزٹ سے سرگوشی

(از جناب مولوی سید برکت اللہ صاحب)

اے مرے مسلم گزٹ اے آبروئے مؤمنین
اے کفیلِ قوم اے سرمایۂ دنیا و دیں

اے کہ اظہارِ حقیقت تیرا ہر عنوان ہے
تیری تحریر ہر یک گنجینۂ عرفان ہے

درس تہذیب و تمدن ہے ترے اوراق میں
ارتقائے قوم مضمر ہے ترے اسباق میں

تیرا سینہ راز دارِ ملّتِ اسلام ہے
تیرا دل حبِّ الٰہی کا چھلکتا جام ہے

احتجاجِ قوم کا بس ذریعۂ واحد ہے تو
زندگانی کا ہماری یک فقط شاہد ہے تو
زندگی تیری ثبوتِ زندگیٔ قوم ہے
ابتری تیری دلیلِ ابتریٔ قوم ہے

تو ہمارے ملک کا پروردۂ صد ناز ہے
تو زبانِ قوم ہے تو قوم کی آواز ہے
ہاں مگر اس دورِ ظلمت میں تجھے پوچھے گا کون
اے بتِ دنیا و دیں بتلا تجھے پوچھے گا کون

نکبت و افلاس اب ہیں ہمدم و ہمرازِ قوم
جہل و لاعلمی بنی ہیں مونس و دمسازِ قوم
جب نہیں خود قوم میں ادراکِ احساسِ زیاں
تو ہی خود بتلا ترا پھر کون ہوگا قدرداں

لیکن اے روپوش ہوجانا نہ گھبرا کر کہیں
بعد ہر تکلیف کے راحت بھی ہوتی ہے قریں
چند روزہ ہیں زحمت صبر کرلے جھیل لے
عمرِ دائم کے لئے ہاں اپنی جاں پر کھیل لے

کر توکل ذاتِ حق پر کوہِ استقلال بن
مرحلے کلفت کے طے کر صاحبِ اقبال بن
کوکبِ اقبال و تمکیں تا ابد رخشندہ باد
بر سرِ چرخ اڑیسہ نامِ تو تابندہ باد[1]

مسلم گزٹ کے اجراء کا پس منظر

اڑیسہ میں اردو صحافت کا آغاز اگرچہ ماہنامہ المنصور سے ہوچکا تھا لیکن عوامی سطح پر یہ جریدہ

---

(۱) مطبوعہ مسلم گزٹ، ۷ار جون ۳۷؛ ص ۷۔

صحافت کی تہہ داریوں سے عوامی ترسیل (MASS MEDIA) کا ذریعہ بن نہیں پایا۔ چنانچہ چند لوگوں کے ذہن میں ایک ہفتہ وار اخبار کے اجراء کی تحریک پیدا ہوئی۔ مسلم گزٹ میں مطبوعہ ایک مضمون "قومی وقار کو باقی رکھو" کا مندرجہ ذیل اقتباس اخبار مذکور کے اجراء کے پس منظر پر روشنی ڈالتا ہے۔

> "برادرانِ ملّت! مسلم گزٹ اڑیسہ کا وہ پرچہ ہے جس کی تعریف میں قلم اُٹھانا صرف حماقت ہے۔ گزٹ مذکور کی زندگی آپ کی سیاسی اور قومی خدمت کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔ آپ میموریل کے نتیجہ سے خوب واقف ہیں۔ اولاً یہ سرکار بہادر تک پہنچتا نہیں اور اگر کبھی اتفاقیہ گرتے پڑتے پہنچ گیا تو اس کو نظر انداز کر دینا معمولی بات ہے۔ اس کے ذریعہ فیض پانا تو تقدیری امور میں سے ہے۔ مگر غیر مسلموں کی تقدیر اخبار کے اشارے پر جھکتی ہے۔ وہ اسی کے ذریعہ چیخ پکار کر کے اپنے حقوق کا تحفظ کر لیتے ہیں۔ بھائیو! اگر زندہ رہنا ہے اور اپنے حقوق کا پاسِ خاطر ہے تو مسلم گزٹ کی اعانت کیجئے اور اس کی ترقیٔ حیات کی دعاء کیجئے۔ اسی کی چیخ پکار سے آپ بھی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔"[1]

مسلم گزٹ کے شمارہ نمبر ۲ میں اداریہ "مسلمانان اُڑیسہ کی اہم ذمہ داری" کے زیر عنوان مدیر نے اُڑیسہ کے اس اولین اخبار کے اجراء کی اہمیت اور قومی ارتباط کے نقطۂ نظر سے اس کی شدید ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور اُڑیسہ میں اردو کی پیش رفت کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل تجاویز ادارہ مسلم گزٹ کی جانب سے پیش کی گئی ہیں:۔

(۱) صوبہ کے مشہور مشہور مقامات میں اردو کتب خانے قائم کرنا جن میں ہر علم و فن کی اردو کتابیں، اخبارات اور رسائل موجود ہوں۔

(۲) اخبارات اور رسائل کی اُڑیسہ میں اشاعت۔

(۳) شعراء اور مصنفین کے کلام اور تصانیف کی اشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہو۔

(۴) عوام میں نیز مکتبوں، اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں کے طلباء کے لئے ایسے ذرائع بہم پہنچانا جن سے ان میں اردو سیکھنے کا ذوق و شوق پیدا ہو۔[2]

---

(۱) ڈاکٹر عبدالحکیم:۔ قومی وقار کو باقی رکھو؛ مطبوعہ مسلم گزٹ کٹک، ۸ر جولائی ۱۹۳۷ء، ص ۶

(۲) اداریہ مسلم گزٹ؛ جلد ۱ شمارہ ۲؛ ص ۳ — ۴

مسلم گزٹ نے اڑیسہ میں اردو صحافت کی تاریخ میں یقینی طور پر اہم رول ادا کیا ہے۔

مسلم گزٹ کی تعلیمی خدمات

سماجی ارتباط کے ساتھ ساتھ اُڑیسہ میں اُردو تعلیم کے فروغ میں بھی مسلم گزٹ نے اہم تجاویز پیش کی ہیں جو مندرجہ ذیل تعلیمی تجاویز کے زیرعنوان شائع ہوئی تھیں:-

"۱۵ر اگست ۱۹۳۷ء کو جمعیۃ علماء ہند شاخ اُڑیسہ کے ایک عام اجتماع میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی گئیں:-

(۱) مسلمانان شہر کٹک کا یہ عام جلسہ حکومت اُڑیسہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ جیسا اس نے دینی و دنیوی ترقی کے لئے اور بہت سی درس گاہیں مثلاً اُڑیسہ میڈیکل اسکول، اڑیسہ انجنیرنگ اسکول، سنسکرت کالج وغیرہ وغیرہ اپنے خاص انتظام میں رکھی ہیں۔ اسی طرح مسلمانانِ اڑیسہ کی دینی و دنیوی ضرورتوں کا لحاظ کر کے ایک سینئر مدرسہ بھی اپنے زیرِاہتمام رکھے اور اپنے انتظام خاص سے چلائے نیز کام کی سہولت اور پوری نگرانی کے خیال سے مسلمانوں کا یہ عام جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ بجائے ایک کے دو اسپیشل انسپکٹنگ آفیسر مقرر کئے جائیں۔ ایک بالیسر اور سنبل پور کے حلقہ کے لئے اور دوسرا پوری اور جنوبی اُڑیسہ کے لئے۔

(۲) مسلمانان کٹک کا یہ عام جلسہ حکومت اُڑیسہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ مدارس اور مکاتب کی نگرانی کے لئے ایک ایگزامینیشن بورڈ قائم کرے اور سکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن میں مسلمانوں کو زیادہ تعداد میں شریک کرے۔

محرک: عبدالرشید۔ ناظم جمعیۃ علماء اڑیسہ

مؤید: مولوی محمد اسماعیل۔ رکن جمعیۃ

(۳) مسلمانان کٹک کا یہ عام جلسہ اڑیسہ میں تعلیمات اسلامیہ کی سہولت کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ صوبہ اڑیسہ میں پراونشیل گریڈ کے ایک ناظر تعلیمات اسلامیہ کا تقرر ہو جو براہ راست ڈائرکٹر صاحب اور مدرسہ ایگزامینیشن سے متعلق ہو اور جس کو وظائف اور امدادوں کے گھٹانے بڑھانے اور

بند کرنے کا پورا اختیار ہو۔

محرک: مولوی محمد اسماعیل

مؤید: مولوی فضل الرحمٰن قاسمی۔ نائب ناظم جمعیۃ

(۴) مسلمانان کٹک کا یہ عام جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ تمام ایم ای اسکولوں اور گورنمنٹ ہائی انگلش اسکولوں کے نیچے کی جماعتوں میں مسلم طلباء کے ذریعۂ تعلیم زبان اردو قرار دی جائے اور پراکٹسنگ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔(۱)

محرک: مولوی محمد اسمٰعیل

مؤید: مولوی سید برکت اللہ (صدر جمعیۃ) "

مذکورہ بالا تعلیمی تجاویز کی تجویز نمبر ۲ کے مطابق ۱۹۳۶ء میں مدرسہ ایکزامینیشن بورڈ کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اڑیسہ بہار سے الگ ہو کر ایک خود مختار صوبہ کی حیثیت سے قائم ہوا لیکن یہاں کے مدارس کے امتحانات بہار مدرسہ ایکزامینیشن بورڈ کے زیر اہتمام ہوتے رہے۔ سالہا سال کی کدو کاوش کے بعد ۱۹۷۲ء میں اڑیسہ میں" مدرسہ ایکزامینیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور اڑیسہ کے تمام علوم مشرقیہ کے مدارس کا الحاق ریاستی مدرسہ ایکزامینیشن بورڈ کے ساتھ ہوا۔ راقم الحروف ۱۹۷۲ء سے اس ایکزامینیشن بورڈ کا رکن ہے۔

مسلم گزٹ کی اہم خبریں

"مسلم گزٹ" میں شاہ سرخیوں کے ساتھ ہر شمارہ میں بیسوں تازہ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ ان خبروں میں سے ۵۰ فی صد خبریں ریاستی، ۲۰ فی صد بین ریاستی اور ۳۰ فی صد بین الاقوامی ہوا کرتی تھیں۔ ان خبروں کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ان سے اڑیسہ کی تاریخ اور تہذیب کی نشان دہی ہوتی ہے اور عوام کے معاصر سیاسی معتقدات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر چند خبریں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "کٹک، ۲۷ اگست ۱۹۳۶ء۔ گذشتہ ۲۵ تاریخ کو کٹک حفاظتی کمیٹی کا ایک جلسہ رام چندر بھون میں ہوا جس میں اڑیسہ کے دارالسلطنت کے لئے کٹک منتخب

---

(۱) تعلیمی تجاویز؛ مطبوعہ "مسلم گزٹ"؛ جلد ۱ شمارہ ۱۲؛ ۲۰ اگست ۱۹۳۶ء؛ ص ۷

کیا گیا۔ اس سلسلہ میں عنقریب ایک وفد وزارت اُڑیسہ سے ملاقات کرے گا۔[1]"

(۲) "کٹک ۲۷ راگست ۱۹۳۷ء ۔ کل گورنر اُڑیسہ اسپیشل ٹرین سے کٹک تشریف لائے اور آج نو بجے سرکٹ ہاؤس میں وزارت اُڑیسہ سے گفتگو ہوئی۔"[2]

بری ضلع کٹک میں ٹینری

(۳) "معلوم ہوا ہے کہ اُتکل ہری جن سیوا سنگھ کی طرف سے بابو منموہن چودھری کو کلکتہ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ وہاں سے چمڑا ٹیننگ سیکھ کر آنے سے بری ضلع کٹک میں ایک TANNARY کھولی جائے گی جس کے لئے مکان وغیرہ تیار ہو چکے ہیں۔"[3]

حاجی مولا بخش صاحب کا ایثار

(۴) "بھدرک۔ شنکر پور کے رئیس حاجی مولا بخش خاں صاحب نے اپنی جائداد کا قیمتی حصہ تعلیم اور دیگر چند کارِ خیر کے لئے وقف کیا ہے۔"[4]

بہار سے الگ ہونے کے بعد اُڑیسہ کی راجدھانی کٹک ہی میں قائم ہوئی۔ شہر کٹک میں اُڑیسہ کی راجدھانی کے قیام کے سلسلہ میں جو عوامی تحریکیں بروئے کار آئیں ان کی نشان دہی پیش نظر خبر ۱ سے ہوتی ہے۔

خبر نمبر ۳ اُڑیسہ میں سماجی تبدیلیوں کی مظہر ہے۔ شری من موہن چودھری اُڑیسہ کے معروف سرودیہ لیڈر شری گوپ بندھو چودھری اور عظیم گاندھی وادی سوشل ورکر شریمتی رما دیوی کے صاحبزادہ ہیں۔ ملک کی آزادی کے حصول میں اہنسا کے اصول پر گامزن رہ کر عوام کے فلاحی کاموں کے لئے جن

---

(۱) خبر مطبوعہ ہفتہ وار مسلم گزٹ کٹک جلد ۱ شمارہ ۱۳ : ۲۷ راگست ۱۹۳۷ء : ص ۶

(۲)	ایضاً	ایضاً	ایضاً
(۳)	ایضاً	جلد ۱ شمارہ ۷ : ۱۵ جولائی ۱۹۳۷ء : ص ۶	
(۴)	ایضاً	ایضاً	: ص ۴

چند لوگوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی ان لوگوں میں شری گوپ بندھو چودھری، ان کی رفیقۂ حیات شریمتی رما دیوی، ان کے صاحبزادہ من موہن چودھری اور داماد شرت چندر مہارنا کا نام آتا ہے۔ خصوصی طور پر ہریجنوں کی فلاح اور ان کے سماجی عروج کے لئے مذکورہ حضرات نے پورے صوبہ میں وہ بے لوث خدمات اور کارنامے انجام دیتے ہیں جن کی وجہ سے اُڑیسہ کی تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ بری کٹک میں چمڑے کی ٹینری کے بارے میں جو خبر "مسلم گزٹ" میں شائع ہوئی تھی اس دور کے قنوطیت پسند اور سماجی بھید بھاؤ رکھنے والوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج بری میں (جہاں گوپ بندھو چودھری کا آشرم تھا) گوپ بندھو چودھری کالج قائم ہے۔ بھوبنیشر میں خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مختص "رما دیوی ویمنز کالج" قائم ہے اور اُڑیسہ کے عوام رما دیوی کی بے لوث عوامی خدمات کی بناء پر انھیں مدر ٹریسا کا مقام دیتے ہیں اور جذبۂ عقیدت مندی سے مغلوب ہوکر انھیں "ماں" کہتے ہیں۔

چوتھی خبر "حاجی مولا بخش صاحب کا ایثار" کے عنوان سے ہے۔ حاجی مولا بخش بھدرک کے رئیس تھے اور اردو کے صوفی المسلک شاعر جنھوں نے اردو کے فروغ میں خاصہ حصہ لیا ہے اور ان کے متعدد شعری مجموعے کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اردو تعلیم کے فروغ کے لئے بھدرک میں اپنی جائداد کا ایک قیمتی حصہ وقف کردیا تھا۔ حاجی مولا بخش مولاؔ کا تفصیلی ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے۔

"مسلم گزٹ" کا اشاعتی بحران

ہر دور میں اردو اخبارات اور جرائد کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ اردو صحافت کی پیش رفت میں عام طور پر جو چیز آڑے آتی رہی ہے وہ اردو کے قارئین ہیں جن کی اخبارات اور رسائل کی خریدنے کی طرف توجہ بہت کم ہوتی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اڑیسہ جیسے دور افتادہ مقام سے اردو کے ہفتہ وار اخبار کا اجراء اور اس کی اشاعت میں مالی خسارہ اور ساتھ ساتھ گوناگوں مسائل سامنے آتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب مسلم گزٹ اڑیسہ کے چرخِ صحافت پر طلوع ہوا تو نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ اڑیسہ کے اردو دان عوام کا مرغوب و مقبول اخبار رہا ہوگا لیکن جیساکہ درج ذیل اعتذار مظہر ہے۔ وہ زیادہ دنوں تک تہ دار خساروں کا متحمل نہ ہو پایا ہوگا۔

پرچہ کی اشاعت میں تاخیر

"ناظرین مسلم گزٹ بہت زیادہ مضطرب ہوں گے کہ پرچہ وقت پر شائع نہیں ہوتا۔ ہم خود بھی اس کو محسوس کرتے ہیں۔ پریس کا ڈیڑھ سو روپیہ ہم پر باقی ہے جس سے وہ لوگ صحیح وقت پر کام نہیں دیتے۔ ہمیں امید تھی کہ پہلی تاریخ اگست کو روپئے مل جائیں گے اور ہم ادا کر دیں گے۔ مگر افسوس جن لوگوں کے پاس پچھلے مہینے کا روپیہ باقی ہے نہ انھوں نے دیا، نہ ان لوگوں نے جو شروع سے پرچہ لیتے ہیں اور اب تک ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ بعض حضرات نے پہلی تاریخ کا وعدہ فرماکر اسے فراموش کر دیا۔ ایسی حالت میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کم از کم بطور امداد کچھ چندہ ہی ارسال فرمائیے تاکہ ہم پریس کے قرضہ سے سبکدوش ہو جائیں۔ (ادارہ)" (۱)

ادارہ "مسلم گزٹ" کی جانب سے پیش نظر اعلان میں بے بسی اور بے کسی کا جو احساس مضمر ہے وہ اردو صحافت سے گذر کر ذاتی کیفیت تک آپہنچتا ہے۔ اس اعتذار نامہ میں زبان صحافت کی نہیں بلکہ بے تکلف عزیزوں کی ہے جس میں ذاتی اِن والومنٹ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

اُس سے پتہ چلتا ہے کہ صوبہ اڑیسہ کے اس واحد اردو ہفتہ وار کی پشت پناہی کرنے کے لئے کوئی ادارہ تیار تھا نہ اردو سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ ثروت حضرات کو ملکی اور قومی مسائل اور اردو صحافت سے وہ دلچسپی تھی کہ وہ مالی استعانت بہم پہنچاتے۔ بہرحال ادارہ کی آخری گذارش ہے "کم از کم بطور امداد کچھ چندہ ہی ارسال فرمائیے تاکہ ہم پریس کے قرضہ سے سبکدوش ہو جائیں"۔

یہاں اس گذارشِ احوالِ واقعی نے اڑیسہ میں اردو صحافت کی کسمپرسی اور قارئین کی عدم توجہ اور زبان وادب سے دلچسپی کے فقدان پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

حالانکہ "مسلم گزٹ" ملک کی آزادی سے قبل قومی دھارے میں پیش قدمی کرنے والی سیاسی جماعت کانگریس کا حامی اور مسلمانوں کے مسائل کی نمائندگی کرنے والا واحد اخبار تھا۔ لیکن ان تمام اہمیتوں کے باوجود مسلم گزٹ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ اور آج اڑیسہ کے اردو داں حضرات کے ذاتی کتب خانوں میں یا کسی پبلک لائبریری میں شاید ہی "مسلم گزٹ" کا کوئی شمارہ دستیاب ہو۔ راقم الحروف نے نہایت عرق ریزی سے اس کے ۱۳ شمارے فراہم کئے جو انتہائی خستگی کے عالم میں ہیں۔

---

(۱) مطبوعہ مسلم گزٹ، ۱۳؍ اگست ۱۹۳۶ء؛ ص ۷

ہفتہ وار — دورِ جدید — کٹک

مدیر
عبدالرشید نقاد

دورِ جدید اُڑیسہ سے شائع ہونے والا دوسرا ہفتہ وار اخبار تھا جو مولوی عبدالرشید نقاد کی ادارت میں کٹک کے لکشمی نارائن پریس سے شائع ہوا کرتا تھا۔ لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود "دورِ جدید" کا کوئی بھی شمارہ دستیاب نہ ہو سکا۔ راقم الحروف نے مدیر محترم سے رابطہ قائم کیا لیکن انتہائی ضعیف العمری کی بناء پر موصوف کی یادداشت نہایت کمزور ہو چکی ہے۔ ان سے بھی کارآمد معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ دورِ جدید کے دو تین شمارے راقم الحروف نے البتہ مدرسہ سلطانیہ کٹک کی لائبریری میں ۵۴۔۱۹۵۳ء کے دوران دیکھے تھے۔

دورِ جدید "مسلم گزٹ" کی طرح اردو ٹائپ میں طبع ہوتا تھا اور اس میں آٹھ صفحات ہوا کرتے تھے۔ صفحات کے نقطۂ نظر سے یہ اخبار قومی اور ملی مسائل پر مبسوط مضامین اور مقامی اور بیرونی خبروں کا تر و تازہ گلدستہ تھا۔ دورِ جدید بھی مالی مشکلات کی زد میں زیادہ دنوں تک پنپ نہ سکا۔

ہفتہ وار — بیداری — کٹک

مدیر
محمد عبدالدیان

اُڑیسہ کے مسلم طلباء کی انجمن نے ایک ہفتہ وار اخبار "بیداری" کا اجراء کیا جس کے مدیر محمد عبدالدیان اور منیجر ہمایوں قدر بیگ تھے۔ چار صفحات پر مشتمل اردو کا یہ اخبار کٹک کے لکشمی نارائن پریس سے اردو ٹائپ میں طبع ہوا کرتا تھا۔

" بیداری" کا صرف ایک ہی شمارہ بابت ۱۰ر جولائی ۱۹۴۷ء ہمایوں قدر بیگ کے توسط سے راقم الحروف کو دستیاب ہوا۔ اخبار کے ٹائٹل کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ؎

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جائیں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جائیں

" بیداری" کے پیشِ نظر شمارہ کا آغاز عبدالحلیم نقیب سونگڑوی کی ایک نظم " خطاب بہ مسلم" سے ہوتا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

آہ پامال تری سطوت شاہانہ ہے — دردانگیز اے مسلم تیرا افسانہ ہے
داستاں تیری ہوئی قصۂ پارینہ کیوں — آج کیوں دہر ترے نام سے بیگانہ ہے
بن کے آیا تھا تو اس بزم جہاں کا مشعل — بے ضیا آج مگر تیرا ہی کا شانہ ہے
تو جہانگیر جہاندار کبھی تھا لیکن — اب ترے بازو میں کیوں رعشۂ پیرانہ ہے
نہ وہ ثروت ہے تری اور نہ وہ سطوت تیری — نہ وہ پہلی سی تری شوکت شاہانہ ہے

اٹھ کے پھر رنگ دکھا اپنا جہاں کو اے نقیب
تری فطرت میں نہاں جوہر مردانہ ہے

اس شمارہ میں صاحب اشعار کا ایک مضمون " اپنوں سے چند باتیں" کے زیر عنوان شریک اشاعت ہے۔

نامساعد حالات کی بناء پر " بیداری" کی اشاعت چند ہی شماروں تک محدود رہی۔

کٹک	شاخسار	دوماہی

مدیر
امجد نجمی

اڑیسہ کی اردو صحافت کی تاریخ میں اولین معیاری ادبی جریدہ کا آغاز ۱۹۶۵ء میں امجد نجمی کے زیر ادارت دوماہی شاخسار کٹک کے اجراء سے ہوا۔ شاخسار کا اولین شمارہ ۴۸ صفحات پر مشتمل

جون جولائی ۱۹۶۵ء کا شمارہ تھا جس کی کتابت غلام رسول کٹکی نے کی تھی اور سرورق کا ڈیزائن دنود راؤت بلیغ نے تیار کیا تھا۔ اڑیسہ میں اردو کا کوئی پریس نہ ہونے کی وجہ سے رسالہ کی کتابت کٹک میں اور اس کی طباعت لیبل لیتھو پریس پٹنہ میں ہوتی۔

شاخسار کی مجلس مشاورت سید حرمت الاکرام، مظہر امام، کرامت علی کرامت اور راقم الحروف پر مشتمل تھی۔ مدت دراز سے اڑیسہ میں اردو کے ایک ادبی رسالہ کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ شہر کٹک اڑیسہ میں اردو کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور وہاں اردو کی ادبی سرگرمیاں، مشاعرے اور مذاکرے باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوا کرتے تھے۔ خصوصی طور پر جناب امجد نجمی کی ادبی سرگرمیوں اور کرامت علی کرامت کی شعری تخلیقات اور تخلیقی نگارشات نے پورے صوبہ کو اردو دنیا سے منسلک و مربوط کردیا تھا۔

شاخسار کے اولین شمارہ کی اشاعت پر ملک کے مشاہیر شعراء داد بارتے اڑیسہ ایک خوش آئند ادبی رسالہ کے اجراء کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ سے لکھا:۔

"یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ کٹک سے ایک اردو رسالہ "شاخسار" نکال رہے ہیں۔ جن ارباب قلم کے اسمائے گرامی آپ نے لکھے ہیں، ان کا تعاون اس امر کی ضمانت ہے کہ رسالہ ہر اعتبار سے مفید و مقبول ہوگا .... کسی زبان کی بڑی قابل لحاظ اور قابل قدر صفت یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص علاقہ اور خطہ سے باہر بھی بغیر کسی رد و رعایت یا جبر و اکراہ کے مفید و مقبول ہو۔ ایسی جتنی بھی زبانیں ہیں ان میں ایک اردو بھی ہے۔"(۱)

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا:۔

"یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ کی ادارت میں کٹک سے ایک دو ماہی رسالہ "شاخسار" نکلنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رسالہ اڑیسہ میں اردو کی مقبولیت بڑھائے گا اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرے گا۔"(۲)

کراچی سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:۔

"یہ جان کر واقعی خوشی ہوئی کہ آپ حضرت امجد نجمی کی ادارت میں دوماہی "شاخسار" نکال

---

(۱) اقتباس مراسلہ پروفیسر رشید احمد صدیقی؛ مطبوعہ شاخسار کٹک، جلد ا شمارہ ا، بابت جون جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۴۶
(۲) اقتباس مراسلہ پروفیسر آل احمد سرور ایضاً ایضاً ایضاً

رہے ہیں۔ خدا کرے آپ حضرات آپنے مقصد میں کامیاب رہیں .... آپ کا خط میں نے مولانا (علامہ نیاز فتح پوری) کو دکھادیا ہے۔ ان دنوں ان کے پاؤں میں تکلیف ہے۔ بحر حال کچھ لکھوانے کی کوشش کروں گا۔"[۱]

جس زمانہ میں اُڑیسہ سے شاخسار کا اجراء عمل میں آیا، ملک گیر پیمانہ پر اردو کی صورت حال کا جائزہ سید حرمت الاکرام کے خط سے لیا جاسکتا ہے:۔

" شاخسار کے اجراء کا اجازت نامہ حاصل ہوگیا۔ مبارکباد قبول کیجئے۔ کٹک جیسی سرزمین سے کسی اردو جریدہ کا اجراء بڑی حوصلہ مندی اور ایک معنی میں جرأت رندانہ کا کام ہے۔ وہ بھی اس دور ابتلاء میں جب کہ ایک طرف اردو کشی کی منظم تحریک ہی نہیں مہم چلائی جارہی ہے اور دوسری جانب خود اردو والے اردو کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ حالات کی سنگینی یہ سوچنے پر مجبور کررہی ہے کہ کل کے ہندوستان میں اردو کا وجود باقی بھی رہا تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ یوں تو اردو کا پورا لٹریچر خواہ وہ نثر ہو یا نظم بڑی تیزی کے ساتھ ہندی رسم الخط میں منتقل ہوتا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندی جرائد میں بھی اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کا خاصہ حصہ نظر آتا ہے لیکن ہر زبان اپنے رسم الخط سے ایک اٹوٹ وابستگی رکھتی ہے جو براہِ راست انسان کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات کو متاثر کرتی ہے۔ اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب ایک ثقافتی تحریک بھی ہے جس کی گہرائیوں اور توانائیوں کا انحصار اس کے رسم الخط پر ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال جس قدر غور طلب ہے اتنی ہی تشویشناک بھی ہے۔ بہرحال یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے کہ یوپی سے زیادہ ان دور افتادہ علاقوں میں جنھیں اردو مراکز نے کبھی لائق اعتنا تصور نہیں کیا اردو کی لگن نیز اس مظلوم زبان سے اپنائیت، اخلاص اور لگاؤ کی پرزور لہریں پائی جاتی ہیں۔"[۲]

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے شاخسار کے معیار واقدار پر خصوصی توجہ کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا:۔

" کٹک جیسے دور افتادہ مقام سے دوماہی "شاخسار" کے اجراء کی خبر بلاشبہہ باعث مسرت ہے۔ امجد نجمی اور حرمت الاکرام صاحبان کی نگرانی وتعاون سے اس اردو رسالہ کے مستقبل پر حوصلہ مند امیدیں رکھی جاسکتی ہیں۔ یہ بہت اچھا خیال ہے شاخسار کو ماہانہ نہ رکھا ہے۔

---

(۱) اقتباس مراسلہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ شاخسار کٹک: جلد ا شمارہ ۱: بابت جون جولائی ۱۹۶۵ء: ص ۴۶

(۲) اقتباس مراسلہ سید حرمت الاکرام 〃 〃 : ص ۴۷

میری ذاتی رائے تو سہ ماہی کی ہے تا کہ رسالہ کے معیار میں وقار بھی پیدا ہو........ اردو زبان وادب کی خدمت کے لئے اس پرشور دور میں وہ علاقے زیادہ زرخیز ہیں جو اردو کا مرکز نہیں۔ اردو کو آج جشن چراغاں کی حاجت نہیں، چراغ کی ضرورت ہے۔"(۱)

شاخسار کی سالانہ قیمت صرف تین روپے اور فی شمارہ کی قیمت پچاس پیسے تھی۔ اس کی اولین پیش کش میں ۶ افسانے، ۵ نظمیں، ۲۰ غزلیں اور دو مقالے تھے جو سید احتشام حسین، پروفیسر شاہدی، سید حرمت الاکرام، سریندر مہانتی (ترجمہ کرامت علی کرامت) ذکی انور، رضا نقوی واہی، یوسف پرویز، مخمور سعیدی، سلیمان اریب، شمس منیری، احسان دربھنگوی، محسن زیدی، عبدالمغنی، اویس احمد دوراں، تابش اکرامی، ثریا محمود ندرت، واحد پریمی، نیلوفر ناہید، علقمہ شبلی، شفقت کاظمی، حفیظ اللہ نیولپوری، ساحل مانک پوری، کرامت علی کرامت، شہزاد منظر، جرم محمد آبادی، رونق دکنی، سیمابی، جگرآروی، رونق نعیم، ضمیر خاں ضمیر اور ندیم جعفری کی نگارشات کے بہتر نمونے کہے جاسکتے ہیں۔

اداریہ

شاخسار کے شمارہ اوّل کا اداریہ "نقش اول" کے زیر عنوان امجد نجمی کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

نقش اوّل

بیا ساقی نوائے مرغزار از شاخسار آمد
بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد

اقبالؔ

شاخسار اڑیسہ سے اردو کا پہلا رسالہ نہیں ہے۔ اس کے قبل سونگڑہ سے جناب محمد عمر کے زیر ادارت ماہنامہ "المنصور"، کٹک سے جناب سید فضل الرحمٰن قاسمی کے زیر ادارت ہفتہ وار

---

(۱) اقتباس مراسلہ ڈاکٹر سید محمد حسنین؛ مطبوعہ شاخسار جلد ۱ شمارہ ۱؛ بابت جون جولائی ۱۹۶۵ء؛ ص ۴۷۔

"مسلم گزٹ" اور مولوی عبدالرشید نقاد کے زیرِ ادارت "ہفتہ وار دورِ جدید" نکل چکے ہیں۔ لیکن اڑیسہ سے باہر ان رسالوں کی رسائی غالباً کبھی نہیں ہوئی اور اڑیسہ کی سنگلاخ سرزمین میں اردو ادب کے یہ نازک پودے مرجھا کر رہ گئے۔

عرصۂ دراز سے تمنا تھی کہ اڑیسہ سے ایک ایسے اردو رسالہ کا اجراء عمل میں آتے جو اردو کی ہندستان گیر تحریک کا ساتھ دے سکے۔ لیکن ناساعدات نے آج تک ایسا ہونے نہ دیا۔ ہر چند ارباب ذوق صلاح دیتے رہے، اہلِ قلم تعاون کا وعدہ فرماتے رہے لیکن آگے بڑھ کر مینا اٹھانے والا کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ آخر چند مخلص احباب نے ہمت عالی سے کام لے کر اس کشتی کو تلاطم خیز سمندر میں ڈال ہی دیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ اردو کا عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ اب یہ دو ماہی ادبی جریدہ "شاخسار" خدا خدا کر کے معرضِ وجود میں آگیا جس کا پہلا شمارہ شائع ہو کر آپ کے ہاتھ کی زینت بنا ہے۔ اس دورِ ابتلاء میں کسی تازہ پرچے یا رسالہ کا نکالنا گویا ہفتخواں طے کرنے کے برابر ہے۔ لیکن اڑیسہ میں اردو کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے یہ اقدام ضروری تھا۔ اب اس رسالہ کی حیات و بقاء کا مسئلہ ملک کے ارباب ذوق پر عموماً اور اڑیسہ کے اردو داں طبقے پر خصوصاً ایک فریضے کی طرح عائد ہوتا ہے۔ اردو بولنے والوں کی معقول تعداد قریب قریب ہر ریاست میں موجود ہے۔ اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اڑیسہ میں اس زبان کے بولنے سمجھنے اور پڑھنے والے دو لاکھ بارہ ہزار آٹھ سو اکانوے کی تعداد میں موجود ہیں۔ ہم ان کی زبان نوازی اور اردو دوستی سے متوقع ہیں کہ وہ اس رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ ضرور بٹائیں گے۔

ع ؎ ہمتیں اپنی جواں ہیں تو جواں ہے اردو

شاخسار کے اس نقشِ اوّل کو تابدار بنانے میں ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ امید قوی ہے کہ اس شمارہ میں شائع ہونے والی تقریباً تمام تخلیقات قارئین کرام کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑ جائیں گی۔"(۱)

اداریہ کا دوسرا حصہ زبان کے مسئلہ پر اہم نکات کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"........ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اردو ہندوستان میں سب سے زیادہ مظلوم

---

(۱) نقشِ اوّل (اداریہ)، دو ماہی شاخسار کٹک : جلد ۱ شمارہ ۱ : جون جولائی ۱۹۶۶ء : ص ۲

زبان ہے۔ اس کو اب تک کوئی علاقہ الاٹ نہیں ہوا ہے ۔ بلکہ اتر پردیش، پنجاب اور بہار میں بھی اس کو دستوری حقوق سے محروم رکھا گیا ہے ۔ اور یہ بات ایسی نہیں جس سے دیگر غیر ہندی والے چشم پوشی اختیار کر سکتے ہیں۔ ہر شخص کو اس کا اپنا کلچر عزیز ہوتا ہے اور وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کسی دوسرے کا کلچر اس پر حاوی ہو جائے۔ خصوصاً ایک جمہوری ملک میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا ہماری رائے میں ہندی کے لئے بہبودی اسی میں ہے کہ ہندستان کی تمام بڑی علاقائی زبانوں کو ہندی کے دوش بدوش یکساں طور پر ترقی کرنے کا موقع عطا کیا جائے اور اسکولوں، کالجوں نیز سرکاری دفتروں میں ہندی کے ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی اختیاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ .... اس سلسلہ میں ہم اردو والوں سے درخواست کریں گے کہ چاہے ہندی والے اردو کے ساتھ سوتیلی بہن جیسا برتاؤ کرتے رہیں لیکن اردو والے ہندی کو حقیقی بہن تصور کرکے اس کو ضرور سینے سے لگائیں۔ کسی نئی زبان کا سیکھنا (خصوصاً جبکہ اپنی مادری زبان سے اس کا گہرا تعلق ہو) کسی طرح عیب نہیں ہو سکتا بلکہ اسے بہت بڑی خوبی کہا جائے گا۔ اور اگر ہندی والے اردو نہیں پڑھتے تو وہ لوگ خود کو یقیناً ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رکھتے ہیں۔" (۱)

اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاخسار کے مدیر امجد نجمی بنیادی طور پر شاعر و ادیب تھے۔ انھیں اردو صحافت کا کوئی سابقہ تجربہ تو نہ تھا لیکن صحافت سے دلچسپی ضرور تھی۔ دوسری طرف کرامت علی کرامت جو شاخسار کے روح رواں تھے انھیں بھی صحافت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ تجربہ کے اس فقدان کے باوجود شاخسار کا پہلا شمارہ جب ملک کے دور دراز گوشوں تک قارئین کے ہاتھ پہنچا تو اس کی ادبی اہمیت کے لوگ قائل ہو گئے۔

شاخسار کے پہلے شمارہ کا آغاز اڑیا کے معروف ترین کہانی کار سُریندر مہانتی کی کہانی "نیلی ایکسپریس" سے ہوا جس کا کرامت علی کرامت نے اردو ترجمہ پیش کیا تھا۔ اس طرح شاخسار کے توسط سے اردو قارئین کو معاصر اڑیا ادب کی تحریکوں، رجحانات اور تخلیقات سے روشناس کرانے کی شروعات ہوئی اور اس طرح کے ترجموں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس شمارہ میں عبدالمغنی کا ایک مبسوط مقالہ "جدید اردو تنقید کی نظریاتی بنیادیں" شائع ہوا جس میں انیسویں صدی کے

---

(۲) نقش اوّل (اداریہ)، دو ماہی شاخسار کٹک: جلد ۱ شمارہ ۱: جون جولائی ۱۹۶۵ء: ص ۳۔

اواخراور بیسویں صدی کے اوائل میں تحریر شدہ مقالات اور کتابوں کی اساسی حیثیت پر انھوں نے کھل کر گفتگو کی تھی اور اس قدیم تنقید کی عملداری کو میرؔ کے "نکات الشعراء" سے حالی کے "مقدمۂ شعر وشاعری" اور شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" تک پہنچایا تھا۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی تھی کہ جہاں تذکروں میں صرف ہیئت پر تبصرے ہوتے ہیں تو مقالوں اور کتابوں میں مواد پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ حالانکہ ان تذکروں اور مقالات اور کتابوں میں ادب کا کوئی معین اور واضح شعوری نقطۂ نظر نہیں بلکہ ادب کا غیر شعوری تصور اور روایتی انداز نظر ضرور مل جاتا ہے۔

شاخسار کے اس اولین شمارہ میں شہزاد منظر کا مضمون " منٹو، خطوط کے آئینے میں " خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ احمد ندیم قاسمی کے نام مرقومہ منٹو کے متعدد خطوط کی روشنی میں شہزاد منظر نے منٹو کی داخلی شخصیت کا جائزہ لیا تھا اور منٹو کے فن کی عظمت تک پہنچنے کی کوشش کی تھی اور منٹو کے مالی پریشانیوں کی واضح جھلکیاں بھی پیش کی تھیں۔ منٹو بلا معاوضہ لکھنے کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ ان کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"مجھ سے پوچھو تو یہ (افسانہ نگاری) بالکل بکواس ہے جس کے عوض صرف شکریہ ملے۔ میرا ڈاکٹر جو مجھے ہر روز دوا بھیجتا ہے، شکریہ کے علاوہ روپیہ بھی مانگتا ہے۔ کل اس نے ایک روپیہ واپس بھیج دیا تھا، اس لئے کہ اس میں کھنکھناہٹ کم تھی۔ خیال تھا کہ کل افسانہ شروع کروں گا مگر اس کم کھنکھناہٹ والے روپیہ کو ہتھیلی پر رکھا تو میری سب کھنکھناہٹ غائب ہوگئی۔"[1] (جون ۱۹۳۹ء)

شاخسار سے قبل اُڑیسہ کی اردو صحافت کی تاریخ میں جو بھی اخبار یا جرائد شائع ہوئے، ان کی اشاعت صرف اڑیسہ تک ہی محدود رہی۔ اس طرح سے بنیادی طور پر اُڑیسہ میں اردو کی بنیادیں مضبوط تو ضرور ہوئیں لیکن جہاں تک ادبی اور سماجی نظریات کا تعلق تھا ان میں وسعت اور فکر کی گہرائی پیدا نہ ہوسکی۔ شاخسار کی اشاعت اردو صحافت کی تاریخ میں بالعموم اور اُڑیسہ کی ادبی تحریکوں کے لئے بالخصوص مشعل راہ ثابت ہوئی۔ سب سے اہم چیز شاخسار کا آفاقی

---

(۱) شہزاد منظر، منٹو خطوط کے آئینے میں (منٹو کے خط بابت ۱۹۳۹ء کا اقتباس) مطبوعہ دوماہی شاخسار کٹک جلد ۱ شمارہ ۱، بابت جون جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۴۴

نظریۂ ادب اور بین الاقوامی سطح پر ادبی تحریکوں کا مطالعہ تھی۔ اگر شاخسار کو صرف اڑیسہ کے ہی اصحاب قلم کے لئے مختص کر دیا جاتا تو ملک گیر پیمانہ پر ادبی تحریکوں سے اُڑیسہ کے شعراء وادباء مستفید نہ ہو پاتے۔ شاخسار میں جو بھی تخلیقات شریک اشاعت ہوئیں ان میں ادبی معیار واقدار پیش نظر رہی ہیں۔ اولین شمارہ میں ۳۳ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شریک اشاعت ہوئیں جن میں سے صرف پانچ کا تعلق اڑیسہ کی سرزمین سے تھا اور جو مدت دراز سے فکر وفن کی شمعیں روشن کئے ہوئے تھے۔ امجد نجمی کے اداریہ کے علاوہ سریندر مہانتی کا "ین پورا ایکسپریس" یوسف پرویز کے افسانے "مجبور اور بے بس" اور "شکست" راقم الحروف کا افسانہ "گیلا چاند" کرامت علی کرامت کی نظم "پہاڑوں کا سلسلہ" اور ضمیر خاں ضمیر کی غزل کے اشعار اردو دنیا کے سامنے اڑیسہ میں اردو تحریک کی تہہ داریوں کا بیّن ثبوت تھے۔

شاخسار کا شمارہ نمبر ۲ اور ۳ ایک مشترکہ شمارہ کی شکل میں ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ شاخسار میں اشاعت کے لئے معیاری تخلیقات کا سختی کے ساتھ انتخاب کیا جاتا تھا اور چند شماروں کے اجراء کے بعد شاخسار نے ہندوستان اور پاکستان کی اردو صحافت میں اپنی شناخت قائم کر لی۔ اس کا تقریباً ہر شمارہ اپنی مشتملات کی بناء پر خاص اہمیت کا حامل ہوا کرتا تھا۔

۱۹۶۲ء میں دوسری جلد کے چھٹے شمارے میں رونق دکنی سیمابی پر کرامت علی کرامت کا مقالہ تفصیل کے ساتھ رونق کے فکر وفن پر روشنی ڈالتا ہے۔ رونق، جوش، فیض اور جمیل مظہری کے ہم عصر ہیں۔ ان کا ذہن وشعور بھی انہیں سیاسی، سماجی اور ادبی نشیب وفراز سے دوچار ہوا ہے جن سے جوش، فیض یا جمیل کا ذہن وشعور متاثر ہوا تھا۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں رونق دکنی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلاسیکی رچاؤ اور رومانی آہنگ کا امتزاج ہے۔

رشید کوثر کی غزلیہ شاعری پر سید حرمت الاکرام کا معتبر اور مستند مقالہ اعلیٰ ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ نشاط احمد صدیقی کا جوش ملیح آبادی سے لیا ہوا ایک مختصر مگر اہم انٹرویو بھی شاخسار کے اسی شمارہ کی زینت ہے جس میں جوش کی شاعری پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

۱۹۶۳ء میں کرامت علی کرامت نے اُڑیسہ کے اردو شاعروں کا انتخاب کلام ان کی سوانحی نوٹ کے ساتھ "آب خضر" کے نام سے شائع کیا جو فنی اعتبار سے تذکرہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر اُڑیسہ کے شاعروں کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ ضرور پیش کرتا ہے۔ "آب خضر" کی طباعت

کے بعد متعدد شاعرات سے اردو قارئین متعارف ہوئے۔ شاخسار میں سیدہ مصلحت ایزدی کے کلام کی اشاعت اردو صحافت کے توسط سے اڑیسہ کی شاعرات کو اردو قارئین سے روشناس کرانے کی اولین کوشش تھی۔

شاخسار کے اس شمارہ میں کل ۲۴ اصحاب قلم کی تخلیقات شریک اشاعت تھیں جن میں سے صرف چھ کا تعلق سرزمین اڑیسہ سے تھا۔ مثلاً:۔

(۱) کرامت علی کرامت: "رونق دکنی سیمابی"۔ (۲) حفیظ اللہ نیولپوری: "قدیم اڑیسہ کا تمدن"۔

(۳) خالد شفائی: "صنم و حرم"۔ (۴) خالد رحیم: "غزل"۔

(۵) ضمیر خاں ضمیر: "غزل"۔ (۶) سیدہ مصلحت ایزدی: "غزل"۔

۱۹۶۷ء یعنی اپنی تین سال کے عرصۂ حیات میں شاخسار نے اپنی بھرپور مشتملات اور کرامت علی کرامت کے ادبی نظریوں کی توسیع و اشاعت کی بنا پر ملک اور بیرون ملک کے اردو قارئین میں خاصی مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ وہ دور تھا جب اردو ادب جدیدیت کے شدید بحران میں مبتلا تھا۔ الہ آباد سے شمس الرحمٰن فاروقی کا "شب خون" شائع ہو رہا تھا اور نئی پیڑھی کے سر پر جدیدیت کے ساتھ ساتھ شب خون کا سودا تھا۔ کرامت علی کرامت نے اس بحرانی دور میں شاخسار کا اداریہ سنبھالا اور حضرت امجد نجمی کے "نقش اول" کے بجائے "میرا صفحہ" کے عنوان سے کرامت علی کرامت نے شاخسار کے اداریوں میں اپنے ادبی نظریات کا اظہار کیا اور غیر صحت مند جدیدیت کی شدت کے ساتھ مخالفت شروع کی۔ اب شاخسار اڑیسہ کی ہی اردو صحافت میں میں نہیں بلکہ ہند و پاک کی اردو صحافت میں ایک مخصوص ادبی نظریہ کا علمبردار تھا۔

۱۹۶۷ء کے پانچویں شمارہ میں کرامت نے لکھا:۔

"...........افسوس ہے کہ اردو کے نئے شاعروں میں خود اعتمادی کا جذبہ بالکل معدوم ہے۔ اس لحاظ سے بھی اردو کے نئے شاعروں کی کم مائیگی اور تہی دامنی ہمارے سامنے آتی ہے اور ان کی جدید ذہنیت کو زیادہ سے زیادہ آج سے نصف صدی پہلے کی انگریزی شاعری کے رجحان کو پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ نئے شعرا اپنی شاعری کو منوانے کے لئے جگہ جگہ سیمنار منعقد کر رہے ہیں اور تحریک چلا رہے ہیں کہ ان کا کلام یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل ہو، تاکہ طلبا ءکا ذہن نئی شاعری کو قبول کرنے کے قابل بن جائے۔ جہاں تک شاعری کے

مسئلہ ابلاغ کا تعلق ہے، وہ سیمینار منعقد کرنے یا نئی شاعری کو یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل کرنے سے حل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس ابلاغ کا بنیادی تعلق قارئین کی موجودہ زندگی سے ہے اور جب تک نئی شاعری ان کی زندگی سے قریب نہیں ہوگی تب تک ابلاغ کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی شاعری اس وقت تک یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل ہونے کے قابل نہ ہوگی جب تک اس پر اچھا خاصہ تنقیدی سرمایہ فراہم نہ ہو جائے۔ جس کا میرے خیال میں دس حصے کا ایک حصہ بھی نہیں ہو سکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کچھ وقت چاہئے۔ علاوہ ازیں جدید تنقید کی اساس بھی علوم جدیدہ پر مبنی ہونی چاہئے۔ جس کے بغیر جدید شاعری کی قدر و قیمت صحیح طور پر متعین نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا اس وقت نئی شاعری کو یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل کرنے کا مطالبہ قبل از وقت نہیں تو اور کیا ہے؟" (۱)

اداریہ کے اختتام پر ایک اہم تعزیتی خبر سیاہ سوگوار حد بندیوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تھی جس کی اردو صحافت میں تاریخی اہمیت ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

نذرانۂ عقیدت

شری دیونرائن پانڈے نے کان پور میں ۲۷ اگست ۱۹۶۷ء کو اردو کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ۲۷ گھنٹوں کی بھوک ہڑتال کے بعد انتقال فرمایا۔ ادارۂ "شاخسار" شری دیونرائن پانڈے (مرحوم) کی خدمت میں ان کی اس عظیم قربانی کی وجہ سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔ (۲)

شاخسار کا زیرِ نظر شمارہ اپنی اہم مشتملات کے پیشِ نظر نئی راہوں پر گامزن نظر آتا ہے۔ اس شمارہ میں عبدالمغنی کا مقالہ "ادب میں روایت اور بغاوت"۔ سیتا کانت مہاپاتر کا مقالہ

---

(۱) میرا صفحہ (اداریہ)، کرامت علی کرامت، شاخسار کٹک: شمارہ ۵ ۱۹۶۷ء، ص ۳

(۲) نذرانۂ عقیدت: ادارہ شاخسار، ایضاً ایضاً

"کچھ شاعری کی زبان کے بارے میں" (ترجمہ: اطہر عزیز)۔ کرامت علی کرامت کا مقالہ "اردو اور اڑیا کے باہمی تعلقات اور ان کے مسائل"۔ اندرجیت دتّ کا انشائیہ "انصاف"۔ کامل صدیقی لکھنوی کا فکاحیہ "میں چچا بنا"۔ سرتاج بانو شبنم کی کہانی "پھولوں کی سیج"۔ عبدالحنّان کا افسانہ "تصادم"۔ علاء الدین حیدر وارثی کا افسانہ "شام اور سویرا" اور رحمٰن حمیدی کا افسانہ "کشتیٔ دل کے لئے کوئی کنارہ بھی نہیں" کے علاوہ نسیم مظفر پوری کی نظم "وقت کتنا ظالم ہے"۔ ندا فاضلی کی "شام"۔ مظفر حنفی کی "فائلوں کا جادوگر" اور "پاگل، چاند اور چور"۔ خالد شفائی کی "کسی کے نام"۔ آسکر وائلڈ کی "یادوں کے رنگ" (ترجمہ: سہیل اختر) اور سید محسن نقوی، شفقت کاظمی، مہدی پرتاپ گڑھی، اخلاق فتح پوری، آزاد گلاٹی، حفظ الباری حافظ، سید شکیل دسنوی، ناز قادری، جی۔ ایم۔ راہی اور شاہد ماہلی کی غزلیں شریک اشاعت تھیں۔

"شاخسار" کے ہر شمارہ میں نئی کتابوں پر تبصرے بھی پیش کئے جاتے تھے۔ شاخسار کے ابتدائی دور میں چند کتابوں پر راقم الحروف کے تبصرے آئے۔ بعد میں تبصروں کی ذمہ داری کرامت علی کرامت کے سپرد ہوئی۔ ہر شمارہ میں اداریہ عام طور پر ادبی مسائل اور جدید شاعری کے رجحانات پر آتا رہا۔ اس طرح شاخسار نے ادب میں صالح جدیدیت کو فروغ دینے میں [illegible] ادا کیا اور یہی خصوصیات اس کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ شاخسار ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگا اور دن بہ دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

عام طور پر جو دشواریاں اردو کے ادبی جرائد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان سے کہیں زیادہ شاخسار کی باقاعدہ اشاعت میں درپیش آتی رہیں۔ کٹک سے کرامت علی کرامت کا تبادلہ ریاضی کے ریڈر کی حیثیت سے سندر گڑھ کالج میں ہوگیا۔ اس طرح شاخسار کی ترتیب و تدوین سندر گڑھ میں، طباعت پٹنہ کے لیبل لیتھو پریس میں اور اس کی اشاعت کٹک میں ہوتی رہی۔ ترتیب و عمل کے اس تکون کی وجہ سے خاصا وقت اور اخراجات کا بار بھی نسبتاً بڑھ گیا۔

شاخسار نے اپنی تاریخ اشاعت میں کبھی بھی اشتہارات کو ذریعۂ آمدنی نہیں بنایا۔ آخری صفحہ پر کٹک کے "اکبری گوڑا کھو" (منجن) کا اشتہار ہوا کرتا تھا اور اندرونی صفحات میں اردو کی نئی کتابوں کے چند اشتہارات جو محض معاصرانہ ادبی اور اخلاقی نظریہ سے شائع کئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ شاخسار کے خریداروں کی تعداد اور اس کے سرکولیشن میں اضافہ ہوا۔ اس سلسلہ میں اطہر عزیز نے کافی محنت کی اور اپنی صلاحیتوں اور لگن کی بنا پر شاخسار کا دائرۂ اشاعت وسیع سے

وسیع ترکیا۔ لیکن ان تمام مالی وسائل کے باوجود شاخسار ہمیشہ خسارہ کا سودا رہا۔

کرامت علی کرامت کے والد مرحوم مولوی رحمت علی رحمت کے پس اندوختہ زر کثیر سے جو سود کی رقم بینک سے وصول ہوتی تھی شاخسار پر خرچ ہوتی تھی۔ اسی رقم سے شاخسار کا اجراء ہوا اور شاخسار اپنی منزلیں طے کرتا رہا۔ شاخسار کے خریداروں سے جو رقم حاصل ہوتی تھی وہ تو ڈاک کے اخراجات کے لئے بھی ناکافی تھی۔ اس طرح مولوی رحمت علی رحمت مرحوم کی پس ماندہ رقوم کے توسط سے ہی شاخسار ۹ سال تک شائع ہوتا رہا۔ ۹ سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہ تھا۔

پٹنہ کے لیبل لیتھو پریس سے طبع ہو کر شاخسار کی کاپیاں کٹک پہنچتی تھیں اور تب خریداروں اور دیگر حضرات کے نام ترسیل ہوتی تھیں۔ اس طرح کافی وقت لگ جاتا تھا۔

ان تمام قباحتوں کے پیش نظر پٹنہ میں احمد حسین آزاد نے (جو ان دنوں عربی وفارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں طالب علم تھے) شاخسار سے خاصی دلچسپی لی۔ شاخسار کے پروف دیکھنے سے لے کر اس کے ڈسپیچ تک کی ذمہ داری لے لی۔ اس طرح شاخسار پٹنہ میں طبع ہو کر وہیں سے سپرد ڈاک کیا جانے لگا۔

۱۹۷۱ء تک شاخسار کے تمام شمارے اعلیٰ ادبی ذوق اور نکھری ہوئی صحافت کا بین ثبوت تھے۔ شاخسار کی ۷ ویں جلد کے شمارہ ۳۳ میں اردو کے چار منفرد و مقبول شاعر، ادیب، دانشور و صحافی کی وفات پر تعزیتی گوشہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

وہ بزم یار کہاں ہے وہ دور جام کہاں
وہ رند ہی نہیں جب لطف مے کشی کیا ہے

گذشتہ چند سالوں میں اردو کے بہت سے درخشندہ ستارے غروب ہو گئے۔ ان سب کی جدائی کا غم ہمارے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا کہ سلیمان اریب، آغا خلش کاشمیری، روشن صدیقی اور وکیل اختر کے سانحۂ ارتحال سے ہمارے دل کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔

(۱) اردو کے ممتاز شاعر اور ماہنامہ "صبا" (حیدرآباد) کے اڈیٹر سلیمان اریب کا ۷ ردسمبر ۱۹۷۰ء کو حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں جتنے بھی نئے شعراء ابھرے تقریباً سبھوں کی ذہنی تربیت میں "اریب" اور

"صبا" کا اہم حصہ رہا ہے۔

(۲) ہفتہ وار اخبار "مصور" بمبئی کے ایڈیٹر اور سعادت حسن منٹو کے پرانے ساتھی آغا خلش کاشمیری کا بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ موصوف زبان دانی کے لئے مشہور تھے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

(۳) روشن صدیقی جو تقریباً چالیس سال سے ہمارے مشاعروں، ادبی رسالوں اور ادبی نشستوں کا ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے، شاہجہاں پور کے مشاعرہ میں شرکت کے دوران ۲۴ر جنوری ۱۹۷۱ء کو حرکت قلب کے اچانک بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال فرماگئے۔

(۴) کلکتہ کے ہونہار اور نوجوان شاعر وکیل اختر بھی اب ہم میں نہیں رہے۔ ۹ر فروری ۱۹۷۱ء ۱۲ بجکر ۴۵ منٹ کے وقت ان کا انتقال اسلامیہ اسپتال کلکتہ میں ہوگیا۔ ان کی عمر صرف ۳۵ سال تھی۔ جب ان کی شاعری اختر شیرانی کے خالص رومانی انداز سے باہر نکل کر دورِ جدید کے اجتماعی کرب کو ذات کے کرب میں جذب کرلینے کے قابل ہوئی تو وہ ہم سے الگ ہوگئے۔ خدا مرحومین کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ع:۔ آسماں ان کے لحد پر شبنم افشانی کرے۔

شاخسار کے ہر شمارہ میں مشاہیر اصحاب قلم کی تخلیقات و نگارشات میں جہاں مقالات ومضامین، نظم وغزل، ڈرامے وافسانے اور تنقیدی مباحث قارئین کی توجہ کا مرکز بنتے تھے وہاں اپنے منفرد انداز پیش کش کی بنا پر "بزم شاخسار" بھی قابل اعتناء توجہ کی مستحق قرار دی جاتی تھی۔ شاخسار میں مطبوعہ تخلیقات اور اردو کے مسائل پر لکھے گئے اداریوں سے متعلق قارئین اور اصحاب قلم اپنی مرقومہ رائے بھیج دیتے۔ یہ تمام خطوط بزم شاخسار میں شریک اشاعت کئے جاتے لیکن اردو کے ادبی جرائد سے متعلقہ قارئین کی آراء کے عام گوشوں کی روایت کے خلاف بزم شاخسار میں ایک نئی اُپج سامنے آئی، وہ یہ کہ تمام بحث طلب یا جواب طلب خطوط کے جواب بھی متعلقہ خط کے اختتام پر ہی شائع ہوتے تھے۔ اس طرح قارئین شاخسار کے درمیان کسی دیر یا غلط فہمی کا امکان کم سے کم تر ہوجاتا۔ یہ طریقۂ گفتگو بزم شاخسار کے توسط سے اردو

مسئلہ ابلاغ کا تعلق ہے، وہ سیمنار منعقد کرنے یا نئی شاعری کو یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل کرنے سے حل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس ابلاغ کا بنیادی تعلق قارئین کی موجودہ زندگی سے ہے اور جب تک نئی شاعری ان کی زندگی سے قریب نہیں ہوگی تب تک ابلاغ کا مسئلہ حل نہیں ہوسکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی شاعری اس وقت تک یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل ہونے کے قابل نہ ہوگی جب تک اس پر اچھا خاصہ تنقیدی سرمایہ فراہم نہ ہوجائے۔ جس کا میرے خیال میں دس حصے کا ایک حصہ بھی نہیں ہوسکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کچھ وقت چاہئے۔ علاوہ ازیں جدید تنقید کی اساس بھی علوم جدیدہ پر مبنی ہونی چاہئے۔ جس کے بغیر جدید شاعری کی قدروقیمت صحیح طور پر متعین نہیں ہوسکے گی۔ لہٰذا اس وقت نئی شاعری کو یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل کرنے کا مطالبہ قبل از وقت نہیں تو اور کیا ہے؟" (۱)

اداریہ کے اختتام پر ایک اہم تعزیتی خبر سیاہ سوگوار حد بندیوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تھی جس کی اردو صحافت میں تاریخی اہمیت ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

> ## نذرانۂ عقیدت
>
> شری دیونرائن پانڈے نے کان پور میں ۷ ہر اگست ۱۹۶۷ء کو اردو کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ۲۷ گھنٹوں کی بھوک ہڑتال کے بعد انتقال فرمایا۔ ادارۂ "شاخسار" شری دیونرائن پانڈے (مرحوم) کی خدمت میں ان کی اس عظیم قربانی کی وجہ سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔ (۲)

شاخسار کا زیرِ نظر شمارہ اپنی اہم مشمولات کے پیشِ نظر نئی راہوں پر گامزن نظر آتا ہے۔ اس شمارہ میں عبدالمغنی کا مقالہ "ادب میں روایت اور بغاوت"۔ سیتا کانت مہاپاتر کا مقالہ

---

(۱) میرا صفحہ (اداریہ)، کرامت علی کرامت، شاخسار کٹک، شمارہ ۵ ۱۹۶۷ء، ص ۳

(۲) نذرانۂ عقیدت، ادارہ شاخسار، ایضاً ایضاً

"کچھ شاعری کی زبان کے بارے میں" (ترجمہ: اطہر عزیز)۔ کرامت علی کرامت کا مقالہ "اردو اوراڑیا کے باہمی تعلقات اوران کے مسائل"۔ اندرجیت دتّ کا انشائیہ "انصاف"۔ کامل صدیقی لکھنوی کا فکاحیہ "میں چچا بنا"۔ سرتاج بانو شبنم کی کہانی "پھولوں کی سیج"۔ عبدالحنّان کا افسانہ "تصادم"۔ علاءالدین حیدر وارثی کا افسانہ "شام اور سویرا" اور رحمٰن حمیدی کا افسانہ "کشتیٔ دل کے لئے کوئی کنارہ بھی نہیں" کے علاوہ نسیم مظفر پوری کی نظم "وقت کتنا ظالم ہے"۔ ندا فاضلی کی "شام"۔ مظفر حنفی کی "قاتلوں کا جادوگر" اور "پاگل، چاند اور چور"۔ خالد شفائی کی "کسی کے نام"۔ آسکر وائلڈ کی "یادوں کے رنگ" (ترجمہ: سہیل اختر) اور سید محسن نقوی، شفقت کاظمی، مہدی پرتاپ گڑھی، اخلاق فتح پوری، آزاد گلاٹی، حفظ الباری حافظ، سید شکیل دسنوی، ناز قادری، جی۔ ایم۔ راہی اور شاہد ماہلی کی غزلیں شریک اشاعت تھیں۔

"شاخسار" کے ہر شمارہ میں نئی کتابوں پر تبصرے بھی پیش کئے جاتے تھے۔ شاخسار کے ابتدائی دور میں چند کتابوں پر راقم الحروف کے تبصرے آئے۔ بعد میں تبصروں کی ذمہ داری کرامت علی کرامت کے سپرد ہوئی۔ ہر شمارہ میں اداریہ عام طور پر ادبی مسائل اور جدید شاعری کے رجحانات پر آتا رہا۔ اس طرح شاخسار نے ادب میں صالح جدیدیت کو فروغ دینے میں خاصہ اہم رول ادا کیا اور یہی خصوصیات اس کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ شاخسار ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگا اور دن بہ دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

عام طور پر جو دشواریاں اردو کے ادبی جرائد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان سے کہیں زیادہ شاخسار کی باقاعدہ اشاعت میں درپیش آتی رہیں۔ کٹک سے کرامت علی کرامت کا تبادلہ ریاضی کے ریڈر کی حیثیت سے سندر گڑھ کالج میں ہوگیا۔ اس طرح شاخسار کی ترتیب و تدوین سندر گڑھ میں، طباعت پٹنہ کے لیبل لیتھو پریس میں اور اس کی اشاعت کٹک میں ہوتی رہی۔ ترتیب و عمل کے اس تکون کی وجہ سے خاصا وقت اور اخراجات کا بار بھی نسبتاً بڑھ گیا۔

شاخسار نے اپنی تاریخ اشاعت میں کبھی بھی اشتہارات کو ذریعۂ آمدنی نہیں بنایا۔ آخری صفحہ پر کٹک کے "اکبری گوڑا کھو" (منجن) کا اشتہار ہوا کرتا تھا اور اندرونی صفحات میں اردو کی نئی کتابوں کے چند اشتہارات جو محض معاصرانہ ادبی اور اخلاقی نظریہ سے شائع کئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ شاخسار کے خریداروں کی تعداد اور اس کے سرکولیشن میں اضافہ ہوا۔ اس سلسلہ میں اطہر عزیز نے کافی محنت کی اور اپنی صلاحیتوں اور لگن کی بنا پر شاخسار کا دائرۂ اشاعت وسیع سے

وسیع تر کیا۔ لیکن ان تمام مالی وسائل کے باوجود شاخسار ہمیشہ خسارہ کا سودا رہا۔

کرامت علی کرامت کے والد مرحوم مولوی رحمت علی رحمت کے پس اندوختہ زر کثیر سے جو سود کی رقم بینک سے وصول ہوتی تھی شاخسار پر خرچ ہوتی تھی۔ اسی رقم سے شاخسار کا اجراء ہوا اور شاخسار اپنی منزلیں طے کرتا رہا۔ شاخسار کے خریداروں سے جو رقم حاصل ہوتی تھی وہ تو ڈاک کے اخراجات کے لئے بھی ناکافی تھی۔ اس طرح مولوی رحمت علی رحمت مرحوم کی پس ماندہ رقوم کے توسط سے ہی شاخسار ۹ سال تک شائع ہوتا رہا۔ ۹ سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہ تھا۔

پٹنہ کے لیبل لیتھو پریس سے طبع ہوکر شاخسار کی کاپیاں کٹک پہنچتی تھیں اور تب خریداروں اور دیگر حضرات کے نام ترسیل ہوتی تھیں۔ اس طرح کافی وقت لگ جاتا تھا۔

ان تمام قباحتوں کے پیش نظر پٹنہ میں احمد حسین آزاد نے (جو ان دنوں عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں طالب علم تھے ،) شاخسار سے خاصی دلچسپی لی۔ شاخسار کے پروف دیکھنے سے لے کر اس کے ڈِسپیچ تک کی ذمہ داری لے لی۔ اس طرح شاخسار پٹنہ میں طبع ہوکر وہیں سے سپرد ڈاک کیا جانے لگا۔

۱۹۷۱ء تک شاخسار کے تمام شمارے اعلیٰ ادبی ذوق اور نکھری ہوئی صحافت کا بیّن ثبوت تھے۔ شاخسار کی ۷ ویں جلد کے شمارہ ۳۳ میں اردو کے چار منفرد و مقبول شاعر، ادیب، دانشور و صحافی کی وفات پر تعزیتی گوشہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

وہ بزم یار کہاں ہے وہ دور جام کہاں
وہ رند ہی نہیں جب لطف مے کشی کیا ہے

گذشتہ چند سالوں میں اردو کے بہت سے درخشندہ ستارے غروب ہو گئے۔ ان سب کی جدائی کا غم ہمارے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا کہ سلیمان اریب، آغا غلش کاشمیری، روشن صدیقی اور وکیل اختر کے سانحۂ ارتحال سے ہمارے دل کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔

(۱) اردو کے ممتاز شاعر اور ماہنامہ "صبا" (حیدرآباد) کے اڈیٹر سلیمان اریب کا ۷، ردسمبر ۱۹۷۰ء کو حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں جتنے بھی نئے شعراء ابھرے تقریباً سبھوں کی ذہنی تربیت میں "اریب" اور

"صبا" کا اہم حصہ رہا ہے۔

(۲) ہفتہ وار اخبار "مصور" بمبئی کے ایڈیٹر اور سعادت حسن منٹو کے پُرانے ساتھی آغا خلش کاشمیری کا بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ موصوف زبان دانی کے لئے مشہور تھے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

(۳) روشن صدیقی جو تقریباً چالیس سال سے ہمارے مشاعروں، ادبی رسالوں اور ادبی نشستوں کا ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے، شاہجہاں پور کے مشاعرہ میں شرکت کے دوران ۲۲ر جنوری ۱۹۷۱ء کو حرکت قلب کے اچانک بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال فرما گئے۔

(۴) کلکتہ کے ہونہار اور نوجوان شاعر وکیل اختر بھی اب ہم میں نہیں رہے۔ ۹ر فروری ۱۹۷۱ء ۱۲ بجکر ۵۴ منٹ کے وقت ان کا انتقال اسلامیہ اسپتال کلکتہ میں ہوگیا۔ ان کی عمر صرف ۳۵ سال تھی۔ جب ان کی شاعری اختر شیرانی کے خالص رومانی انداز سے باہر نکل کر دورِ جدید کے اجتماعی کرب کو ذات کے کرب میں جذب کر لینے کے قابل ہوئی تو وہ ہم سے الگ ہوگئے۔ خدا مرحومین کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ع: آسماں ان کے لحد پر شبنم افشانی کرے۔

شاخسار کے ہر شمارہ میں مشاہیر اصحاب قلم کی تخلیقات و نگارشات میں جہاں مقالات ومضامین، نظم وغزل، ڈرامے وافسانے اور تنقیدی مباحث قارئین کی توجہ کا مرکز بنتے تھے وہاں اپنے منفرد انداز پیش کش کی بنا پر "بزم شاخسار" بھی قابل اعتناء توجہ کی مستحق قرار دی جاتی تھی۔ شاخسار میں مطبوعہ تخلیقات اور اردو کے مسائل پر لکھے گئے اداریوں سے متعلق قارئین اور اصحاب قلم اپنی مرقومہ رائے بھیج دیتے۔ یہ تمام خطوط بزم شاخسار میں شریک اشاعت کئے جاتے لیکن اردو کے ادبی جرائد سے متعلقہ قارئین کی آراء کے عام گوشوں کی روایت کے خلاف بزم شاخسار میں ایک نئی اُپج سامنے آئی، وہ یہ کہ تمام بحث طلب یا جواب طلب خطوط کے جواب بھی متعلقہ خط کے اختتام پر ہی شائع ہوتے تھے۔ اس طرح قارئین شاخسار کے درمیان کسی دیر یا غلط فہمی کا امکان کم سے کم تر ہو جاتا۔ یہ طریقۂ گفتگو بزم شاخسار کے توسط سے اردو

صحافت میں بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

بزم شاخسار میں اشاعت کے لئے ہر ماہ متعدد خطوط آیا کرتے تھے اور ہر اہم خط کی بزم شاخسار میں اشاعت ضرور ہوتی تھی۔ اگر شاخسار کے مشتملات سے قطع نظر صرف بزم شاخسار میں مشتمل اکابرین ادب کے خطوط کا جائزہ لیں تو اس عہد میں اردو کی تحریک اور عام رویّوں کی مکمل داستان مرتب کی جا سکتی ہے۔

شاخسار کے عرصۂ اشاعت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اڑیسہ کی اردو صحافت میں اس کی ۴۸ شماروں کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شاخسار کا اولین شمارہ جون جولائی ۱۹۶۵ء کا تھا اور آخری شمارہ مئی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ شاخسار کے ۴۰ شمارے ۱۹۷۲ء تک دو ماہی کی حیثیت سے لیبل لیتھو پریس پٹنہ سے شائع ہوئے۔ پھر ماہنامہ کی شکل میں شمارہ نمبر ۴۱ سے ۴۸ تک سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہوتے۔ لکھنؤ میں اولاد اصغر رضوی نے شاخسار کی اشاعت کی نگرانی کی۔ شمارہ ۱۱-۱۲ ۱۹۶۷ء تک اداریہ امجد نجمی لکھتے رہے۔ اس کے بعد اداریہ کرامت علی کرامت نے لکھا۔ کرامت کے اداریوں اور تبصروں سے جدید شاعری کی تحریک کو نئی تقویت ملی۔ بعض اداریوں کا اقتباس کرامت علی کرامت نے اپنی کتاب "اضافی تنقید" کے آخری مضمون "جدید شعری رویّہ ۶۰ء کے بعد" میں شامل ہے۔ شاخسار کے مندرجہ ذیل خاص نمبر اہم ہیں:۔

شمارہ نمبر ۱-۲ ۱۹۶۸ء۔ شمارہ نمبر ۲۲-۲۳ ۱۹۶۹ء۔ شمارہ نمبر ۲۴-۲۵ ۱۹۶۹ء۔
شمارہ نمبر ۲۶-۲۷-۲۸ ۱۹۷۰ء۔ شمارہ نمبر ۴۱-۴۲-۴۳ ۱۹۷۲ء اور شمارہ نمبر ۴۴-۴۵-۴۶ ۱۹۷۳ء۔

ماہنامہ	صدائے اُڑیسہ	کٹک

جناب امجد نجمی کی وفات (یکم فروری ۱۹۷۴ء) کے بعد سے شاخسار کی اشاعت ملتوی ہوگئی۔ اس دوران اُڑیسہ سے ایک اردو رسالہ کے اجراء کے ضمن میں اردو سے دلچسپی رکھنے والے چند حضرات نے اپنی مساعیٔ جمیلہ سے "صدائے اڑیسہ" کے نام کا ایک اردو نیوز میگزین یکم جون ۱۹۸۲ء میں

جاری کیا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار کی ضخامت و ہیئت کا یہ اولین شمارہ اپنے اندر دوہری خصوصیات رکھتا ہے جس کے ۱۲ صفحات اردو میں اور ۴ صفحات اڑیا میں شائع ہوئے۔ ضیاء الدین محمد یونس اس کے مشیر اعلیٰ ہیں اور شیخ قریش نامی کٹک کے ایک نوجوان اس کے انتظامیہ مدیر۔ قریش نے اڑیسہ کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرکے صدائے اڑیسہ کے لئے خریدار فراہم کئے اور اس طرح اس اخبار کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں سعید رحمانی، فرحت زیدی اور شفیق الرحمٰن عاجز سونگڑوی تھے جن کی انتھک کوششوں سے اس اخبار کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ اخبار شروع میں کلکتہ کے تاج پریس طبع ہوکر کٹک سے شائع ہوتا تھا۔

صدائے اڑیسہ کے اولین شمارہ کی اشاعت پر اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ شری جانکی ولبھ پٹنائک نے مدیر کے نام اپنے ایک پیغام میں لکھا تھا کہ:۔

> "ماہ رواں سے ایک اردو اڑیا رسالہ کے اجراء کی خبر سن کر بے حد مسرت ہوئی۔ اڑیسہ میں اگرچہ اردو بولنے والوں کی کمی نہیں مگر اردو میں اب تک کوئی باقاعدہ رسالہ شائع نہیں ہو سکا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ "صدائے اڑیسہ" اس کمی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اردو اور اڑیا زبانوں کے اندر افہام و تفہیم کے دائرہ کو وسیع کرنے میں معاون ہوگا۔ اس کے علاوہ میرا یقین ہے کہ اس سے اڑیسہ میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کے جذبات کو تقویت پہنچے گی۔"(۱)

صدائے اڑیسہ" کے اوّلین شمارہ کا اداریہ اخبار کے اجراء کا پس منظر پیش کرتا ہے۔ اداریہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

برسوں پہلے ہم نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی حسین تعبیر "صدائے اڑیسہ" کی صورت میں اب ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس کو حقیقت کا روپ دینے میں ہمیں کیسی کیسی صبر آزما منازل

---

(۱) صدائے اڑیسہ: جلد ۱ شمارہ ۲، بابت جولائی ۱۹۸۲ء؛ ص ۱۔

سے گذرنا پڑا اور کن کن کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا یہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ مگر یہ سب تکالیف اس وقت ہیچ معلوم ہوتی ہیں جب نظر اس جریدے کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔

اڑیسہ کے لئے اردو صحافت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ البتہ عرصہ دراز سے یہ سلسلہ منقطع تھا۔ ہم نے تو صرف اس کی تجدید کی ہے۔ تحریک آزادی کے زمانہ میں کٹک سے ایک ہفتہ وار اخبار "بیداری" کے نام سے شائع ہوتا تھا اس کے بعد ایک طویل خاموشی رہی۔ پھر آزادی کا سورج طلوع ہوا اور اپنے ساتھ "دور جدید" لایا جو ایک ہفتہ وار اخبار تھا۔ چند نامساعد حالات کے تحت اس کی اشاعت بھی رک گئی۔ ہو سکتا ہے ابھی بھی ان اخبارات کی کاپیاں کہیں موجود ہوں۔ ان کے حصول کے لئے ہماری کوشش جاری ہے۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ آگئیں تو آئندہ ہم ان پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ اس کے بعد صحافت کی دنیا میں ایک طویل سناٹا مسلط رہا۔ ذرائع ابلاغ کی کمی بری طرح لوگوں کو کھٹکتی رہی۔ پھر کٹک کے ادبی ماحول میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی جب چند سال پہلے حضرت نجمی کی ادارت میں "شاخسار" کا اجرا ہوا۔ جناب نجمی تاحیات گلشن ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کی ذات ایک محفل تھی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ موصوف کی جدائی اڑیسہ میں اردو ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ بہر حال یہ دو ماہی رسالہ خالص ادبی حیثیت رکھتا تھا اور برصغیر کے ادبی حلقوں میں اس نے بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل کر لی تھی مگر افسوس کہ اس کو بھی زمانہ کی نظر لگ گئی۔

ہندوستان میں نت نئے رسالے منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں چند خوش نصیب ہی حوادث زمانہ کا مقابلہ کر پاتے ہیں۔ اگر اس کے اسباب و علل پر ایک نظر ڈالی جائے تو بہت ساری باتیں سامنے آتی ہیں۔ مگر اڑیسہ کی حیثیت ان سب سے جداگانہ ہے۔ اول تو یہ اردو کے مرکز ثقل سے بہت دوری پر ہے اور دیگر وسائل بھی بہت محدود ہیں۔ مگر سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہاں اردو کا کوئی پریس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی اردو رسالہ کی بقا یہاں بظاہر غیر یقینی سی لگتی ہے۔ مگر ایک بات مسلم ہے کہ یقین محکم اور عزم راسخ ہو تو پربت بھی رائی بن جاتا ہے۔ صدائے اڑیسہ کے حق میں یہ بات فال نیک تصور کی جائے گی کہ ایسے ایسے نوجوانوں کی حمایت حاصل ہے جو مربوط ضابطوں کے تحت عملی قدم اٹھانے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے ان رفقائے کار کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں جن کی سعئ بلیغ سے اڑیسہ کے ادبی افق پر اردو صحافت کا سورج پھر سے طلوع ہوا ہے اور وہ وقت بھی دور نہیں جب یہ بلندی پر پہنچے گا اور دور دور تک اس کی

روشنی پھیلے گی۔ جریدہ کے تابناک مستقبل کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں کیونکہ اشاعت سے پہلے ہی خاطر خواہ تعداد میں خریداروں کے ایک مخصوص حلقہ کی سرپرستی اسے حاصل ہو چکی ہے۔ .... صدائے اڑیسہ دراصل ایک نیوز میگزین ہے اور اس کا اولین شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔"(۱)

صدائے اُڑیسہ کے اسی شمارہ میں "اپنی باتیں" کے زیر عنوان اداریہ کا دوسرا وسیع پہلو بھی قابل توجہ ہے:۔

"........... ہمیں افسوس ہے کہ ایک دو پرچوں کے علاوہ اب تک اڑیسہ سے کوئی قابل ذکر اردو اخبار نہیں شائع ہوا۔ ہمارا مقصد ہے کہ ہم اس کمی کو پورا کریں اور اڑیسہ کے مختلف اور دور دراز علاقوں میں رہنے والے اردو داں طبقہ کو ایک دوسرے سے متعارف کرائیں اور قریب لائیں۔ صدائے اڑیسہ کی اشاعت اور خریداروں کی فراہمی کی مہم میں ہمیں جب اڑیسہ کے مختلف علاقوں کا دورہ کرنا پڑا تو ہمیں یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی کہ مختلف علاقوں میں بہت سارے مسلم ادارے تعمیری میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ مگر افسوس کہ ان میں رابطے کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جو انھیں ایک دوسرے کی کارگذاریوں سے روشناس کراتا۔

اُڑیسہ میں اردو داں طبقہ کی اسی لامرکزیت کی وجہ سے ملک کے اردو نقشہ میں ایک نقطہ سے زیادہ اہمیت نہیں مل سکی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اُڑیسہ کے مختلف علاقوں میں رہنے والے اردو داں طبقہ کی سیاسی، معاشی، ثقافتی، ادبی اور سماجی کامیابیوں، سرگرمیوں، کوششوں اور ضرورتوں کو منظر عام پر لائیں تاکہ افہام وتفہیم اور باہمی تعاون کا دائرہ نہ صرف اڑیسہ بلکہ پورے ملک میں وسیع سے وسیع تر ہو سکے۔"(۲)

صدائے اُڑیسہ کا دوسرا شمارہ جولائی ۱۹۸۲ء میں کلکتہ کے تاج پریس سے طبع ہو کر کٹک سے شائع ہوا لیکن شمارہ اوّل کے مقابلہ میں اس میں اردو کے آٹھ صفحات اور اڑیا کے دو صفحات تھے مشتملات کے لحاظ سے دوسرا شمارہ پہلے شمارہ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔

صدائے اڑیسہ کا چھٹا اور ساتواں مشترکہ شمارہ "امجد نجمی نمبر" تھا۔ یہ شمارہ اگرچہ آٹھ صفحات

---

(۱) اداریہ، صدائے اڑیسہ، جلد ۱ شمارہ ۱: بابت جون ۱۹۸۲ء، ص ۲۔
(۲) ایضاً ایضاً ایضاً

پر محیط تھا لیکن مواد کے لحاظ سے خاصی ادبی اہمیت کا حامل تھا۔ اس شمارہ میں سعید رحمانی کی نظم "نذرِ نجمی"، یوسف جمال کا مضمون "امجد نجمی"۔ ضیاء الدین محمد یونس اور شیخ قریش کا تفصیلی مضمون "بیگم نجمی سے ایک ملاقات" (نجمی صاحب کی بیگم اور اہل خانہ کی تصویر کے ساتھ) کرامت علی کرامت کا خاکہ "امجد نجمی کے سوانحی حالات ایک نظر میں"۔ ڈاکٹر شیریں باسط کا مقالہ "امجد نجمی کا فنی شعور"۔ سعید رحمانی کا "یادِ نجمی" اور نورالدین احمد کا خاکہ "حیات مسیح ایک نظر میں" خاصے کی مشتملات تھیں جو آٹھ صفحات کے اس اخبار کو ادبی اہمیت عطا کرتی ہیں۔

یہ شمارہ فرحت زیدی اور شفیق الرحمٰن عاجز کے حسن رقم کا نمونہ ہے جس کی طباعت آفسٹ پر کٹک ہی میں ہوئی۔

اس کے بعد صدائے اڑیسہ کے ادارہ میں ناگپور سے شارق جمال معاون مدیر کے طور پر شریک ہوئے اور انھوں نے صدائے اڑیسہ کی کتابت وطباعت کا ذمہ لے کر اس اخبار کی طباعت ناگپور سے کروائی۔ ناگپور سے صدائے اڑیسہ کے دس صفحات طبع ہو کر آتے ہیں اور درمیانی دو صفحات کی اڑیا طباعت کٹک میں ہوتی ہے۔

صدائے اڑیسہ نے نومبر ۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ آل اڑیسہ مشاعرہ اور دو روزہ آل اڑیسہ اردو کانفرنس کا اعلیٰ پیمانہ پر اہتمام کیا تھا جس کی تفصیل اگلے باب میں درج ہوگی۔

اگر یہ اخبار ترتیب واشاعت میں سنجیدگی کی راہ پر گامزن ہو تو اسے اڑیسہ کی اردو صحافت میں پائیداری اور مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔

تنقید

کرامت علی کرامت

کرامت علی کرامت ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں شہر کٹک میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی رحمت علی رحمت ماہر ریاضیات اور اردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ کرامت علی کرامت نے ۱۹۵۸ء میں راونشا کالج کٹک سے ریاضیات میں ایم ایس سی کیا اور اتکل یونی ورسٹی میں اول آنے کی بنا پر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اور اسی سال اڑیسہ ایجوکیشنل سروس میں ریاضی کے لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں سمبل پور یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی

کی ڈگری حاصل کی۔ اڑیسہ کے مختلف سرکاری کالجوں میں لکچرر اور ریڈر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ تک کندرہ پاڑہ کالج میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ راونشا کالج کٹک میں وائس پرنسپل رہے۔ اب ۱۳ر اگست ۱۹۸۴ء سے کھلی کوٹ کالج برہم پور میں صدر شعبۂ ریاضیات کی حیثیت سے ان کا تبادلہ ہوا ہے۔ یہ عہدہ پروفیسر کا ہے۔

کرامت علی کرامت کی ادبی زندگی کا آغاز یوں تو ان کے زمانہ طالب علمی سے ہی ہو چکا تھا۔ کٹک میں مظہر امام کی رہائش کے دوران (۱۹۶۲ــــ ۱۹۵۸ء) نثر نگاری کی تحریک ملی۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے جو ملک کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔

آج کرامت علی کرامت کا نام اڑیسہ میں اردو کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین نظم و نثر کے ذریعہ پوری اردو دنیا میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔ جس زمانہ میں اردو کی جدید شاعری پر مایوسی، بے یقینی، افسردگی اور محزونی کی فضا چھانے لگی تھی۔ کرامت نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور جدید شاعری میں جدید انسان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ صالح اور صحت مند جدیدیت کے فروغ کے سلسلہ میں مدلل بحثیں کیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدید شاعری کو روایت سے انحراف کی علامت سمجھا جاتا تھا اور کلاسیکی شاعری کے اعلیٰ اقدار کی شکست و ریخت کو فیشن کے طور پر قبول کیا جارہا تھا لیکن کرامت نے ترقی پسند موضوعات کو بھی جدید شاعری کے دائرہ میں روا رکھا۔ اس عہد کے جدیدیت پسند شعراء ادب میں مشروطیت کے قائل نہ تھے لیکن ان کی کوشش یہی رہی کہ جدید شاعری میں مشروطیت کو بھی جائز مقام ملنا چاہئے۔

جب جدید شاعری میں نثری نظموں کی طرف توجہ مرکوز ہونے لگی تو کرامت علی کرامت نے اس سے اختلاف کیا۔ انھوں نے اپنے نظریات کو مدلل طور پر پیش کرنے کے لئے ایک طرف تو سنسکرت، عربی و فارسی کے تنقیدی اصول سے استفادہ کیا اور دوسری طرف مختلف علوم جدیدہ کے تحقیقی نتائج کی مدد سے اپنے نظریات کی واضح طور پر توسیع کی۔

۱۹۷۷ء میں کرامت علی کرامت کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اضافی تنقید" شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ان کے مندرجہ ذیل مضامین شریک اشاعت ہیں :۔

(۱) شعری تنقید میں اضافیات۔ (۲) جدید شاعری اور اس کا پس منظر۔

(۳) غالب کا کلام جدید میزان پر۔ (۴) ادب میں کمٹ منٹ کے مسائل۔

(۵) جدید شاعری کا بحران۔ (۶) ترسیل کی ناکامی کا مسئلہ۔
(۷) جدید شاعری میں وزن اور آہنگ کے مسائل۔ (۸) ادب اور فکری شعور۔
(۹) امجد نجمی، عصریت اور ابدیت کے آئینے میں۔ (۱۰) مظہر امام کا ذہنی سفر۔
(۱۱) جدید شاعری کی چند معتبر آوازیں۔ (۱۲) جدید شعری رویہ ۱۹۶۰ء کے بعد۔

"اضافی تنقید" میں کرامت علی کرامت کی تنقید شعریات اور جدید شاعری سے وابستہ موضوعات و مسائل کے ارد گرد گھومتی ہے۔ کرامت کی تنقید کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) وہ حصہ جس میں شعریات، تخلیقی عوامل اور ترسیل و ابلاغ کے مسائل پر منفرد انداز میں بحث کی گئی ہے۔

(ب) وہ حصہ جس میں جدید شاعری سے وابستہ مختلف مسائل پر عام روش سے ہٹ کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(ج) وہ حصہ جس میں مندرجہ بالا تنقیدی اصول کی روشنی میں جدید شاعروں کے کارناموں پر عملی تنقید کی گئی ہے۔

اس طرح کرامت علی کرامت کی تنقید نگاری کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شعریات، تخلیقی عوامل اور ترسیل و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ان کا مضمون "شعری تنقید میں اضافیا" اساسی اور کلیدی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ریاضیات، شماریات، سائنس، علم النفس، جدید علم فلسفہ اور فنون لطیفہ کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادب میں ایک ایسا نظریہ اضافیات پیش کیا ہے جسے فڈرک اے پوٹل (۱۹۴۶ء) کے CRITICAL RELATIVISM کے نظریہ کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔

پوٹل نے شاعری کو مطلق اور تنقید کو اضافی قرار دیا تھا لیکن کرامت علی کرامت نے شاعری اور تنقید دونوں کو اضافی قرار دیا ہے۔ تخلیقی عوامل کے متعلق فرانسیسی فلسفی ژاق ماریتیس کے فلسفیانہ نظریات اور آئی اے رچرڈس کی نفسیاتی تنقید میں ترمیم و اضافہ کر کے انھوں نے ترسیل و ابلاغ کے ہر مرحلے میں کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی RELATIVE EXCESS

کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں شعر کے لئے محض جذبات کی فراوانی کافی نہیں بلکہ جذبات کو دیگر عناصر یعنی فکر و تعقل پر حاوی ہونا چاہئے۔

موسیقی کے سائنسی اصول یعنی زیر و بم یا PITCH ، شدت یا INTENSITY اور کیفیت یا TIMBRE کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرامت نے شعری اقدار کے تعین کے لئے ذیل کے تین اصول وضع کئے ہیں۔

(الف) جذباتی کیفیت کی موجیں کتنی وسیع ہیں۔ یعنی زندگی کے کتنے وسیع تجربات پر مبنی ہیں۔

(ب) جذباتی کیفیت کی موجیں کتنی گہری ہیں۔ یعنی یہ موجیں تحت الشعور اور لاشعور کی کتنی گہرائیوں سے قاری کے ذہنی تجربات کو شعور کی سطح پر ابھارنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

(ج) جذباتی کیفیت کی مختلف لہریں باہم مل کر سالم کلیّت TOTALITY کی شکل اختیار کرتی ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاعری عمدہ شاعری نہیں کہلا سکتی۔

کرامت علی کرامت نے ان ہی اصولوں کو اپنی عملی تنقید میں استعمال کیا ہے اور اسی مخصوص نقطۂ نظر سے جدید شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے کی بے باکانہ کوشش کی ہے۔ وہ شاعری کے لئے الفاظ کی مخصوص ترتیب، در و بست، تراش خراش اور خارجی آہنگ کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ کسی زبان کے خارجی آہنگ کا مزاج اس زبان کے قارئین کے اجتماعی لاشعور پر منحصر ہوتا ہے اور کرامت کی نظر میں خارجی آہنگ کا تصور بھی اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نظر میں چونکہ اردو شاعری کے مزاج کی تشکیل میں صنف غزل کا سب سے اہم حصہ رہا ہے اس لئے اس میں مروّجہ آزاد نظم اور آزاد غزل کا تجربہ تو کامیاب ہو سکتا ہے لیکن نثری نظم کا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مروجہ آزاد نظم اور آزاد غزل میں غزل کے بحور و آہنگ کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے جبکہ نثری نظم میں اس کی پابندی نہیں ہوتی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے عروض آہنگ اور بیان میں ''اصولِ تسکینِ اوسط'' کے اصول پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس اصول کو وسعت دے کر غزل کی بحروں سے نثری نظم کا آہنگ اخذ کرنے پر زور دیا ہے۔ لیکن کرامت علی کرامت اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اصول تسکین اوسط'' عروض میں کلیہ کا درجہ نہیں رکھتا اور اپنی مرضی کے مطابق اسے بروئے کار لاتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس سے آہنگ کے آفاقی اصول مجروح نہ

ہوں جن پر دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری کے خارجی آہنگ کا دارو مدار ہے۔

جدید شاعری سے وابستہ مختلف مسائل پر کرامت علی کرامت نے نہایت اہم مضامین لکھے ہیں جن سے نئی نسل کو لمحۂ فکر حاصل ہوتا ہے۔ اردو کی جدید شاعری دراصل بین الاقوامی شعری رجحان کی شاخ ہے جو MODERNISM سے موسوم ہے۔ مغربی تنقید کے زیر اثر اردو کی جدید شاعری میں تنہائی، کرب، اضطراب، مایوسی، حزن و ملال اور غیر محفوظیت کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن کرامت کو جدید شاعری کی اس تعبیر سے شدید اختلاف ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اردو کی جدید شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائے میں جدیدیت دراصل وہ ہے جس میں جدید انسان کی نفسیاتی پیچیدگی واضح طور پر سامنے آسکے۔ جدید شاعری میں جدید انسان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی عکاسی ہونی چاہئے۔ ان کی نظر میں جدید شاعری میں فرد کی ذات، ذات کا کرب اور کرب کا احساس ان ہی تینوں عناصر سے وابستہ منفی رجحان سے متعلق کرنا نصف انسان کی دریافت کے مترادف ہے۔

جس دور میں جدید نقاد اردو کی جدید شاعری میں منفی رجحانات کی تبلیغ کر رہے تھے، اردو کے مرکز سے دور سرزمین اڑیسہ سے کرامت علی کرامت نے اس کے خلاف آواز بلند کر کے صحت مند اور تعمیری فکر و نظر کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے تعمیری فکر و نظر پر مبنی جدیدیت کو پہلی بار " صالح اور صحت مند جدیدیت" کے نام سے موسوم کر کے اس کی اہمیت کی جانب نئے فن کاروں کی توجہ مبذول کرائی اور ان خارجی موضوعات کو بھی جدید شاعری کے زمرے میں شامل کیا۔ جن کے اظہار میں جدید انسان کی نفسیاتی پیچیدگی واضح طور پر سامنے آتی ہو۔ اس اعتبار سے ترقی پسند شاعری جو اظہار و بیان کے اعتبار سے جدید شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو، جدید شاعری کے دائرے سے خارج نہیں ہوتی۔ ان کے دیگر ہم عصر نقاد عموماً جدیدیت کو ترقی پسندی کی ضد سمجھتے ہیں لیکن کرامت علی کرامت کا نقطۂ نظر ان سے مختلف ہے۔

کرامت علی کرامت کی "اضافی تنقید" پر تبصرہ کرتے ہوئے سلیم شہزاد نے لکھا ہے:۔

"پروفیسر کرامت کی تنقید میانہ روی اور ادب کے لئے ناقد کے خلوص اور ENTHUSIASM کی مثال ہے۔ جدیدیت نے جو ناقد فراہم کئے ہیں ان میں پروفیسر صاحب کا اپنا مقام ہے اور اپنی اعتدال پسندی کی وجہ سے وہ جدید EXTREMIST ناقدین سے الگ اپنی شناخت بناتے

ہیں اور تاثراتی تنقید کے ناقدوں نیاز فتحپوری، سجّاد انصاری، فراق اور آل احمد سرور کے خطوط کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کی سائنسی فکر ادب کے مطالعہ اور تنقید پر حاوی نہ ہوتے ہوئے اس میں معاونت کرتی ہیں۔" (۱)

جدید تنقید کا ایک اور اہم مسئلہ ادب میں کمٹ منٹ کا مسئلہ ہے۔ اکثر جدید نقادوں کا کہنا ہے کہ جدید شاعری غیر مشروط شاعری ہے۔ چونکہ ترقی پسند شاعری مشروط شاعری تھی اسی وجہ سے ترقی پسند شعراء کو جدید نقاد قابل ملامت سمجھتے ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق جدید شاعری داخلیت پسند شاعری ہے۔ اس کے برعکس ترقی پسند شاعری خارجیت پسند تھی۔ چنانچہ خارجیت پسند شاعری شاعری ہو ہی نہیں سکتی لیکن کرامت کی رائے میں خارجیت پسندی کا احساس حقائق پر مبنی ہو تو فن کار کی تخلیق ذات کا حصہ بن کر اچھی شاعری کا موجب بن سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر داخلیت پسندی کا احساس صداقت پر مبنی نہ ہو تو یہ احساس نہ فن کار کی تخلیقی ذات کا حصہ بن سکتا ہے نہ اعلیٰ ادب کی تخلیق کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر کیفیات ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی نہ ہو تو داخلیت پسند شاعری ہو یا خارجیت پسند شاعری COMMITTED شاعری ہو یا NON-COMMITTED شاعری، قدیم شاعری ہو یا جدید شاعری، یہ کسی خصوصی اہمیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اصل سوال مشروطیت یا غیر مشروطیت کا نہیں بلکہ جذبات کی اضافی فراوانی کے ہونے یا نہ ہونے کا ہے۔

کرامت علی کرامت نے جدید شاعری میں وزن اور آہنگ کے مسائل پر بھی منفرد انداز میں بحث کی ہے اور وزن و آہنگ کے اصول پر بحث کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:-

(۱) جدید شعراء کے پیچیدہ نفسیاتی تجربات کی کامیاب ترسیل کے لئے غیر مترنم اور قلیل الاستعمال بحروں کے بجائے مترنم اور دلکش بحروں کا استعمال ہونا چاہئے۔

(۲) سنسکرت کی مترنم بحروں سے بھی اردو غزل میں استفادہ کیا جائے۔

(۳) غزل میں ایسی زحافات کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے جن سے غزل کا آہنگ

---

(۱) سلیم شہزاد، تبصرہ "اضافی تنقید"، مطبوعہ جواز مالیگاؤں شمارہ ۵: بابت دسمبر ۱۹۷۷ء تا مئی ۱۹۷۸ء: ص ۳۵۲۔

مجروح ہوتا ہو۔

(۴) جدید شاعری میں ہر لفظ کو اپنے صحیح تلفظ کے ساتھ ہونا چاہئے۔

(۵) جدید شاعری میں مثنوی اور رباعی جیسی اصناف سخن کا احیاء کیا جائے۔

(۶) نثری نظم کے بجائے مروجہ آزاد نظموں کو فروغ دیا جائے۔

(۷) صنفِ غزل کے پہلو بہ پہلو آزاد غزل جیسی نو میدہ صنفِ سخن کو بھی فروغ دیا جائے۔

کرامت علی کرامت نے اپنی تنقید کے لئے وضع کردہ اصولوں کو شاعری کی عملی تنقید کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور اسی نظریہ کے تحت" اضافی تنقید" میں انھوں نے امجد نجمی، مظہر امام، شہاب جعفری، بانی، خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، لاج نرائن راز، کمار پاشی، ندا فاضلی، بشیر بدر اور مخمور سعیدی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

امجد نجمی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" اسلوب اور حسیت کے اعتبار سے ان کی شاعری میں اس قدر تغیرات -FLUCTUA TIONS- پائے جاتے ہیں کہ انھیں کسی ایک گروپ سے وابستہ کرنا خود ان کے تغیر پسند مزاج کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ایک طرف تو انھوں نے پر شکوہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے اشعار کہے ہیں وہیں عام فہم الفاظ میں بھی شعر کہے ہیں۔ آخر ان کی شاعری میں یہ تضاد اور اتنا تغیر کیوں ہے؟ بادی النظر میں آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ امجد نجمی کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جن میں سے ایک کا رجحان روایتی شاعری کی طرف تھا تو دوسرے کا رجحان نئے احساس اور نئی طرزِ اظہار کی طرف۔ لیکن اگر آپ ذرا غور کیجئے گا تو آپ کو بہ آسانی محسوس ہوگا کہ دراصل ان کے ذہن و شعور کی جڑیں ماضی کی سرزمین میں گہرائی تک پیوست تھیں لیکن ان کی مضطرب طبیعت ہمیشہ انھیں ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا ہر وقت وہ ذہنی طور پر ایک طرح کی کشمکش، جد و جہد اور پیچ و تاب سے عبارت رہے۔ وہ آخری وقت تک اسی کشمکش میں مبتلا رہے۔ انھیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہی اور وہ ہمیشہ چشم آفل نگر کا شیوہ لے کر فن آذری کی صیقل میں مصروف رہے .... یہ دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوتی ہے کہ حالانکہ امجد نجمی بنیادی طور پر کلاسیکل شاعر ہیں لیکن ان کی بعض تخلیقات میں وہی بے چہرگی، وہی تنہائی، وہی ناکامی، وہی شکست خوردگی، وہی تشنگی، امید و بیم کی وہی کشمکش، موجود

حیات کی وہی تیز رفتاری پائی جاتی ہے جو نئے شعراء کو جدید حسیّت کا عطیہ ہے۔"(۱)

"مظہر امام کا ذہنی سفر" کے زیرِ عنوان کرامت علی کرامت نے ان کی شاعری اور شاعرانہ رویّوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مظہر امام کا تعلق اس گروپ کے شعراء کے ساتھ ہے جسے ترقی پسند اور جدیدیت کے درمیان کی کڑی کہا جاتا ہے۔ مظہر امام کی ترقی پسند دور سے متعلق شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کرامت علی کرامت لکھتے ہیں:-

"................ان کی اس دور کی شاعری کا اصل جوہر وہ ترقی پسند اشعار ہیں جو خارجی موضوعات سے وابستہ ہونے کے باوجود شاعر کے داخلی احساسات کی آنچ سے اس کے شخصی تجربہ کا حصہ بن گئے ہیں اور جس میں شاعر سیاسی طور پر کمٹڈ COMMITTED ہونے کے باوجود شاعری کے بنیادی تقاضوں سے بے نیاز نہ ہونے کی وجہ سے ایک غیر مشروط ذہن کا مالک نظر آتا ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک کمٹ منٹ اور نان کمٹ منٹ کا مصنوعی فرق مٹ جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشعار میں مظہر امام نے دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح گلشن، بہار، غنچہ، دار، پھول لہو، زلف، شانہ، سحر جیسے الفاظ کو تشبیہات و استعارات کی حیثیت سے بار بار استعمال کیا ہے۔ لیکن الفاظ کی مخصوص قسم کی نشست و برخاست اور پیکروں کی تراش و خراش سے شاعر کی منفرد شان ٹپکتی ہے۔ انھوں نے اشارے کنائے سے کام لیتے ہوئے جس طرح "برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست" کو اپنا شیوہ بنایا ہے اس کی وجہ سے انھیں نیاز حیدر گروپ کے ترقی پسندوں سے الگ کر کے فیض، پرویز شاہدی، مجروح اور احمد ندیم قاسمی گروپ کے ترقی پسندوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔"(۲)

مظہر امام کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہوئے کرامت لکھتے ہیں:-

"احمد ہمیش، افتخار جالب، جیلانی کامران گروپ کے نراجی شعراء کے برخلاف مظہر امام کی شاعری ذات کے خول میں محبوس ہو کے نہیں رہ جاتی بلکہ اب بھی سماج سے شاعر کے اٹوٹ رشتے پر یقین و اعتماد رکھتے ہوئے حزینہ لے میں "جدید

---

(۱) کرامت علی کرامت، اضافی تنقید، مطبوعہ ۱۹۷۷ء، پبلشرز اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد، ص ۲۰۶۔

(۲) کرامت علی کرامت: اضافی تنقید، ۱۹۷۷ء: ص ۲۲۴ (اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد)

انسان کی شکست خوردگی، پیاس، تڑپ اور اینٹھن کی ترجمانی کرتی ہے، جو ظاہر ہے کہ جدید انسان کو صنعتی تہذیب سے بطور ودیعت ملی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ "رشتہ گونگے سفر کا"[1] میں جدید انسان کا مثبت کردار ابھرتا ہوا نظر نہیں آتا، لیکن یہی کیا کم ہے کہ "زخم تمنا"[2] میں جو شاعر قطب نما کے مقناطیس کی طرح منفرد شعری رویّہ کی تلاش میں ہمیشہ مضطرب رہا کرتا تھا اور کسی ایک رویّہ پر مطمئن نہیں تھا اب اسے مخصوص سمت مل چکی ہے اور "زخم تمنا" کی بکھری متنوع آوازوں میں سے گذر کر اس نے اپنی آواز دریافت کر لی ہے۔

غرض کہ مظہر امام کے ذہن و شعور نے اجتماعی غم سے ذات کے کرب تک ابلاغ کی تن آسانی سے ناکامیٔ ترسیل کے المیہ تک، مرعوب کن فارسی آمیز زبان سے عام بول چال کی لطیف اور رچنے والی زبان تک، رجائی رومانیت سے قنوطی پیکریت تک، ترقی پسندانہ شعری رویّہ سے جدید حسّیت تک جو طویل ذہنی مسافت طے کی ہے وہ محض خوش آئند ہی نہیں بلکہ ان کے تمام ہم عصروں مثلاً حرمت الاکرام، نازش پرتاپ گڑھی، فضا ابن فیضی وغیرہ سے ممیز کر کے انھیں ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والی نئی نسل کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔"[3]

کرامت علی کرامت نے جدید شاعری سے متعلق کئی ایسی باتیں کہی ہیں جو ان سے قبل کسی نقّاد نے نہیں کہیں۔ انھوں نے علامت پسندی، پیکریت اور مکعبیت کا تصور قدیم مذہبی عقائد و تصورات میں دریافت کیا ہے۔ انھیں غالب و اقبال کی شاعری میں اسی بغاوت کی توسیع نظر آتی ہے جو ان سے قبل امیر خسرو کے ہندوستانی سنگیت، دورِ مغلیہ کی مصوری اور شاہ ولی اللہ کی مذہبی تجدید و اصلاح میں رونما ہوئی تھی۔ مظہر امام کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت کرامت نے اسلوبیات کی ایک نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے جو شماریات پر مبنی ہے۔ انھوں نے بسمل سعیدی کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت بھی یہی تکنیک استعمال

---

(۱) رشتہ گونگے سفر کا: مظہر امام کا دوسرا شعری مجموعہ۔
(۲) زخم تمنا: مظہر امام کا اولین شعری مجموعہ جسے اُڑیسہ اردو پبلشرز نے شائع کیا تھا۔
(۳) کرامت علی کرامت، اضافی تنقید: ۱۹۷۷ء، ص ۲۴۴ (اردو رائٹرز گلڈ، الٰہ آباد)

کیا ہے۔ اس اصول مطالعہ کے توسط سے کسی شاعر کے مختلف ادوار کی شاعری کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

چاہے اصولی تنقید ہو یا عملی تنقید اپنی باتوں کو مدلل انداز میں پیش کرنے کے لئے کرامت علی کرامت کبھی انگریزی، اڑیا، بنگالی، ہندی، سنسکرت، فارسی اور عربی ادب کا حوالہ دیتے ہیں تو کبھی سائنس، مذہب، علم النفس، تحلیل نفسی، عمرانیات، سماجیات، مصوری وغیرہ کے اصولوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی تنقید میں حوالوں کی بہتات ہوتی ہے جو کہیں کہیں غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تنقید کا اصل نفسِ مضمون مجروح نہیں ہوتا۔

تنقید نگاری کے علاوہ کرامت علی کرامت نے بہت سارے شعری مجموعوں کے پیش لفظ بھی لکھے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل کتابوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) کلکتہ: ایک رباب: سید حرمت الاکرام (مطبوعہ ۱۹۶۶ء)۔ (۲) سید حرمت الاکرام: شہپر (۱۹۷۳ء)۔ (۳) مہدی پرتاپ گڑھی: نئے نئے آسمان (مطبوعہ ۱۹۸۳ء)۔ (۴) قسیم الحق گیاوی: نقش و نغمہ (مطبوعہ ۱۹۷۵ء)۔ (۵) آزاد گلاٹی: دشت صدا (مطبوعہ ۱۹۷۶ء)۔ (۶) اسلام پرویز: ٹوٹی ہوئی پتیاں (مطبوعہ ۱۹۷۵ء)۔ (۷) علیم صبا نویدی: طرح نو (مطبوعہ ۱۹۷۵ء)۔ (۸) خالد رحیم: عکس در عکس (مطبوعہ ۱۹۸۳ء)۔ (۹) رشمی کانت راہی: حرف مستبّب (مطبوعہ ۱۹۸۴ء)۔

یوسف جمال

یوسف جمال کا تفصیلی جائزہ پچھلے باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ اردو کے ایک معتبر شاعر اور مستند ادیب ہیں۔ انھوں نے متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو وقتاً فوقتاً ہندو پاک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا پہلا تنقیدی مضمون "شاعر فرد واحد پر ہی"[1] ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک

---

(۱) مطبوعہ "منصف" حیدرآباد: اکتوبر ۱۹۶۷ء؛ ص ۴۔

یوسف جمال کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے "امجد نجمی کی شاعری کا جوہر"[۱] لکھا۔ اس کے بعد سے وہ مسلسل تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل مضامین قابل توجہ ہیں:۔

(۱) کرامت علی کرامت: شعاعوں کی صلیب کے آئینے میں۔[۲] (۲) جدید شاعری کا پس منظر۔[۳] (۳) مائیکل اینجیلو کی آخری تخلیق۔[۴] (۴) حرمت الاکرام اور جدیدیت۔[۵] (۵) لہو کے سفر کا مسافر۔ علیم صبا نویدی۔[۶] (۶) کالی دھرتی کی غزلیں۔[۷] (۷) مظہر امام۔ ایک قابل قدر فن کار۔[۸] (۸) ظہیر غازی پوری کا تخلیقی سفر۔[۹] (۹) "شہپر" پر ایک طائرانہ نظر۔[۱۰] (۱۰) "جنگل" صلاح الدین پرویز کی شاعری کا احاطہ۔[۱۱] (۱۱) شرف الدین اجمر۔ حیات سے موت کی دہلیز تک۔[۱۲] (۱۲) جلال الدین رومی۔[۱۳] (۱۳) افسانہ زندہ رہے گا۔[۱۴] (۱۴) اضافی تنقید۔ ایک مطالعہ۔[۱۵] (۱۵) اضافی تنقید کی تخلیقی شخصیت۔[۱۶] (۱۶) آزاد غزل۔[۱۷] آزاد غزل اور نثری غزل۔[۱۸] (۱۸) آشوب نوا کا شاعر ظہیر غازی پوری۔[۱۹]

وزیر آغا کی طویل نظم کا مجموعہ "آدھی صدی کے بعد" کا تفصیلی جائزہ اور ایک تنقیدی مضمون "مثلث کا شکار پریم چند" یوسف جمال کی تنقیدی بصیرت کے نمائندہ نمونے ہیں۔

اوائل سنہ ۱۹۷۶ء میں ان کا مضمون "جدید شاعری کا پس منظر" ادارہ تعمیر نو بمبئی کے زیر

---

(۱) مطبوعہ صبح امید بمبئی/ دسمبر ۱۹۷۱ء؛ ص ۱۱
(۲) " علم و دانش سرینگر/ جنوری ۱۹۷۳ء؛ ص ۵۰
(۳) " گوشۂ ادب (تعمیر نو)/ جنوری ۱۹۷۶ء؛ ص ۴۱
(۴) " معاز آزمور/ اپریل ۱۹۷۳ء؛ ص ۱۶
(۵) " " / جولائی ۱۹۷۳ء؛ ص ۲۴
(۶) " مورچہ گیا/ ۶ر جنوری ۱۹۷۹ء؛ ص ۵
(۷) " " / ۲۹ر جنوری ۱۹۷۷ء؛ ص ۴
(۸) " " / ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۷ء؛ ص ۴
(۹) " " / ۲۳ر نومبر ۱۹۷۷ء؛ ص ۴
(۱۰) ہماری زبان دہلی/ ۲۲ر جولائی ۱۹۷۹ء؛ ص ۴
(۱۱) سہیل گیا/ جولائی ۱۹۷۵ء؛ ص ۳۴
(۱۲) ہمالہ پٹنہ/ یکم نومبر ۱۹۷۶ء؛ ص ۲
(۱۳) تہذیب و ترتیب لکھنؤ/ یکم نومبر ۱۹۷۶ء؛ ص ۶
(۱۴) اتحاد مدراس/ ۲۳ر مارچ ۱۹۷۹ء؛ ص ۲
(۱۵) اوراق لاہور/ جولائی اگست ۷۹ء؛ ص ۲۹۶
(۱۶) زبان و ادب پٹنہ/ ستمبر ۱۹۸۱ء؛ ص ۵
(۱۷) کہسار ہزاری باغ/ مارچ ۱۹۸۰ء
(۱۸) سکہ بنگلور/ نومبر ۱۹۸۰ء؛ ص ۲
(۱۹) عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ/ ۱۹۸۲ء؛ ص ۴

اہتمام کل ہند ادبی انعامی مقابلہ میں اول آیا جس کی بنا پر ادارہ تعمیر نو نے یوسف جمال کو دو سو روپئے نقد انعام سے نوازا۔ محولہ بالا مضامین کے علاوہ یوسف جمال کے متعدد تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے مختلف شعراء کی ۳۰ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

یوسف جمال کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"جدید شاعری سے متعلق ہمارے ادب میں دو نظریئے بیک وقت کار فرما ہیں۔ پہلا نظریہ یہ کہ جدیدیت روایت سے انحراف کا نام ہے اور دوسرا نظریہ یہ کہ جدیدیت روایت کی توسیع کا نام ہے۔ روایت سے انحراف کے نام پر ہمارے ادب میں کئی طرح کے تجربے ہوئے جن کا بیشتر حصہ محض تجربے سے آگے نہ بڑھ سکا اور جن کے امکانات کے بارے میں اب بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعض حصے کامیاب بھی ثابت ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی شعراء نے بعض مقامات پر انحراف برائے انحراف کو اپنایا اور شاعری میں پھکڑ پن، اینٹی شاعری اور اینٹی غزل کو رواج دے کر قارئین کے ذہن میں مضحک جذبے پیدا کرتے رہے۔ ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ جس کی تشکیل میں اس کے ماضی کی تاریخ، اس کی عظیم تہذیبی روایت اور عصری مزاج کے ساتھ اس کی قوت ہم آہنگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ شاعری میں نئے نئے تجربے زبان کے اس مخصوص مزاج کے ماضی و حال کے تسلسل کے آئینے میں کئے جانا چاہئیں۔

روایت کی توسیع کے لئے بے پناہ خلاقانہ ذہنیت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ روایت کی توسیع سے مراد صرف روایت کو آگے بڑھانا نہیں لیا جا سکتا بلکہ اس میں ایک ایسی تازگی، توانائی اور ندرت پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جس سے ہمارا ذہن

پہلے سے مانوس نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایک نامانوس فضا میں سانس لے کر ذات کی عمیق تہوں سے ایک غیر مانوس جذبے کی دریافت میں کامیابی معمولی فن کار کے بس کی بات نہیں۔"(۱)

شیخ حبیب اللہ

شیخ حبیب اللہ اُڑیسہ کی اردو دنیا میں ماہر اقبالیات کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کے تنقیدی شعور اور بصیرت نے ان سے علامہ اقبال کی شاعری پر لاتعداد مضامین لکھوائے ہیں۔ جن میں سے ان کے مندرجہ ذیل مضامین نے اردو قارئین کو ان کے وسیع مطالعہ، ژرف نگاہی اور ان کے معتدل نظریات کا معترف کر دیا ہے۔

(۱) پریم چند پر اقبال کا اثر۔(۲)
(۲) کارل مارکس اور اقبال۔(۳)
(۳) اقبال کا تصور مومن۔(۴)
(۴) اقبال اور ڈاکٹر تارا چرن رستوگی۔(۵)
(۵) غالب اور اقبال کا استغراب۔(۶)
(۶) کلام اقبال کی تشریحات۔(۷)
(۷) ابلیس اقبال کی نظر میں۔(۸)
(۸) اقبال کی پیشین گوئیاں۔(۹)
(۹) اقبال کی ہندی مہاپرشوں سے عقیدتمندی۔(۱۰)
(۱۰) اقبال پر زرتشت کا اثر۔(۱۱)
(۱۱) یہ ہیں اقبال۔(۱۲)
(۱۲) اقبال اور یورپی مفکرین۔(۱۳)

---

(۱) یوسف جمال، کرامت علی کرامت کی شاعری "شعاعوں کی صلیب" کے آئینہ میں: علم و دانش: سری نگر: جنوری سنہ ۱۹۷۳ء: ص ۵۰۔

(۲) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ/ مارچ اپریل ۸۰ء؛ ص ۲۷۔
(۳) ایضاً / مارچ سنہ ۱۹۸۰ء؛ ص ۲۰۔
(۴) ایضاً / جون سنہ ۱۹۸۳ء؛ ص ۶۔
(۵) ایضاً / مئی سنہ ۱۹۸۳ء: ص ۱۳۔
(۶) ایضاً / اکتوبر نومبر سنہ ۱۹۷۹ء؛ ص ۳۰۔
(۷) ایضاً / مئی سنہ ۱۹۷۹ء: ص ۵۔
(۸) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ/ نومبر سنہ ۱۹۷۷ء؛ ص ۱۴۔
(۹) ایضاً / جون سنہ ۱۹۷۳ء؛ ص ۲۰۔
(۱۰) ایضاً / جولائی سنہ ۱۹۷۲ء: ص ۹۔
(۱۱) ایضاً / اکتوبر سنہ ۱۹۷۳ء؛ ص ۱۳۔
(۱۲) ایضاً / جون سنہ ۱۹۷۳ء؛ ص ۹۔
(۱۳) ایضاً / اپریل سنہ ۱۹۷۳ء؛ ص ۱۵۔

(۱۳) غالب اقبال اور فسانۂ دل[1]۔
(۱۴) غالب اقبال اور روداد عشق[2]۔
(۱۵) اقبال اور دریوزہ گری[3]۔
(۱۶) غالب اقبال اور پروردگار[4]۔
(۱۷) اقبال غالب اور زندگی[5]۔
(۱۸) گیتانجلی پر فلسفۂ قرآنی اور اقبال کا اثر[6]۔
(۱۹) حافظ شیرازی اور اقبال[7]۔
(۲۰) اقبال اور تصور باری تعالیٰ[8]۔
(۲۱) جگن ناتھ آزاد اور اقبال[9]۔

شیخ تجمّل علی فہمی

شیخ تجمل علی فہمی اُڑیسہ کے اولین صاحب دیوان شاعر شیخ امین اللہ چرخی کے ہم وطن ہیں۔ کرشنا نندپور کے محلہ لعل محمد پرگنہ بالوبیسی ضلع کٹک میں ۱۹۲۳ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیخ سراج الحق تھا۔ فہمی صاحب نے میٹرک کے بعد کلکتہ پورٹ کمیشن میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور ۳۷ سال کے طویل عرصہ تک وہاں ملازمت سے منسلک رہے اور ان کا مستقل قیام کلکتہ کے مٹیا برج میں رہا۔ وہاں کے ادبی ماحول نے فہمی صاحب کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ انھوں نے جامعہ علی گڑھ کے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کے امتحانات میں امتیازی طور پر کامیابی حاصل کی۔ شعر وادب سے ان کی گہری وابستگی نے انھیں شاعر وادیب بنا دیا۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ان کا غیر مطبوعہ دیوان اڑیسہ کے اردو شعر وادب کا قابل اعتنا سرمایہ ہے۔

فہمی صاحب نے متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل

---

(۱) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ/ جولائی ۷۲ء ص ۳۱۔
(۲) ایضاً / مارچ ۱۹۷۲ء ص ۵۔
(۳) ایضاً / جون ۱۹۷۲ء ص ۱۶۔
(۴) ایضاً / دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۵۔
(۵) ایضاً / مارچ ۱۹۷۵ء ص ۱۸۔
(۶) مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ/ جولائی ۷۵ء ص ۲۲۔
(۷) ایضاً / دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۳۔
(۸) ایضاً / ستمبر ۱۹۸۳ء ص ۲۰۔
(۹) مطبوعہ صبح امید بمبئی، اگست ۱۹۷۴ء ص ۵

مضامین قابل ذکر ہیں۔

(۱) غالب منفرد غزل گو۔(۱) (۲) علامہ اثر رودولوی۔(۲)

(۳) کیف الاثر ایک تعارف۔(۳) (۴) اقبال اور اس کی شاعرانہ صلاحیت۔(۴)

(۵) اُڑیسہ، اردو شعر و ادب کا ایک دیرینہ دبستان۔(۵)

ان کے اسلوب اور تنقیدی نظریئے کی مثال ذیل کے اقتباس سے مل سکتی ہے:۔

"یہ حقائق سے چشم پوشی ہے کیونکہ اقبال نے اردو شاعری کو بام شہرت تک پہنچایا اور اس کو فلسفیانہ بلند آہنگی کی وہ دولت عطا کی جس سے وہ ناآشنا تھی۔ اس کے دامن کو شائستہ اور بلیغ الفاظ اور محاورات کے جواہر پاروں سے بھر دیا جن کی بدولت اردو ادب نے اقصائے عالم کی نظر میں درجۂ رفعت حاصل کر لیا۔ اور خود دور حاضر کے شعرائے کرام کے مشعل راہ بن گئے۔ اقبال کو خداداد قوت گویائی ملی تھی جس کی تاثیر ہمارے درماندہ قوم کے حق میں کیمیا ثابت ہوئی۔ ان کی شاعری زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک مبصرانہ تنقید ہے۔ دنیا میں جب تک انسانیت زندہ ہے اس شاعر اعظم کو فراموش نہیں کر سکتی۔"(۶)

اُڑیسہ میں اردو تحقیق

اُڑیسہ میں اردو تحقیق کی پیش رفت میں پروفیسر اصغر علی بیدل، پروفیسر سید منظر حسن

---

(۱) مطبوعہ آرزوئے ہند کلکتہ بابت دسمبر ۱۹۶۹ء۔

(۲) مطبوعہ روزنامہ غازی کلکتہ بابت ۲۹ فروری ۱۹۷۰ء۔

(۳) مطبوعہ ماہنامہ کاف نون کلکتہ بابت اگست ۱۹۸۱ء۔

(۴) مطبوعہ دوماہی شاخسار کٹک جلد ۳ شمارہ ۲-۳ / ۱۹۶۸ء۔

(۵) مطبوعہ کاف نون کلکتہ جلد ۱ شمارہ ۴ / اکتوبر ۱۹۸۱ء۔

(۶) مطبوعہ دوماہی شاخسار کٹک جلد ۲ شمارہ ۲ ۱۹۶۸ء۔

دستوی، مولوی عبدالرشید نقادؔ، امجد نجمیؔ، مولوی عبداللطیف عارفؔ، شیخ حبیب اللہ، پروفیسر سید مسیح اللہ، شیخ مبین اللہ، ڈاکٹر کرامت علی کرامت اور راقم الحروف نے قابل اعتنا کام کیا ہے۔ ملک سے شائع ہونے والے مختلف جرائد میں مذکورہ بالا حضرات کے تحقیقی مقالے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل خواتین و حضرات نے اہم موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھ کر ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں سے ایم اے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور کچھ مقالے یونی ورسٹیوں میں پیش ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:۔

ڈاکٹر نسیمہ بیگم:۔ بخشی جگ بندھو کالج بھوبنیشور کی اردو لکچرر نسیمہ بیگم نے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس کی نگرانی میں "ترقی پسند ادبی تحریک اور مختصر افسانوں پر اس کے اثرات" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے اُتکل یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اڑیسہ کی اولین خاتون ہیں جنھوں نے اردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

ڈاکٹر سید مسیح اللہ مسیح (مرحوم):۔ سید مسیح اللہ مسیح (مرحوم) جو بنیادی طور پر راونشا کالج کٹک میں فارسی کے ریڈر رہے تھے اور میں پٹنا مونڈائی کالج کے پرنسپل کے عہدہ فائز تھے۔ رانچی یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سمیع الحق کی نگرانی میں اڑیسہ کے برگزیدہ شاعر "نجم الشعرا امجد نجمی۔ حیات اور ادبی خدمات" پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے رانچی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مسیح اللہ صاحب کا تحقیقی مقالہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

ڈاکٹر شیریں پروین:۔ شیل بالا ویمنز کالج کٹک کی اردو لکچرر مسز شیریں پروین نے رانچی یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر وہاب اشرفی کی نگرانی میں "مُلّا وجہی۔ حیات اور شاعری" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے اُتکل یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ شیریں کا تحقیقی مقالہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

سید سراج الاسلام:۔ سید سراج الاسلام شیل بالا ویمنز کالج کٹک میں اردو کے لکچرر ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں وہ رانچی یونیورسٹی

کے ڈاکٹر ابوذر عثمانی کی نگرانی میں مدیر معارف صباح الدین عبد الرحمٰن کی حیات اور ادبی خدمات پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ توقع ہے کہ جلد ہی ان کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

شیخ مبین اللہ:- شیخ مبین اللہ فقیر موہن کالج بالیسر میں اردو کے لکچرر ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے اڑیسہ کے گمنام شعراء پر ان کے متعدد تحقیقی مقالے ملک کے مؤقر جرائد میں شائع ہو کر اردو کے قارئین کی توجہ مبذول کر چکے ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین میں مجرم سنبلپوری، معلم سنبلپوری، عبد المجید بھونیا حیا، خاتم بہراج پوری اور شیخ امین اللہ چرخی جیسے صاحب دیوان اور گمنام شعراء پر لکھے گئے مضامین اڑیسہ میں اردو کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑنے میں خاصے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

موصوف ڈاکٹر کرامت علی کرامت کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ "اردو اور اڑیا کے ترقی پسند افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ" لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنا تحقیقی مقالہ جلد ہی ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لئے اُتکل یونی ورسٹی میں پیش کرنے والے ہیں۔

کشور جہاں:- اُڑیسہ میں اردو تحقیق کی پیش رفت میں ادھر کرامت علی کرامت نے خاصہ عملی قدم اٹھایا ہے۔ انھوں نے خود ۱۹۸۲ء میں سنبلپور یونی ورسٹی سے ریاضیات میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی ہے لیکن اس کے باوجود اردو تحقیق کی جانب ان کی گہری دلچسپی اور لگن نے اُڑیسہ میں اردو کے بہت سارے اساتذہ میں تحقیق و جستجو کے جذبہ کو مہمیز کیا ہے۔ شیخ مبین اللہ کے علاوہ راونشا کالج کی نوعمر اردو لکچرر کشور جہاں بھی کرامت علی کرامت کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لئے "اردو اور اڑیا کے جدید شعری رجحانات کا تقابلی مطالعہ" پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔ انھوں نے اپنا رجسٹریشن اُتکل یونی ورسٹی میں کرایا ہے۔

سید افتخار احمد آزاد:- راونشا کالج کٹک کے شعبۂ اردو سید افتخار احمد آزاد بھی کرامت علی کرامت کی نگرانی میں" ارنسٹ ہیمنگوے کا ناول " OLD MAN AND THE SEA کا ترجمہ مع مقدمہ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے اپنا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں آزاد کا یہ مقالہ اُتکل یونی ورسٹی میں پیش کر دیا جائے گا۔

فرحت شریف:- بھدرک کالج کی اردو لکچرر مس فرحت شریف ڈاکٹر شیریں بڑین کی نگرانی میں امجد نجمی کی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں جسے وہ ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لئے اُتکل یونی ورسٹی میں پیش کریں گی۔ ان کا موضوع ہے "امجد نجمی کی شاعری میں عصری شعور و آگہی"۔

عبدالخالق خاں:- فقیر موہن کالج بالیسر کے اردو لکچرر عبدالخالق خاں نے اسی سال جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے استاد ڈاکٹر نصیر احمد خاں کی نگرانی میں ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ "فسانۂ عجائب کا اسلوبیاتی مطالعہ" سنٹر آف انڈین لنگویجز، اسکول آف لنگویجز جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دہلی میں پیش کیا ہے۔

شیخ عزیز الرحمٰن عزیز:- اڑیسہ کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن عزیز نے "کرامت علی کرامت کی حیات اور شاعری" پر پروفیسر وہاب اشرفی کی نگرانی میں تقریباً ڈھائی سو صفحات کا ایک نہایت وقیع اور مبسوط مقالہ لکھ کر رانچی یونی ورسٹی میں ایم اے کے ڈسرٹیشن کے طور پر جمع کیا ہے۔

اس مقالہ میں کرامت علی کرامت کا تعارف، سوانحی حالات، کرامت کی شاعری میں ان کی شخصیت کا عکس، ان کی شخصیت پر مختلف زبانوں کے اثرات، کرامت کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، کرامت کی تنقید اور شاعری کے باہمی اثرات، کرامت کی شاعری پر تیئی روشنی، کرامت علی کرامت پر معاصرین کے اثرات اور معاصرین پر کرامت کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ سید شفیق الرحمٰن عاجز نے بڑی لگن اور محنت کے ساتھ اس مقالہ کی کتابت کی ہے۔

بہاء الدین ریاض:- این سی کالج جاج پور کے اردو لکچرر بہاء الدین ریاض "اڑیسہ میں اردو شاعری ۱۹۶۰ء تک" کے موضوع پر کلکتہ یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی نگرانی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

راقم الحروف نے بھی پیش نظر تحقیقی مقالہ کے علاوہ ۱۹۸۱ء میں اردو کے اولین عوامی ڈرامہ "مغل تماشہ" پر جواہر لال نہرو یونی ورسٹی سے پروفیسر محمد حسن صاحب کی

نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ جس میں مغل تماشہ کا فنی جائزہ اور اردو کی ڈرامہ نگاری میں اڑیسہ کے اس ادبی ورثہ کی اولیت اور مقبولیت کے تمام سماجی شواہد پیش کئے گئے۔ اس کے علاوہ باب اول میں اڑیا ناٹک۔ آغاز اور پس منظر، مغل تماشہ کے مصنف کے تفصیلی حالات زندگی اور ان کی دیگر تصانیف کا فنی جائزہ، مغل تماشہ کے اسٹیج، کردار، رقص و موسیقی اور مکالموں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا اور ساتھ ساتھ مغل تماشہ کی لسانی، سماجی اور ادبی اہمیت پر ذیلی ابواب قائم کر کے اردو کے اس اولین ڈرامہ کا فنی جائزہ لیا گیا جو بنیادی طور پر اڑیا رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ مقالہ کے آخری باب میں بنگلہ اور اڑیا عبارت کا ترجمہ، فرہنگ اور تعلیقات سے مقالہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔

"اڑیسہ میں اردو" کے تحقیقی مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں راقم الحروف کو اڑیسہ کے دور دراز علاقوں کی خاک چھاننی پڑی۔ اردو کے اثرات کی تلاش و تحقیق کے دوران فارسی اور اردو کے گراں بہا قدیم قلمی نسخے دستیاب ہوئے جو اڑیسہ میں اردو تحقیق کی دشوار گذار راہوں میں نشان منزل کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان نوادرات پارینہ میں "سکندر نامہ بحری" کا ایک مجلد قلمی نسخہ ہے جو ڈیمائی سائز کے ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مٹیالے رنگ کے دبیز کاغذ پر پکی روشنائی سے خط نستعلیق میں اڑیسہ کے ایک خوشنویس ضیاءالدین نے اس کی کتابت کی ہے۔

غلام حسین :- آغاز کتاب میں "الجزءالاول نسخۂ سکندر نامہ بحری نظامی" لکھا ہوا ہے اور اس کے نیچے مہر تصدیق ثبت ہے۔ صفحۂ اول کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خرد ہر کی کنجی آرد بدید　　　　زنام خدا سازد آنرا کلید

....　　　　.............................

صفحہ ۲۲۹ کا اختتام ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:-

"تمت تمام شد کار من نظام نسخۂ سکندر نامہ بحری من تصنیف حضرت مخدومی نظامی بوقت سہ پہر بروز سہ شنبہ بتاریخ بیست و نہم شہر شوال در عمل نواب نامدار

میر محمد افضل صوبہ دار اوڈیسا سالثہ ۱۱۲ علی در مقام رگھوناتھ پور بدولت خانہ اجودھیا رام از خط خام ضیاء الدین نام تحریر یافت اگر کسے دعوئی نماید باطل نامسموع گردد اگر کسے گرفتہ لعنت بر آباء و اجداد او باد۔"

نسخۂ مذکورہ کے آخری صفحہ (صفحہ ۲۳۰) میں ذیل کی عبارت درج ہے:۔

انا مالكه بالهبة الصحيح

غلام حسین

لالہ سری پت رائے ولد دیوان بھگت رام بتاریخ دوم شہر رمضان المبارک در سال ۱۱۷۷ھ علی بحضور آخوند محمد ذاکر صاحب و استادی میاں منوچہر صاحب بہ ایں (کذا) بندۂ عاصی غلام حسین ایں نسخۂ متبرکہ منظومہ را بخشش نمودہ قابض گردانیدند۔ فقط۔

اڑیسہ کے اولین شاعر ہردے رام جودت کا تذکرہ نساخ، عشقی، شورش، ابراہیم خاں خلیل، قاضی عبدالودود، جاوید نہال وغیرہ نے کیا ہے۔ مذکورہ بالا قلمی نسخہ سے جہاں اڑیسہ میں دور قدیم سے اردو و فارسی کلچر کی نشان دہی ہوتی ہے اور فارسی کی کلاسیکل کتابوں کے قلمی نسخوں کا تیار کروانا ونیز اپنے مطالعہ میں رکھنا سماجی اعتبار سے علمی امتیاز کی نشانی سمجھا جاتا تھا، اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لالہ سری پت رائے (لالہ) ہردے رام کا بھائی اور دیوان بھگت رام اس کے والد رہے ہوں گے۔

رسالہ روحیہ

۱۳۰ صفحات پر مشتمل کتابی سائز کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم الحروف کو معصوم پور کے علی حسن[1] سے دستیاب ہوا ہے جس میں مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین درج ہیں۔ یہ قلمی نسخہ اڑیسہ میں خط نستعلیق کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے، جس کی تفصیل اگلے صفحہ پر پیش کی جاتی ہے:۔

---

(۱) جناب علی حسن حبیبی معصوم پور کے مولوی عبدالمالک مرحوم کے صاحبزادہ ہیں۔ "اڑیسہ میں اردو" کے مواد کی فراہمی میں موصوف نے راقم الحروف کے ساتھ خاصا تعاون کیا ہے۔
(ح ن)

رسالہ روحیہ کی تفصیل

(۱) رسالہ روحیہ علم تصوف پر صفحہ ۱ سے ۱۱ تک محیط ہے۔ اس رسالہ کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے۔

"حق سبحانہٗ وتعالیٰ دل را از حسن خیال نام پسری و ذوق نام دختر نسبت بخشد آں ہر دو بغایت خوشرو ونیکو خوئی بودند چوں روح صورت روح وخوی آنہا را مشاہدہ کرد بسیار محظوظ شد........"

اختتام:۔ "اما آنچہ مشاہدہ در کلبہ وجود می دیدہ است...... بایں اغیار دبند کلبہ وجود است والسلام والاکرام۔ خدایا تو بر کار خیرم بدار و گر نہ نیاید ز من ہیچ کار۔

تمام شد کار من نظام شد۔ رسالہ روحیہ نام است۔

(۲) "رسالہ در بیان توبہ و ارادت و ذکر"

شیخ المشائخ حضرت ابوالحسن خرقانی کا لکھا ہوا یہ رسالہ نو ابواب پر مشتمل ہے جو اس قلمی نسخہ کے صفحہ ۱۲ سے صفحہ ۲۷ تک محیط ہے۔ باب اول ارادت پر۔ باب دوم توبہ دادن۔ باب سوم مقراض راندن۔ باب چہارم کلاہ پوشیدن۔ باب پنجم خرقہ پوشیدن۔ باب ششم میان بستن۔ باب ہفتم در قندیل و زنبیل و علم۔ باب ہشتم در جاروب و کچکول و وتکبیر گفتن۔ باب نہم در چہل و چہار مقام فقر دانستن۔ پر ہے۔

اس ضمن میں صاحب رسالہ نے لکھا ہے:۔

"پس سالک را باید کہ بدیں بابہا کہ بنا کردہ است اگر بتواند کار کند تا حضرت رب العلمین و نام پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و جمیع اصحاب و مشائخ رضی اللہ عنہم اجمعین از وے خوشنود شوند......"

(۳) رسالہ مرغوب القلوب

رسالہ مرغوب القلوب حضرت شمس تبریز کی تصنیف ہے۔ اس میں دس فصلیں ہیں جو صفحہ ۲۸ سے ۴۱ تک قلمی نسخہ کو محیط ہیں۔ فصل اول توبہ کے بیان میں۔ فصل دوم

روح کے بارے میں۔ فصل سوم نماز کے بارے میں۔ فصل چہارم ترک دنیا کے باب میں۔ فصل پنجم تجرید و تفرید کے باب میں۔ فصل ششم معرفت کے بارے میں۔ فصل ہفتم عشق کے بیان میں۔ فصل ہشتم عاشق و معشوق کے بیان میں۔ فصل نہم فنا کے بیان میں اور فصل دہم سفر و اقامت کے بیان میں درج ہیں۔

(۴) رسالہ بو علی قلندر

یہ رسالہ صفحہ ۴۶ سے صفحہ ۵۴ تک پھیلا ہوا ہے۔ دراصل یہ حضرت شیخ شرف شاہ بو علی قلندر پانی پتی کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔

(۵) رسالہ ارشاد نامہ در مشرب شطّار مظہری

یہ تصوف کا ایک اہم رسالہ ہے جس میں مشرب شطار مظہری میں سات میم کے تعلق پر رموز و ایماء کی گرہیں کھولی گئی ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"....... نوع دیگر در مشرب شطاری ہفت میم است باید کہ طالب ایں ہر میم را در عمل خود آرد اول میم محاسبہ، دوم میم مباحثہ، سوم میم محاربہ، چہارم میم مواعظہ، پنجم میم ملاحظہ، ششم میم مراقبہ، ہفتم میم مشاہدہ بیان آں ہفت میم تعلق از مرشد است باید کہ برسد مدد عمل خود آورد تا از ہمہ تفرقہ طالب حق باید......."

(۶) رسالہ صوفیہ (صفحہ ۶۳ سے ۷۰ تک)

اس رسالہ میں حضرت میر محی الدین، حضرت بایزید بسطامی، حضرت جنید بغدادی کے ملفوظات مرتب ہیں۔ موضوع تصوف ہے۔

(۷) رسالہ اطلاع المختصر (صفحہ ۷۱ سے ۷۶ تک)

اس رسالہ کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:۔

"حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند الفقر فخری والفقر منّی، درویش را باید کہ ایں چہار مقام بداند اول لاہوت۔ دوم جبروت۔ سوم ملکوت۔ چہارم ناسوت اگر

ترا پرسند کہ ایں چہار مقام کہ گفتے چہ معنی دارد جواب بگو اول مقام لاہوت معرفت است دوم مقام جبروت حقیقت است سوم مقام ملکوت طریقت است چہارم مقام ناسوت شریعت است بدانکہ لاہوت اسرافیل دارد و جبروت جبرئیل دارد و ملکوت میکائیل دارد ناسوت عزرائیل دارد۔"

(۸) مکتوبات حضرت نظام الدین اولیاء (صفحہ ۷۷ سے ۸۸)

یہ مکتوبات توحید کے بیان میں ہیں۔

(۹) رسالہ حضرت پیران چہاردہ خانوادہ (صفحہ ۸۹ سے ۱۰۰)

اس میں چودہ خانوادوں کے پیران طریقت کی تفصیلات درج ہیں۔

(۱۰) ترکیب خلعت مشائخان (۱۰۱ سے ۱۱۳ تک)

شیوخ کے اعتکاف کی ترکیب و تمہید تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

(۱۱) کرسی نامہ (صفحہ ۱۱۴ سے ۱۲۸ تک)

اس کرسی نامہ میں حضرت محمد مصطفےٰ ؐ، حضرت ابو بکر صدیق ؓ، حضرت عمر ؓ، حضرت عثمان ؓ، حضرت علی ؓ اور حضرت بی بی فاطمہ ؓ کی نسبتیں درج ہیں۔

باب پنجم

اُڑیسہ میں عہد جدید میں اُردو کی صورتِ حال

الف
شعروادب

اُڑیسہ کا پہلا اردو شاعر ہردے رام جودت تھا۔ پھر یہاں کے شعروادب کے قافلہ میں جن لوگوں نے شرکت کی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے معاصرین میں مقبولیت وشہرت حاصل کی ان میں سے چند ممتاز نام ہیں:۔

شیخ امین اللہ چرخی۔ مولوی محمد سلطان راجی۔ خاتم بہراج پوری۔ ظہورالحق ظہوری۔ شمس الحق شمس۔ مجرم سنبلپوری۔ عبدالمجید بھونیاں حیا۔ محمد یوسف یوسف۔ معلم سنبلپوری۔ عبدالرحیم احسن۔ عبدالستار عبد۔ جان محمد حازم۔ محمد محسن۔ نور علی انور۔ عبدالعزیز عاشق۔ رفیع الدین رفیع۔ مولا بخش شاہ مولا۔ رحمت علی رحمت۔ عبدالرشید نقاد اور فیض النساء تسخیر۔

لیکن امجد نجمی کی تخلیقات سے اُڑیسہ کی اردو شاعری کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے اور اس قافلے میں یکے بعد دیگرے جو شعراء وادباء ساتھ دیتے گئے ان میں سے تمیت النساء تمیت۔ برکت اللہ برکت۔ عبدالحلیم حلیم۔ عجیبہ خاتون عجب۔ عبدالرحیم راقم۔ عبدالحلیم نقیب۔ قادر شریف رونق۔ عنایت اللہ جراز۔ منظر حسن دسنوی۔ عبداللطیف عارف۔ حفظ الباری حافظ۔ نورالہدیٰ قائد۔ تلوک ناتھ انجم۔ شمس الہدیٰ شمس۔ مصلحت

ایزدی۔ ضمیر خاں ضمیر۔ تجمل علی فہمی۔ غلام رسول نسیم۔ سعید اختر۔ اسماعیل شمسی۔ خلیل تاباں۔ ظہیر اللہ نور۔ رحمٰن کریم شاکر۔ قادر بخش تسلیم۔ عبدالمجید فیضی۔ حیدر نایاب۔ محمد فیاض۔ رفیق داد۔ عبدالصمد واصف۔ شہید اکرامی۔ مسیح اللہ مسیح۔ اور غالب فہمی کے نام اہمیت کے حامل ہیں اور نئی آگہی اور عصری حسیت کے اظہار کے لئے نئی جہتوں کی تلاش میں پیش پیش رہے ہیں۔

ملک میں اردو کی جدید شاعری کے میلانات اور رجحانات کا اڑیسہ کی شاعری پر بھی خاصہ اثر پڑا اور نتیجہ کے طور پر یہاں اردو کے جدید شاعروں کی ایک نئی نسل ابھری جن میں کرامت علی کرامت۔ بہاء الدین ریاض۔ الطاف حسین حسرت۔ جبار غنی۔ جبار جلیل۔ سعید رحمانی۔ معزہ خاتون موزوں۔ شکیل دسنوی۔ خالد رحیم۔ یوسف جمال۔ ساجد اثر۔ اطہر عزیز۔ نفیس منظر۔ رشمی کانت راہی۔ اسماعیل آذر۔ ابرار احمد ابرار۔ قاسم خلش۔ راشد شبنم۔ قیوم قریشی۔ حامد ندیم۔ علی یوسف نیر۔ اختر حسین شافی۔ عبدالمتین جامی۔ مجیب الرحمٰن مکیش۔ اعظم علی جوہر۔ الطاف نادر۔ مظہر مجیدی۔ صفدر علی خاور۔ ابو داؤد نادر۔ انور علی انور۔ ظہور اختر۔ نور الٰہی ناطق۔ اولاد رسول قدسی۔ غریب مسافر۔ اثر نظامی۔ ریاض تشنہ وغیرہ کا نام بار بار سامنے آتا ہے۔ خاور نقیب کا شمار مابعد جدیت کے ابھرتے ہوئے شاعروں میں ہوتا ہے۔

جو بیرونی حضرات تادیر اڑیسہ میں مقیم رہے اور اڑیسہ میں اردو کی ادبی تحریکوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی شعری اور ادبی تخلیقات سے اڑیسہ میں اردو کی پیش رفت میں اہم کارنامے انجام دیئے ان میں سے شمس منیری۔ اصغر علی بیدل۔ مظہر امام۔ عبدالجلیل نجم۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن۔ اوج اعظمی۔ فرحت زیدی۔ سیلانی سیوتے۔ خالد شفائی۔ خان نیازی۔ گھائل فریدی۔ ڈی این شرما منور۔ پنہاں لکھنوی۔ شجاع الدین ہمدانی عباس پرویز۔ نذیر چشتی۔ افضال بیدار وغیرہ کی خدمات اڑیسہ کی اردو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

مذکورہ بالا اصحاب قلم میں سے اہم فن کاروں کا تذکرہ اور ان کا نمونۂ کلام اگلے اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے جس کے مطالعہ سے اڑیسہ میں اردو کی سمتوں اور رفتار کی نشان دہی ہو سکے گی۔ ان میں سے چند اصحاب قلم کی تخلیقات ملک کے مؤقر ادبی جرائد میں شائع ہو کر منظر عام پر آتی رہی ہیں اور کچھ لوگ جو نسبتاً زیادہ داخلیت پسند ہیں اور نام و نمود سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے، ہنوز ان کی تخلیقات غیر مطبوعہ ہیں۔

پیش نظر باب میں جن اصحاب قلم کا انتخاب کیا جارہا ہے ان کی تخلیقات کے نمونوں کا ماخذ آب خضر، اخبارات ورسائل اور ان حضرات کی بیاضیں اور قلمی مسودے ہیں۔

مولوی سید برکت اللہ برکتؔ

۱۹۰۵ —— ۱۹۷۹ء

مولوی سید برکت اللہ برکتؔ کی ولادت شہر کٹک میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔[1] ان کے والد سید مکرم علی کٹک کے معروف تاجر تھے۔ برکتؔ کی تعلیم گھر پر ہی اتالیقوں کے توسط سے ہوئی۔ عربی فارسی اور اردو کے متبحر عالم، خطیب اور شاعر تھے۔ انھیں عبدالرحیم احسنؔ سونگڑوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ان کے آباء واجداد بہ سلسلۂ تجارت مرشد آباد سے کٹک آئے تھے اور یہاں مستقل بودوباش اختیار کرلی تھی۔ ان کا خاندانی سلسلہ سادات بارہ سے ملتا ہے۔ اس خاندان نے تجارت میں ترقی حاصل کرنے کے بعد زمین داریاں حاصل کیں جن کا تعلق کٹک اور پوری ضلع سے تھا۔ مولوی برکت اللہ صاحب نے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی تھی۔ طویل عرصے تک اڑیسہ میں جمعیۃ العلماء ہند کے صدر رہے۔ ہندو مسلم قومی اتحاد قائم رکھنے کے سلسلے میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ مولانا کو مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ عربی فارسی اور اردو کتابوں کا قابل اعتناء ذخیرہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود رہے۔ ان کی شادی ایک جدّی بہن سے ہوئی جن سے پانچ لڑکے ظہیر اللہ۔ مسیح اللہ۔ شفیع اللہ۔ وسعت اللہ اور عبید اللہ اور چار لڑکیاں تولد ہوئیں۔ ان کی اولاد میں ظہیر اللہ نورؔ اور مسیح اللہ مسیحؔ کی شعری تخلیقات اڑیسہ کی اردو تحریک میں اہمیت رکھتی ہیں۔

مولوی برکت اللہ برکتؔ اردو اور فارسی کے ایک پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں قومی اور ملّی مسائل کو پیش نظر رکھا اور اڑیسہ کے کہنہ مشق شعراء میں درجۂ امتیاز حاصل کیا۔ ان کی نظمیں "مسلم گزٹ سے خطاب"۔ "گاندھی جی"۔ "دل"۔ اور "انسان"

---

(۱) کرامت علی کرامتؔ: آب خضر اگست ۱۹۶۳ء؛ ص ۱۶۹۔

ان کی پختہ کار شعری صلاحیتوں کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کی غزلوں پر تصوف کا رنگ حاوی رہتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر ؎

تبسم ریز ہے یک غزنوی شکل ایازی میں ⁂ حقیقت دیکھ لے پنہاں ہے پوشاک مجازی میں

ان کے دورِ آخر کے کلام میں ترقی پسند رجحانات کی غمازی اس شکل میں ملتی ہے ؎

میخانۂ جمہور کے ساقی یہ بتانا کیوں چھین لیا جاتا ہے پیمانہ کسی کا

مولوی سید برکت اللہ برکت اُڑیسہ کی اردو شاعری میں اعلیٰ مرتبت کے حامل تھے۔ ان کے اردو اور فارسی کلام کا قابلِ اعتنا اثاثہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور ان کے ورثا کی تحویل میں محفوظ ہے۔ ان کے ورثا کے عدمِ تعاون کی بنا پر ان کی شاہکار تخلیقات کے نمونے منظرِ عام پر نہیں آسکے۔ طویل مدت تک مولانا بزم ادب کٹک کے صدر رہے ہیں۔ شہر کٹک میں ان کے تلامذہ وافر تعداد میں موجود ہیں۔

اپنی رہائش گاہ کرم منزل اُڑیا بازار کٹک میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۹ء کو داعئ اجل کو لبیک کہا۔(۱)

نمونۂ کلام

ذرّہ میں مہر، قطرہ میں دریا لئے ہوئے آیا ہوں بزمِ ہست میں کیا کیا لئے ہوئے

معشوق دل نواز بھی، عاشق مزاج بھی غمزہ لئے ہوئے دلِ شیدا لئے ہوئے

کور بُئی بولہب بھی ضیائے کلیم بھی تبت یدا لئے یدِ بیضا لئے ہوئے

اک مشتِ خاک جامعِ اضدادِ کائنات رنگیں تماشہ طرفہ کرشمہ لئے ہوئے

ہر لحظہ اضطرابیٔ اضداد در سرم

در حیرتم کہ رفتہ بمنزل چساں برم

کس منہ سے عافیت کی تمنا کرے کوئی شیدائے غم ہو دل ہی اگر کیا کرے کوئی

اک جنبشِ نگاہ نے مستانہ کر دیا کیوں اہتمام ساغر و مینا کرے کوئی

---

(۱) تاریخ وفات ان کے صاحبزادہ ظہیر اللہ نور سے حاصل ہوئی۔

رہبر ہے دردِ عشق ہی وادیٔ عشق کا
کیوں جستجوئے نقشِ کفِ پا کرے کوئی

کہوں میں جا کے یہاں کس سے مدعا دل کا — ہے دو جہاں پہ چھانے کا حوصلہ دل کا
قدم قدم پہ مصیبت روش روش پہ خلش — ہے ایک مخزنِ اندوہ مرحلہ دل کا
ہوا یہ تجربہ مدت کی کاوشوں سے ہمیں — کہ دل ہے رہزنِ دل، دل ہے رہنما دل کا
فسانۂ دلِ شوریدہ کیا کہیں برکت
ہے رنج و درد سے لبریز ماجرا دل کا

مولوی عبدالحلیم حلیم

ولادت ۱۹۱۰ء

مولوی عبدالحلیم کی ولادت آبِ خضر میں مندرجہ سنہ کے مطابق ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔(۱) لیکن ان کے صاحبزادہ کمال ظفر کی تحریر کے مطابق ان کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں پرگنہ بالوبیسی ضلع کٹک میں ہوئی۔(۲) مولوی عبدالحلیم اڑیسہ میں اردو کے سب سے قدیم صاحب دیوان شاعر شیخ امین اللہ جرحیؔ کے بھتیجے اور متبنیٰ فرزند عبدالمجید مجیدؔ کے پوتے اور مولوی عبدالرشید قاصر کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد کا شمار بالوبیسی کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ حلیم بچپن میں اپنے والد ماجد کے زیرِ تعلیم رہے۔ اس کے بعد دھام نگر کے مدرسہ میں مجاہد ملت سید محمد حبیب الرحمٰنؒ کی نگرانی میں کچھ دنوں تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ لیکن مدرسہ کے نظام میں کمزوری پیدا ہونے کی بناء پر مدرسہ سلطانیہ کٹک میں داخلہ لے کر ملّا اور مولوی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے کلکتہ گئے اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں

---

(۱) کرامت علی کرامت: آبِ خضر مطبوعہ ۱۹۶۳ء؛ ص ۱۶۹۔
(۲) کمال ظفر: اڑیسہ کے ایک بزرگ شاعر مولانا عبدالحلیم حلیم؛ مطبوعہ صدائے اڑیسہ کٹک جلد ۲ شمارہ ۱۷، ص ۵۔

۱۹۲۶ء میں داخلہ لیا۔ اور یہاں سے عالم و فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حلیم کو شاعری کا ذوق وراثتاً نصیب ہوا ہے۔ انھوں نے دوران تعلیم اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا میں انھوں نے پٹنہ یونی ورسٹی کے فارسی کے پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ عظیم آبادی سے اپنی تخلیقات پر اصلاح لی۔ اور بعد میں ساغرؔ لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پٹنہ کے دوران قیام ان کی نظمیں اور مضامین ماہنامہ "ندیم" گیا اور دیگر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ مختلف مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بھی وہ حصہ لیتے رہے۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کرنے کے بعد مولوی عبدالحلیم اُڑیسہ واپس آگئے اور اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے ۱۹۳۱ء میں ان کا تقرر مسلم سیمنری کٹک (ثم سعید سیمنری) میں ہوا۔ سال دو سال بعد انھیں سنبلپور ضلع اسکول میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۳ء تک سنبل پور ضلع اسکول، ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک راونشا کالجیٹ کٹک، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک بالیسر ضلع اسکول اور وہاں سے پھر سنبل پور ضلع اسکول میں ان کا تبادلہ ہوگیا۔ جہاں ۱۹۶۸ء تک تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوکر بالیسر میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ پٹنہ کے دوران قیام ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مجموعۂ کلام "موج نسیم" برقی پریس پٹنہ سے شائع کیا۔ "موج نسیم" کے آغاز میں ان کے والد مولوی عبدالرشید قاصرؔ کی ایک حمد اور تین نعتیں شریک اشاعت ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں ادارہ صدائے اُڑیسہ کٹک کی جانب سے مولوی عبدالحلیم حلیمؔ کو ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

حلیم کی غزلوں میں تصوف کی چاشنی اور ان کی نظموں میں قومی و ملی شعور کا عکس ملتا ہے۔

نمونۂ کلام

توبھی تو تیغ دہر میں ہوجا حقیقت آشنا
سارا جہاں پرو چکا شیرازۂ مجاز میں

کوئی جو با نقاب ہو کر دیں گے بے نقاب ہم
اتنا سا جرم ہے روا آئین سوز و ساز میں

اللہ رے یہ ولولے، یہ تازہ تازہ حوصلے
میں بھی کوئی طلسم ہوں دنیائے امتیاز میں

اک میں کہ میری ہر روش سے ہے زمانہ منحرف
اک وہ کہ ان کی ہر ادا ہے معرضِ نیاز میں

یہ کس کی موجِ شمیم کا کل فضا میں عنبر لٹا رہی ہے
کہ دل کے غنچوں کو خود نسیم اپنی مستیوں سے کھلا رہی ہے
حیات حرکت سے ہے عبارت، سکون ہے موت کی نشانی
سنے تو کوئی کہ موجِ دریا ہمیشہ یہ گیت گا رہی ہے
حلیمؔ کیا کیجے کہ فطرت کی کارفرمائیاں یہی ہیں
شباب پھولوں کا لٹ رہا ہے، بہار کلیوں پہ آ رہی ہے

زبان اُردو اور اُڑیسہ

اے اُڑیسہ اے دیارِ شاہدِ اُڑیا زباں
تیرے طول و عرض میں اردو بھی ہے جلوہ فشاں

گرچہ آبادی ہماری ہے یہاں دو فیصدی
لیکن اردو ہی ہماری ہے زبانِ مادری

رشک کے قابل اقلیت ہماری ہے یہاں
ہے جدا تہذیب اپنی ہے جدا اپنی زباں

اپنے ہمسایوں سے ہے مشرب ہمارا مختلف
ہے جدا مذہب عقیدت کا ہے دھارا مختلف

دامن اردو سے ہم وابستہ ہیں لیل و نہار
اپنے گلزارِ تخیل کی اسی سے ہے بہار

اردو کے دم سے درخشاں ہے ہماری قومیت
اس سے قائم ہے ہماری انفرادی حیثیت

ہے یہ سرچشمہ ہمارے دینی رجحانات کا
ترجماں ہے یہ ہمارے قلبی احساسات کا

ہند کی ساری زبانوں میں یہی ممتاز ہے
گونجتی فلموں میں بھی اردو ہی کی آواز ہے

اُڑیا کے ماحول میں یہ پھولتی پھلتی رہی
شمع اردو آج کیا ہر دور میں جلتی رہی

دامنِ اڑیا بھی ہم نے ہاتھ سے چھوڑا نہیں
اس سے اپنا رشتۂ علمی کبھی توڑا نہیں

اردو اور اُڑیا غرض دونوں کے ہم ہیں نغمہ خواں
دونوں پر ہے دسترس دونوں ہیں اپنی زباں

اُڑیا کے ماحول میں گرچہ ہوئی نشو و نما
اے حلیمؔ اردو سے لیکن رابطہ اپنا رہا

عجیبہ خاتون عجبؔ

اُڑیسہ کے علمی اور ثقافتی مرکز میں سونگڑہ میں عجیبہ خاتون عجبؔ کی ولادت ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے گھر کے علمی اور ادبی ماحول میں خانگی تعلیم حاصل کی۔ طبیعت میں شروع سے ہی شاعرانہ رچاؤ تھا۔ وسعت مطالعہ اور فطری مناسبت سے انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ مشق سخن اور طبعی ذوق کی بنا پر ان کے کلام میں پختگی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ بہت سارے منظوم خطوط بھی لکھے ہیں۔ ان کے یہ خطوط تمت النساء تمت کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اُڑیسہ کے شعرائے اردو کے تذکرہ "آب خضر" میں ان کی ایک نظم "گورنر آصف علی کی آمد پر" اور پانچ غزلیں شریک اشاعت ہیں۔ ان کی چند غزلیں دو ماہی شاخسار کٹک میں بھی شائع ہوئیں لیکن اردو کے مرکز سے دور رہ کر سونگڑہ جیسی جگہ سے ایک پردہ نشیں خاتون کا اپنی تخلیقات کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دینا زیادہ ممکن بھی نہ تھا۔ ان کی طویل ادبی خدمات کی بنا پر ۱۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو ماہنامہ صلائے اڑیسہ کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا لیکن شومیٔ قسمت سے ۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو ہی کٹک میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نمونۂ کلام

اِدھر غنچوں کے کانوں میں صبا کچھ اور کہتی ہے
اُدھر گلشن میں بادِ تند پا کچھ اور کہتی ہے

اِدھر اہلِ چمن پر تولنے کی مشق کرتے ہیں
اُدھر صیاد کی زلف دوتا کچھ اور کہتی ہے

اشارہ گرچہ ہے کچھ اور ہی ابروئے قاتل کا
مگر ہم سے وہ چشم سرمہ سا کچھ اور کہتی ہے

عجبؔ اے طائر بد بخت تو مائل بہ پستی ہے
ادھر تجھ سے فضائے ارتقا کچھ اور کہتی ہے

یہ عیش و راحت دنیائے عارضی کیا ہے
جسے دوام نہ حاصل ہو وہ خوشی کیا ہے

کہاں گیا وہ ترا شیوۂ براہیمی
ترے چلن میں یہ انداز آذری کیا ہے

نمود جس سے ہو مقصود وہ ریاضت کیا
خلوص جس سے نہ ٹپکے وہ بندگی کیا ہے

جذبۂ دل کوئے جاناں تک پہنچ کر رہ گیا
جا کے آبِ خضر تک تشنہ سکندر رہ گیا
نکلے تھے عشاق قسمت آزمائی کے لئے
ان کے سنگِ در سے ٹکرا کر مقدر رہ گیا

حکیم عبدالرحیم راقمؔ

ولادت ۱۹۱۲ء

نام عبدالرحیم۔ تخلص راقمؔ۔ ۱۴ مارچ ۱۹۱۲ء[1] کو کٹک کے صوبہ دارنی بلاک بخشی بازار میں پیدا ہوئے۔ راقمؔ کے والد شیخ عبدالستار کی ولادت بھی کٹک میں ہوئی۔ ان کے جدِ امجد شیخ الٰہی بخش احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ کٹک آکر انھوں نے پیشۂ خیاطی اختیار کیا اور کٹک میں ہی مستقل طور پر بود و باش اختیار کر لی۔ عبدالرحیم راقمؔ اوائل عمری میں جان محمد حازمؔ سے درس لیا کرتے تھے۔ حازمؔ شہر کٹک کے ایک پرگو شاعر تھے۔ اپنے ایک رفیق کار احمد علی عیسیٰ سے راقمؔ کو شعر گوئی کی تحریک ملی۔ راقمؔ نے شعر کہنا شروع کیا۔ پروفیسر اصغر علی بیدلؔ سے ابتدائی دور میں اصلاح لی۔ اصغر علی بیدلؔ راونشا کالج سے ریٹائرڈ ہو کر اپنے وطن مظفر پور چلے گئے تو راقمؔ نے مولوی برکت اللہ برکتؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ بالآخر امجد نجمی کے کٹک آنے پر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

کٹک میں بزم ادب کے آغاز سے ہی وہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ راقمؔ زود گو شاعر نہیں ہیں۔ تادمِ تحریر ان کی تقریباً ڈیڑھ سو غزلیں بیاض میں لکھی ہوئی ہیں۔

---

(۱) کرامت علی کرامت، آبِ خضر ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۹۔

چھپنے چھپانے سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ رہی۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوتے حکومت اڑیسہ نے انھیں ۱۹۸۳ء میں تاحیات وظیفۂ فن کار عطا کی ہے۔ان کا کلام تغزل سے بھر پور ہے جس میں سنجیدگی ،ٹھہراؤ اور توازن پایا جاتا ہے ۔نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

نمونۂ کلام

بڑی مشکل سے اب تو کٹ رہی ہے زندگی اپنی ہمیں در در پھراتی ہے جہاں میں بے بسی اپنی
بتوں کے دل میں جب سے ہوگئی ہے دشمنی اپنی نہ رہنے پائے دنیا میں کبھی ہم چین سے یارب

جمال یار آنکھوں میں تصور دل میں ہے راقم
اسی کے نور سے روشن ہے ساری زندگی اپنی

قدم پھر ڈگمگا کر رہ گئے ہیں کرم کی اک نظر ساقی ادھر بھی
دیئے پھر ٹمٹما کر رہ گئے ہیں اٹھا ہے آج کس کے رخ سے پردہ

وہی گل پھر کھلا گلشن میں راقم
جسے دشمن مٹا کر رہ گئے ہیں

کلیجہ منہ کو آئے گا سنو گر داستاں ہم سے دلِ مجبور کا تم پوچھتے ہو کیا بیاں ہم سے
نہیں غم ،ہوں مخالف یہ زمین و آسماں ہم سے تمھارے نام کا ہی ورد ہم دن رات کرتے ہیں

مریضِ ہجر پر اب تو خدارا رحم فرماؤ
اٹھایا جا نہیں سکتا یہ اب بارِ گراں ہم سے

آئے گا تجھ سے ملنے تیرا بے قرار دیکھ
شمع جلا کے راہ شبِ انتظار دیکھ
تو اپنے دل کے شیشے میں تصویرِ یار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

غزل در غزل

پہلا سا اب وہ رنگ نہیں لالہ زار میں
وہ کیف اب وہ لطف نہیں ہے بہار میں

کب آئے گی بہارِ چمن ہے یہ انتظار
بے چین عندلیب ہے اجڑے دیار میں

اب اس سے بڑھ کے خوشی کیا ملے گی دوست
دو جہاں ملے ہیں مجھے تیرے پیار میں

مجھ کو غرض حرم سے نہ الفت ہے دیر سے
اب سر جھکا ہوا ہے میرا کوئے یار میں

بسمل ہزار ہو گئے کی جس طرف نگاہ
جو ہے نظر میں وہ نہیں خنجر کی دھار میں

یہ ہجرِ یار بھی ہے عجب درد لادوا
پایا نہیں قرار دلِ بے قرار میں

راقم کٹی ہے مانا گناہوں میں زندگی
کچھ کم نہیں ہے رحمتِ پروردگار میں

دل میں ارمان رہ گئے دل کے
بات بھی ہو نہ سکی مل کے

دیکھ کر شکل میری مقتل میں
ہاتھ شل ہو گئے قاتل کے

آ گئی ہے بہار گلشن میں
آؤ خوشیاں منائیں مل مل کے

دل میں ارمان دید کے لے کر
کب سے ٹھہرا ہوں پاس محمل کے

وائے تقدیر میری کشتیِ دل
ہو گئی غرق پاس ساحل کے

تم نے دیکھا ہے ان کو بھی راقم
جن کے گالوں پہ داغ ہیں تل کے

آج سہارے چھوٹ گئے ہیں
بن کے مقدر پھوٹ گئے ہیں

عشق میں ان کے جانے کتنے
پیار بھرے دل ٹوٹ گئے ہیں

جانے والے آنکھ ملا کر
دل کی دنیا لوٹ گئے ہیں

تاروں بھری راتوں میں اکثر
رنگین سپنے ٹوٹ گئے ہیں

ایک ادائے رنگیں بن کر
میرا دل وہ لوٹ گئے ہیں

اب میں بھروسہ کس پر کروں جب — پیار کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں
اک ایک کر کے کتنے ایسے — آبلے دل کے پھوٹ گئے ہیں
ہم بھی راقم ہجر میں ان کے
چھاتی اپنی کوٹ گئے ہیں

راقم کی غزل کے مطالعہ سے سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں زبان کا غیر پیچیدہ استعمال، ان کے استعارے غیر مبہم اور معنوی اعتبار سے وسعت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں روزمرہ کا استعمال کیا ہے اور اڑیسہ میں مروج اردو محاوروں کا بھی۔ مثلاً "چھاتی کوٹنا" اڑیسہ میں محاورہ ہے۔

سیّد عبدالحلیم نقیب

ولادت ۱۹۱۲ء

سیّد عبدالحلیم نام۔ نقیب تخلّص۔ ولادت ۱۹۱۲ء میں سونگڑہ ضلع کٹک میں ہوئی۔ زمانۂ دراز تک مدرسہ سلطانیہ کٹک میں مدرس رہے۔ بعد میں انھوں نے ریلوے میں ملازمت حاصل کی اور خوردہ روڈ جنکشن میں متعین ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اڑیا بازار اردو گرلز اسکول کٹک میں ان کا تقرر ہوا۔ مدرسہ سلطانیہ کٹک میں تدریس کے دوران عرصۂ دراز تک بزم ادب، کٹک کے سکریٹری رہے۔

نثر میں ان کے روزنامچے ادبی حیثیت کے حامل ہیں لیکن طبعی رجحان زیادہ تر شاعری کی طرف مائل رہا۔ انھوں نے وافر تعداد میں غزلیں کہی ہیں۔ رنگ سخن روایتی ہے۔ اشعار میں تغزل اور اظہار میں جدت ہے۔

ان کے فرزندوں میں سید علی یوسف نیّر اور سید نورالہی ناطق کو بھی شاعری سے لگاؤ ہے اور ناطق موجودہ دور میں اڑیسہ کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں بطور خاص نقیب بھی!

سید عبدالحلیم نقیب کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

طالب وصل ہے اگر وعدوں پہ اعتبار کر — پیدا دلِ ملول میں لذّتِ انتظار کر
محو تجلّی گر کوئی جل ہی مرا تو جل مرے — اس سے تجھے ہے کیا غرض حسن کو شعلہ بار کر
ظلمت درونِ قبر کی شمع لحد سے کیا مٹے — نورِ چراغ حسن سے روشن مرا مزار کر
لطفِ بہار گر نہیں تیرے نصیب میں نقیبؔ
داغِ دلِ خراب کو رشکِ گُل بہار کر

واقف ہوں خوب ہمنشیں دیر و حرم کے راز سے
خانۂ بت نواز سے سجدہ گہِ نیاز سے
تو بھی زمیں نواز ہے میں بھی زمیں بوس ہوں
میری نماز کم نہیں زاہد تیری نماز سے
شور و فغاں و بانگ آہ کچھ بھی نہیں تو لطف کیا
محفلِ حسن و عشق کی رونق ہے سوز و ساز سے
شوخی و فتنہ و غرور غمزہ ادا و عشوہ ناز
پاتے ہیں پرورش نقیبؔ ان کے حریم ناز سے

سرشار چشم ناز کو حاجت جام ناب کیا — محو سرودِ عشق کو چنگ و دف و رباب کیا
عیش و نشاطِ زندگی منت کش وصال ہے — محروم وصل کے لئے لطف مے و شباب کیا

سیّد منظر حسن دسنوی

ولادت ۱۹۱۴ء

سید منظر حسن دسنوی کی پیدائش دیسنہ ضلع نالندہ (بہار) میں فروری ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کرکے اپنے والد سید آل حسن کے ساتھ جو

بسلسلۂ ملازمت رانچی میں مقیم تھے، چلے گئے۔ فارسی اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھیں۔ پھر منظر صاحب پٹنہ چلے آئے۔ اور رام موہن رائے سیمنری میں داخل ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۲۹ء میں انھوں نے میٹرک پاس کیا۔ بعد ازاں ان کا داخلہ پٹنہ کالج میں ہوا۔ اسی کالج سے ۱۹۳۳ء میں بی اے پاس کیا۔ پھر دو سال پٹنہ ٹریننگ کالج میں تعلیم پائی۔ اور ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کر کے بہار کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت شروع کی۔ دربھنگہ اور موتی ہاری کے سرکاری اسکولوں میں ڈھائی سال اسسٹنٹ ماسٹر رہے۔ پھر ۱۹۳۶ء میں بھاگلپور سیکنڈری ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں معلم مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء تک یہاں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی درمیان میں انھوں نے ۱۹۴۱ء میں پرائیوٹ طور پر پٹنہ یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی خدمات حکومت اڑیسہ کو منتقل کر دی گئیں اور وہ راونشا کالج کٹک میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور کٹک کے اڑیا بازار (بانس گلی) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شاعری کا شوق منظر صاحب کو کٹک کے ادبی ماحول میں ہوا۔ ان کی طبیعت کا رجحان غزل گوئی کی جانب ہے۔ ان کی غزلیں پیام مشرق دہلی، سب رس حیدر آباد، بیسویں صدی دہلی، جمالستان دہلی اور شاخسار کٹک میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔

نمونۂ کلام

ہاتھ میں آکے ترے گل ہوا ممنون ترا — چاہتا تھا یہ ذرا اور نمایاں ہونا

دیکھا جو دل محزوں کو ہم نے ایک عجب ویرانہ تھا — اجڑی ہوئی محفل تھی گویا ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

ان کی نظروں کا گلہ کیا؛ شکوۂ اغیار کیوں؟ — خود ہمارا شوق نکلا فتنہ ساماں دیکھئے

منظر صاحب نے شعوری طور پر حسرت، شاد، جگر وغیرہ سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ زندگی کے پختہ تجربات کی جھلکیاں ان کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ ان کی چند غزلیں ملاحظہ ہوں۔

غزلیں

اک میرے نکلنے سے ساقی کچھ رونق محفل کم نہ ہوئی
جاری رہا دورِ پیمانہ شمعوں کی ضیاء مدھم نہ ہوئی

آئی جو بہاراں ہم نفسو یہ رنگ گلستاں کا دیکھا
غنچے تھے تبسم سے عاری اور گریہ کناں شبنم نہ ہوئی

کیا شعلہ نوائی سے حاصل اور دیدہ وری کیا کام آے
جب نرگس و گل کے شیون سے پامالیٔ گلشن کم نہ ہوئی

میں تشنہ لبی کو نشّہ کہوں اور جور و جفا کو لطف و کرم
کب سر پہ مرے آرے نہ چلے کب مشقِ ستم پیہم نہ ہوئی

بے دردِ ستار و بتلاؤ کیا حال تھا میرا فرقت میں
کب دل کی خلش نے چین دیا کب آنکھ مری پرنم نہ ہوئی

اک سمت چھلکتے پیمانے اک سمت رخِ روشن تیرا
یہ محفل تیری اے ساقی کب باعثِ رشکِ ارم نہ ہوئی

پیمانے میں جو شئے رکھی تھی وہ صہبا تھی صہبا ہی رہی
بس تیرے ہی پینے سے واعظ کوثر نہ ہوئی زمزم نہ ہوئی

تم تندیٔ مے کے قائل ہو لیکن ذرا اس پر غور کرو
کیوں نشّۂ مے سے بھی منظر وہ زلف رسا برہم نہ ہوئی

دیکھا جو دلِ محزوں کو ہم نے ایک عجب ویرانہ تھا
اُجڑی ہوئی محفل تھی گویا ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

کیا تجھ کو بتائیں اے ساقی کل بزم میں ہم پر کیا گذری
گردش میں ہماری قسمت تھی چکر میں ترا پیمانہ تھا

وہی تنہائی کا عالم، وہی ہے یادِ ہجراں کی — وہی میں ہوں وہی سوزِ غم ہائے نہانی ہے
زمانہ لے رہا ہے امتحاں کیوں شوق کا میرے — دلِ خستہ مرا اب عمرِ رفتہ کی نشانی ہے

قفس ہے اور تصور ہے روئے جاناں کا — خزاں بھی اب کی برنگ بہار گذری ہے

غمِ حیات بتادے مجھے کدھر جاؤں — اِدھر ہے منزلِ جاناں اُدھر قضا میری

تلخیٔ دوراں ہے منظر اس قدر ہمت شکن
اب کہاں تک کیجئے زلفوں کو سلجھانے کی بات

مولوی عبداللطیف عارف

ولادت: ۱۹۱۴ء

محمد عبداللطیف نام۔ عارف تخلص۔ ابن الحاج محمد عبدالعلی مرحوم جولاساہی کٹک میں ۱۲ مارچ ۱۹۱۴ء بروز پنجشنبہ بوقت ۸ بجے شب تولد ہوئے۔ مولوی تک کی تعلیم مدرسہ سلطانیہ کٹک میں حاصل کی۔ عالم اور فاضل کے امتحانات پرائیوٹ طور پر بہار مدرسہ کے ایگزامنیشن بورڈ پٹنہ سے پاس کئے۔ ان کے جدِ امجد حسین احمد مرحوم جولاساہی کٹک کے بانی تھے۔ دادا عبدالغنی تجارت پیشہ تھے۔ خاندان میں درس و تدریس کی جانب ان کے چچا عبدالرشید نقاد مائل ہوئے۔ بعد میں عارف نے بھی پیشۂ معلمی اختیار کیا۔ ۱۹۳۳ء میں جو نئر اسکول بنجھارپور میں معلم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم سیمنری کٹک آ گئے۔ مولوی عبدالرشید نقاد سے شاعری کی تحریک ملی۔ تخلص عارف ان ہی کا عطا کردہ ہے۔ عارف نے منشی عبدالرحیم احسن سے خوش خطی کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۸۲ء تک ایک مثالی استاد کی حیثیت سے مسلم سیمنری (اب سعید سیمنری) میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد جون ۱۹۸۲ء میں ملازمت سے سبکدوش

ہونے کے بعد کمزوریٔ صحت کی بناء پر عزلت نشیں ہیں۔

ابتدائی دور میں عارف نے حضرت نقاد سے مشورۂ سخن کیا اور پھر بعد میں امجد نجمی سے مشورۂ سخن کیا۔ عارف کی بیاض میں ان کا مکمل شعری سرمایہ بالترتیب محفوظ ہے۔

بیاض عارف میں پہلی غزل ۵ رنومبر ۱۹۵۰ء کی ملتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

شبِ فرقت میں سن کر نامۂ درد نہاں ہم سے
چرایا بلبلِ ناشاد نے طرزِ فغاں ہم سے

ان کی آخری غزل ۵ رجون ۱۹۷۵ء کی ہے لیکن اسی بیاض میں ایک نظم بعنوان "چند پند" اور ایک الوداعی نظم بھی ہے جس میں کلام کی پختگی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عارف نے شاعری کا آغاز ۱۹۴۰ء کے آس پاس کیا ہوگا لیکن اس دہے میں ان کی شاعری زیادہ فعال نہ رہی ہوگی اور اس کی وجہ محض شعری تحریک کا فقدان ہوگا۔

بیاض عارف میں ۱۲۳ غزلیں ہیں جن کا عرصۂ تخلیق ۵ رنومبر ۱۹۵۰ء سے ۵ رجون ۱۹۷۴ء تک محیط ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک عارف نے بزم ادب کٹک کے مشاعروں میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کی ہے۔ ۹ رفروری ۱۹۵۸ء کو انھوں نے بزم سخن کے مشاعرے میں اپنی ۱۵ اشعار پر مشتمل ایک غزل پیش کی تھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ظالم نہ پھینک ہاتھوں کو رنگیں بنا کے دیکھ — پنہاں قتیلِ ناز کا خوں ہے حنا نہیں
مانا کہ چشم قہر ہے ہر لمحہ دل گداز — امید گاہ لطف کوئی دوسرا نہیں

۱۲۳ غزلوں کے علاوہ عارف نے اہم نظمیں بھی کہی ہیں جو بیاض عارف میں بالترتیب درج ہیں۔ ان کے متفرق اشعار سے رنگ سخن ملاحظہ ہو۔

بشر کو جانے کیوں مرہونِ آب وگل سمجھتے ہیں — اسے اہل خرد تو عشق کا حاصل سمجھتے ہیں
اسی میں لذت ارماں، اسی میں امتحان دل — تو کیوں احباب غم کو خنجر قاتل سمجھتے ہیں
نشاطِ زندگی سعیٔ مسلسل کا نتیجہ ہے — حقیقت کیوں نہ اس کی حضرت غافل سمجھتے ہیں

جو غرق آرزو ہیں ان کی بیتابی کا کیا کہنا
وہ ہر ایک درمیانی موج کو ساحل سمجھتے ہیں

تجھ کو لے کر کیا کروں پیری میں اب لے آئینہ — انحطاط حسن کا اب دور داخل ہوگیا

عشق کی محرومیوں کا حال مجھ سے کچھ نہ پوچھ — آرزو دل میں رہی میں غرق ساحل ہوگیا
جان دینے کو چلے آتے ہیں پروانے کھنچے — کون ہے وہ شمع رو جو زیبِ محفل ہوگیا
کس قدر رنگینیٔ دنیا میں پنہاں ہے کشش
جس نے اس کو اک نظر دیکھا تو مائل ہوگیا

سوزش غم کے پھپھولے جو نمایاں ہوں گے — آپ بھی دیکھ کے انگشت بدنداں ہوں گے
ان کی آمد پہ نہ ہو خندہ زن اے زخم جگر — کہیں ہاتھوں میں لئے دیکھ نمکداں ہوں گے
خونچکاں دل رہے گر غم میں تمہارے ہر دم — پھر تو داماں جگر رشک گلستاں ہوں گے
بزم میں آج ہے کچھ لطف سخن کا چرچا
عارف شیریں زباں آج غزل خواں ہوں گے

ہاں بسم اللہ اے خامہ تجھے چلنا ہے کسی کی مدحت میں
تو ڈھونڈ کے لا الفاظ ادب اس شیخ عمل کی حرمت میں
آتے ہیں سب شاہ و گدا مصروف اسی کی خدمت میں
پاتے ہیں تجلیات الٰہی بھی تو اسی کی قربت میں

حفظ الباری حافظ

ولادت ۱۹۱۵ء

حفظ الباری حافظ کے بارے میں آب خضر میں درج ہے :۔
"حفظ الباری حافظ (پیدائش ۱۹۱۵ء) آپ نے اپنے والد کبیر الدین انشا سے شاعری کا ذوق ورثہ میں پایا۔ اڑیسہ میں اردو اسٹیج کو مقبول بنانے میں آپ کا بھی اہم حصہ ہے ۔ خود بھی ایک اچھے اداکار ہیں اور بعض مکالموں اور ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کی ہے ۔ آپ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ بزم ادب کٹک اور انجمن ترقی اردو ہند شاخ کٹک

کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے آپ نے اردو کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔"(1)

یہ ایک حقیقت ہے کہ کٹک میں حفظ الباری حافظ نے اردو کی پیش رفت میں قابل ذکر سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ ان کا کلام جذبات سے معمور رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں چینی جارحیت کے خلاف شعرائے کٹک کی احتجاجی نظموں کا مجموعہ "صدائے ہمالہ" شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس میں حفظ الباری حافظ کی ایک نظم "خطاب بہ چین" اپنی اثر آفرینی کی بنا پر خاصی مقبول ہوئی۔ ان کی نظموں میں تشبیہات و استعارات اکثر غزل کی روایت سے حاصل کئے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے جذبات کی عکاسی کے لئے روایتی قدروں کو اس جدت عمل کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ان کی فرسودگی کا گمان تک نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

نہ آئے پر نہ آئے راس دو آنسو کے قطرے بھی
کہ یہ بھی خشک ہوجاتے ہیں آتے آتے دامن تک

وہ مے بھی گئی، ساغر بھی گیا، محفل بھی گئی، ساقی بھی گیا
کہنے کو فقط اک بات رہی، جو بات ہمیں منظور نہیں

عجیب چیز ہے پیمانۂ حجاب نظر چھلک گیا تو کوئی شئے بری بھلی نہ رہی

ہر نقش کف پائے سر راہ مٹا کر بے چارگیٔ عمر رواں دیکھ رہا ہوں

تم نے دامن کو اپنے پھیلا کر چھین لی آبرو گدائی کی
شیخ نے آج مے سے کی توبہ رہ گئی شرم پارسائی کی
ساری دنیا کو چھوڑ حافظ نے
ایک کافر سے آشنائی کی

---

(۱) آب خضر؛ ص ۱۶۹۔

خطاب بہ چین

فریب خوردۂ تہذیب ہے زمانہ ابھی
نظر سے اس کی نہاں ہے سہیلِ امن و اماں
عدوئے پیکرِ انسانیت ہے خندہ بہ لب
کہ موج زن ہے ابھی اس کی آرزوئے جواں

بھٹک رہا ہے نئی روشنی کا لے کے چراغ
سیاہ رات ہے تیری، سحر سے دور ابھی
خرد ہزار کرے اہتمامِ دیدہ وری
مقامِ حسن ہے لیکن نظر سے دور ابھی

بنائے قصرِ تمدن ہے لرزہ براندام
مآلِ جبر و تشدد سے آشنا ہو کر
اتر ہی جائے گا یہ نشۂ جہانگیری
یہ بزمِ مے تری رہ جائے گی فنا ہو کر

تمام عالمِ انسانیت ہو خاک بسر
یہی ہے خواب تو تعبیرِ خواب کیا ہوگی
بجھا سکے گی نہ حرص و ہوس کی تشنہ لبی
سرور جس میں نہ ہو وہ شراب کیا ہوگی

مگر تھی پردۂ تخریب میں نہاں تعمیر
کہ قوم ہوش میں آئی ہے خوابِ غفلت سے
نفس نفس میں ہے موجِ شرابِ بیداری
ابھر رہی ہے سحر پھر حجابِ ظلمت سے

سنبھل سنبھل کہ شہیدوں کے خون سے پیدا
ہزار زلزلۂ حشر بار ہوتا ہے
سنبھل سنبھل کہ یہاں کا ہر ایک فردِ وطن
ہزار جاں سے وطن پر نثار ہوتا ہے

شمس الہدیٰ شمسؔ

ولادت سنہ ۱۹۱۸ء

شمس الہدیٰ شمسؔ کی ولادت سنہ ۱۹۱۸ء[1] میں بمقام سونگڑہ ضلع کٹک میں ہوئی۔ انھیں نوح ناروی سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ عبدالرحیم احسن اور حسن بجنوری کی رہنمائی میں ان کے شعری ذوق کی صیقل ہوئی۔ پہلے وہ جاج پور ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے عہدہ پہ فائز تھے۔ بعد میں اکرام رسول ہائی اسکول سونگڑہ میں اسی عہدہ پر مامور ہوئے۔ عرصۂ دراز سے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور اپنے وطن میں مقیم ہیں۔

شمسؔ کے کلام میں جدّت اور سادگی کا اظہار ملتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

موسم گل ہے دور ابھی، اس کا نہ انتظار کر — خون جگر کے رنگ کو زینت صد بہار کر
داورِ حشر، تجھ سے ہے میری بس ایک التجا — اپنے کرم کو دیکھ میرے گنہ شمار کر

چشم ساقی کی بھی کچھ مستی ہے شاید جام میں
جو بھی اس محفل میں ہے وہ ہوش سے بیگانہ ہے
دل کی یہ وارفتگی، اللہ رے یہ انقلاب
جو کبھی تھا رشک کعبہ آج وہ بت خانہ ہے

ساری محفل ہو رہی تھی جام گلگوں پر نثار — میری نظروں میں جمالِ ساقی گلفام تھا
دیکھتے ہی دیکھتے بدلا نظام مے کدہ — دور ساغر بھی حریفِ گردش ایام تھا

مدتوں ہم نے غم جاناں کے جھیلے ہیں ستم — اے غم دوراں تجھے خاطر میں کیا لائیں ہم
ڈال جا کنج قفس میں لے، صیاد دو چار پھول — موسم گل ہے انھیں سے دل کو بہلائیں گے ہم
کتنا خوش آیند تھا لے دوست آغازِ سفر — کیا خبر تھی آگے منزل پہ بھٹک جائیں گے ہم

---

(۱) آب خضر سنہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۰

آخری ہچکی یہ بیمارِ محبت کی نہ تھی   داستانِ عشق کا یہ مختصر افسانہ تھا
وقت آخر بھی نہ آیا وہ وفانا آشنا
شمس جس کا راستہ ہم عمر بھر دیکھا کئے

شمس کی شاعری میں فکر و جذبہ اور لفظ و آہنگ کی وحدت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں غیر ضروری الفاظ و خیالات سے گریز کیا ہے۔

سیّدہ مصلحت ایزدی

ولادت ۱۹۲۰ء

مصلحت ایزدی ۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو قصبہ بالوبیسی ضلع کٹک میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ اوائل عمری سے ہی طبیعت کا رجحان شاعری کی جانب رہا۔ اڑیسہ کی خواتین میں شاعری کا ذوق محض چند مستورات کو حاصل ہوا ہے۔ موصوفہ قومی، ملی اور فلاحی امور میں خاصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی سسرال محی الدین پور میں تعلیم نسواں کی عملی تحریک پیدا کی اور وہاں کی خواتین میں علم و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اور اپنی صاحبزادی معززہ خاتون موزوں کو بھی شاعری ورثہ میں عطا کی۔ مصلحت ایزدی نے اپنے ذوق مطالعہ کی بناء پر اڑیسہ کی نثر نگاری میں بھی اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ غزل گوئی کی بہ نسبت نظم نگاری کی جانب ان کی طبیعت زیادہ مائل رہی۔ ان کا رنگ سخن ملاحظہ ہو:-

کشتیٔ شکستہ، بحرالم، خطرات کے یہ آثار سہی
تقدیر میں تیری اے ہمدم ساحل نہ سہی منجدھار سہی
ماحول ترا پرہول سہی، کمزور ترا پتوار سہی
ہے بادِ مخالف پیشِ نظر، ہر گام ترا دشوار سہی
فطرت کا تقاضہ ہے لیکن ہمت کو تو اپنی توڑ نہ دے
اے بحر تلاطم کے رہرو تو صبر کا دامن چھوڑ نہ دے

گھنگھور گھٹاؤں سے اکثر اللہ کی رحمت ملتی ہے
بادل کی کڑک میں پوشیدہ ہاں برق کی طاقت ملتی ہے
طوفان حوادث کے اندر راہوں کی وساطت ملتی ہے
ہر موج رواں کی ٹکر میں ساحل کی بشارت ملتی ہے
گھبرا نہ کبھی، آزردہ نہ ہو، امواج کی زد سے بچ کے نکل
ہے عزم مصمم ساتھ ترے ہر منزل پہ گر گر کے سنبھل
(اقتباس: ہر گام ترا دشوار سہی)

مصلحت کو موجودہ دور کے اقدار کے کھوکھلے پن کا احساس ہے جوان کی شاعری میں لفظ و پیکر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مصلحت ایزدی کی غزلیات کے نمونے:۔

زمانہ آنکھیں بدل رہا ہے تو مجھ کو اس کا گلہ نہیں ہے
یہ کھیل قدرت کو کھیلنا ہے تو شکوۂ غم بجا نہیں ہے
کسی کے ہاتھوں سے ہوگیا ہے مری تمنا کا خون شاید
شفق کی سرخی ہے اشک افشاں کہ ظلم کی انتہا نہیں ہے
چمن چمن پھول کھل رہے ہیں تہی ہے پھر بھی نظر کا دامن
روش روش دیکھ لی ہے ہم نے گلوں میں بوئے وفا نہیں ہے
شفا ہے دست قضا میں میری، مجھے طبیبوں کی کیا ضرورت
مریضِ غم کے لئے جہاں میں اس سے بہتر دوا نہیں ہے
مجھے تلاشِ رضا ہے تیری، تلاشِ دیر و حرم نہیں ہے
مری تمنا کی وسعتوں میں کچھ اور تیرے سوا نہیں ہے
حریم دل میں مقیم رہ کر وہ دے رہے ہیں فنا کی دعوت
ہے مصلحت بے خودی کچھ ایسی کہ مجھ کو اپنا پتا نہیں ہے

اذیت سے خوشی کچھ اور بھی سنگین ہوتی ہے — تڑپ لے دل، تڑپنے سے بڑی تسکین ہوتی ہے
کہیں ابرو کی جنبش پر زمانہ سر جھکاتا ہے — کہیں تو جور پر بھی صبر کی تلقین ہوتی ہے

وہاں تو دشمنی بھی موجبِ تعظیم و عزت ہے
یہاں ایثار میں بھی عشق کی توہین ہوتی ہے

دل کو تیری نگہِ لطف پہ وارا میں نے — آفریں گنجِ محبت کے امیں، سامنے آ
دور تھی میں تو تمنا تھی قریب آنے کی — اب تو نزدیک بھی آکر ہوں حزیں، سامنے آ

مصلحت ایزدی کے کلام سے فکر و احساس کی بوقلمونی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اڑیسہ جیسے دور افتادہ ریاست کے ایک مضافاتی ماحول کی پروردہ پردہ نشیں خاتون کے یہ اشعار ان کے ذہن و شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تجمّل علی فہمی

ولادت ۱۹۲۳ء

نام شیخ تجمل علی۔ تخلص فہمی۔ ابن شیخ سراج الحق۔ تجمل علی فہمی کی ولادت ۱۹۲۳ء میں محلہ لعل محمد، کرشنا نند پور، پرگنہ بالوبیسی ضلع کٹک میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد کلکتہ پورٹ کمیشن میں ملازمت کے سلسلہ میں فہمی کا قیام کلکتہ کے مٹیا برج میں طویل مدت تک رہا۔ وہاں کے ادبی ماحول سے فہمی کے اندر شعر گوئی کی تحریک پیدا ہوئی۔ ملازمت کے سلسلہ میں کلکتہ آنے سے قبل وہ اڑیا میں بھی شعر کہتے تھے۔ کلکتہ کے دوران قیام انھوں نے جامعہ علی گڑھ سے "ادیب کامل" کیا۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ ابتدائی دور میں انھوں نے محمد حلیم ثمر آدری سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ بعد میں محمد یٰسین کیف الاثر سے مشورۂ سخن کیا اور آخر ابوظفر شمیم سے مستقل طور پر اصلاح لینے لگے۔

فہمیؔ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن مزاج کے اعتبار سے وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات پانچ غیر مطبوعہ دواوین کی صورت میں محفوظ ہیں۔ ان کی شاعری پر روایتی آہنگ کے گہرے اثرات ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

انقلاباتِ زمانہ کی کروں میں شرح کیا — کل انیسِ غم جو تھا وہ آج بیگانہ ہوا
رشکِ حسرت نقش اپنا چھوڑ ہی جائے گا دوست — بادۂ غم سے اگر لبریز پیمانہ ہوا

محفل انبساط میں آیا جو بے نقاب گل — پہلو میں دل مچل گئے دیکھ کے لاجواب گل
لاکھوں چراغ جل گئے انجمن حیات میں — بزم طرب میں آگیا ہو کے جو بے حجاب گل
کارگہِ حیات میں کیوں نہ کھلیں خوشی کے پھول — پڑھنے لگا یہ ذوق ہے عشق کی جب کتاب گل
روئے حسیں پر میری نگاہ ٹھہرتی ہی نہیں — اتنا نہ دیکھا تھا کوئی حسن میں کامیاب گل

فہمی ذرا سا جھونکا بھی نیند اڑا نہ دے کہیں
چل اے صبا ٹھہر کے چل دیکھ ہے محوِ خواب گل

جذبۂ تعمیر اک دن رنگ لائے گا مرا — برق کے دامن میں ہو گی آشیانوں کی اساس
ملتمس ہونا تو فہمیؔ کے لئے ممکن نہیں — آپ سے کرتا ہوں جانے کس لئے پھر التماس

دیکھئے جس کو وہی ہے خوگرِ محسن کُشی — آج کوئی دل نہیں ممنونِ احسانِ وفا
کہیئے کیا عالم میں طوفانِ حوادث کا اثر — ٹمٹماتی ہے ہر اک شمع شبستانِ وفا
جائیے جس سمت بزم عالم ایجاد میں — ہر طرف پیشِ نظر ہے چاک دامانِ وفا

سازش و مکر و دغا کی ہے فراوانی مگر
گوہرِ اخلاق سے خالی ہے دامانِ وفا

جب یاد کبھی تم آئے ہو پھولوں کا موسم آیا ہے — جذبات میں طوفاں اٹھے ہیں اشکوں میں روانی آئی ہے
تم بھول گئے کچھ یاد نہیں ہم زخم بھی کھا کر زندہ ہیں — اک داغ کی صورت حصہ میں تابندہ نشانی آئی ہے

دلِ بیتاب کا کیا دکھڑا سناؤں تجھ کو   کیا توقع کروں جب ہو دل آزار صنم
میری بربادی کا عالم ہے ہر سمت عیاں   خندہ زن آج ہیں دیکھو در و دیوار صنم

برسوں کے بعد ٹوٹی ہے زنجیر پاؤں کی
کھاتے ہیں خوف اس لئے زلف رسا سے ہم

دورِ جدید

"عہد جدید میں اڑیسہ میں اردو کی صورت حال" کے باب میں اوائل بیسویں صدی کے جن شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں مولوی سید برکت اللہ برکت، عبد الحلیم حلیم، عجیبہ خاتون عجب، عبدالرحیم راقم، عبدالحلیم نقیب، عبداللطیف عارف، حفظ الباری حافظ، شمس الہدیٰ شمس اور مصلحت ایزدی کے کلام میں کلاسیکل رچاؤ ہونے کے باوجود اسلوب اور حسیت کے اعتبار سے ان کی شاعری میں اس قدر تغیرات پائے جاتے ہیں کہ انھیں کسی ایک گروپ سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ تجمل علی فہمی رومانی شاعر ہیں اور ان کے کلام میں رومان کے ساتھ ساتھ جدید حسیت بھی داخلی طور پر چھائی ہوئی ہے۔

دور جدید کے جن شعراء کا تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے ان کی تمام تخلیقات یکساں معیار کی نہیں ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کے یہاں بلند پایہ اشعار اس قدر وقیع اور مرصع ہیں کہ ان کے بعض پست اشعار کی وجہ سے ان کے ادبی مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گذشتہ دو دہائی میں ہماری جدید شاعری پر مایوسی اور بے یقینی کی جو منفی فضا چھائی رہی اس سے اڑیسہ کے جدید شعراء کس حد تک متاثر ہوئے اور ان کے رویہ میں کس طرح کی تبدیلی پیدا ہونے لگی اس کا اندازہ حیدر نایاب، رفیق درد، بہار الدین ریاض، کرامت علی کرامت، عبدالمجید فیضی، شکیل دسنوی، خالد رحیم، یوسف جمال، ساجد اثر، اسماعیل آذر، رشمی کانت راہی، اطہر عزیز، الطاف حسین حسرت، راشد شبنم، الطاف نادر، عبدالمتین جامی، اولاد رسول قدسی وغیرہ کے کلام میں عزم د

عمل کے رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

حیدر نایاب

ولادت ۱۹۳۰ء

حیدر نایاب کی ولادت ۱۵ر جولائی ۱۹۳۰ء کو اچھا پور میں ہوئی۔ ان کا پورا نام میر غلام حیدر ہے۔ ان کے والد میر غلام حسین صاحب فارسی کے علاوہ علوم طب و نجوم کے بھی ماہر تھے۔ حیدر نایاب بچپن ہی میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے۔ ۱۹۵۳ء میں سول انجینئرنگ کی ڈگری درجۂ اول میں حاصل کی۔ اور حکومت اڑیسہ کے محکمۂ صحت عامہ میں بطور انجینئران کا تقرر عمل میں آیا۔ سردست حکومت اڑیسہ کے چیف انجینئر برائے محکمۂ صحت عامہ ہیں۔

ان کی شاعری کا آغاز انجینئرنگ کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی ہوا۔ لیکن کٹک کے دوران قیام امجد نجمی اور کرامت علی کرامت کی صحبتوں نے ان کے شاعرانہ ذوق کو مہمیز کیا۔ انھوں نے وافر تعداد میں غزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔ اور غزل گوئی میں قابل ذکر تجربے بھی کئے ہیں۔ انھوں نے ایسی IMAGERIES کا استعمال کیا ہے جو کسی منطقی اصول کی مرہون منت نہیں ہے۔ مثلاً ؎

ان کا غمزہ ہے کہ پھولوں پہ سلگتی شبنم
اس نزاکت پہ کوئی دل کو نہ وارے کیسے

ان کے کلام میں ندرت خیال کے ساتھ اظہار کی بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

غیر جو تھے، اگر نہ میرے ہو سکے تو کیا گلہ؟
اپنا دل جو کل تلک اپنا تھا، بیگانہ ہے آج

دلِ بیتاب کا کیا دکھڑا سناؤں تجھ کو　　کیا توقع کروں جب ہو دل آزار صنم
میری بربادی کا عالم ہے بہر سمت عیاں　　خندہ زن آج ہیں دیکھو در و دیوار صنم

برسوں کے بعد ٹوٹی ہے زنجیر پاؤں کی
کھاتے ہیں خوف اس لئے زلف رسا سے ہم

دورِ جدید

"عہدِ جدید میں اُڑیسہ میں اردو کی صورت حال" کے باب میں اوائل بیسویں صدی کے جن شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں مولوی سید برکت اللہ برکتؔ، عبدالحلیم حلیمؔ، عجیبہ خاتون عجبؔ، عبدالرحیم راقمؔ، عبدالحلیم نقیبؔ، عبداللطیف عارفؔ، حفظ الباری حافظؔ، شمس الہدیٰ شمسؔ اور مصلحت ایزدی کے کلام میں کلاسیکل رچاؤ ہونے کے باوجود اسلوب اور حسیت کے اعتبار سے ان کی شاعری میں اس قدر تغیرات پائے جاتے ہیں کہ انھیں کسی ایک گروپ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ تجمل علی فہمیؔ رومانی شاعر ہیں اور ان کے کلام میں رومان کے ساتھ ساتھ جدید حسیت بھی داخلی طور پر چھائی ہوئی ہے۔

دورِ جدید کے جن شعراء کا تذکرہ پیش کیا جارہا ہے ان کی تمام تخلیقات یکساں معیار کی نہیں ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کے یہاں بلند پایہ اشعار اس قدر وقیع اور مرصع ہیں کہ ان کے بعض پست اشعار کی وجہ سے ان کے ادبی مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گذشتہ دو دہائی میں ہماری جدید شاعری پر مایوسی اور بے یقینی کی جو منفی فضا چھائی رہی اس سے اڑیسہ کے جدید شعراء کس حد تک متاثر ہوئے اور ان کے رویہ میں کس طرح کی تبدیلی پیدا ہونے لگی اس کا اندازہ حیدر نایاب، رفیق دردؔ، بہارالدین ریاضؔ، کرامت علی کرامتؔ، عبدالمجید فیضیؔ، شکیل دسنوی، خالد رحیمؔ، یوسف جمال، ساجد اثرؔ، اسماعیل آذرؔ، رشمی کانت راہیؔ، اطہر عزیز، الطاف حسین حسرتؔ، راشد شبنم، الطاف نادر، عبدالمتین جامی، اولادِ رسول قدسیؔ وغیرہ کے کلام میں عزم و

عمل کے رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

حیدر نایاب

ولادت ۱۹۳۰ء

حیدر نایاب کی ولادت ۱۵ر جولائی ۱۹۳۰ء کو اچھاپور میں ہوئی۔ ان کا پورا نام میر غلام حیدر ہے۔ ان کے والد میر غلام حسین صاحب فارسی کے علاوہ علوم طب و نجوم کے بھی ماہر تھے۔ حیدر نایاب بچپن ہی میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے۔ ۱۹۵۳ء میں سول انجینیرنگ کی ڈگری درجۂ اول میں حاصل کی۔ اور حکومت اُڑیسہ کے محکمۂ صحت عامّہ میں بطور انجینئر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ سردست حکومت اُڑیسہ کے چیف انجینئر برائے محکمۂ صحت عامّہ ہیں۔

ان کی شاعری کا آغاز انجینیرنگ کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی ہوا۔ لیکن کٹک کے دوران قیام امجد نجمی اور کرامت علی کرامت کی صحبتوں نے ان کے شاعرانہ ذوق کو مہمیز کیا۔ انھوں نے وافر تعداد میں غزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔ اور غزل گوئی میں قابل ذکر تجربے بھی کئے ہیں۔ انھوں نے ایسی IMAGERIES کا استعمال کیا ہے جو کسی منطقی اصول کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ مثلاً ؎

ان کا غمزہ ہے کہ پھولوں پہ سلگتی شبنم
اس نزاکت پہ کوئی دل کو نہ وارے کیسے

ان کے کلام میں ندرت خیال کے ساتھ اظہار کی بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

غیر جو تھے اگر نہ میرے ہو سکے تو کیا گلہ؟
اپنا دل جو کل تلک اپنا تھا بیگانہ ہے آج

سنگ در سے رفتہ رفتہ آ گئے ہم دار تک
دیکھئے ان کی محبت لے کے جاتی ہے کہاں

۱۹۷۱ء میں حیدر نایاب کا اولین شعری مجموعہ "لمحوں کی بازگشت" اسرار کریمی پریس الہ آباد سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ جس میں کیمیا گر، بازگشت، عکس آگہی، یادوں کا آئینہ، خواب سحر، ۱۹۶۹ء ایک خواب، خواب کا حشر، جوگ، کال، بھوک، بہتا ہے، زہر خندہ، رقص انا، تضاد، تخلیق شعر، صبر، خالی کشکول، خود فریبی، [illegible]، مطالبہ، [illegible]، جھوٹ، حال، ماضی، مفلسی، روشنی کا رقیق، چشمۂ تمدن، [illegible]، یہ میری منزل نہیں، غم دوراں، نئی بیماریاں، پیکر شر، تاثر، تنہائی، سالگرہ، خیال بد، ایڈیشن، سانحہ، لمس انبساط، طوفان اور تنکے وغیرہ نظموں کے علاوہ ان کی ۲۶ غزلیں بھی شریک اشاعت ہیں۔

سید احتشام حسین کی رائے میں :-

"حیدر نایاب کی نظموں اور غزلوں دونوں میں روایت اور جدت کی آمیزش ہے۔ بعض اشعار خالص روایتی رنگ کے ہیں۔ بعض نئی معنویت اور نئے احساس کا پتہ دیتے ہیں۔ کہیں تشبیہیں اور استعارے عام ہیں، کہیں علامتی رنگ اختیار کر کے جدید رنگ کے حامل ہو گئے ہیں۔ ایسا ہونا قرین قیاس بھی ہے کیونکہ یہ معاملہ ذہنی تربیت اور شعور کا ہے۔ موضوع کے انتخاب کا انحصار شاعر کے نظریۂ حیات پر ہے اور فن سے وابستگی روایت فن کے احساس پر ہے۔ حیدر نایاب اس لحاظ سے درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔"(۱)

نمونۂ کلام

مندر کا ہو، مسجد کا ہو یا گرجا کا پتھر — انساں کو پیارا ہوتا ہے اپنا اپنا پتھر
کومل کومل تن من اس کا، کومل کومل چہرہ — میری بھکتی کا مرکز ہے اک نازک سا پتھر

---

(۱) حیدر نایاب، لمحوں کی بازگشت مطبوعہ ۱۹۷۱ء : پیش لفظ از سید احتشام حسین۔ ص ۷۔

پانی پانی بہتی آنکھیں قسمت کے ماروں کی   گلشن گلشن کاٹتے دیکھے دریا دریا پتھر
مجھ سے اسی دم روٹھ گیا تھا میرا بچپن نایاب
اپنے دل سے جب ٹکرایا دکھ کا پہلا پتھر

آنکھیں پھولوں کی بھی ہونے لگیں شبنم شبنم   دیکھ کر وقت کے ماتھے پہ نمی آخرِ شب
صبح کے رخ پہ سیہ داغ کی صورت ابھری   ظلمت و نور کی بے راہ روی آخرِ شب
شام سے کتنی فروزاں تھی تمناؤں کی لو   شمع امید مگر بجھ سی گئی آخرِ شب
ایک ہالے میں سمٹ کر دمِ رخصت نایاب
چاندنی چاند کی باہوں میں رہی آخرِ شب

چھپا سکا نہ کسی حال میں نقاب کا رنگ   تمھاری آنکھوں نے پایا ہے وہ شراب کا رنگ
قریب ہے کہ بدل جائے وقت کی رفتار   قریب ہے کہ نکھر جائے انقلاب کا رنگ
نہ دست شوق بڑھایا نہ عرض شوق ہی کی
ابھی سے اڑنے لگا کس لئے جناب کا رنگ

رواں دواں ہیں فروغِ سوز جگر سے کرب و بلا کے آنسو
فرات کی طرح بہہ رہے ہیں یہ چشمِ درد آشنا کے آنسو
نہ پوچھو ان کی خوشی کا عالم جنھوں نے منزل کو پالیا ہے
ہمیں ہیں وہ فلسفی کہ جس نے بہائے منزل پہ آکے آنسو
کیا پتہ دل کو پڑے گا کس جنوں سے واسطہ
جانے کس جانب قدم اٹھیں گے مے خانے کے بعد

رفیق درد

ولادت ۱۹۳۲ء

محمد رفیق نام، درد تخلص۔ ولدیت محمد بشیر۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو ضلع کٹک کے مضافات ٹانگی بھگت پور میں اپنے نانا کے گھر ولادت ہوئی۔ کٹک کے سعید سیمنری سے تعلیم حاصل کی۔ مستقل سکونت شہر کٹک کے محلہ ہاتھی تالاب میں ہے۔ پچھلی تین دہائیوں سے شعر و سخن کی مشاطگی میں مصروف ہیں۔

ابتدائی دور میں عبدالعزیز نازاں شعلہ پوری سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ بعد میں مولوی سید برکت اللہ برکت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ جب امجد نجمی ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر کٹک آگئے تو مولوی برکت اللہ نے رفیق درد کو امجد نجمی کے سپرد کر دیا۔ اس طرح جنابِ امجد نجمی کے مشوروں کی روشنی میں اڑیسہ کے اس خوش گلو شاعر کے فکر و شعور نے ارتقائی منازل طے کیں۔

نمونۂ کلام

یارو سمجھ رہے ہو جنھیں تیرگی کے پھول
اک دن ضرور ہوں گے وہی روشنی کے پھول

اے درد تم خلوص کی چادر بچھائے جاؤ
دشمن اگرچہ پھینکتے ہیں دشمنی کے پھول

حسن کے دامن میں کیا ہوگا
شبنم ہوگی شعلہ ہوگا

جو بھی ہوا میں اُڑتا ہوگا
میری قبا کا ٹکڑا ہوگا

دوڑ رہا ہوں جس کے پیچھے
شاید کوئی سایہ ہوگا

آنکھ نہ ٹھہرے جب چلمن پر
ان کا چہرہ کیسا ہوگا

خوشبو کیسی ویرانے میں
زخم کسی کا مہکا ہوگا

راہ کے پتھر سہمے کیوں ہیں
رہبر کوئی بدلا ہوگا

ترے جلووں سے جو ٹکرا کے ٹھہر جاتا ہے
ساتھ رہتے ہیں اجالے وہ جدھر جاتا ہے
درد کام آتے ہیں ٹکڑے بھی کئی چہروں کے
ٹوٹ کر جب کوئی آئینہ بکھر جاتا ہے

آپ کہہ دیں تو یہ کام انجام دوں
ظلمتوں کو نور کا پیغام دوں
چلچلاتی دھوپ ہے چاروں طرف
درد کو آخر کہاں آرام دوں

اپنے کلام کی سادگی، لہجہ کی حلاوت اور آواز کی دلکشی نے رفیق درد کو اپنے معاصرین میں امتیاز بخشا ہے۔ ملک کے مختلف جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ کٹک کے متعدد نوجوان شعراء ان سے مشورۂ سخن بھی کرتے ہیں۔

سیّد مسیح اللہ مسیح

ولادت ۱۹۳۲ء ـــــ وفات ۱۹۸۲ء

سیّد مسیح اللہ مسیح کی ولادت ۱۹۳۲ء میں بمقام کٹک ہوئی۔[1] شاعری انھیں اپنے والد مولوی سید برکت اللہ برکت سے ورثہ میں ملی۔ ۱۹۵۴ء میں راونشا کالج کٹک سے فارسی آنرز کے ساتھ بی اے پاس کیا اور اول آئے۔ ۱۹۵۶ء میں کلکتہ یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۰ء میں پروفیسر اصغر علی بیدل کے ریٹائر ہونے کے بعد ان کا تقرر فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے راونشا کالج کٹک میں ہوا۔ دوران ملازمت انھوں نے

---

(۱) آب خضر ۱۹۶۳ء: ص ۱۶۲

کلکتہ یونی ورسٹی سے اردو میں بھی ایم اے کیا۔ اڑیسہ کی تاریخ میں وہ پہلے استاد ہیں جنھیں ریڈر شپ حاصل ہوئی۔ "نجم الشعراء امجد نجمی۔ حیات اور ادبی خدمات" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر رانچی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مسیح اللہ مسیح کی ملازمت کا آغاز راونشا کالج سے ہوا۔ وہ اس کالج میں فارسی کے لکچرر رہے۔ پھر فارسی کے ریڈر کی حیثیت سے زمانۂ دراز تک سرگرم عمل رہے۔ کچھ عرصہ کے لئے ان کا تبادلہ گنگادھر مہر کالج سنبل پور میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے ہوگیا۔ اور اس کے بعد پٹا مونڈائی کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے وہ ڈیپوٹیشن پر چلے گئے۔ علم و ادب، کھیل کود اور این سی سی سے انھیں مساوی دلچسپی رہی۔ وہ بزم سخن کٹک کے صدر رہے، اُتکل یونی ورسٹی کے اسپورٹس سکریٹری کی حیثیت سے کافی عرصہ تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور مستقل طور پر این سی سی کے کیپٹن رہے۔

تصنیف و تالیف میں ان کی ایک فارسی قواعد اور ترجمہ کی کتاب پرائمری اسکول میں تدریس کے لئے مختص "نخل اردو" اور ان کا تحقیقی مقالہ "نجم الشعراء امجد نجمی۔ حیات اور ادبی خدمات" یادگار ہیں۔

گردے کے مرض کا شکار ہو کر طویل مدت تک صاحب فراش رہے اور بالآخر ۱۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔[1]

مسیح کی شاعری روایتی انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ زبان و بیان میں سلاست ہے۔ لیکن فکری گہرائی کا فقدان ان کے اکثر اشعار سے ہویدا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

زخم دل زخم جگر چاک گریباں دیکھئے — نوع انساں کا تلاطم خیز ارماں دیکھئے
خاک کو اپنی رسائی ہو جبین یار تک — عاشق شوریدہ سر کے دل کے ارماں دیکھئے
جو چھپائے سے نہ چھپ سکتا ہو پھر کیا چھپے — راز دل آنکھوں سے ہوتا ہے نمایاں دیکھئے
لیکے ہاتھوں میں عقائد کی برائی ہڈیاں — آدمیت کر رہی ہے رقص شیطاں دیکھئے
آدم خاکی کی پرواز فلک سے ہے مسیح — محو حیرت زرد رو آلودہ داماں دیکھئے

---

(۱) نورالدین احمد نور: حیات مسیح ایک نظر میں مطبوعہ ماہنامہ صلائے اڑیسہ کٹک نجمی نمبر، ص ۴۲

خالد شفائی

۱۹۳۴ء

خالد شفائی تقریباً پچھلی تین دہائیوں سے گیا (بہار) سے ترک وطن کر کے اڑیسہ کے نواحی مقام بسرا میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔ اصل نام غلام محمد ہے۔ خالد تخلص کرتے ہیں اور شاعری میں حضرت شفا گوالیاری سے نسبت تلمذ کی بنا پر خالد شفائی کے نام سے معروف ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۳۴ء میں گیا ضلع کے ہسوہ میں ہوئی۔ اڑیسہ کے ایک دور افتادہ مضافاتی علاقہ میں رہنے کے باوجود خالد شفائی اپنے فکر و فن کو شعری سانچوں میں ڈھالتے رہے ہیں۔ اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں:-

"یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ میں اس وقت ایک ایسے ویرانہ میں سانس لے رہا ہوں جو ادبی اور تہذیبی اعتبار سے بالکل پست ہے۔ یہاں نہ تو کوئی ادبی ماحول ہے نہ ادیب و شاعر دوست جس کے ساتھ بیٹھ کر دو گھڑی شعر و سخن کی باتیں ہوں۔ عام طور پر لوگ ان پڑھ اور جاہل ہیں اور دن رات ایسے ہی لوگوں سے واسطہ ہے۔ ایسے میں کوئی کب تک فکر و فن کی مشعل جلاتے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اب تک یہ دیوانگی نباہے جا رہا ہوں۔ اور ہنوز یہ چراغ روشن ہے۔"(1)

خالد شفائی کا شعری مجموعہ "سنگ و سمن" ۱۹۹۶ء میں مغل اکیڈمی حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے جس میں ان کی ۷۵ نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ مذکورہ نظموں میں صبح آزادی، دعوت، اجتہاد، میر اگاؤں، توڑ دو زنجیریں، چراغ جلاؤ، ایشیا جاگ چکا ہے، عزم کے چراغ، اور بنت در یوزہ گر اور متعدد دوسری نظمیں ان کی نمایاں تخلیقات ہیں۔ رنگِ سخن ملاحظہ ہو:-

یہ رہگذاروں کی وحشت، یہ پیچ و خم کا سکوت
کہ جی کے دل پہ ہے مرے نقش پا کی تصویر

---

(1) خالد شفائی کا خط بنام کرامت علی کرامت: از مقام بسرا، سند گڑھ، یکم اگست ۱۹۶۶ء

قدم قدم پہ دلاتے ہیں یاد ماضی کی
ہے ان میں دفن مرے خواب رفتہ کی تعبیر
اجاڑ اجاڑ سے ہیں تا حد نظر اشجار
ہیں سہمے سہمے ہوئے سے تمام تر منظر
نہ کھیتوں پہ رونق ہے نہ جوہڑوں پہ جمال
بجھے بجھے سے ستارے لٹا لٹا سا قمر

(اقتباس: میرا گاؤں)

بہارالدین ریاض

ولادت ۱۹۳۵ء

بہارالدین کا اصل نام ریاض الدین خاں تھا۔ ان کے والد کا نام کلیم الدین خاں تھا۔ لیکن ان کے نانا مولوی ابرار بخش نے یہ نام بدل کر بہارالدین خاں نام رکھا۔ جب بہارالدین کی طبیعت شاعری کی جانب مائل ہوئی تو انھوں نے اپنے سابقہ نام کو تخلص کے طور پر استعمال کیا۔ اس طرح وہ بہارالدین ریاض کے روپ میں سامنے آتے۔ ریاض کی ولادت شہر کٹک کے سوتا ہاٹ میں ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔(۱)

گریجویشن کرنے کے بعد ایک طویل عرصہ تک وہ ریونیو ڈیوژنل کمشنر کے دفتر کٹک میں ملازم رہے اور بعد میں اتکل یونی ورسٹی سے پرائیوٹ طور پر اردو میں ایم اے کیا اور ان کا تقرر نرائن چند کالج جاج پور میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔

---

(۱) آب خضر ۱۹۶۳ء، ص۔۱۳۰

ریاض ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۶ء تک سعید سینری کٹک میں ٹیچر رہے۔
۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۸ء تک ریونیو ڈیوژنل کمشنر کے دفتر میں کلرک رہے۔
۱۹۷۸ء سے تادم تحریر این سی کالج جاج پور میں اردو کے لکچرر ہیں۔

۱۹۵۹ء میں بہارالدین کی شاعری کا آغاز ہوا۔ مظہر امام کے کٹک میں قیام کے زمانہ میں بہارالدین ریاض ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ان کی شاعری کا رجحان ترقی پسندی کی طرف مائل تھا۔ انھوں نے غزلوں سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

رات۔ سنسان اور چاندنی زرد   پیڑ ساکت، فضا غم میں ڈوبی ہوئی
اک پرندہ اُڑا، چند پتے گرے   پھر وہی ہو کا عالم وہی خامشی

دفعتہً سرسراہٹ ہوئی اک طرف   ایک ٹوٹی ہوئی قبر ہلنے لگی
چاند کے ٹمٹماتے دیئے کے تلے   ایک مردہ کلی جیسے کھلنے لگی

اک جواں مرد، دلکش حسیں خوبرو   جیسے یونان کا ہو کوئی دیوتا
اس کے چہرہ پہ تھیں غم کی پرچھائیاں   جیسے صدیوں سے ہو کرب میں مبتلا

وہ بڑھا اور رکا ایک اک گام پر   ڈھونڈتے ڈھونڈتے مدفنوں کے نشاں
ہر لحد اس کی یادوں کی آماجگاہ   ہر لحد میں تھے کچھ راز اسکے نہاں

دور تک تھا مزاروں کا اک سلسلہ   چند قبریں پرانی تھیں اور کچھ نئی
چند قبریں تھیں پھاڑے ہوئے اپنا منہ   چند پر تازہ مٹی کی بوباس تھی

سایہ رکتا رہا ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس   اور کبھی زیر لب بڑبڑاتا رہا
جیسے کہتا ہو "کب تک میں مرتا رہوں   اک جائز تمنا کی خاطر بھلا؟"

(نظم جائز تمنا)

اس نظم میں تحت الشعور کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کے باوجود نظم کی فضاء مزید پراسرار بن گئی ہے۔

بہارالدین ریاضؔ کا رنگِ تغزل ملاحظہ ہو۔

کہرے کے راج میں ہے ہر اک گھر دھواں دھواں
صحرا دھواں دھواں ہے سمندر دھواں دھواں
اس قصرِ آرزو کو جب آگ لگ گئی
ہوتا نہ کیسے ذہن کا امبر دھواں دھواں

ایک مدت ہوئی ان سے بچھڑے ہوئے آنکھیں پتھرا گئیں راہ تکتے ہوئے
مجھ کو اب فکر سود و زیاں بھی نہیں دل کے ارمان سارے وہیں رہ گئے
ہے دلِ زار کس کی تجھے آرزو کس کی روئے حسیں کی ہے اب جستجو
اس جگہ بیتی یادوں کا ہے مقبرہ سارے دلکش نظارے وہیں رہ گئے

رات لمبی ہے زندگی کم ہے　　آ بھی جاؤ کہ آنکھ میں دم ہے
چاند سے شعلے کیوں لپکتے ہیں؟　　کیوں پریشان ابن آدم ہے
چوٹ کرنوں کی سہہ نہیں سکتی　　"کتنی نازک مزاج شبنم ہے"
رقص فرما ہیں موت کے سائے　　زندگی زندگی کا ماتم ہے
قصۂ غم کہے زمانہ ہوا　　آج تک آنکھ ان کی پرنم ہے
چاک دامن رفو تو کر لو ریاضؔ
ہر روش پہ جنوں کا عالم ہے

بہارالدین ریاضؔ کی شاعری کا نتیجہ تقریباً ڈیڑھ سو نظموں اور غزلوں کے روپ میں ملتا ہے۔ ان کی چند تخلیقات ملک کے مؤقر جرائد میں چھپتی رہی ہیں۔

کرامت علی کرامت

ولادت ۱۹۳۶ء

کرامت علی کرامت کی ولادت کٹک میں ستمبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ شاعری انھیں اپنے والد مولوی رحمت علی رحمت سے ورثہ میں ملی۔ نجم الشعراء حضرت امجد نجمی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ کرامت کی شاعری صالح جدیدیت کے روشن امکانات کا پتہ دیتی ہے۔ جس میں وقت کو اپنی ذات میں جذب کر لینے کا جذبہ، مذہبی وسیع النظری کا عنصر، روحانیت وادھیت کا توازن، انسانیت کا اظہار، مابعد الطبیعی عناصر کا وجود، درد مائی اور نو کلاسیکی عناصر کے امتزاج کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔

کرامت علی کرامت کا اولین شعری مجموعہ "شعاعوں کی صلیب" ۱۹۷۲ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا تو ہندو پاک کے اکابرین ادب نے اُڑیسہ کے اس شعری مجموعہ کو اعتبار نظر بخشا اور اتر پردیش اردو اکیڈمی نے اسے انعام واکرام سے نوازا۔

"شعاعوں کی صلیب" کے مطالعہ کے بعد علامہ جمیل مظہری نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا۔

"جہاں تک آپ کی غزلوں کا سوال ہے وہ جدت وقدامت کے درمیان ایک ایسا نقطۂ مفاہمت ہے جس کی مثال آپ کے معاصرین میں کم ملتی ہے۔"(۱)

پروفیسر محمد حسن نے اپنی گراں قدر رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"افق تا افق کی نظمیں اور کف قاتل خوب ہیں۔ البتہ تکرار اور بے جا وضاحتوں سے احتراز کریں تو اچھا ہے۔ غزلوں کے بعض اشعار پوری پوری نظموں پر بھاری ہیں۔"(۲)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رائے ہیں:۔

"آپ تحت الشعور کے خزانوں کو جس طرح بروئے کار لاتے ہیں اور اپنی سائنسی

---

(۱) مطبوعہ شاخسار کٹک؛ مشترکہ شمارہ ۴۴ - ۴۵ - ۴۶ ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۲
(۲) ایضاً شمارہ ۴۷ ۱۹۷۳ء؛ ص ۱۳

بصیرت کو جس طرح ادب کے تخلیقی آرٹ میں استعمال کرتے ہیں اس کی مثال تلاش کرنا آسان نہیں۔ آپ کی آواز جدید اردو شاعری میں نرالی آواز ہے۔"(۱)

کرامت علی کرامت کی شاعری سے متعلق مظہر امام کی رائے ہے:۔

"آپ کی شاعری میں جو فکری لے ہے وہ آج کی شاعری میں کمتر نظر آتی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ صرف منظر نگاری، پیکر تراشی، اسلوب کی تازگی اور بے ساختگی سے بڑی شاعری معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ مشاہدہ اور جذبہ کے ساتھ فکر و فلسفہ کی آمیزش بھی ضروری ہے۔"(۲)

کرامت علی کرامت کا نمونۂ کلام

غزل

جو تاریخ پنہاں گپھاؤں میں تھی
وہی آسماں کی اداؤں میں تھی

وہ اعصاب میں میرے گھر کر گئی
جو خنکی سحر کی ہواؤں میں تھی

وہی منجمد خامشی درد کی
وہی کیفیت جو نداؤں میں تھی

کئی آبگینوں میں آئی نظر
جو شئے بادلوں کی رداؤں میں تھی

وہ مٹی کے پتلے میں حل ہوگئی
رعونت جو اگلے خداؤں میں تھی

معطر مرے خواب کو کر گئی
وہ خوشبو جو تیری وفاؤں میں تھی

جو معصوم تتلی کا پر کاٹ دے
کچھ ایسی روایت فضاؤں میں تھی

بظاہر تھے روپوش دن میں مگر
چمک جگنوؤں کی خلاؤں میں تھی

وہی شوق کی داستان بن گئی
جو نازک خرامی صباؤں میں تھی

---

(۱) مطبوعہ شاخسار کٹک: مشترکہ شمارہ ۶ ۴ ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۶۔
(۲) ایضاً شمارہ ۶ ۴ ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۸۔

کرامت یہ بچپن سے سنتے ہیں ہم
اثر آفرینی دعاؤں میں تھی[1]

عالم ہستی میں رکھتے ہی قدم، قسمت میں تھا
اک تسلسل جو ازل سے نور اور ظلمت میں تھا

ایک مرکز پر سمٹ آئی تھی رنگوں کی برات
کتنے جلووں کا نچوڑ اس اجنبی صورت میں تھا

لوگ کہتے تھے کہ ویراں ہے دیارِ ممکنات
اک جہاں آباد لیکن میری ہر حسرت میں تھا

آنکھ میں نے بند کرلی جب حقائق زار سے
خواب کے عالم میں دیکھا وادیٔ جنت میں تھا

آتشیں رخسار پر گو نیند مجھ کو آ گئی
فاصلہ صدیوں کا جیسے پھر بھی اس قربت میں تھا

چبھ رہا تھا دل میں ہر دم، کر رہا تھا بیقرار
اک اذیت ناک پہلو جو مری راحت میں تھا

وقت کی دوشیزہ نے تن سے اتارا جب لباس
یہ زمیں ششدر تھی اور یہ آسماں حیرت میں تھا

اک ہوس کی دھوپ میں جلتا تھا سارا تن بدن
پُرسکونِ روح حاصل سایۂ الفت میں تھا

چاندنی میں بچھ گیا ہو جس طرح ابرق کا فرش
دلکشی کا ایسا عالم باپ کی شفقت میں تھا

اِذن بیداری ملا تھا جذبۂ تخلیق کو
قافلہ ایّام کا جب عالم غفلت میں تھا[2]

عبدالمجید فیضی

ولادت ۱۹۳۶ء

عبدالمجید نام۔ فیضی تخلص۔ ۱۹۳۶ء میں سمبلپور میں پیدا ہوئے۔ شاعری کی تحریک عبدالحلیم حلیم سے ملی اور تلمذ بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ شمالی اڑیسہ کے اردو شعراء میں عبدالمجید فیضی کو درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ درس و تدریس ان کا مشغلہ ہے۔ طبعی رجحان غزل گوئی

---

(۱) مطبوعہ شاعر بمبئی: شمارہ ۶ ۱۹۸۲ء۔
(۲) مطبوعہ سوونیر آل انڈیا مشاعرہ/بزم سخن کٹک ۱۹۷۷ء: ص ۴۴

کی جانب ہے۔ پچھلی تین دہائی سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن نام و نمود کے ہوس سے بے گانہ ہیں۔ اس لئے ان کی بیشتر تخلیقات اب تک محروم اشاعت ہیں۔ ان کا کلام تغزل سے بھرپور ہوتا ہے۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "نذرانۂ عقیدت" جماعت رضائے مصطفٰے سمبلپور کے زیر اہتمام طبع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ ۴۰ صفحات کے اس کتابچہ کے آغاز میں ایک طویل حمد ہے۔ اس کے بعد قصۂ میلاد النبیؐ، زمزمۂ ولادت کریم، ہدیۂ شوق، عید رحمت، فارسی اردو اور ہندی میں تین نعتیں، سلام ارمغان عقیدت اپنے پیر و مرشد مولانا اختر رضا خاں کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت، نذر عقیدت بہ بارگاہِ حضور مفتیٔ اعظم اور سلام بحضور خیر الانام ہے۔ پیش نظر مجموعۂ کلام غالباً محفل میلاد میں پڑھنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ بہرحال اس مجموعہ کی روشنی میں عبدالمجید فیضی کی شاعرانہ صلاحیت اور پختگی کلام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پیش نظر مجموعہ کے مشمولات میں "عید رحمت" فیضی کی شاہکار نظم ہے جو مثنوی کے انداز میں ۳۶ بندوں پر مشتمل ہے۔

نمونۂ کلام

عید کی تقریب تھی اور اہل طیبہ شادماں — پیکر عشرت نظر آتا تھا ہر پیر و جواں
موجزن تھا شادکامیوں کا بحر بے کراں — عید گہ کی سمت سب اہل مدینہ تھے رواں

کارواں در کارواں ارباب ایماں چل پڑے
بارگاہ ایزدی میں سر جھکانے کے لئے

راکب ناقہ تھا کوئی، کوئی گھوڑے پر سوار — نرم رو کوئی تھا کوئی گرم رو دیوانہ وار
تھے خراماں بے خودی میں نوجواں مستانہ وار — وجد کے عالم میں ہر طفل و جواں تھا نغمہ بار

چھوڑ کر آبادیوں کو سوئے صحرا تھا رواں
خم سر تسلیم حق کرنے کو ہر پیر و جواں

غزل کے چند اشعار

جانِ بہار حسنِ شبابِ غزل ہو تم ۔۔۔ دراصل کیفِ موجِ شرابِ غزل ہو تم
رعنائیاں غزل کی مری تم پہ ہیں نثار ۔۔۔ میری نظروں میں خود ہی جوابِ غزل ہو تم
رخشندہ ہے تمھیں سے مرے دل کی کائنات ۔۔۔ گویا مری نظر میں شہابِ غزل ہو تم

تم روحِ انبساط و حیات و سرود ہو
یا نغمۂ نشاطِ ربابِ غزل ہو تم

سیّد شکیل دسنوی

ولادت ۱۹۳۹ء

شکیل دسنوی کی ولادت کا سنہ "آبِ خضر" میں ۱۹۳۹ء(۱) درج ہے۔ لیکن ان کے مجموعۂ کلام "زندگی اے زندگی" کے ڈسٹ کور پر ان کے حالات زندگی درج ہیں۔ اس کے مطابق شکیل کی تاریخ پیدائش ۲۰؍ فروری ۱۹۴۱ء(۲) ہے اور مقام پیدائش بہار شریف ہے۔ غالباً مؤخر الذکر تاریخ ولادت ان کے تعلیمی سرٹی فیکٹ کے مطابق رہی ہوگی۔

شکیل کو شاعری اپنے والد پروفیسر سید منظر حسن دسنوی سے ورثہ میں ملی ہے۔ چونکہ ان کے گھر پر شعر و ادب کا خاصہ چرچا رہا ہے۔ شکیل نے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی شعر کہنا شروع کیا۔ ان کی اس دور کی تخلیقات پیام مشرق دہلی، کھلونہ دہلی، کلیاں لکھنؤ وغیرہ جرائد میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ گذشتہ دس بارہ سال سے ان کی تخلیقات شمع دہلی، بیسویں صدی دہلی اور ملک کے دوسرے مؤقر جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

شکیل پیشہ کے اعتبار سے انجینئر ہیں اور ان کا تقرر حکومت اڑیسہ کے محکمہ صحت

---

(۱) آبِ خضر ۱۹۶۳ء؛ ص ۱۷۶۔
(۲) سید شکیل دسنوی؛ زندگی اے زندگی مطبوعہ ۱۹۸۱ء؛ ڈسٹ کور۔

عامہ میں ایگزیکیٹو انجینئر کی حیثیت سے ہے۔ ان کے عہد میں جو ادبی اور شعری میلانات غالب رہے ہیں۔ شکیل ان سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ روایت پرستی کی بنا پر ان کی شاعری میں زبان کی صحت وصفائی اور اظہار و بیان میں شستگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔

شکیل نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لیکن ان کا مزاج غزل کی طرف زیادہ مائل ہے۔ ان کے محسوسات پر ناکام عشقیہ واردات کی گہری چھاپ ہے اس لئے وہ اپنے جذباتی تجربوں کو غزل کے پیرایہ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں نشاط انگیں کیفیات کی جو جھلک ملتی ہے اس میں غم واندوہ کی زیریں لہریں بھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دل میں اک درد کا شعلہ سا لپک جاتا ہے — زخم دل چھو کے صبا جب بھی گذر جاتی ہے

ہائے کس کا ذکر آیا شب مہتاب میں — نام پر ان مے فروش آنکھوں کے اب ساغر چلے

پھر کوئی چوٹ ابھری دل میں کسک سی جاگی — یادوں کی شاید آج پروائی چل رہی ہے

ظلمتیں ہیں پوشیدہ روشنی کے پردے میں
دشمنی بھی ہوتی ہے دوستی کے پردے میں

شکیل نے ہمعصر سیاسی اور سماجی صورت حال کے تعلق سے بھی اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا ہے ؎

عمر بھر پیتا رہا ہوں زہر غم تیرے لئے — اب نہ مجھ کو آزما اے زندگی اے زندگی

قطرے قطرے سے لہو کے تیرا پیمانہ بھرا — اور میں تشنہ رہا اے زندگی اے زندگی

بیٹھے رہیں گے تھام کے کب تک یوں خالی پیمانے لوگ
حد سے بڑھے جب تشنہ لبی تو پھونک دیں مے خانے لوگ

ہم دنیا کو دے کر خوشیاں غم بدلے میں لیتے ہیں
ڈھونڈے سے بھی کہاں ملیں گے ہم جیسے دیوانے لوگ

دل پر کتنے زخم لگے ہیں تب جا کر یہ جانا ہے
اپنوں سے تو اچھے ہیں ہر صورت میں بے گانے لوگ

دنیا کو شکیل آج بہت ہم سے گِلے ہیں　　دو پھول تبسم کے جو ہونٹوں پہ کِھلے ہیں
جو رات کی ظلمت میں اُجالے کی طرح تھے　　وہ رہروِ حق صبح سے سر دار مِلے ہیں
اِک غم کے سوا کس نے یہاں ساتھ دیا ہے　　واللہ مجھے آپ سے شکوے نہ گِلے ہیں
چیخ اٹھے گا ہر حلقۂ زنجیر اک روز
کیا غم جو شکیل آج مرے ہونٹ سلے ہیں

ملتی ہے وفاؤں کی سزا تیرے نگر میں　　حیران ہیں ہم اہلِ وفا تیرے نگر میں
ہاں دیکھ لیا ہم نے بھی تیرا یہ نگر آج　　ہر شئے ہے محبت کے سوا تیرے نگر میں
تھے بھیس میں رہبر کے ہر اک موڑ پہ رہزن　　ہر اجنبی آ کر ہے لٹا تیرے نگر میں
ہم جنسِ وفا لے کے سرِ راہ کھڑے ہیں
کوئی نہ خریدار ملا تیرے نگر میں

شکیل کی تخلیقات میں خالص غزل کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ تغزل سے بھرپور ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تیرے عارض سے سحر آ کے ضیا مانگے ہے　　اور کلی لب سے تبسم کی ادا مانگے ہے
شوخ وہ ایسا کہ پوچھے ہے وفا کے معنی　　دل وہ ناداں کہ وفاؤں کا صِلہ مانگے ہے
کبھی اک بار تو بھولے سے سمجھئے اپنا
اور شکیل آپ کا کیا اسکے سوا مانگے ہے

شکیل کی بعض غزلوں کی لفظیات ہندی کے دوہوں اور گیتوں کی زبان سے ملتی جلتی ہے اور ان غزلوں کی معنوی فضا بھی ہندی شاعری کے اسلوب سے زیادہ قریب ہے۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہم تو ٹھہرے رمتے جوگی در در ڈھونڈیں سچا پیار
کیا کیا مانگیں جگ کے باسی اپنا تو بس ایک سوال

نگری نگری گھوم کے دیکھا سارے جگ کا ایک سا حال
دُکھ کو سنبھالے راج سنگھاسن سُکھ کا پڑا ہے جیسے کال

رات کی باتیں میں جانوں یا جانیں میرے من کے میت
دیکھ کے کیوں مسکائیں سکھیاں بھور کو الجھی لٹ کی اور

بھید بھاؤ کی باتیں کیسی جگ تو مسافر خانہ ہو
ایک ہی رستے کے سب راہی سب کا ایک ٹھکانہ ہو
بنسی کے سینے میں کتنے چھید ہوئے تو سُر نکلے
کتنا کٹھن ہے شعر کا کہنا سمجھے خاک زمانہ ہو

کبھی تو ہوں گے روپ کی دیوی درشن ہم اس آشا میں
لے کے اک بنجارہ دل یوں سانجھ سویرے پھرتے ہیں

پریم پتر کو پریتم دیکھیں اور انھیں یہ پیاسے نین
لکھا ہے اس کارن میں نے آنکھوں سے لے کر کاجل

خالد رحیم

۱۹۴۷ء

نام شیخ رحیم بخش۔ ولدیت شیخ قادر بخش۔ قلمی نام خالد رحیم۔ ''آبِ خضر'' میں ان کا سنہ ولادت ۱۹۴۱ء درج ہے۔ لیکن ان کے مجموعۂ کلام ''عکس در عکس'' میں ۹ مئی ۱۹۴۴ء درج ہے۔ مقام ولادت اٹریا بازار کٹک۔ پیشۂ آبا تجارت۔ خالد رحیم کا

خاندانی سلسلہ دہلی کے پہاڑ گنج سے ملتا ہے۔ بہت زمانہ قبل خالد رحیم کے جدِّ امجد تجارت کے سلسلہ میں دہلی سے منتقل ہو کر کلکتہ آئے۔ ان کے دادا شیخ قمرالدین کی دوسری شادی کلکتہ میں جن خاتون سے ہوئی تھی ان کا تعلق کٹک کے سوتا ہاٹ سے تھا۔

خالد رحیم کی تعلیم کٹک کے مدرسہ اسلامیہ، مدرسہ سلطانیہ، سعید سیمنری اور راونشا کالج میں ہوئی۔ ملازمت کی بجائے انھوں نے آبائی پیشہ تجارت اختیار کیا۔ لیکن شاعری کے ذوق اور کٹک کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ان کی غیر معمولی محویت نے انھیں میدان تجارت میں سخت ہزیمت دی لیکن شاعری کی پناہ گاہ ان کے لئے قلعۂ معلیٰ ثابت ہوئی۔

خالد رحیم اس صدی کی چھٹی دہائی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کے فنی شعور کے ارتقاء میں جہاں مظہر امام کے مفید مشوروں اور حضرت امجد نجمی کے قرب نے اہم حصہ ادا کیا ہے وہیں رضا نقوی واہی۔ سید حرمت الاکرام اور ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے ساتھ ادبی رابطوں نے بھی اس کو نئی جلا بخشی ہے۔ یوں تو انھوں نے وطنی، سیاسی، سماجی، اخلاقی ہر طرح کی نظمیں کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جدید قدروں کے علاوہ کلاسیکل شاعری کی عظیم روایتوں کا احترام بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے ان کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے "عکس در عکس" کے پیش لفظ میں لکھا ہے:۔

"اڑیسہ کے نئے اور پرانے تمام شاعروں میں خالد رحیم امجد نجمی کے بعد سب سے زیادہ پرگو شاعر ہیں۔ ایک نشست میں قلم برداشتہ لمبی لمبی نظمیں، لمبے لمبے منظوم خاکے اور منظوم لکھ ڈالتے ہیں۔"(۱)

۱۹۸۳ء میں خالد رحیم کا مجموعۂ کلام "عکس در عکس" طبع ہو کر منظر عام پر آیا جس پر انھیں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

خالد رحیم کی شاعری کے بارے میں پروفیسر محمد حسن رقمطراز ہیں:۔

"خالد رحیم صاحب کا مجموعۂ کلام تازگی اور شگفتگی کا بھرا پرا چمن ہے۔ ان کے اشعار میں احساس کی نرمی اور لطافت بھی ہے اور عصری زندگی کے مسائل کا شعور و ادراک

---

(۱) خالد رحیم، عکس در عکس مطبوعہ ۱۹۸۳ء: پیش لفظ/ ڈاکٹر کرامت علی کرامت: ص ۱۰

بھی۔ ایک ایسے دور میں جب شاعری کا چہرہ ابہام کے بڑھتے ہوئے سایوں نے مسخ کر رکھا ہے۔ خالد رحیم کی شاعری جمالیاتی کیفیات اور عصری دردمندی سے معمور ہے۔"(۱)

خالد رحیم کی تخلیقات ہند و پاک کے مقتدر ادبی رسائل میں پچھلی دو دہائی سے چھپتی آ رہی ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات سے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں :۔

"خالد رحیم کی غزل میں بچپن کی معصومیت اور حیرت بھی ہے اور عہد پیری کی فکری پختگی بھی۔ مگر یہ دونوں رویے تحت تحت حالت میں نہیں ہیں بلکہ اکثر و بیشتر کچھ اس طور یکجا ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ ان کے شعری اسلوب میں تازگی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ اس اسلوب میں اور نکھار آئے گا۔"(۲)

خالد رحیم نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ بچّوں کے لئے بھی بہت ساری نظمیں لکھی ہیں جو اکثر و بیشتر ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نشر ہوتی رہی ہیں اور ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ان کی نظم "ہمارا اڑیسہ" وطنی اور ملّی جذبات کی اعلیٰ قدروں کی ضامن ہے اور خالد رحیم کی نظموں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند بند ملاحظہ ہو :۔

زمینِ اڑیسہ کے ہم پاسباں
ہمارا اڑیسہ ہے جنّت نشاں

یہ سنتوں کی دھرتی یہ رشیوں کا دیس
یہ مذہب کی وادی یہ ولیوں کا دیس
یہ پھولوں کا گلشن یہ کلیوں کا دیس
ادیبوں کا مسکن یہ کویوں کا دیس

زمیں اس کی پیاری حسیں آسماں
ہمارا اڑیسہ ہے جنّت نشاں

---

(۱) پروفیسر محمد حسن، رائے/ عکس در عکس، ۱۹۸۳ء؛ اندرونی فلیپ۔
(۲) ڈاکٹر وزیر آغا، رائے/ ایضاً

یہ تیرتھ کی بھومی، جگن ناتھ دھام
یہ کائی پدر مرجع خاص و عام
یہاں سوریہ مندر کا نقش دوام
یہاں کیسے کیسے ہیں دلکش مقام
مقدس یہاں کی ہر اک داستاں
ہمارا اُڑیسہ ہے جنت نشاں

عجوبہ کونارک سا کوئی نہیں
نمونہ ہے یہ فکر و فن کا حسیں
یہاں کے ہیں پتھر بڑے دل نشیں
سجی ہے فن بت گری سے زمیں
یہاں پتھروں کو ملی ہے زباں
ہمارا اڑیسہ ہے جنّت نشاں

یہاں شوخ ندیاں حسیں آبدار
یہاں سبز کھیتوں پہ رنگ بہار
یہاں گنگناتے ہوئے آبشار
یہاں سر اٹھاتے ہوئے کوہسار
یہاں ہے سمندر کا دلکش سماں
ہمارا اڑیسہ ہے جنّت نشاں

اُڑیسہ کا اپنا ہے اک رکھ رکھاؤ
نہیں ہندو مسلم میں کچھ بھید بھاؤ
سبھی کو پسند ایکتا کا سبھاؤ
زبانوں کا جھگڑا نہ کوئی تناؤ
فضا امن پرور حسیں شادماں
ہمارا اُڑیسہ ہے جنّت نشاں

اُڑیسہ ہمارا دیارِ طہور
اُڑیسہ کی مٹی ہے آنکھوں کا نور
اُڑیسہ ہے خالق کے دل کا سرور
یہاں علم و فن کو ملا ہے شعور
کریں اور کیا اس کی عظمت بیاں
ہمارا اُڑیسہ ہے جنّت نشاں
(اقتباس از ہمارا اُڑیسہ)

خالد رحیم کی غزلوں میں جو سادگی اور رچاؤ ہے اس سے متاثر ہو کر کمار پاشی رقمطراز ہیں:

"خالد رحیم نے اپنے گرد و پیش کے حوالے سے اپنی شخصیت کو جاننے، پرکھنے اور پیش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اور سادہ سلیس اور عام بول چال کی زبان میں اظہار کا حق ادا کیا ہے۔"(۱)

اب خالد رحیم کے رنگ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

شعلے بھڑکاؤ کوئی پھول سا پیکر نہ رہے — درد ہی درد رہے پیار کا منظر نہ رہے
اب یہ تحریک چلی ہے کہ یہاں سر نہ رہے — برہنہ روح رہے جسم کی چادر نہ رہے
اب کے شمشیر بکف یادِ صبا گذری ہے — شاخِ امید پہ اب کوئی گُل تر نہ رہے
یہ بھی ممکن ہے سرِ شام جو واپس آؤں — اس سلگتی ہوئی بستی میں مرا گھر نہ رہے
اب یہ سازش ہے کہ خوں رنگ ہو موسم کا لباس
سبز پودوں کا سلامت کہیں پیکر نہ رہے

چہرے کو چاند لکھ دے لب کو گلاب لکھ دے
جلتے بدن کو اس کے تو آفتاب لکھ دے
قرطاس زندگی پر تعبیرِ خواب لکھ دے
اپنے دل و نظر کا کچھ انتخاب لکھ دے

---

(۱) کمار پاشی: رائے/ عکس در عکس، مطبوعہ ۱۹۸۳ء: اندرون فلیپ۔

پڑھنے لگی ہے دنیا اب تیری داستاں کو
اپنی اذیتوں کا اک اور باب لکھ دے

یہ رات چاہتی ہے تیرے قلم کی جنبش
اُٹھ ایک رُخِ حسیں کو زیرِ نقاب لکھ دے

جو زندگی کے غم کو آپس میں بانٹتی ہو
بہرِ نصاب کوئی ایسی کتاب لکھ دے

اپنے لہو میں اُنگلی اپنی ڈبو کے خالد
اپنے ہی روز و شب کا کوئی حساب لکھ دے

یوسف جمال

۱۹۴۷ء

نام محمد یوسف اور تخلص جمالؔ ہے۔ دنیائے ادب میں یوسف جمال کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ والد کا نام محمد خیر الدین اور والدہ کا نام سلیمہ خاتون تھا۔ یوسف جمال ۱ار فروری ۱۹۴۷ء کو ضلع سنگھ بھوم کے چکردھر پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کا مسکن مغربی بنگال تھا۔ بعد میں یہ خاندان چکردھر پور منتقل ہوا اور پھر چکردھر پور سے یوسف جمال کے زمانۂ طفولیت ہی میں راج گانگ پور (اڑیسہ) چلا آیا۔ وہ بچپن ہی سے اڑیسہ میں ہیں۔ اور سرزمینِ اڑیسہ کو ہی اپنا وطن مالوف سمجھتے ہیں۔ جہاں ان کے ذہن و شعور کی پرورش ہوئی۔ یوسف جمال نے اسکول میں صرف مڈل تک کی تعلیم حاصل کی ہے۔ بعد میں اپنی محنت اور لگن سے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کیا۔ ان دنوں راج گانگ پور کے اردو پرائمری اسکول میں مدرس ہیں۔ گھر کے قطعی غیر ادبی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اردو شعر و ادب سے فطری ذوق و لگن اور مطالعہ کی بنا پر وہ شاعر و ادیب بن گئے۔ اڑیسہ میں کرامت علی کرامت کے بعد اردو کے باشعور ادیب و شاعر کی حیثیت سے یوسف جمال کا نام آتا ہے۔ یوسف جمال پچھلی دو دہائی سے اردو شعر و ادب کی مشاقی کرتے آ رہے ہیں۔

یوسف جمال نے ابتدائی دور میں اپنی چند غزلوں پر گھائل فریدی سے اصلاح لی پھر ان کے مشورہ سے جناب ظرفہ قریشی کے زمرۂ تلامذہ میں شریک ہوئے لیکن ان کی اصلاح سے ذہنی آسودگی حاصل نہ ہوسکی تو بالآخر سید حرمت الاکرام سے برائے اصلاح رجوع کیا۔ حرمت صاحب کے مخلصانہ مشوروں اور ضروری اصلاح نے یوسف جمال کے ذوقِ شعرگوئی کو جلا بخشی۔

یوسف جمال کے اب تک کے تخلیقی سرمایہ کا جائزہ لیا جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ انھوں نے ۱۲۱ روایتی غزلیں کہی ہیں (جن میں سے تقریباً سو غزلیں مطبوعہ ہیں)۔ ۱۹ قدیم رنگ کی نظمیں ہیں (جن میں سے ۱۴ مطبوعہ ہیں)۔ تقریباً ۲۰۰ جدید رنگ کی غزلیں ہیں (جن میں سے بیشتر شائع ہو چکی ہیں)۔ نثر جدید نظمیں اور تقریباً چالیس آزاد غزلوں کا سرمایہ یوسف جمال کی پہلو دار تخلیقی صلاحیت کا بیّن ثبوت ہے۔ یوسف جمال نے تجربوں کی شکل میں اردو کی جدید شاعری کو جو کچھ دیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

یوسف جمال کی شعری پیکر کے انوکھے پن سے متاثر ہونے کے لئے تحت الشعور اور لاشعور کی گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوسف جمال کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

زخموں کی مناجات میں پنہاں وہ اثر تھا — آنکھوں سے ٹپکتا ہوا آنسو بھی گہر تھا
اشکوں کی معیت میں تھے مغموم اندھیرے — صدمات کی ہر سیج میں اک خوف کا گھر تھا
دروازے مکانوں کے ہوتے بند سرِ شام — کہتے ہیں مگر سب کہ جیالوں کا نگر تھا
کیسی وہ ہوس تھی کہ بنی موجبِ تعذیر — جنّت سے نکلوا دیا کیسا وہ ثمر تھا

وہ تیرگی کا مرثیہ پڑھتا رہا تا عمر
دل اس کا مگر طالعِ انوارِ سحر تھا (۱)

یوسف جمال کے مختلف رنگوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اے جمال اونچا تھا قد اس واسطے سبکی ہوئی — روک سکتا ور نہ کیا اس گھر کا دروازہ مجھے

---

(۱) مطبوعہ اوراق خاص نمبر بابت مئی جون ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۶

منتظر تھا میں کہ خوش پیکر سویرا آئے گا   دفعتاً کمرہ کھلا، آیا اجالا زرد رنگ

قحط نیندوں کا پڑے گا چاہتو کے کھیت میں   خواب کی فصلیں اگر ساری جلادی جائینگی

برسوں کے کالے دن نے جب دیکھا اجلی دھوپ کا روپ
سایوں کی گونگی بھاشا کی سورج ہنسی اڑاتا ہے

کورے کاغذ کی طرح بے نور بابوں میں رہا   تیرگی کا حاشیہ بن کر کتابوں میں رہا
جس قدر دی جسم کو مقروض سانسوں کی زکات   کیا بتاؤں جسم اتنا ہی عذابوں میں رہا

سارا بدن ہے خوں سے کیوں تر اسے دکھا   شہ رگ کٹی ہے جس سے وہ نشتر اسے دکھا
آئے گی کیسے نیند دکھا وہ بستر اسے   پھر اس کے بعد خواب کو چھو کر اسے دکھا
پوچھے جو زندگی کی حقیقت کوئی اے جمالؔ   تو چٹکیوں میں ریت اڑا کر اسے دکھا
رہ گیا اپنی طرف حیرت سے میں تکتا جمالؔ
جب وہ میرے قاتلوں میں بھولے پن سے جا ملے

ساجد اثر

۱۹۴۷ء

اصل نام عبداللطیف خاں ولد ابراہیم خاں۔ قلمی نام ساجدؔ اثر۔ ۸؍ جولائی ۱۹۴۶ء کو دیوان بازار کٹک میں پیدا ہوئے۔ مقامی کالج میں پری یونیورسٹی تک تعلیم پائی۔ گھریلو ماحول میں دور دور تک شعر و ادب کا کوئی چرچا نہ تھا۔ لیکن امجد نجمی کی صحبت سے ساجد اثر کو شعر گوئی کی تحریک ملی۔ ۱۹۶۴ء سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ انھوں نے جناب امجد نجمی سے ہی شرف تلمذ حاصل کیا۔

ساجد اثر اردو کی جدید شاعری سے داخلی طور پر متاثر ہیں۔ انھوں نے جدید شاعری کو فیشن یا فارمولے کے طور پر نہیں اپنایا۔ بلکہ جدید شاعری ان کی شاعرانہ شخصیت کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ ساجد اثر کی شاعری ایک طرف اگر موجودہ حیات کے زخم خوردہ احساسات کے اظہار کے لئے پیپ، خون، طاعون، تپ دق جیسے کراہت انگیز پیکروں کا سہارا لیتی ہے تو دوسری طرف چوٹ کا پارس، مایوسیوں کے شامیانے امیدوں کی قالین جیسی جدید و دلکش ترکیبوں سے پیچیدہ نفسیاتی ردّ عمل کے علامتی اظہار کی کوشش کرتی ہے اور قاری کو نیم شعوری اور نیم تحت الشعوری طور پر متاثر کرتی ہے۔ وہ عام طور پر اپنی طبع زاد زمین میں شعر کہتے ہیں اور نئے نئے قوافی اور ردیفوں کا استعمال کرتے ہیں۔ نئے قوافی ان کے ذہنوں کو نئی سمتوں کی جانب موڑ دیتے ہیں جن سے نئے خیالات سے آراستہ بہت ہی خوب صورت ڈھلے ڈھلائے اشعار قاری کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

زندگی جب اداس لگتی ہے — ہر خوشی بے لباس لگتی ہے
آنسوؤں کے نمک میں پوشیدہ — قہقہوں کی مٹھاس لگتی ہے
وہی محفل جو طنز کرتی تھی — اب سراپا سپاس لگتی ہے
کرفیو کا نفاذ ہے ظلمت — روشنی بد حواس لگتی ہے
آج ساجد اثر کی ہر خواہش
ایک ٹوٹا گلاس لگتی ہے

وقت ایک بچہ ہے — آدمی کھلونا ہے
آرزوؤں کے ہاتھوں میں — درد کا صحیفہ ہے
ذہن کی حویلی پر
الجھنوں کا سایہ ہے

اور خواہش کو بھڑکنے دیجیے — پھل ابھی کچا ہے پکنے دیجیے
زندگی کہرے کی پگڈنڈی سہی — اپنی آنکھوں کو چمکنے دیجیے
روشنی میں غرق ہو جائیں گے ہم — ابر کا ٹکڑا سرکنے دیجیے

کل یونہی بالکل اچانک — ہوگیا خود پر مجھے شک
آگئی یادوں کی ٹولی — کھل گیا ماضی کا پھاٹک
کوئی بھی پڑھتا نہیں ہے — میں ہوں اک بے کار پُستک
دل کی چوبی الگنی کو — چاٹتی ہے غم کی دیمک
تم کو دنیا جانتی ہے — میں؟ کنویں کا ایک مینڈک
دل کے دروازے پہ ساجدؔ
دے رہا ہے کرب دستک

چلی وقت کی گرم، جلّاد لو — رگڑنے لگی ایڑیاں آرزو
تمھاری عنایت سے مربوط ہے — لہو رنگ، سفّاک سازش کی بو
ہواؤں پہ فالج کا دورہ پڑا — دھواں چوستا ہے فضا کا لہو
سیاہی کی جھنکار نے چھین لی — اجالوں کی سنگیت کی آبرو
اداسی کا شاہی خزانہ ملا — مری زندگی ہوگئی سُرخرو
جو لفظوں کی پونجی سے محروم ہیں — اکھرتی ہے ان کو مری گفتگو
اب انسان کرنے لگا ہے اثرؔ
تباہی کے تنوّر کی جستجو

مسکراہٹ کا رقص جاری ہے — آنسوؤں پر جمود طاری ہے
چھاؤں حق تمھیں مبارک ہو — دھوپ کی سلطنت ہماری ہے
میرے تاریخ ساز خوابوں کا — ایک لمحہ صدی پہ بھاری ہے
آپ کی دل شکن نوازش کا — پھول پژمردگی سے عاری ہے
لوگ بے چہرگی کی زندانی! — آئینہ عکس کا بھکاری ہے
مطلق ساعتوں کے گنبد میں — میرا مقسوم بے قراری ہے
اے اثرؔ انتشار ہے مورت
اور انسان اک پجاری ہے

سنگ ریزوں کا جزیرہ چھوڑ کر   وادیٔ گل میں اترنے دے مجھے
تو اگر آسودگی کا پیڑ ہے   اپنی چھاؤں میں ٹھہرنے دے مجھے
اونگھتی خاموشیوں کے دشت میں
اک صدا بن کر بکھرنے دے مجھے

غموں کی کڑی دھوپ کو ماردیں گے   ملائم امیدوں کے بادل نشیلے
قنوطی عقائد کے جنگل میں گم ہیں   مہذب امیدوں کے روشن قبیلے
اثر لب کشائی کو دشمن سمجھ کر
تحمّل کے دھاگوں سے ہونٹوں کو سی لے

اسمٰعیل آذر

سنہ ۱۹۴۲ء

نام اسماعیل خاں ولدیت احمداللہ خاں۔ جائے ولادت پنشن لین کٹک۔ تاریخ ولادت جنوری سنہ ۱۹۴۲ء۔ تعلیم کا آغاز اسلامی تعلیم سے مدرسہ سلطانیہ کٹک میں ہوا۔ مدرسہ سلطانیہ سے فوقانیہ اوّل پاس کیا۔ اس کے بعد اسماعیل نے سعید سیمنزی کٹک میں داخلہ لیا تو راقم الحروف نے اسماعیل خاں کو اسماعیل سعیدی سے مسمّٰی کیا۔ اسماعیل سعیدی نے راونشا کالج کٹک سے فارسی آنرز کے ساتھ بی اے کیا اور دہلی سے ڈپلوما ان آرکائیوز کیپنگ "Diploma in Archieves Keeping" حاصل کیا۔ ان دنوں اسٹیٹ آرکائیوز بھوبنیشر میں آرکیوسٹ کے عہدہ پر فائز ہیں۔ انھیں زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر و سخن سے دلچسپی رہی ہے۔ اردو لائبریری آف اڑیسہ کے ایک مشاعرہ میں صدر لائبریری جناب معین الدین احمد کی تحریک و ترغیب پر ہی سنہ ۱۹۷۳ء میں اسماعیل نے شعر گوئی کا آغاز کیا اور اس طرح وہ اسماعیل سعیدی سے اسماعیل آذر بنے۔ اپنے ابتدائی دور میں اسماعیل آذر روایتی انداز میں شعر کہتے تھے اور کٹک کے مشاعروں میں ترنم سے پڑھا

کرتے تھے لیکن بڑی سرعت سے انھوں نے اپنا رخ جدید شاعری کی طرف کر لیا۔

دہلی کے دوران قیام ان کی طبیعت طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئی۔ فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین کی صحبت نے انھیں طنز و ظرافت کے میدان میں نثر کی طرف مائل کیا لیکن داخلی طور پر شعری رجحان ان پر غالب رہا۔ انھوں نے ابتدا میں مولوی برکت اللہ برکت، مسیح اللہ مسیح اور منظر حسن دسنوی سے مشورۂ سخن کیا۔ لیکن بعد میں خود کو جناب حرمت الاکرام سے وابستہ کر لیا۔ اسماعیل آذر نے ۱۹۷۶ء میں مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا اور سنجیدہ شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اسماعیل آذر نے اڑیسہ میں طنز و مزاح کے فروغ کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ بزم سخن کی جانب سے انھوں نے جشن ظرافت اور آل انڈیا مزاحیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا اور بعد میں انھوں نے ایک باقاعدہ مزاحیہ بزم کی بنیاد ڈالی جو آج "بزم ظرافت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس "بزم ظرافت" کے زیر اہتمام ۲۶ رمئی ۱۹۸۴ء کو انھوں نے ایک آل انڈیا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کیا جس میں حیدرآباد سے نریندر لوتھر، صبغت اللہ بمباٹ، پٹنہ سے اسرار جامعی اور عادل آباد سے پاگل عادل آبادی کے علاوہ متعدد نامور مزاحیہ شاعروں نے شرکت کی۔ اسماعیل آذر ملک کے دور دراز علاقوں میں منعقدہ آل انڈیا مشاعروں میں بھی اکثر و بیشتر شرکت کرتے رہے ہیں۔ ابھی انھوں نے دہلی دور درشن کے زیر اہتمام ۲۵ راگست ۱۹۸۴ء کو منعقدہ ہندی اور اردو کے مزاحیہ مشاعرہ میں شرکت کرکے اپنی ہلکی نظم پر دادِ سخن لوٹا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف اردو کے مزاحیہ مضامین کا اڑیا میں ترجمہ کرکے اڑیا قارئین کو اردو مزاح نگاری کے شہ پاروں سے روشناس کراتے رہے ہیں۔ اور اڑیا کے مزاحیہ ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ کرکے اردو قارئین کو اڑیا طنز و مزاح کی سمتوں سے واقف کراتے رہے ہیں۔ اس طرح بین لسانی طنز و مزاح میں ربط و انسلاک قائم کرنے میں وہ ہمہ وقت مصروف رہا کرتے ہیں۔

اسماعیل آذر کی پہلی غزل جس کا مطلع تھا ؎

بھیس میں شاعر کے قوال آ گئے　　　شعر کی محفل میں گا نک چھا گئے

شگوفہ حیدرآباد بابت اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسماعیل آذر نے مزاحیہ شاعری میں غزل گوئی کی بہ نسبت نظم گوئی کی جانب زیادہ توجہ دی ہے۔ ان کی

تخلیقات میں مندرجہ ذیل نظموں نے عوامی مقبولیت حاصل کی ہے ۔ ان کی یہ نظمیں ادبی اعتبار سے کامیاب اور قابل اعتنا ہیں جن میں ظرافت کے خوش رنگ گل بوٹے عوام کی دلکشی کا باعث بنتے ہیں ۔ ان کے طنز کی تیز دھار ظرافت کی چمک کے لئے قاری کے دل کی تہوں میں اترتی چلی جاتی ہے ۔ ان کی وہ نظمیں ہیں ۔

کیا مذاق ہے ۔ شیطان کو ورغلائے بشر ۔ حلم کی آبرو لٹوا رہا ہے ۔ کابلی والا ۔ جہیز مانگ کر رشتے کو توڑتے کیوں ہو ۔ اب وہ کھڑکی ادھر نہیں کھلتی ۔ چھٹ نہ جائے دم زدن میں عمر کا ابرِ بہار ۔ دوست جب سویا ہوا اس کا اس طرح کچومر بناؤ ۔ بالی کو دا سے گوبال پور بالی کو دا ۔ کیا پئیں ؟ شادی کی عمر ۔ دانتوں کی خصوصیات ۔ ذکر اس پری وش کا ۔ مہاجن کی پگڑی ۔ قصہ حضرت خضر ۔ عورت اور دو سرکا ۔ آپ کے منہ پر ۔ آذر نہیں ہوں میں ۔ الکتب فی سبیل اللہ ۔ لالو بھائی کی حجامت ۔ تضاد ۔ دوران امتحان ۔ برٹش پالیسی ۔ بلی حج کو چلی ۔ آہ میرے جوتے ۔ آیا بچوں کا سال ۔ تعزیت نامہ ۔ الیکشن کا احترام کرو ۔ دے خدا کی راہ میں ۔ پپ پپیارا میرا ۔ سبیل ۔ یاد ماضی ۔ ہمت نسواں مدد مرداں ۔ ساقی ۔ تکلیف دہ ہے کتنا دفتر کا جانا آنا ۔ چاند بی بی ۔ کیا پوتا بولوں اماں اور ملا ٹلانی پر بگڑے ۔ جھوٹ سچ ۔ خیریت ۔ کس کا مونہہ دیکھا ۔ حوصلہ مند اقدام ۔ گلے پڑی مصیبت ۔ کتنا سیدھا ہے گڈو ہمارا ۔ کون صاحب ہیں یہ ضمیر میاں ۔ میں کیا کھائی ماٹی ۔ شاعر کے گھر ایک شاعر کی نقب زنی ۔ عجیب حالت ۔ طوفانی سیوا ۔ شاعر بننا کوئی کمال نہیں ۔ نیا سال مبارک ہو اور سیاسی جلسہ میں مشاعرہ کا انعقاد ۔

اسماعیل آذر کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

اک ادارہ مالی حالت جس کی تھی ناگفتنی
اس کی صحت کے لئے ترکیب کچھ سوچی گئی
تاکہ ہر ممبر کو حصہ میں ملیں کچھ آم بھی
اور اس کے ساتھ پائیں گٹھلیوں کے دام بھی
الغرض جلسہ بلا ناغے ہوا ایک شاندار
تاکہ نخلستان نکلے اندرون ریگ زار
شاعروں نے وقت سے پہلے کیں تیاریاں
راہ پھر تکنے لگے لیتے ہوئے انگڑائیاں
یک بیک مائک سے اک آواز گونجی صاحبان!
آج کا جلسہ رہا ہے کامیاب و کامران
آج کا دن کم نہیں ہے صاحبو کچھ عید سے
لیڈروں کے صدقے گھر لوٹینگے ہم امید سے
شاعروں کو اب کوئی زحمت دیں شاید عوام
اس لئے جلسے کا کرتے ہیں یہیں ہم اختتام

سن کے یہ اعلان کھسکے سارے محمود و ایاز   انگلی کاپی میں پھنسائے رہ گئے اردو نواز

آج کل بلوائی جاتی ہے سیاسی ٹیم جب
ایکسٹرا کی لسٹ میں جتتے ہیں شاعر سب کے سب

(اقتباس، سیاسی جلسہ میں مشاعرے کا انعقاد)

بیٹھے ہوئے تھے کھاٹ پہ منشی غریب خاں   فرزند ارجمند سے بولے کہ "او میاں!
سنتے ہیں آج گاؤں میں ایک سانحہ ہوا   بیٹا زمین دار کا دنیا سے چل بسا
لازم ہے تعزیت کو چلو تم بہ چشم تر   احسان ان کا بھی تو رہا ہم غریب پر"
فرزند بولے " عذر تو مجھ کو نہیں ذرا   لیکن میں جانتا ہی نہیں تعزیت ہے کیا"
اس پر بزرگ بولے " بس اتنا ہی ہے بہت   چوکھٹ پہ ان کی حاضری دینا ہی ہے بہت
جاکر وہاں دیکھو مناتے ہیں کیسے سوگ   آداب تعزیت کے دکھاتے ہیں کیسے لوگ"
القصہ روبروئے زمیندار جب ہوا   آنکھوں میں اشک بھر گئے بھرا گئی صدا
بولا " حضور ہو گیا یہ کیسا حادثہ   دنیا سے نور چشم یکایک جو اٹھ گیا
حق مغفرت کرے کہ بڑا بدمعاش تھا   لچا، لفنگا، پاجی، گدھا، بدقماش تھا
اکتا تھا اس سے ہر اک فرد گاؤں کا   اچھا ہوا خبیث زمانے سے اٹھ گیا"
پھر کیا تھا اک آن میں سب اس پہ پل پڑے   لاتوں سے جوتیوں سے نوازا کھڑے کھڑے
پہنچی غریب خاں کے جو کانوں میں یہ خبر   حرکت پہ نور چشم کی تھاما دل و جگر
چکرا گئے بے چارے کچھ اتنا کہ بالآخر   دوڑے وہ گرتے پڑتے سوئے خانۂ امیر
بولے "خطا معاف ہو اے میرے نیک دل   حرکت پہ اپنی لال کی بے حد ہوں منفعل
لہٰذا اس کی بات کا نوٹس نہ لیجیے آپ   لچا، لفنگا، پاجی، گدھا ہو گا اس کا باپ
اقرار کر رہا ہوں قسم کھا کے باپ کی   بھیجوں گا میں نہ پھر کبھی چوکھٹ پہ آپ کی

لڑکا جو کوئی دوسرا دنیا سے جائے گا
یہ بندہ خود حضور کے گھر دوڑا آئے گا"

(اقتباس، تعزیت نامہ)

رشمی کانت راہی

۱۹۳۹ء

نام رشمی کانت پاریکھ ولد ہرکشن داس مادھوجی پاریکھ۔ شہر کٹک میں ۷/ نومبر ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ تقریباً ۸۵ سال قبل ان کے دادا مادھوجی نے سوراسٹر کے مہوا گاؤں سے بغرض تجارت کٹک آکر یہاں مستقل بودوباش اختیار کی۔ ان کا خاندانی پیشہ جوہری ہے۔ مادری زبان گجراتی ہے۔ میٹرک کے بعد ہی ۱۹۵۴ء میں رشمی کانت نے موسیقی سے گہری وابستگی کی بناء پر غزل کہنی شروع کی۔ غزل اردو میں کہتے تھے لیکن اردو رسم الخط سے ناواقف تھے اس لئے گجراتی رسم الخط میں لکھ لیا کرتے تھے۔ اس دوران انھوں کسی سے اصلاح بھی نہیں لی۔ ۱۹۶۷ء میں اپنے ایک بھائی دوست اسداللہ حسن نیکوئی سے اردو سیکھی اور جناب امجد نجمی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ نجمی صاحب کے مشوروں اور اصلاح نے ان کی شعرگوئی کو حوصلہ عطا کیا۔ اوج اعظمی اور فرحت زیدی کی صحبتوں نے ان کے شعری میلانات کو فعال بنایا اور کٹک کی ادبی فضا نے ان کی شاعری کو نئی جلا بخشی۔ اس طرح شاعری کے میدان میں راہی رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگے۔

اب تک دو سو سے کچھ زیادہ غزلیں، ۱۵ نظمیں اور ۲۰ قصیدے ان کے تخلیقی سفر کا سرمایہ ہیں۔ کرامت علی کرامت نے ان کا اولین شعری مجموعہ " حرفِ مستعب" مرتب کیا ہے۔ جو نجمی اکیڈمی کٹک کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ ساجد اثر، خالد رحیم اور کرامت علی کرامت کے قرب نے انھیں جدید شاعری کی طرف مائل کر دیا۔ اس طرح ان کا شمار اڑیسہ کے کامیاب جدید شاعروں میں ہونے لگا۔

رشمی کانت راہی کی شاعری سے متعلق کرامت علی کرامت کی رائے ہے:

"........اصل چیز راہی کے تجربات کا پھیلاؤ اور اسلوب کا انوکھا پن ہے۔ انھوں نے دوسروں کی عینک سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے موجودہ حیات کو دیکھا ہے، پرکھا ہے اور اپنی شاعری میں اس کی سچی ترجمانی کی ہے۔ ان کا انداز بیان زیادہ تر پیکری ہے۔

لیکن کہیں کہیں پراسرار ہو کر علامتی بھی بن گیا ہے۔‘‘(۱)

رشمی کانت راہی کی شاعری ہندو مسلم ثقافت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں جس میں انسانی اخوت کی حکمرانی ہو اور جہاں فساد و فتور کا نام و نشان تک نہ ہو۔ مذہب کے نام پر خونریزی انھیں مضطرب رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

امن کے رخ پر بدحواسی ہے — وقت کا فیصلہ سیاسی ہے
خونِ اہلِ وطن ہو ارزاں — آج ہر شہر اک پلاسی ہے
مختلف آج ہیں اصولِ حیات — کون سا ضابطہ اساسی ہے

ان کے چند پیکری اور علامتی اشعار ملاحظہ ہوں:-

غم و عیش کا آئینہ لے گئی — ہوا میرا چہرہ اڑا لے گئی
کئی منجمد خواہشوں کی ہوس — مری زیست کا حاشیہ لے گئی

جو چاند شام سے تا صبح قتل ہوتا ہے — تو صحنِ شب میں بکھرتا ہے چاندنی کا لہو
آئینۂ وجود پہ یادوں کی دھول ہے — پرچھائیوں کے ساتھ الجھنا فضول ہے

حاصلِ الفت صنم لکھو — کالے کاغذ پہ اجلے غم لکھو

ان کے کلام میں ہندوستانی عناصر پورے نکھار کے ساتھ پائے جاتے ہیں جن پر گنگا جمنی تہذیب کی گہری چھاپ ہوا کرتی ہے۔

پڑھتی رہی ہے پریم کی پوتھی — زندگی ہے کہ دیو داسی ہے
نقش جدا ہیں ایک نقاش — کوہِ طور ہو یا کیلاش

---

(۱) کرامت علی کرامت: ’’اردو شاعری کی ایک نئی آواز۔ رشمی کانت راہی‘‘، مطبوعہ اخبارِ مشرق کلکتہ۔ ۲۲؍ ستمبر ۱۹۹۳ء۔

اطہر عزیز

اطہر عزیز کا اصل نام سبحان خاں ہے۔ ان کی ولادت کٹک کے کھٹین ساہی میں ہوئی۔ اطہر عزیز کی ابتدائی تعلیم کٹک کے ایک مدرسہ میں ہوئی۔ بعد میں انھوں نے سعید سیمنری سے میٹرک پاس کیا اور راونشا کالج کٹک سے بی ایس سی کیا۔ طویل عرصہ تک الٰہ آباد کے جیپ فلیش لائٹ کے ادارہ میں Geep Flash Light رہے۔ وہاں سے ملازمت ترک کر کے کٹک میں مکتبہ رحمانیہ (بکڈپو) قائم کیا۔ پھر "بک لینڈ" سے منسلک ہوئے اور بالآخر دہلی آکر دفتر قومی آواز میں شعبۂ اشتہارات میں معاون ناظم کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہاں سے بھی الگ ہو گئے۔ اور بمبئی کو اپنا مستقر بنایا۔

اطہر عزیز اڑیسہ کے جدید شاعروں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

کہنا ہے جو بھی کہہ دو یہیں میرے کان میں — دیکھو جلا ئیو نہ مجھے سائبان میں
خوابوں کی سیڑھیوں پہ نظر رکھ کے کیا کریں — رہتی ہے اب تو یاد بھی اونچے مکان میں
لہجے میں ایک بار تو شبنم بھی گھول لو — یہ کیا کہ نے کی بات لہو کی زبان میں
سورج کی خودکشی کا بھی منظر عجیب تھا — بکھرا جو دائروں میں سمٹا چٹان میں
فکر جمیل جانے کہاں جا کے سو گئی — ہم ڈھونڈتے ہیں گیت غزل کی دکان میں
سانسوں سے پوچھتی تھیں یہی لب کی آہٹیں — یہ تو بتاؤ کیا کیا امتحان میں

آہوں کے تیر اشک کے نیزے تو بن گئے
شعلے سمٹ کے رہ گئے لیکن کمان میں (۱)

---

(۱) مطبوعہ دماہی الفاظ علی گڑھ ۱۹۸۲ء / "اردو" دہلی ۱۹۸۳ء

الطاف حسین حسرت

۱۹۳۹ء

سید الطاف حسین نام۔ حسرت تخلص۔ ولد سید جلال مرحوم۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۳۹ء کو سمبلپور میں پیدا ہوئے۔ حسرت کی تعلیم انٹرمیڈیٹ آرٹس تک ہے۔ عرصۂ دراز سے حکومت اُڑیسہ کے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ ویلفیئر آفیسر کے عہدہ پر مامور ہیں۔ ملازمت کے سلسلہ میں الطاف حسین حسرت کا قیام جن دنوں کٹک میں تھا کٹک کے ادبی ماحول نے ان کے اندر شاعر کے میلانات کو فروغ دیا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور یعنی ۶۰ — ۱۹۵۹ء میں حسرت نے مظہر امام سے مشو ہ سخن کیا۔ مظہر امام کا تبادلہ کٹک سے گوہاٹی ہوگیا تو حسرت طرفہ قریشی مرحوم سے اصلاح لینے لگے۔ ۱۹۵۹ء میں حسرت نے پہلی مرتبہ سمبلپور کے ایک مشاعرہ میں اپنا کلا یش کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔ ان کی غزلیں اور نعتیں روزانہ ہند کلکتہ، پیامِ مشرق دہلی، آستانہ دہلی، ساز سرمدی دہرہ دون اور دیگر کئی ادبی جریدوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی تخلیقات کا قابل اعتناء ذخیرہ موجود ہے۔ اب تک ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے۔

نمونۂ کلام

ہمیشہ دب کے نہیں رہتا جوہر فطرت — صدف نکل کے چلا آیا گہرے پانی میں

آج اسیر تیرگی ہے ابن آدم کا ضمیر — کل چراغِ رہ گذر تھا اک زمانہ کے لئے

جام مے نشاط سہی جام زندگی — قاتل جو زندگی کا ہے وہ سم بھی ساتھ ہے

وہ حسنِ دل فروز بتاؤ کہاں نہیں　　پردہ پڑا ہوا ہے ہماری نگاہ پر

سوزِ دل گریۂ پیہم سے لپٹ جاتا ہے　　یہ وہ شعلہ ہے جو شبنم سے لپٹ جاتا ہے

اے دوست زندگی کا نصابِ عمل نہ پوچھ　　ہیں کتنے امتحان کہوں میں تو کیا کہوں

اللہ رے جنون کی خلوت پسندیاں　　میں رشتہ اپنی ذات سے بھی توڑنے لگا

یہ حادثات کے موجوں کے تیز تیز قدم　　ارے ارے یہ گھروندا میرا بنایا ہوا

یاد کر لینا ادھوری زندگانی کو مری　　ہوا را دے میں ترے تکمیل افسانہ جہاں

دلوں کے آئینے یکسر ہیں روپ سے خالی　　حرم میں ہو گئے کیا تبدیل صنم خانے

شمع جلتی ہے دن کو کمروں میں　　آج کل دن میں تیرگی ہے بہت

راشد شبنم

سنہ ۱۹۳۹ء

نام سید محمد راشد۔ تخلص شبنم ولد محمد ساجد ولادت سنہ ۱۹۳۹ء میں شہر کٹک کے محلّہ درگاہ بازار میں ہوئی۔ ان کا خاندانی تعلق سونگڑہ کے سادات سے ہے۔ راشد شبنم نے صرف دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے اور پیشہ کے لحاظ سے پرائمری اسکول میں مدرس ہیں۔ سونگڑہ اڑیسہ میں علم و ادب اور اسلامی کلچر کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ وہاں

کی ادبی اور تہذیبی فضاء میں سید محمد راشد شبنم کی شاعری کو جلا ملی۔ راشد شبنم نے ۱۹۵۶ء میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ سونگڑہ کی ادبی انجمن "گلشن ادب" کی جانب سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور قابل قدر تخلیقات کی بناء پر "ستارۂ گلشن ادب" کے خطاب سے نوازا گیا۔ ابتدائی دور میں راشد شبنم غزلیں کہا کرتے تھے لیکن بعد میں مذہبی رجحان اور طبعی میلان کی بناء پر وہ نعت گوئی کی جانب متوجہ ہوئے اور بہت ہی ایمان افروز نعتیں کہیں۔ ان کی نعت گوئی کی شہرت نے انھیں اعزازی طور پر "اجلاس کل ہند مؤتمر فضلاء وابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند" میں شرکت کر کے نعت اور "مؤتمر" نظم پیش کرنے کا موقع دیا۔

راشد شبنم سونگڑہ کی ادبی فضاء کو بنائے رکھنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں۔ اڑیسہ کے تین شاعروں نے حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہو کر اڑیسہ پر نظمیں کہی ہیں جن میں سب سے پہلا نام امجد نجمی (اُتکل اڑیسہ کلنگا ہمارا)، دوسرا نام خالد رحیم (ہمارا اڑیسہ)، اور تیسرا نام راشد شبنم (صوبۂ اڑیسہ) کا ہے۔

اڑیسہ میں اردو ادب کے ارتقاء کی کڑیوں کو جوڑتے وقت راشد شبنم کی تخلیقات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مواد اور اسلوب کے لحاظ سے شبنم کے نعتیہ کلام میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ لیکن غزل کی زمین پر ان کی گرفت غیر مستحکم ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

جب سر شام ہی ویران ہے دل کی بستی　　رات فرقت کی کوئی کیسے گذارے سمجھو

رہبر نہیں، رفیق نہیں، ہمسفر نہیں　　پہنچے ہیں ہم کہاں ہمیں کچھ خبر نہیں
آنگن میں تیرگی کے سسکتی رہی حیات　　شاید ہمارے حق میں طلوع سحر نہیں

بے بس ہے چشم شوق نظاروں کی بھیڑ میں　　کلیاں سسک رہی ہیں نظاروں کی بھیڑ میں
کیسے اچک کے جانے اندھیروں نے لے لیا　　حالانکہ ہم کھڑے تھے ستاروں کی بھیڑ میں

پھیلی ہوئی ہے رشد و ہدایت کی چاندنی　　ہر سمت موجزن ہے شریعت کی چاندنی
اب منتظر نہیں ہیں طلوع سحر کے ہم　　کافی ہے ماہتاب رسالت کی چاندنی

درِ کعبہ سے اک عظمت بھرا دل لے کے آیا ہوں
مدینے سے ضیائے ماہِ کامل لے کے آیا ہوں
سمٹ آئی مرے کشکول میں کونین کی دولت
خطائیں بیچ کر عقبیٰ کا حاصل لے کے آیا ہوں
دیارِ رحمتِ عالم سے خالی ہاتھ کیا آتا
شفاعت کے لئے رحمت کو شامل لے کے آیا ہوں
نگاہوں میں ابھی ہے جلوہ گر توحید کی محفل
وہ محفل جس سے کچھ آدابِ محفل لے کے آیا ہوں
وضو کرتی ہے جس پر آ کے ٹولی عرش والوں کی
خیالوں میں اسی زمزم کا ساحل لے کے آیا ہوں
منور ہے جبیں پر نور سجدہ ہائے کعبہ کا
نشانِ سنت و فرض و نوافل لے کے آیا ہوں
مرے ہمراہ رہبر ہے کلامِ پاک کا نسخہ
ہوا تھا کل سوئے کعبہ جو نازل لے کے آیا ہوں
حصولِ دولتِ دیں تھا بہت مشکل مگر شبنمؔ
پہنچ کر در بہ در منزل بمنزل لے کے آیا ہوں

جس کے سنہرے فرش کا سبزہ ہے پیرہن
وہ صوبۂ اڑیسہ ہے میرا حسیں وطن
سونا اُگے ہے کھیت میں پانی میں برق ہے
اس کے پھلوں میں رس ہے تو پھولوں میں عرق ہے
ہر شخص اس کے پیار میں ممتا میں غرق ہے
قدرت کے زیورات سے یہ زرق برق ہے
حاصل ہیں اس کو ایسے نظارے نصیب سے
تکتے ہیں جن کو چاند ستارے قریب سے

ویران پارہ دیپ تجارت کا در بنا
یہ کاروان بحر کا اک رہگذر بنا
لوگوں میں دور دیش کا عزم سفر بنا
صوبہ ہمارا تاجورِ بحر و بر بنا
پہنچے یہ دور دور جہازوں کے ڈول پر
پتھر ہمارے بک گئے سونے کے مول پر

راشد شبنم کے کلام میں روانی اور سلاست کے باوجود جا بجا زبان و بیان کی خامیاں پائی جاتی ہیں تاہم ان کے ماحول اور شعری وجدان کے پس منظر میں ان کی تخلیقات ناقابل اعتنا نہیں ہیں۔

عبدالمتین جامی

سنہ ۱۹۵۰ء

نام عبدالمتین۔ تخلص جامی۔ ولد شیخ ثناء اللہ مرحوم۔ ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو سونگڑہ میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا آغاز سنہ ۱۹۷۶ء میں ہوا۔ طبعی میلان جدید شاعری کی طرف ہے۔ اپنے ماموں کرامت علی کرامت سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ اب تک تقریباً سو غزلیں کہہ چکے ہیں۔ ان کا کلام روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ، ماہنامہ صدائے اڑیسہ، ادب نکھار مئو ناتھ بھنجن، نئی نسلیں علی گڑھ، گل کدہ سہسوان، ساز سرمدی دہرہ دون، چنگاری دہلی کے علاوہ ملک کے مقتدر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ کٹک کی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر درج ذیل اشعار پیش ہیں:-

جب کبھی ظاہر ہوئے سورج کے زردیلے نقوش
خود پگھلنے لگ گئے چہروں کے برفیلے نقوش

سن رہے تھے ہر طرف اپنی صدا کی بازگشت
ہر طرف بکھرے ہوئے تھے ذہن کے ڈھیلے نقوش

ساعتوں کا قافلہ ساکت کھڑا تھا جسم میں   چلتے پھرتے تھے مگر سانسوں کے پتھریلے نقوش
وحشتوں کی روشنائی بہہ گئی کاغذ پہ جب   دہر میں ہر سمت تھے جنگل کے زہریلے نقوش
ہم نے بویا تھا بدن کے کھیت میں تخمِ ہوس   کاٹتے ہیں راحتوں کی فصل زردیلے نقوش
کتنی آسانی فراہم کی تھی جامی وقت نے
مل رہے تھے راستے میں نیلے اور پیلے نقوش

نغموں کے قافلہ کا میں تنہا نقیب تھا   یا شاخِ کائنات پہ اک عندلیب تھا
اپنا کوئی رفیق نہ کوئی رقیب تھا   میں خواہشوں کی بزم میں سب کے قریب تھا
زینے پہ قصرِ وقت کے چڑھتا چلا گیا   میرا شکستہ حوصلہ جو خوش نصیب تھا
لپٹی ہوئی تھی جسم سے اس کے لہو کی شاخ   وہ شخص جو کہ شہرِ انا کا خطیب تھا
تھیں آسماں کی وسعتیں اپنی نگاہ میں   لمحاتِ گمشدہ کا تصور عجیب تھا
گردابِ حادثات میں ہم پھنس کے رہ گئے   جب ساحلِ مراد بہت ہی قریب تھا
لوگوں سے مل رہی تھی اسے روشنی کی بھیک
دل کے حسین دیار میں جامی غریب تھا

پتھروں کی بارشیں اب ہو رہی ہیں ہر طرف   گھر نہیں اپنا کوئی ہم چھپائیں سر کہاں
کس طرح دیکھیں بھلا ہم اپنے مستقبل کا خواب   وقت کے آئینے میں امید کا جوہر کہاں
ذات کے محبس میں عرصہ سے چھپے بیٹھے ہو تم   ڈھونڈتے پھرتے ہو خود کو روز و شب باہر کہاں
ہم نے جامی کر لیا تعمیر شیشے کا محل
اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر کا پتھر کہاں

الطاف نادر

۱۹۵۵ء

نام محمد الطاف الرحمٰن۔ تخلص نادر۔ ولد محمد ایوب۔ ۲ر مارچ ۱۹۵۵ء میں بھدرک کے محلّہ قاضی ساہی میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول میں درجہ یازدہم تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ طبیعت کا میلان جدید شاعری کی طرف ہے۔ اب تک تقریباً سو سوا سو غزلیں کہہ چکے ہیں جن میں سے متعدد غزلیں ملک کے مؤقر جرائد مثلاً پاسبان پنجاب، آج کل دہلی، بیسویں صدی دہلی، ادب نکھار مئو ناتھ بھنجن، قومی راج بمبئی، نیا دور لکھنؤ، روبی دہلی وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

سوزِ دل سوزِ جگر سوزِ جنوں سوزِ حیات
وقت پیاسا ہے سمندر بھی نہ صحرا ہو جائے

ہر کوئی ہاتھ میں آئینہ لئے پھرتا ہے
کیا پتہ مجھ سے جدا کب مرا چہرا ہو جائے

دھوپ سے شاخوں پہ زلفوں کا گھنیرا سایہ
پانی دریا کا کہیں اور نہ گہرا ہو جائے

اس رشک آئینہ کے مقابل ہے آئینہ
گیسو سنور بھی جائیں تو شیشہ میں بل پڑے

یادوں کے جزیروں میں سوکھے ہوئے پیڑوں پر
موسم کے برستے ہی پھر برگ و ثمر آئے

جب قید تھے بہتر تھا تنہائی کی مجلس میں
یہ کون چھڑا لایا کس شخص کے گھر آئے

ابھرے ہیں کئی چہرے احساس کے درپن میں
ممکن ہے کوئی تازہ آفت میرے سر آئے

سطح سے ہوتا ہے گہرائی کا اندازہ کہیں
دل کی حالت کا پتہ مت نبض کو چھو کر لگا

کل تلک محلوں میں تھا جو فرش گل پر محوِ خواب
آج اسی انساں کا ہے فٹ پاتھ پر بستر لگا

تھا مثالِ آئینہ نادر یہاں میرا وجود
دیکھنے میں اہل دنیا کے مگر پتھر لگا

تنہائیوں میں وسعت صحرا سمیٹ کر
میں بھی دیارِ فکر میں دریا لئے پھرا

جو آئینہ ملا وہ شکستہ ملا مجھے — تکمیل عکس کی ہی تمنا لئے پھرا
جس کے بدن کی آنچ سے احساس جل گیا — دل میں اسی کے قرب کا جلوہ لئے پھرا
جو صبح کی فصیل سے ٹکرا کے مر گئے — ان شب کے پنچھیوں کا ہی لاشہ لئے پھرا
بیمار خواہشوں کے سمندر میں کود کر
نادر لہولہان سراپا لئے پھرا

وہ شخص اجنبی تھا تو میرے قریب تھا — جب آشنا ہوا تو بہت فاصلے ہوئے
وہ رات کے اندھیرے میں باہر چلا گیا — دروازے کہہ رہے ہیں یہی جاگتے ہوئے

سید اولاد رسول قدسی

۱۹۶۳ء

نام سید اولاد رسول، قدسی تخلص، ولد مولانا سید عبدالقدوس۔ مرزاپور بھدرک میں ۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ بھدرک کالج سے بی اے کیا اور فی الحال راونشا کالج کٹک میں ایم اے کر رہے ہیں۔ اپنے گھر کے علمی ادبی اور مذہبی ماحول میں قدسی کو شعر گوئی کی تحریک ملی۔ انھوں نے اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ خانگی طور پر مذہبی تعلیمات حاصل کیں جسے ان کے گھریلو معاملات نے جلا بخشی۔ پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے پہلی نعت کہی۔ اگرچہ ان کی شاعری عہد طفولیت میں ہے لیکن ان کی بالغ نظری نے ان کی تخلیقات میں تمام شاعرانہ محرکات کو پیش نظر رکھا ہے۔ کٹک کے ادبی ماحول میں جا کر کرامت علی کرامت سے مشورۂ سخن حاصل کرنے کے بعد شاعری کے جدید میلانات ان پر مکمل طور پر حاوی ہوئے۔ ان کے تخلیقی عوامل میں انسانی کرب جس طرح سے محلول ہوا ہے اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں اڑیسہ میں اردو کی جدید شاعری میں وہ بہت جلد اپنی شناخت قائم کر لیں گے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

عکس خشکی ابھی برسات کے شیشے میں ہے — دھول آلام کی حالات کے شیشے میں ہے

چاندنی اس کے تصور کی پڑی ہے دل میں　　تیرگی گرچہ ملاقات کے شیشے میں ہے
آنکھ منظر کی چکاچوند نظر آتی ہے　　جلوہ گر کون حجابات کے شیشے میں ہے
مختلف کرب کے چہرے تو سلگتے ہیں یہاں　　ظلم کی دھوپ عنایات کے شیشے میں ہے
یہ نتیجہ ہے کرامت کے کرم کا قدسی
رنگ جو تیرا خیالات کے شیشے میں ہے

اشجار کا سایہ ہے اشعار کے جنگل میں　　سورج کی تمازت ہے اب یاس کے جنگل میں
یادوں کے بگولوں کو کس طرح اڑاؤں گا　　پت جھڑ کا ہے یہ موسم جب آس کے جنگل میں
معنی کے لئے بڑھ کر جذبات اگاؤ تم
بھرمار ہے لفظوں کی قرطاس کے جنگل میں

ہر پیڑ کے بدن پر گلوں کا لباس تھا　　گویا سنہرا خواب بہاروں کے پاس تھا
ماتھے پہ موج کے بھی لکیریں تھیں فکر کی　　پُر پیچ بحر وقت کا ہر اقتباس تھا
کیوں سرزمین وہم پر اس کا ہے بود و باش
ایقان کا مجسمہ جس کا قیاس تھا

اڑیسہ میں اردو کے فروغ میں بیرونی اصحاب قلم کا حصّہ

عہد جدید میں اڑیسہ میں اردو کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے وقت ان حضرات کی ادبی خدمات کا ذکر ضروری ہے جو بیرون اڑیسہ سے ملازمت یا تجارت کے سلسلہ میں اڑیسہ آکر تادیر مقیم رہے اور یہاں اردو کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔

شمس منیری

حافظ شمس الدین احمد شمس منیری (ولادت ۱۸۹۶ء) راونشا کالج کٹک میں قانون کے استاد کی حیثیت سے ۱۹۲۳ء میں کٹک تشریف لائے۔ موصوف نے ۱۹۲۷ء تک یہاں قیام کیا اور اپنے دوران قیام یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں قابل ذکر حصہ لیا۔ وہ یہاں کے اردو ڈراماٹک سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ وہ ایک بلند پایہ پرگو شاعر تھے۔ بزم ادب کٹک کے تمام مشاعروں میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ طبعی رجحانات اور مزاج کی ہم آہنگی کی بنا پر موصوف کو امجد نجمی سے قرب خاص تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

بھاگے تو تھے کشاکش بزم بتاں سے ہم — پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

اللہ! ان کی یاد اب اتنی سی رہ گئی — گویا کبھی ملے تھے کسی میہماں سے ہم

منزل پہ پہلے کون پہنچتا ہے دیکھئے — دوڑے ہیں شرط باندھ کے عمر رواں سے ہم

ہے گردشِ فلک میں بھی چشم بتاں کا رنگ — یوں ورنہ دبنے والے نہ تھے آسماں سے ہم

منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اختلاف کیوں؟ — بس یہ کہ بڑھ گئے ہیں ذرا کارواں سے ہم

راہِ طلب میں جس کے نشاں ہر قدم پہ ہیں
ملنے چلے ہیں شمس اسی بے نشاں سے ہم

آستاں پر ترے جھکا تھا کبھی　　سر میں اب تک غرور ہے اے دوست

یوں تو ہیں سب کی نگاہوں میں یہ پیاری آنکھیں
"کوئی دیکھے میری آنکھوں سے تمہاری آنکھیں"
(نجمی)

اصغر علی بیدؔل

سنہ ۱۹۰۴ء

اصغر علی بیدؔل مظفر پوری کا تقرر راونشا کالج کٹک میں سنہ ۱۹۳۴ء میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ہوا۔ موصوف سنہ ۱۹۵۹ء تک اس کالج میں شعبۂ اردو اور فارسی کے صدر رہے۔ اصغر علی بیدل کی ادبی زندگی کا بیشتر حصہ کٹک کی ادبی فضاء کا جزء لاینفک بنا رہا۔ وہ نہایت ہی باوضع شخصیت کے حامل تھے۔ اکثر شام کو ڈاکٹر جلال الدین احمد ریٹائرڈ سول سرجن کی کوٹھی کے احاطہ میں لان پر کرسیاں لگائی جاتیں جہاں صاحب خانہ کے علاوہ پروفیسر مناظر حسن (صدر شعبۂ جغرافیہ راونشا کالج کٹک)، اصغر علی بیدل، عبدالجلیل ایم ایل سی اور ان کے دوسرے احباب یکجا ہوا کرتے اور ادب، ثقافت اور سیاست کے سرگرم باب کھلتے۔ اصغر علی بیدل کو سرزمین اڑیسہ سے والہانہ لگاؤ اور محبت تھی۔ انھوں نے اپنی اولادوں کی شادیاں بھی یہیں کیں۔ اس طرح انفرادی اور سماجی سطح پر بھی انھوں نے اڑیسہ کے ساتھ اپنا رشتہ مستحکم کیا اور نسلاً در نسل اڑیسہ کی ادبی اور ثقافتی فضاء میں خود کو ضم کرنے کی طرح ڈالی۔

انھوں نے تاریخ کے قدیم ابواب سے اڑیسہ کے تمدن اور علمی فضاء پر اپنے متعدد مضامین کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے تحقیقی اور تاریخی مضامین ملک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور پر Orissa Historical Journal میں ان کے متعدد مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے

بہت سی فارسی کتب کا مطالعہ کر کے تاریخی شواہد کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مغلیہ دور حکومت میں اڑیسہ کا اولین دارالسلطنت پوری ضلع کا مقام پپلی (پیر پلی) تھا۔(1) اصغر علی بیدل ایک پر گو شاعر تھے اور انھیں حافظ شمس الدین احمد شمس منیری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔(۲) نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔ (متفرق اشعار)

ہچکیاں آئیں دمِ نزع تو سمجھا ہم نے　　بیڑیاں ٹوٹیں رہا قیدئ زنداں ہونگے

سنا ہے ان کو نیند آتی ہے سن کر داستاں کوئی
مگر نیند آئے جس سے وہ ہماری داستاں کیوں ہو

ہر مصیبت سے بڑی یہ ہے مصیبت کہ اگر　　آئے بھی تو یہ نہ سمجھیں کہ مصیبت آئی

قسمت نے جب چمن سے نکالا تو ہم کو کیا　　فصلِ بہار ہو کہ خزاں کا زمانہ ہو

تمھارے وعدوں پہ ہم جیتے رہیں گے یوں ہی　　اگر نہ آؤ گے تو موت بھی نہ آئے گی

شباب آیا کسی کا کہ ایک فتنہ نے　　نکالی راہ نئی سر اٹھا کے آنے کی

عبدالجلیل خنجر

ولادت ۱۹۰۶ء

عبدالجلیل خنجر حیدر آبادی کا کٹک کے جنرل پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر کی

---

(1) Asghar Ali: Pipli the forgotten Capital of Moghul Orissa, Orissa Historical Journal: Volume II Sept. 1953 AD PP. 59-60

(۲) آبِ خضر ۱۹۶۳ء؛ ص ۱۷۵

حیثیت سے تقرر ہوا تو انھوں نے یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں پوری تن دہی کے ساتھ حصہ لیا۔ ذاتی طور پر وہ ایک خوش گو شاعر تھے اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کی کوششوں سے کٹک میں یوم جگر منایا گیا تھا۔ اس تقریب میں انھوں نے جگر کا ایک بڑے سائز کا پنسل اسکیچ بنایا تھا جو ان کے ذوق مصوری کا آئینہ دار تھا۔ ان کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کہیں غیروں سے ٹکرائی ہے شاید — نظر سے کیوں نظر ملتی نہیں ہے
بلندی آسماں کی بڑھ گئی ہے — مری آہوں میں کچھ پستی نہیں ہے
دم آخر جو پیہم آ رہی ہے — کسی کی یاد ہے ہچکی نہیں ہے
خوشی کے دن تو اڑتے جا رہے تھے — مصیبت کی گھڑی کٹتی نہیں ہے
لہو آنکھوں میں آ کر جم گیا ہے — نظر اب دور تک جاتی نہیں ہے

جہاں چلنے پہ آ جاتا ہے خنجر
روانی اس کی پھر رکتی نہیں ہے

حسن کے تذکرے کے ساتھ کہیں — عشق کا تذکرہ نہ آ جائے
منہمک ہوں میں بت پرستی میں — دل میں یادِ خدا نہ آ جائے

کیا طوالت ہے ان کی زلفوں کی
میرے سر یہ بلا نہ آ جائے

مظہر امام

۱۹۳۰ء

اردو کے مشہور و معروف شاعر مظہر امام کا تقرر آل انڈیا ریڈیو کٹک میں پروگرام ایگزیکیوٹو کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ ان کا قیام شہر کٹک میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک رہا۔ اس دوران وہ کٹک کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنے رہے۔ ان کی قربت و صحبت

سے کٹک کے نئی نوجوانوں کی شعرگوئی نے نئی سمت پائی اوران کے مشورۂ سخن سے کئی شعراء نے اردو شاعری کی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرلی۔ کرامت علی کرامت اپنی تنقیدی بصیرت اور نثر نگاری میں مرہونِ منت ہیں۔ مظہرامام کا اولین شعری مجموعہ" زخم تمنا" اڑیسہ اردو پبلشرز کٹک کے زیر اہتمام ہی شائع ہوا ہے۔

مظہر امام کی شاعری کا اصل جوہر ان کی غزلوں میں ظاہر ہوتا ہے جس کے پیش نظر ان کو نئی اردو غزل کی آواز کہا جاسکتا ہے۔ ان کا انفرادی انداز بیان شعر کی ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے۔ وہ آزاد غزل کے بانی ہیں۔ انھیں حیات کے المیہ کا صحیح عرفان حاصل ہے۔ ان کی شاعری انسانی دردمندی سے معمور ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہاں تھی تندئی صہبا، یہاں شکستِ وجود — یہ سنگِ صبح ہے، وہ شب کا آبگینہ تھا
چھپی تھی موج کی بانہوں میں لوحِ تشنہ بھی — چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

اٹھ گئی ہے دوسروں کی راہ پر چلنے کی رسم — اب وہ اپنے ساتھ اپنا نقشِ پا لے جائے گا

نایاب تھے گہر ہی کی مانند خشت و سنگ — یا اس نگر میں کوئی گنہگار ہی نہ تھا

میں تو اس حشر تماشہ میں خدا بن کے رہا — تو بھی اس بھیڑ میں ہوتا تو اکیلا ہوتا

اپنی ناکردہ گناہی نے وہ شہرت بخشی — ہم نمائش میں لگا یا ہوا بازار ہوئے

جس سے کترا کے نکلتے رہے برسوں سرِ راہ — اس سے کل ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا
نرم رو تھا تو سبھی راہ سے مونہہ موڑ گئے — سنگ اٹھایا تو مرے ساتھ زمانہ نکلا

فرحت زیدی

۱۹۳۷ء

سید فرحت علی زیدی جو عرف عام میں فرحت زیدی ہیں ۸ ردسمبر ۱۹۶۸ء کو کٹک کیا آئے کہ کٹک کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک حصہ بن کر رہ گئے۔ پچھلے چودہ پندرہ سال سے زیدی صاحب کٹک کے سنٹرل فشریز سے وابستہ تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کا دفتر کٹک سے بھوبنیشور کے نواح میں واقع دھولی گیری کو منتقل ہو گیا ہے۔ زیدی صاحب کی ولادت ۲ ر مارچ ۱۹۳۷ء کو اتر پردیش کے کج گاؤں ضلع جون پور میں ہوئی۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا۔

فرحت زیدی بزم سخن اڑیسہ کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ بزم سخن کے جلسے ہوں یا کوئی ادبی و ثقافتی فنکشن ہو زیدی صاحب انتہائی سرگرمی کے ساتھ ہر ادبی تقریب میں حصہ لیا کرتے ہیں۔ کٹک سے دھولی چلے جانے کے باوجود وہ ہر فنکشن میں مدعو ہو کر شرکت کے لئے تشریف لایا کرتے ہیں۔ زیدی صاحب اردو کے مجاہد ہیں اور ایک پرگو شاعر۔ ان کی شاعری روایتی قدروں کی محافظ ہے۔ اظہار و بیان میں شائستگی، شستگی اور سلاست ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ وہ فی البدیہہ شعر کہہ لیتے ہیں اور بے تکلف رواں طویل منظوم خطوط لکھ لیا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر موصوف کے ایک منظوم خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جس سے ان کے فکر و فن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بھائی حفیظ اللہ جی ! — تسلیم بھی آداب بھی
خط آپ کا آیا ابھی — بے حد طبیعت خوش ہوئی
اک ہمدم دیرینہ کی — چٹھی جو ملتی ہے کبھی
اب کیا بتاتا ہیں کس طرح — کھل پڑتی ہے دل کی کلی
تھی بس تو لکھتے آپ ہیں — لیتے ہیں میرا امتحاں
اپنی ہی تخلیقات سے — کیسے بھلا چھانٹے کوئی

میں تو فقط فن کار ہوں　　تخلیق سے مجھ کو ہے کام
اور میری تخلیقات کیا　　رکھتی ہیں اردو میں مقام
اس کا نہ مجھ کو علم ہے　　اور فکر بھی کوئی نہیں
اس واسطے تنقید کی　　نظروں سے دیکھیں آپ گر
انصاف سے بھی کام لیں
یہ ہے کلام مختصر

فرحت زیدی کا رنگ تغزل ملاحظہ ہو:۔

مانا کہ راستوں کو نہ تبدیل کر سکے　　ہم کاروانِ نو کی تو تشکیل کر سکے
احکام وقت کی وہی تعمیل کر سکے　　اپنے ضمیر کی بھی جو تذلیل کر سکے
الفاظ کیا وہ ایک اشارہ بھی ہے بہت　　جو ان کہے فسانوں کی ترسیل کر سکے
بدلے شعار مہر و وفا وقت کی طرح　　ہم اپنی عادتوں کو نہ تبدیل کر سکے
فرحت حیات ہوتی ہے انساں کی مختصر
کیا زندگی کی شرح بہ تفصیل کر سکے

نئی چال دنیا چلے کیا بھروسہ　　ہر اک بازی الٹی پڑے کیا بھروسہ
کسی کو بناؤ نہ ہمراز اپنا　　کبھی وہ بھی دشمن بنے کیا بھروسہ
بچاتے رہو آج کل اپنی عزت　　کوئی بے سبب لوٹ لے کیا بھروسہ
کسی سے بھلائی کرو بھول جاؤ　　وہی تم کو دشمن کہے کیا بھروسہ
قلم اپنا فرحت نہ بیچو ابھی تم
ابھی اور قیمت چڑھے کیا بھروسہ

جسے کبھی نہیں ہوا ہے رہ گذر کا تجربہ　　بیان آج کر رہا ہے وہ سفر کا تجربہ
یہ تاجرانِ شب ہیں دن کی روشنی سے نابلد　　انھیں ابھی کہاں ہوا کسی سحر کا تجربہ
موازنہ کریں تو کیا، ہماری بات اور ہے　　تمھاری داستاں ہے اک نصیب ور کا تجربہ

رسوخ جس کے تھے اسی کو کامرانیاں ملیں
دھرا ہی رہ گیا ہمارا عمر بھر کا تجربہ

ہمارا غم ہم سے دور ہوگا تمھیں بھی کیف و سرور ہوگا
شعور پیدا ضرور ہوگا ملے نظر سے نظر تو پہلے
یقیں کی روشنی ملے گی وہ منزل آگہی ملے گی
سیاہئ اشتباہ سے ہو بہ عزم و ہمت گذر تو پہلے
حیات کے تلخ تجربوں کو تم اپنے احساس میں سمو لو
قدم پھر آگے بڑھانا فرحتؔ اٹھا لو رختِ سفر تو پہلے

تصنع پر یہ دنیا مرمٹی ہے　　حقیقت اک کہانی بن گئی ہے
نئی تہذیب کی یہ روشنی ہے　　جو ہر سو تیرگی پھیلی ہوئی ہے
چراغوں سے ہی گھر جلنے لگے ہیں　　ہوا کچھ اس طرح چلنے لگی ہے
مرا دامن ہی شاید تنگ ہوگا
وگرنہ تجھ کو کس شے کی کمی ہے

فرحت زیدی ایک باوضع انسان اور بے ریا شاعر ہیں۔ ان کا ذہنی رشتہ شعروادب کی روایتی قدروں سے مربوط و مستحکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اخلاقی قدریں صاف اور عیاں ہیں۔ انھوں نے جدید شاعری کے بحرانی دور میں جدید رنگ کی غزلیں بھی کہی ہیں لیکن صرف طنزاً کیونکہ بنیادی طور پر ان کا مزاج کلاسیکل ہے اور ان کا طبعی رجحان بھی اسی کے مطابق ہے۔ جدید رنگ میں ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

زمانہ میں جو رائج شاعری ہے　　میرے نزدیک تو یہ چیستی ہے
یہ حدت بھی برتنی پڑ رہی ہے　　"بہت مجبور اپنی زندگی ہے"
تبسم میں انا کی تیرگی ہے　　وفا اک زنگ آلودہ چھری ہے
تشیکی آرزو ننگی کھڑی ہے　　مہک ہر پھول کی زردائی ہے

ہر اک چٹان کے پیچھے سے دیکھو اندھیری چاندنی اگنے لگی ہے
ہماری ذات کی تنہائیوں سے یہ دنیا اک مثلث بن گئی ہے
خلاء کی سیڑھیاں چڑھتا ہے سورج جو ہر صورت میں اک بے چہر گی ہے
فصیل وقت کی سنگین قینچی امیدوں کی گلی میں بھونکتی ہے
مرے ابہام کی تفہیم فرحت
جو سچ پوچھو تو دن کی چاندنی ہے

پیش نظر غزل کی لفظیات اور جدید ترکیبوں کے بارے میں فرحت زیدی نے اپنے منظوم خط میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

اور دوسری اک طنز ہے جدت پرستوں کے لئے
ترکیبیں مستعمل ہیں وہ الفاظ بھی شامل ہیں وہ
جو آج کل جدت پسند غزلوں میں اپنی لکھتے ہیں
خود لکھتے ہیں خود پڑھتے ہیں میرے لئے لیکن وہ ہیں
بے کار اور بالائے عقل جن میں نہیں معنی کو دخل
ان شعروں میں میرے اگر معنی جو نکلیں بے خطر
اک اتفاقی بات ہے قاری کی وہ سوغات ہے
بس ختم کرتا ہوں میں خط ہم خیریت سے ہیں فقط
مہر و خلوص و بندگی
از کمترین فرحت علی (۱)

---

(۱) فرحت زیدی، منظوم خط: بنام راقم الحروف، مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۸۴ء۔ از مقام دھولی، کوشلیا گنگ (بھوبنیشور)

اوج اعظمی

محمد عثمان اوج اعظمی کا نام پچھلی دو دہائی سے اڑیسہ میں اردو کی سرگرمیوں کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اوج اعظمی طویل مدت تک کٹک میں بہ سلسلہ تجارت مقیم رہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں اور فن شاعری میں استادانہ صلاحیت کے حامل بھی۔ بزم سخن کٹک کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ادریس بانکے۔ شہید اکرامی۔ الطاف نادر۔ رشمی کانت راہی اور مظہر مجیدی کے علاوہ اڑیسہ کے بہت سارے نوجوان شعراء ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے اوج صاحب دارالعلوم اہلسنت ضیاء العلوم خیرآباد (اعظم گڑھ) سے منسلک ہوگئے ہیں لیکن باوجود اس کے سال میں ایک مرتبہ اڑیسہ ضرور آتے ہیں اور یہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔

اڑیسہ میں اپنے طویل قیام کے دوران اوج اعظمی نے یہاں اردو کے ارتقاء میں پوری سرگرمی و تندہی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ اڑیسہ میں اردو کی تاریخ ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ کٹک کے دوران قیام ان کی تخلیقات ماہنامہ سبب کراچی۔ ماہ نو کراچی۔ ادب لطیف لاہور۔ بیسویں صدی دہلی۔ شمع / ستما دہلی۔ ہدیٰ ڈائجسٹ نئی دہلی۔ نیا دور لکھنؤ۔ آج کل دہلی۔ پاسبان الٰہ آباد۔ ہفتہ وار اجالا کلکتہ۔ عصر جدید کلکتہ۔ ماہنامہ سب رس حیدرآباد۔ برگ آوارہ حیدرآباد۔ مورچہ گیا۔ صبح نو پٹنہ۔ سنگم پٹنہ۔ شاخسار کٹک۔ شاعر بمبئی۔ کہکشاں بمبئی۔ جمالستان دہلی۔ نقوش لاہور۔ افکار کراچی میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یقینی طور پر ان تخلیقات کا شمار اڑیسہ کے ادبی اثاثہ میں اہم اضافہ سمجھا جائے گا۔ اوج صاحب کا کلام کٹک کے معروف گلوکار محمد یونس کی آواز میں لانگ پلیئنگ ریکارڈ کے طور پر بھی آچکا ہے۔ ان کا رنگ تغزل ملاحظہ ہو۔

سیکڑوں صدیاں سمیٹے میں نہاں اک پل میں ہوں
زندگی ہے نام میرا وقت کے مقتل میں ہوں

جز سمندر کا ہوں لہراتا ہوا بادل میں ہوں
قیمتی موتی ہوں لیکن رات کے آنچل میں ہوں

ہے مری ہی ذات سے مشہور شہروں کا ہجوم
میں مگر تنہا کھڑا احساس کے جنگل میں ہوں

وہ بھی کیا دن تھے کہ اجلے نین کے کاجل میں تھا
یہ بھی کیا دن ہیں کہ کالے گیسوؤں کے بل میں ہوں

لفظ کے پیکر میں ڈھل کر منجمد ہو جاؤں گا
ذہن کی الجھن لئے جذبات کی ہلچل میں ہوں

میں گرفت وقت سے آزاد ہوں پہچان لو
حال و ماضی اور مستقبل کے اک اک پل میں ہوں

اوجؔ ! ہوں بے بس بھنور میں اہل کشتی جس طرح
میں اسی صورت ابھی حالات کے دلدل میں ہوں

ہر نفس پر عمر کی چادر سمٹتی جائے ہے
رفتہ رفتہ قید کی میعاد گھٹتی جائے ہے

تیرگی جب ذہن کے مطلع سے چھٹتی جائے ہے
روشنی اشعار کی ٹکڑوں میں بٹتی جائے ہے

اژدہے کی شکل ہر دریا ہے منہ پھاڑے ہوئے
دن بدن اپنی زمیں گھٹتی سمٹتی جائے ہے

دم الٹتا جائے ہے افلاس کے ماحول میں
آدمیت آدمی سے دور ہٹتی جائے ہے

دل کی دھڑکن میں بھی شامل کیا ترے قدموں کی چاپ
سوتے سوتے شب کو اکثر نیند اچٹتی جائے ہے

خود بھی ہو جائے گی اک دن دامِ فانی میں اسیر
موت کی ڈائن جو ہر اک پر جھپٹتی جائے ہے

اوجؔ اس سے دامنِ دل کو بچاتا ہوں مگر
یادِ ماضی ہے کہ سینے سے چمٹتی جائے ہے

بیانِ غم نہ کرو سوزشِ جگر نہ کہو
جو سر پھروں سے ملو تو خود کو اہلِ سر نہ کہو

جہاں میں ہوتا ہے ہمدردِ ہر بشر نہ کہو
ہے سایہ دار یہاں کا ہر اک شجر نہ کہو

جو تیرگی کا نشیمن اجاڑ دیتی ہو
طرب فزا ہے اسے صبحِ غم اثر نہ کہو

زمانہ ساز، وفا کیش، مصلحت اندیش
جو ہم سفر ہو تو ناکامیٔ سفر نہ کہو

تضادِ قول و عمل میں ہے کس لئے یارو!
کہ کام کر کے دکھاؤ ادھر ادھر نہ کہو

یہ برف آگ کی صورت بھی دہک سکتی ہے　　یہ بے ضرر رہی سہی پھر بھی بے ضرر نہ کہو

گلوں کے لب پہ ہنسی دیکھتے رہو چپ چاپ
مگر ہے کس لئے شبنم کی آنکھ تر نہ کہو

درد چاہے نہ صلہ نہ ستائش مانگے　　غم کا ماحول حسیں ہونٹ کی جنبش مانگے
بے خودی مانگے ہر اک گام پہ لغزش مانگے　　وقت کی نبض نئے خون کی گردش مانگے
دوستو! دامن خورشید نچوڑیں آؤ　　غنچۂ زیست شعاعوں کی تراوش مانگے
کیوں فقط کرتے ہو الفاظ کی کرنوں کو اسیر　　سینۂ شعر تو جذبات کی سوزش مانگے
دل کہ ہر آن تری یاد کا مرہم چاہے　　تو کہ دل سے مرے زخموں کی نمائش مانگے
وہ سیہ بخت جسے منہ نہ لگائے کوئی　　کس سے فریاد کرے کس سے نوازش مانگے
بے حسی ذہن کے آنگن میں کھڑی ہے پھر بھی　　دل کی دہلیز کہ ہنگامہ و شورش مانگے

آج فرسودہ مضامین کی بندش کب تک
شاعری آج نئی طرز نگارش مانگے

سیلانی سیوتے

نام نریش کمار۔ قلمی نام سیلانی سیوتے۔ سیلانی سیوتے کا اس صدی کی آٹھویں دہائی کے اوائل میں کٹک دوردرشن کیندر میں تبادلہ پر تقرر ہوا۔ سیلانی سیوتے کٹک پہنچے تو قومی یک جہتی کی زندہ علامت تھے۔ کٹک کے پنشن لین میں رہائش اختیار کی۔ اردو میں شعر کہتے تھے اور کٹک کے ہر مشاعرہ میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ رمضان میں احباب کو افطار کی دعوت دیتے تھے۔ خود کو مقامی ماحول میں اس طرح ضم کر دیا کہ یہاں کا جزولاینفک بن گئے۔ ان دنوں لکھنؤ دوردرشن سے منسلک ہیں لیکن اب تک کٹک کی ادبی سرگرمیوں کی یادیں ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اپنے ایک خط میں راقم الحروف کو لکھتے ہیں،

”۱۹۷۲ء میں دہلی دوردرشن پر پروڈیوسر کی سروس حاصل کی اور وہیں سے سیلانی

زندگی کا آغاز ہوا۔ اردو زبان کے نام پر سری نگر تبادلہ ہوا اور وہاں سے ہندی زبان کے نام پر کٹک (اڑیسہ)، جہاں ہندی تو نہیں اردو ہی ایک ایسی زبان ملی جس نے سہارا دیا۔"[1]

سیلانی سیوتے کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

زخموں کو مرے رنگِ حنا دے گئی صبا — چاہا تھا کیا بہار میں کیا دے گئی صبا
سانسیں اُلجھ کے رہ گئیں ماضی کی یاد سے — کس کا پیام وقتِ قضا دے گئی صبا
دشتِ جنوں کی گرد اڑی اور جم گئی — عریاں تھا میرا جسم قبا دے گئی صبا
دل کو اڑا کے لے گئی مانندِ بوئے گل
کانٹوں پہ لوٹنے کی سزا دے گئی صبا

حقیقتوں کی طلب میں نمودِ خواب ملا
سکونِ قلب جو چاہا تو اضطراب ملا
بھٹک رہے ہیں یہاں در بدر جو سیلانی
کسے بتائیں تخلص بہت خراب ملا

سیلانی سیوتے کا مجموعۂ کلام "برگِ چنار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اڑیسہ میں اردو کی پیش رفت میں ان کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔

خان نیازی امروہوی

۱۹۳۹ء

نام شبیر حسین خاں تخلص نیازی۔ امروہہ اتر پردیش کے متوطن ہیں۔ ولادت ۱۲/ اگست ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ تعلیم انٹرمیڈیٹ اور ڈپلوما ان الیکٹریکل ٹریڈ۔ تقریباً

---

(۱) سیلانی سیوتے: خط بنام راقم الحروف: از دوردرشن کیندر لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

پندرہ سال ہوئے ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ راؤرکیلا میں برسرِ ملازمت ہیں۔ نیازی صاحب کے شاعرانہ ذوق اور ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے راؤرکیلا میں قابلِ ذکر ادبی فضا بنی ہوئی ہے۔ انھیں ابرا حسنی گنوری مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ موصوف روایتی شاعر ہیں۔ اپنے احباب کے تعاون سے راؤرکیلا میں ادبی وشعری محفلیں سجاتے ہیں اور ہر سال اعلیٰ پیمانہ پر آل انڈیا مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اڑیسہ کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

خان نیازی کا رنگ سخن ملاحظہ ہو:۔

بن گئے اہل گلزار دشمن — چاہتے ہیں اجڑ جائے گلشن
آتشِ گل نے پھونکا ہے جس کو — پھر رہا ہے نظر میں نشیمن
دشمنی کب تھی دیر و حرم میں — لڑ گئے خود ہی شیخ و برہمن
دوست کے عیب جس نے چھپائے — اس سے بڑھ کر نہیں کوئی دشمن
میرا سینہ ہے گورِ غریباں — سیکڑوں حسرتوں کا ہے مدفن
بوالعجب کوئی دل سا نہ دیکھا — دوست کا دوست دشمن کا دشمن

اہلِ گلشن بنا لیں نیازی
عزمِ محکم پر اپنا نشیمن

قطعہ

حسن جب بے نقاب ہوتا ہے
عشق خانہ خراب ہوتا ہے
سیکڑوں فتنے جاگ اٹھتے ہیں
حسن جب محوِ خواب ہوتا ہے

خان نیازی نے راؤرکیلا میں ادارہ اردوئے معلیٰ قائم کر رکھا ہے جس کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۸ء میں جشنِ غالب منایا گیا، آل انڈیا مشاعرہ ہوا اور "نقشِ جاوداں" کے

نام سے شرکائے مشاعرہ کا انتخاب کلام بھی شائع کیا گیا۔

گھائل فریدی

۱۹۳۰ء

نام اقبال احمد۔ قلمی نام گھائل فریدی ولد مختار احمد۔ ۱۹۳۰ء میں مانک پور ضلع پرتاپ گڑھ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ جناب طرفہ قریشی سے تلمذ ہے۔ مدت دراز سے راج کانگ پور میں قیام ہے۔ شغل کاروبار ٹھیکیداری۔ شاعری کا اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا رنگ تغزل ملاحظہ ہو۔

سایۂ زلف سے برسات کی بو آتی ہے
آج تو دن میں مجھے رات کی بو آتی ہے

ہر نفس سے مجھے صدمات کی بو آتی ہے
سوختہ حسرت و جذبات کی بو آتی ہے

قدریں بدلی ہیں زمانہ کی بدل جا تو بھی
اے وفا تجھ سے روایات کی بو آتی ہے

اپنے دل کو یہی کہہ کہہ کے تسلّی دی ہے
ان کے انکار سے اثبات کی بو آتی ہے

وادیٔ عشق ہے یہ سوچ سمجھ کر چلئے
ہر قدم پر یہاں صدمات کی بو آتی ہے

آج گھائل پہ کوئی تازہ ستم ٹوٹے گا
ان کی باتوں سے عنایات کی بو آتی ہے

بیٹھ کر سنتے ہیں رقیبوں سے
میری روداد کہانی کی طرح
اور میں دیکھ کے ان کا یہ ستم
پیتا ہوں آگ کو پانی کی طرح

جبّار غنی

جبّار غنی کا وطن رانچی ہے۔ لیکن عرصۂ دراز سے وہ اردو ہائی اسکول راؤرکیلا میں مدرس ہیں۔ شعر و ادب کا خاصا ذوق رکھتے ہیں۔ راؤرکیلا میں اردو کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے راہی مسافر غریب کو بھی شاعری سے خاصہ لگاؤ ہے۔ جبّار غنی کا رنگِ سخن ملاحظہ ہو:۔

کبھی دنیا نئی تنظیم کے خاکے بناتی ہے ۔۔۔ بکھر جاتا ہے شیرازہ کبھی پل میں زمانے کا
ہوائیں چل رہی ہیں سرد موسم گل بدلماں ہے ۔۔۔ غنیؔ اب آگیا وقت اپنی جولانی دکھانے کا

محبت روح کو سوزِ دروں سے جگمگاتی ہے ۔۔۔ چراغِ ظلم و استبداد پھونکوں سے بجھاتے ہے
نہ جانے کون سی وادی میں آپہنچے ہیں دیوانے ۔۔۔ خیالِ صحنِ گلشن ان کو رہ رہ کر ستاتے ہے
نہ اتراؤ اگر ساحل کی حدیں آ گئے ہو تم ۔۔۔ کہ ساحل کے قریب آ کر بھی کشتی ڈوب جاتی ہے

غنیؔ اہلِ خرد سے کہہ دو آ کر پھول برسائیں
کہ اک دیوانہ ویرانہ میں قندیلیں جلاتا ہے (۱)

نالوں سے کہاں ہم نے کبھی کام لیا ہے ۔۔۔ یاد آتی ہے تیری تو جگر تھام لیا ہے
جب میں نے محبت سے ترا نام لیا ہے ۔۔۔ طعنوں سے حریفوں نے بڑا کام لیا ہے

کب بارِ الم کوئی اٹھاتا ہے کسی کا
تم نے غنیؔ ہمت سے بڑا کام لیا ہے

شاعری کا اچھا ذوق رکھنے کے باوجود جبّار غنی کی شاعری کا رنگ روایتی ہے۔ اور

---

(۱) جبّار غنیؔ رانچوی؛ غزل مطبوعہ روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ بابت ۲۵ جولائی ۱۹۸۲ء؛ ص ۴۔

ان کے کلام میں فکر کی گہرائی کا فقدان کھٹکتا ہے لیکن اڑیسہ میں اردو کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں ان کی خدمات ناقابل اعتنا نہیں ہیں۔

معین الدین زخمی

نام محمد معین الدین، تخلص زخمیؔ، ولدیت محمد نظام الدین۔ ۲۱ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو پُرولیا (مغربی بنگال) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اردو اور عربی سے شروع ہوئی۔ بعد میں ہائی اسکول میں درجۂ یازدہم تک تعلیم حاصل کی۔ عرصۂ دراز سے جھارسوگڑہ میں مقیم ہیں۔ اور درس وتدریس میں مشغول۔

۱۹۵۴ء سے ہی طبیعت شعروشاعری کی طرف مائل ہوئی۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں راہی بالاگھاٹی سے تلمذ کیا اور تب سے ہی ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ چند غزلوں پر انھوں نے ظرفہ قریشی مرحوم سے بھی اصلاح لی تھی۔ ان کی شاعری کا رنگ روایتی ہے۔ اس کے باوجود کلام دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات میں نعت، قطعات اور غزلوں کا خاصہ ذخیرہ موجود ہے جو ہنوز طباعت سے محروم ہے۔ ان کے متفرق اشعار رنگ سخن ملاحظہ ہو:۔

ہے برہنہ مدتوں سے پیکرِ فرزانگی　　　میرے دامن کی اسے کچھ دھجیاں دے دیجئے

کسی کے نکہت گیسو کے واسطے ہم نے　　　نہ جانے کتنے گلوں کے جگر تراشے ہیں

کبھی ہوتا ہے جو قسمت سے معمارِ چمن پیدا　　　تو دنیا کرہی دیتی ہے دار و رسن پیدا
گرا تھا جو کبھی حسن ازل کے دیدۂ نم سے　　　اسی اک گل سے ہو گئے کتنے چمن پیدا
انھیں کو بھول بیٹھی ہے یہ دنیا آج اے زخمیؔ
ہوا جن کے لہو کے رنگ سے حسن چمن پیدا

آتا ہے غریبوں کے ہونٹوں پہ تبسم جب — شادابیِ گلشن پہ ہنس دیتا ہے ویرانہ
ارباب سیاست کی خواہش ہے یہی شاید — منہ تکتے رہیں پیاسے لٹتا رہے مےخانہ
ہوتا ہے بغاوت پر آمادہ ضمیر اس دم — جس دم کسی بے کس کا جل اٹھتا ہے کاشانہ

شجاع ہمدانی

حکیم سید شجاع الدین ہمدانی کا تقرر ۱۹۸۲ء میں ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسنز بھدرک میں ریسرچ آفیسر انچارج کی حیثیت سے ہوا۔ ہمدانی صاحب کا وطن جلالی (علی گڑھ) ہے۔ اپنے دوران قیام انھوں نے بھدرک کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خاصا حصہ لیا۔ اور وہاں کے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔

ہمدانی صاحب جمالیاتی ذوق کے آدمی ہیں۔ اپنے اشعار میں بے تکلف روزمرہ کے سادہ اور سلیس الفاظ میں زندگی اور اس کے حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سادگی کے ساتھ فلسفۂ حیات کی گہرائی اور گیرائی بھی پائی جاتی ہے۔

ان کا رنگِ سخن ملاحظہ ہو:۔

سحر تمام ہوئی فکر شام باقی ہے — دم اخیر کا کچھ اہتمام باقی ہے
ابھی مریض کی آنکھوں میں جان ہے یارو — اٹھاؤ جام ابھی دورِ جام باقی ہے

مزے اڑائیں کریں عیش دیکھا جائے گا
رہِ حیات ابھی چند گام باقی ہے

ڈی۔ این۔ شرما سوز

ڈی۔ این۔ شرما سوز بھوبنیشور میں انڈین آئل کمپنی کے ریجنل منیجر تھے۔ شاعری کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اور شاعر نواز بھی تھے۔ ان کے دوران قیام اڑیسہ میں مشاعروں کی روایت

مستحکم ہوئی۔ ان کے اشتراک عمل سے بزم سخن اڑیسہ کے زیر اہتمام کٹک کے کلا وکاش کیندر میں ۱۳؍ اگست ۱۹۷۷ء میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ملک کے دور دراز علاقوں سے مشاہیر شعراء نے شرکت کی اور اس تقریب پر ایک خوب صورت مجلہ سووینئر بھی شائع ہوا۔ سوز صاحب نے ہر ادبی اور ثقافتی تقریب میں کھل کر حصہ لیا۔ وہ ہر مشاعرے کے مہمان شعراء کو بھوبنیشور میں اپنی رہائش گاہ پر ضرور مدعو کرتے اور اپنی شاعرانہ ضیافت سے نوازتے۔ ان کا رنگِ سخن ملاحظہ ہو:۔

اب کہاں غنچہ و گل سرو سمن کی خوشبو — ہر طرف پھیل گئی تیرے بدن کی خوشبو
بس گئی روح میں یوں تیرے بدن کی خوشبو — جیسے شاعر کے خیالوں میں سخن کی خوشبو
چھو کے آئی ہے ترے عارض و گیسو سے کہیں — لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے چمن کی خوشبو
یوں تو دلکش ہے بہت باغِ ارم کی خوشبو — اس سے بہتر ہے مگر تیرے بدن کی خوشبو

دل میں یوں آتی ہے بھولی ہوئی یادوں کی مہک
جیسے غربت میں کہیں آتے وطن کی خوشبو

مرے دل میں رہو کسی صورت — چاہے تم اضطراب بن جاؤ
میں سراپا سوال بنتا ہوں — تم سراپا جواب بن جاؤ

(ب)

عہد حاضر میں اُڑیسہ میں اردو تعلیم کی صورت حال

جہاں تک اردو تعلیم و تدریس کا تعلق ہے، ریاست میں پھیلی ہوئی بے شمار ابتدائی درس گاہوں میں سے تقریباً چار سو پرائمری اسکولز سرکاری، نیم سرکاری اور میونسپل بورڈ کی نگرانی میں اردو تعلیم و تدریس کے علمی مراکز کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس نوعیت کے اسکولوں میں سے اکثر میں اردو بحیثیت مادری زبان پڑھائی جاتی ہے اور بعض اسکولوں میں جو دراصل اردو مکاتب کی حیثیت سے چل رہے ہیں صرف اردو داں اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا کرتا تھا لیکن پچھلی دہائی سے اردو مکاتب میں بعض جگہ غیر اردو داں اساتذہ کا تقرر بھی عمل میں آرہا ہے۔

مذکورہ بالا ابتدائی مکاتب میں تمام درسی کتابیں اردو میں پڑھائی جاتی ہیں اور اڑیا بحیثیت ثانوی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے ضمن میں درسی کتابوں سے متعلق چند عملی قباحتیں درپیش ہوتی ہیں۔ چونکہ پوری ریاست میں ابتدائی مدارس کا ایک ہی نصاب چل رہا ہے اور تمام درسی کتابیں Nationalised ہو چکی ہیں لہٰذا اڑیا کی منصوبہ بند کتابوں کی مناسبت سے اردو کی درسی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں اور جو کتابیں بہار یا اتر پردیش کے ابتدائی اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں ان سے اڑیا طلباء مناسب طور پر مستفید نہیں ہو سکتے۔ اس مرحلہ پر اردو کے طلباء اور طالبات کے لئے طرح طرح کی پریشانیاں درپیش ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں درسی کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی اہم وجہ یہ ہے کہ صوبہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد محدود ہے اور اس لحاظ سے اردو میں درسی کتابوں کی نکاسی کا امید افزا اسکوپ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں درسی کتابوں کی اشاعت کی جانب یہاں کوئی پبلشر متوجہ نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ ریاست بھر میں اردو کتابت و طباعت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ابھی

چند ماہ پیشتر مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن کٹک نے بنگلور سے ایک بڑا لیتھو پریس فراہم کیا ہے لیکن تادم تحریر یہ ' یں بروئے کار نہیں آیا ہے۔ حافظ غلام رسول نسیم اڑیسہ کے منفرد کاتب ہیں لیکن پریس کی سہولت پیدا ہونے سے قبل وہ اپنے فن کا چراغ کہاں جلائیں!؟

اردو داں طلباء کی سہولت کے پیش نظر اڑیسہ پرائمری ایجوکیشن بورڈ نے اڑیا کی قومیائی ہوئی درسی کتابوں کا ایک دہائی قبل اردو میں ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر [illegible] (چھوبی.بوہی) کا اردو ترجمہ "نقشہ کتاب" کے مضحکہ خیز نام کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا۔ مذکورہ کتاب ابتدائی مکاتب کی جماعت اول کے لئے ہے اور اس کا اردو ترجمہ لسانی صحت سے قطع نظر علاقائی اردو میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر اڑیسہ پرائمری ایجوکیشن بورڈ نے کثیر رقم خرچ کی کیونکہ اس کے کل صفحات کی طباعت تحریر و تصویر کے ساتھ سہ رنگے بلاک کے ذریعہ کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک ناکام کوشش کی حدوں میں رہ گئی ہے۔

اڑیسہ میں لسانی اقلیت کے لئے ریاستی حکومت کی جانب سے ابتدائی، ثانوی اور فوق لسانی سطح تک اردو تعلیم و تدریس کے مراعات حاصل ہیں اور اس سلسلہ میں مناسب اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں۔ کسی بھی علاقہ میں اردو داں افراد کی آبادی کے تناسب سے بچوں کی تعلیم کے لئے اردو اسکولز قائم کئے گئے ہیں جہاں اردو بولنے والے افراد بہت کم ہیں وہاں اڑیا پرائمری اسکولز میں بھی اردو طلباء کی سہولت کا انتظام کیا جاتا تھا لیکن ۱۹۷۵ء کے بعد اڑیسہ کے پرائمری اسکولز میں بھی اردو ٹیچرز کا تقرر برائے نام ہی ہوا ہے۔ ڈسٹرکٹ ڈیولپ منٹ بورڈ کے توسط سے مقامی ایم۔ ایل۔ اے۔ اور دوسرے عمائدین کی سفارش پر اڑیا ٹیچرز کے الاٹ منٹ میں سے کچھ کو اردو ٹیچرز کے پوسٹ میں منتقل کیا گیا ہے۔

صرف بالیسر ضلع میں پرائمری اسکولوں کے لئے ۸۴ اردو ٹیچرز کی اسامیوں کے لئے گذشتہ کئی سال سے لکھا جا رہا ہے لیکن ڈائرکٹر آف پرائمر ایجوکیشن صرف جنرل ٹیچر کے الاٹ منٹ دیتے آ رہے ہیں۔ پورے صوبہ میں تقریباً ۱۵۰۰ ہائی اسکولز ہیں جن میں سے صرف مندرجہ ذیل اسکولوں میں اردو بحیثیت مادری زبان پڑھائی جاتی ہے۔

ضلع کٹک

ترتیب	اسکول کا نام اور پتہ	ازدو اساتذہ	کیفیت
۱	راونشا کالجیٹ اسکول کٹک۔	۲	سرکاری
۲	بہوگرام ہائی اسکول، بہوگرام۔	۱	〃
۳	معصوم پور ہائی اسکول۔معصوم پور۔	۱	پرائیویٹ
۴	صالح پور ہائی اسکول ۔ صالح پور۔	۲	سرکاری
۵	اکرام رسول ہائی اسکول، رائی سونگرہ۔	۲	〃
۶	چھتی پور ہائی اسکول۔	۱	پرائیویٹ
۷	بربہرہ ایم ای اسکول۔	۱	〃
۸	اوڑاسنگ ہائی اسکول۔	۱	〃
۹	اوڑاسنگ ایم ای اسکول۔	۱	〃
۱۰	کوٹ پدا ہائی اسکول۔	۱	〃
۱۱	کومڑا جے پور ایم ای اسکول۔	۱	〃
۱۲	چارننگل ہائی اسکول، التی	۲	〃
۱۳	شبلنگ ہائی اسکول۔	۱	〃
۱۴	نے مال ہائی اسکول۔	۱	〃
۱۵	کیس نگر ایم ای اسکول۔	۱	〃
۱۶	آل ہائی اسکول	۱	〃
۱۷	کیندرا پاڑہ ہائی اسکول۔	۲	سرکاری
۱۸	ایس۔کے۔اکیڈمی، جگت سنگھ پور	۱	〃
۱۹	نلیبر ہائی اسکول، 〃 〃	۱	〃
۲۰	محی الدین پور ایم ای اسکول	۱	〃
۲۱	تیل ڈیاہ ہائی اسکول، سوم پور	۱	〃

ترتیب	اسکول کا نام اور پتہ	اردو اساتذہ	کیفیت
۲۲	جولندہ ودّیا پیٹھ، نائی لو۔	۱	سرکاری
۲۳	نائی لو ایم ای اسکول، جگت سنگھ پور۔	۱	پرائیویٹ
۲۴	ایس۔ سی۔ ودّیا پیٹھ، نان پور۔	۱	سرکاری
۲۵	کشورنگر ہائی اسکول۔	۱	پرائیویٹ
۲۶	پہراج پور ہائی اسکول۔	۱	〃
۲۷	حاجی سمیر الدین ہائی اسکول تبینڈا کوڑہ۔	۱	〃
۲۸	کرشنا نند پور ہائی اسکول، بالوبیسی۔	۱	〃
۲۹	کنک پور ہائی اسکول۔	۱	سرکاری
۳۰	اسول ہائی اسکول۔	۲	پرائیویٹ
۳۱	اُتر کل ہائی اسکول۔	۱	〃
۳۲	تریگند ہائی اسکول۔	۱	〃
۳۳	بیری باٹی ہائی اسکول۔	۱	〃
۳۴	سابل کٹا ایم ای اسکول۔	۱	〃
۳۵	کشورنگر ایم ای اسکول۔	۱	〃
۳۶	جاج پور ہائی اسکول۔	۱	سرکاری
۳۷	کبیر پور ہائی اسکول۔	۱	〃
۳۸	آڑنگ ہائی اسکول۔	۱	〃
۳۹	دھرم شالہ ہائی اسکول۔	۱	〃
۴۰	کورائی ہائی اسکول، کورائی۔	۱	پرائیویٹ
۴۱	کلیان پور ہائی اسکول، پنجھار پور۔	۱	سرکاری
۴۲	نجھار پور ہائی اسکول، نجھار پور۔	۱	پرائیویٹ
۴۳	حاجی رحیم بخش ہائی اسکول، برہم بردہ۔	۱	〃
۴۴	نار دہ ایم ای اسکول، کشورنگر۔	۱	〃

کیفیت	اردو اساتذہ	اسکول کا نام اور پتہ	نمبر شمار
پرائیویٹ	۲	سعید سیمنری، شہر کٹک۔	۴۵
"	۲	اڑیا بانار اردو گرلز اسکول شہر کٹک۔	۴۶
"	۱	مشن ہائی اسکول "	۴۷
"	۱	نیالی ہائی اسکول ضلع کٹک۔	۴۸
		ضلع پوری	
سرکاری	۱	پوری ضلع اسکول۔	۴۹
"	۱	کاکٹ پور ہائی اسکول۔	۵۰
پرائیویٹ	۱	رسول پور ہائی اسکول۔	۵۱
"	۱	گوپ ہائی اسکول۔	۵۲
سرکاری	۱	گوبست ہائی اسکول۔	۵۳
پرائیویٹ	۲	فتح گڑھ ہائی اسکول۔	۵۴
سرکاری	۱	کیپیٹل ہائی اسکول، بھونیشور۔	۵۵
"	۱	یونٹ IX گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول بھونیشور	۵۶
"	۱	بی ایم ہائی اسکول "	۵۷
"	۱	خردہ ہائی اسکول خردہ	۵۸
"	۱	نیاگڑھ ہائی اسکول	۵۹
		ضلع بالیسر	
سرکاری	۲	بالیسر ضلع ہائی اسکول، بالیسر۔	۶۰
"	۱	ایس این ہائی اسکول، سورو۔	۶۱
پرائیویٹ	۱	گوجی درّہ ہائی اسکول، گو۔جی درّہ۔	۶۲
سرکاری	۳	نرائن چندر ہائی اسکول، بھدرک۔	۶۳

نمبر شمار	اسکول کا نام اور پتہ	اردو اساتذہ	کیفیت
۶۴	بھدرک ہائی اسکول، بھدرک۔	۱	سرکاری
۶۵	بھدرک گرلز ہائی اسکول، بھدرک۔	۱	"
۶۶	ڈی این گرلز ہائی اسکول، "	۱	پرائیویٹ
۶۷	دھام نگر ہائی اسکول، دھام نگر	۱	سرکاری
۶۸	حاجی محمود گرلز ہائی اسکول، بھدرک	۲	پرائیویٹ
	سمبل پور ضلع		
۶۸	سمبل پور ضلع اسکول، سمبلپور۔	۲	سرکاری
۶۹	سمبلپور میونسپل ہائی اسکول، سمبلپور۔	۱	پرائیویٹ
	کیونجھر ضلع		
۷۰	مہتاب ہائی اسکول، چمپوا۔	۱	سرکاری
	کوراپٹ ضلع		
۷۱	جے پور ہائی اسکول، جے پور	۱	سرکاری
	سندر گڑھ ضلع		
۷۲	سندر گڑھ ضلع اسکول، سندر گڑھ۔	۱	سرکاری
۷۳	اردو ہائی اسکول، راؤرکیلا۔	۲	پرائیویٹ
۷۴	شرف الدین احمد میموریل اردو ہائی اسکول راج گانگ پور۔	۱	"

مذکورہ بالا اسکولوں کے علاوہ اڑیسہ کے مختلف علاقوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ لیکن اس سلسلہ کی کوئی مرتب فہرست نہ حکومت کے شعبۂ تعلیم میں ہے نہ اسپیشل اسپکٹنگ آفیسر برائے اسلامی تعلیمات کے پاس۔ راقم الحروف کو فرداً فرداً تحقیق کرنے پر مذکورہ بالا نام حاصل ہوسکے ہیں۔ اڑیسہ کے تعلیمی اداروں میں ثانوی سطح تک ذریعۂ تعلیم اڑیا ہونے کے باوجود بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے اردو داں طلباء کو کل پرچوں کے جوابات اردو میں تحریر کرنے کے مراعات حاصل ہیں۔ محولہ بالا درس گاہوں میں سے اڑیا بازار اردو گرلز اسکول کٹک، سعید سیمنری کٹک اور راؤرکیلا اردو ہائی اسکول میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔

اڑیسہ میں اردو اساتذہ کی تربیت کے لئے دو تربیت گاہیں عرصۂ دراز سے چلی آرہی تھیں۔ جن میں سے ایک ایلی منٹری ٹریننگ اسکول کٹک میں تھا اور دوسرا بھدرک میں۔ بہار اینڈ اڑیسہ ایجوکیشن رپورٹ کے مطابق اس اسکول کا قیام ۱۹۱۵ء میں عمل میں آیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "No change took place in the number of Training Schools for Mohammadan Teachers. but sanction has been given to the opening of ree more such schools. one in the chotanagpur Division. one at Samastipur and on at Bhadrak. (1)

لیکن مدت دراز سے بھدرک کا یہ ٹریننگ اسکول بند ہوچکا ہے اور اب ریاست میں اردو اساتذہ کی تربیت کے لئے شہر کٹک کی واحد تربیت گاہ اردو ٹیچرز ٹریننگ اسکول (جو ۱۹۶۹ء میں ایلیمنٹری ٹریننگ اسکول سے سیکنڈری ٹریننگ اسکول میں تبدیل ہوا ہے۔) گذشتہ ۷۵ سال سے اردو اساتذہ کی تربیت کررہا ہے۔ یہاں انڈر گریجویٹ اساتذہ کی تعلیمی تربیت ہوتی ہے لیکن افسوس کہ کوششوں کے باوجود اب تک اڑیسہ کے ٹریننگ کالجوں میں سے کسی میں بھی اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہوسکا ہے۔

---

(1) Bihar & Orissa Education Report 1914-1915, Article No 456

۱۹۳۶ء میں اُڑیسہ بہار سے الگ ہوا لیکن ۱۹۷۱ء تک اُڑیسہ میں واقع سرکاری مدرسوں کے امتحانات بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے تحت ہوتے رہے۔ مذکورہ بورڈ کے فارغ التحصیل طلباء اُڑیسہ کے سرکاری وغیر سرکاری مدارس اور اسکولوں میں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہوتے رہے۔ اڑیسہ کے علوم مشرقیہ کے امتحانات بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے تحت ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی دقتیں پیش آیا کرتی تھیں۔ گذشتہ دہائی میں اردو والوں کی دس سالہ مسلسل جدو جہد کے بعد ۱۹۷۱ء میں حکومت اُڑیسہ نے اس جانب توجہ دی جس کے نتیجہ کے طور پر اُڑیسہ میں مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ مذکورہ مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے قیام سے قبل اُڑیسہ میں صرف ذیل کے چار مدرسے تھے جن میں درس عالیہ کے نصاب کے مطابق تعلیم و تدریس ہوتی تھی۔

۱۔ مدرسہ سلطانیہ، بخشی بازار، کٹک۔ ۲۔ جونیئر مدرسہ بنجھار پور ضلع کٹک۔
۳۔ مدرسہ نعمانیہ، بھدرک۔ ۴۔ مدرسہ غوثیہ رکفیہ، دھام نگر، بالیسر۔

ان مدرسوں میں مدرسہ سلطانیہ کٹک میں مولوی تک کی تعلیم کا انتظام تھا اور دوسرے مدارس میں تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ تک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں قبل الذکر دو مدرسوں میں فاضل تک کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوا۔ اُڑیسہ میں مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے قیام کے بعد اب تک مندرجہ ذیل مدرسوں کا بورڈ کے ساتھ الحاق عمل میں آیا ہے۔ ذیل کے گوشوارہ سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت اُڑیسہ سہ ماہی زرِ تعاون کے طور پر ان مدرسوں کے عملے کی تنخواہ کے لئے ایک لاکھ اٹھاسی ہزار تین سو روپئے ادا کرتی ہے۔

ضلع	نمبر شمار	ملحقہ مدرسہ کا نام اور پتہ	منظور شدہ زر تعاون
کٹک	۱	جونیئر اور سینیئر مدرسہ، بنجھار پور	۳۱۰۰۰/- روپئے
〃	۲	مدرسہ سلطانیہ بخشی بازار، کٹک	۲۵۰۰۰/- روپئے
〃	۳	مدرسہ کریمیہ آل، ضلع کٹک	۲۶۰۰/- روپئے
〃	۴	مدرسہ محمودیہ، اُڑیا بازار، کٹک	۱۶۰۰۰/- روپئے
〃	۵	مدرسہ اسلامیہ، سوناموہی، جگت سنگھ پور	۲۶۰۰/- روپئے
〃	۶	مدرسہ سیفیہ، چھٹا، دھرمشالہ ضلع کٹک	۲۶۰۰/- روپئے

ضلع	نمبر شمار	ملحقہ مدرسہ کا نام اور پتہ	منظور شدہ زر تعاون
کٹک	۷	مدرسہ ولی میاں محلہ، چار ننگل، التی	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۸	مدرسہ اسلامیہ عربیہ، تینڈا کوڑہ	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۹	مدرسہ فرقانیہ، بالوبیسی	-/۷۰۰۰ روپئے
〃	۱۰	مدرسہ امدادیہ، محلہ سانیسو، گوبست	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۱۱	مدرسہ تقدس ایمان، چار ننگل، جاج پور	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۱۲	مدرسہ اشرف العلوم رمضانیہ، فقیر آباد کندرا پاڑہ	-/۴۰۰۰ روپئے
〃	۱۳	مدرسہ اسلامیہ، اڑنگ پرشوتم پور	-/۵۲۰۰ روپئے
〃	۱۴	مدرسہ اسلامیہ عربیہ محلہ دلاور پور، کندرا پاڑہ	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۱۵	مدرسہ مقابلین، محلہ پاٹیکول، کرشنا نند پور	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۱۶	مدرسہ غریب نواز، جاج پور	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۱۷	مدرسہ جامع مسجد حنفیہ، کندرا پاڑہ	-/۴۰۰۰ روپئے
〃	۱۸	مدرسہ اسلامیہ چھتابر، کالاسری گوپال پور	-/۵۵۰۰ روپئے
پوری	۱۹	مدرسہ اسلامیہ، محلہ ارکھ پلی، ضلع پوری	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۲۰	مدرسہ امداد العلوم، اورنگ آباد، لتاہرن	-/۸۰۰ روپئے
〃	۲۱	مدرسہ اسلامیہ، یان پور	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۲۲	مدرسہ اسلامیہ دار العلوم، گوپ	-/۲۶۰۰ روپئے
بالیسر	۲۳	مدرسہ غوثیہ رؤفیہ، دھام نگر	-/۱۰,۰۰۰ روپئے
〃	۲۴	مدرسہ قدم رسول پورٹ روڈ، بالیسر	-/۲۶۰۰ روپئے
〃	۲۵	مدرسہ جامعہ منصوریہ، مصطفےٰ پور، دوبل	-/۴۰۰۰ روپئے
〃	۲۶	مدرسہ صالحیہ، سُنہٹ، بالیسر	-/۴۰۰۰ روپئے
〃	۲۷	مدرسہ نعمانیہ، بھدرک	-/۶۰۰۰ روپئے
کیونجھر	۲۸	مدرسہ جامعہ، دار العلوم، کیونجھر	-/۱۰۰۰۰ روپئے
〃	۲۹	مدرسہ شمس العلماء، جھونپڑا	-/۲۶۰۰ روپئے
گنجام	۳۰	مدرسہ اسلامیہ، خواجہ اسٹریٹ، برہم پور	-/۲۶۰۰ روپئے

ضلع	نمبر شمار	ملحقہ مدرسہ کا نام اور پتہ	منظور شدہ زر تعاون
سندر گڑھ	۳۱	مدرسہ حبیبیہ، سیکٹر ۱۵، H بلاک راورکیلا ۳	./...، روپئے

مجموعی سہ ماہی زر تعاون ایک لاکھ اٹھاسی ہزار تین سو روپئے۔(۱)

اڑیسہ کے تمام مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ سوائے انگریزی کے تمام پرچوں کے جوابات اردو ہی میں دیئے جاتے ہیں۔

اڑیسہ میں چار یونی ورسٹیاں ہیں جن میں ایک جامعہ کاشتکاری اور معالجۂ حیوانات کے لئے مخصوص ہے۔ باقی تین یونی ورسٹیاں ہیں:۔ اتکل یونی ورسٹی (وانی وہار)۔ برہم پور یونیورسٹی (بھنج وہار) اور سمبل پور یونی ورسٹی (جیوتی وہار)۔ ان تمام یونی ورسٹیوں میں اتکل یونی ورسٹی سب سے قدیم ہے۔ اس یونی ورسٹی سے تقریباً ۲۰۰ کالج ملحق ہیں۔ برہم پور اور سمبل پور یونیورسٹی کے تحت کسی بھی کالج میں اردو تعلیم و تدریس کا انتظام نہیں ہے۔ صرف خانگی طور پر تیاری کرکے اردو کے پرچوں کا امتحان دیا جاسکتا ہے۔ اڑیسہ میں اتکل یونی ورسٹی کے تحت مندرجہ ذیل کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے:۔

نمبر شمار	کالج کا نام اور پتہ	اساتذہ کی تعداد	اساتذہ کے نام
۱	راونشا کالج، کٹک	۲	سید افتخار احمد آزاد مس کشور جہاں
۲	شیل بالا ویمنز کالج، کٹک	۲	سید سراج الاسلام ڈاکٹر شیریں پروین
۳	بخشی جگ بندھو کالج، بھوبنیشور	۱	ڈاکٹر نسیمہ بیگم
۴	نرائن چندر کالج، جاج پور	۱	بہار الدین ریاض
۵	بھدرک کالج، بھدرک	۴	حفیظ اللہ نیولپوری

1. Office Memo of the Director of Public Instruction, Orissa, NO39904 dated 5.11.83

نمبر شمار	کالج کا نام اور پتہ	اساتذہ کی تعداد	اساتذہ کے نام
			عزیز حسن صدیقی
			سید منظور احمد قاسمی
			مس فرحت شریف
۶	بھدرک ایوننگ کالج، بھدرک	۱	قمر الحسن
۷	پالیا بندھا کالج، بھدرک	۱	مُلّا محمد شمو ئیل فیضی
۸	سالندی کالج، بھدرک	۱	عارضی
۹	چرمپا کالج، بھدرک	۱	عارضی
۱۰	دھام نگر کالج، دھام نگر	۱	عزیز الرحمٰن
۱۱	فقیر موہن کالج، بالیسر	۲	شیخ مبین اللہ
			عبدالخالق خاں

مذکورہ بالا کالجوں میں اردو بحیثیت مادری زبان پڑھائی جاتی ہے۔ کٹک کے شیل بالا ویمنز کالج میں بی اے تک اردو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ صوبہ بھر میں صرف بھدرک کالج میں اردو میں آنرز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُتکل یونی ورسٹی اردو میں ایم اے کے امتحانات منعقد کیا کرتی ہے جس میں ہر سال قابل اعتنا تعداد میں امیدوار پرائیویٹ طور پر شرکت کیا کرتے ہیں۔ اُتکل یونی ورسٹی میں ہنوز اردو کا شعبہ کھلا نہیں ہے جس کی تلافی اڑیسہ میں صرف جناب معین الدین احمد ریٹائرڈ آئی اے ایس کی کاوشوں سے ہو پائی۔ انھوں نے شہر کٹک کے مقامی اساتذہ اور بیرونی اساتذہ کے تعاون سے اردو لائبریری آف اڑیسہ میں ایم اے کی تدریس کا انتظام کیا تھا جس سے شہر کٹک کے متعدد طلباء وطالبات نے فیض حاصل کیا۔

اُڑیسہ کے ثانوی اسکولوں سے فارغ التحصیل اردو داں طلباء کی تعداد اچھی خاصی ہونے کے باوجود کالج کی سطح پر بہت ہی کم طلباء اردو کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اردو داں طبقہ عام طور پر معاشی بحران میں مبتلا رہتا ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اکثر طلباء کسب معاش کے لئے قطع تعلیم کر لیتے ہیں اور جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند

ہوتے بھی ہیں ان کا داخلہ مشکل سے سرکاری کالجوں میں ہو پاتا ہے جہاں اردو تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔

اڑیسہ میں اردو کے ساتھ حکومت کا رویہ اگرچہ معاندانہ نہیں ہے پھر بھی اردو کے سلسلہ میں حکومت نے مناسب اقدامات نہیں کئے جس کی وجہ سے اس صوبہ کے تمام افراد جن کی مادری زبان اردو ہے بالواسطہ پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے مسائل اردو کے مسائل ہیں۔ سرکاری دفاتر میں اردو کی کوئی گنجائش نہیں۔ اردو کے توسط سے ملازمتوں کے مواقع نہایت محدود ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ شہر کٹک جہاں زمانۂ قدیم سے اردو ثقافت کی زبان رہی ہے اور اس شہر کو ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا رہا ہے، وہاں آل انڈیا ریڈیو سے اردو کا کوئی پروگرام نشر نہیں ہوتا۔

اڑیسہ میں اردو تعلیمی اداروں کی نگرانی و معائنہ کے لئے مختلف علاقوں میں پانچ انسپکٹنگ مولوی کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ یہ تمام عہدے اسلامی تعلیم کے خصوصی نگراں افسر (Special Inspecting Officer for Mdn. Edu) کے ماتحت ہیں لیکن حیرت کا مقام ہے کہ آج تک حکومت نے صوبہ کے اس اعلیٰ اور منفرد عہدہ کو گزیٹیڈ قرار نہیں دیا ہے جبکہ اس شعبہ کے سیکشن آفیسر کا عہدہ گزیٹیڈ ہو چکا ہے۔

ج

اُڑیسہ میں اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے

اُڑیسہ میں اُردو کے ادبی اور ثقافتی اداروں نے اس ریاست میں اردو کے نشو و نما اور تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ادبی اور ثقافتی ادارے تہذیبی روایتوں کی تبلیغ، فن کاروں اور ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرکے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں اہم رول ادا کرتے رہے ہیں۔ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی آرا کو عوام تک پہنچانے میں اس طرح کے ادارے کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ فن کاروں کی تخلیقات کو عوام تک پہنچانے اور اہل دانش حضرات کو عوام سے مربوط و منسلک کرنے کے سلسلہ میں ان ادبی اور ثقافتی اداروں کے کردار کو فراموش کیا نہیں جا سکتا۔ ان ہی حقائق کے پیشِ نظر کسی زبان، تہذیب یا قوم کی تاریخ قلمبند کرتے وقت اس نوعیت کے ادبی اور ثقافتی اداروں کا ذکر واقعات کا ایک اہم حصہ قرار پاتا ہے، جن میں مختلف افراد کی ادبی اور تہذیبی کاوشوں کی جھلکیاں دوسروں کے لئے عملی تحریک کا موجب بنتی ہیں۔

اُڑیسہ میں اردو زبان و ادب کے ارتقا میں جن ادبی اور ثقافتی اداروں نے اہم رول ادا کیا ہے ان کا جائزہ موجودہ دور میں اردو کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔

بزم ادب کٹک

۱۹۲۱ء میں امجد نجمی نے شہر کٹک میں "بزم ادب" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس کے زیر اہتمام ہر ماہ پابندی سے طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بزم ادب کی اپنی کوئی عمارت نہ تھی۔ اس کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعرے قلب شہر میں واقع مدرسہ سلطانیہ میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس سے قبل بخشی بازار چوک پر واقع ناخدا بلڈنگ میں بھی کچھ عرصہ تک مشاعرے منعقد ہوا کئے لیکن بعد میں مدرسہ سلطانیہ میں زمانۂ دراز تک ان مشاعروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جب ملازمت کے سلسلہ میں امجد نجمی کا تبادلہ خوردہ روڈ ہو گیا تو عبدالحلیم نقیب سونگڑوی نے اپنی مساعی جمیلہ سے عرصۂ دراز تک اس بزم کی سرگرمیوں کو زندہ رکھا۔

بزم ادب کے مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں تراب علی اخگر، جن کا یہ شعر ان کی شناخت بن گیا تھا ؎

جناب داغ کے شیدائیوں میں ہے اخگر
کٹک میں سب جسے منشی تراب کہتے ہیں

محمد محسن محسن، سید نور علی انور، عبدالعزیز عاشق اور کبیر الدین انشا جیسے شاعروں کا ایک لمبا کارواں شامل تھا۔

۱۹۴۰ء میں بزم ادب کے مشاعروں میں کٹک کے جن شعراء کی شرکت رہتی تھی ان کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ "دامن گلچیں" کے نام سے کٹک کے لکشمی نرائن پریس سے شائع ہوا تھا۔ اس میں سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ دامن گلچیں کا ایک نسخہ امجد نجمی کی فائل میں محفوظ ہے جس میں مندرجہ ذیل شعرائے بزم ادب کا کلام شریک اشاعت ہے :۔

مولوی سید برکت اللہ برکت۔ مولوی محمد محسن محسن۔ مولوی عبداللطیف (سب رجسٹرار) مولوی عبدالرشید نقاد۔ مولوی سیف الرحمٰن پیشاوری۔ پنڈت راجہ رام بھرت دواج زیب۔ عبدالحلیم نقیب۔ رسول بخش کیسرپوری۔ قادر بخش سلیم۔ مولوی نورالہدیٰ حیرت سونگڑوی، (ثم نورالہدیٰ قائد)۔ سید واحد علی وحدت۔ خلیق الدین آرزو۔ عبدالعزیز عاشق۔ فرخند علی بیگ

فاروق معصوم پوری ۔ قادر شریف قادر (ثم قادر شریف رونق) اور امجد نجمی۔

اس بزم کو حافظ شمس الدین احمد شمس منیری، پروفیسر اصغر علی بیدل۔ اور پروفیسر منظر حسن دسنوی جیسے بیرونی شعرائے کرام کا بھی تعاون حاصل رہا۔ ایک عرصہ تک ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایم۔اے۔ احد کی کوٹھی (متصل شیل بالا ویمنز کالج) میں بھی بزم ادب کے مشاعرے ہوتے رہے۔

مولوی عبدالحلیم نقیب، ہمایوں کبیر، اسماعیل بجلی وغیرہ کئی حضرات اس بزم کے سکریٹری رہے۔ اڑیسہ میں یہی ایک بزم تھی جس کے تحت پابندی کے ساتھ ۱۹۵۴ء تک طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

۱۹۵۴ء میں امجد نجمی اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو کر کٹک لوٹے تو ان کی خدمت میں پھر سے "بزم ادب" کی صدارت پیش کی گئی جس کے فرائض انھوں نے انجام دیئے۔ بزم کی سرگرمیوں میں پروفیسر سید منظر حسن دسنوی، حفظ الباری حافظ، داؤد یوسف ملاّ۔ سید محمد اکمل وغیرہم نے نمایاں حصّے لئے۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں بزم ادب کا ایک سالانہ مشاعرہ کٹک کے ناری سیوا سدن میں منعقد ہوا جس میں منظر امام، اصغر راہی، شمس عظیم آبادی وغیرہ کئی بیرونی نامور شعراء نے شرکت کی۔

تنظیمی امور میں بزم ادب کی مجلس انتظامیہ سے اختلاف کی بناء پر امجد نجمی اس بزم کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ "بزم ادب" کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں رفتہ رفتہ سرد پڑتی گئیں۔

بزم سخن اڑیسہ کٹک

کٹک کے اردو شعراء کی نئی نسل اردو کی جدید تحریکات سے بخوبی روشناس ہو چکی تھی۔ چند نوجوان شعراء نے غزل کی بجائے نظم گوئی کو اپنا شیوہ بنایا۔ چونکہ بزم ادب میں ہر ماہ صرف طرحی غزلیں سنائی جاتی تھیں اس لئے چند نوجوانوں نے ۱۹۵۴ء میں "بزم سخن" کے نام سے

ایک الگ بزم کی بناء ڈالی۔ جن نوجوانوں نے اس بزم کی بناء ڈالی ان میں ظہیر اللہ نورؔ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ بزم سخن کے مشاعرے اُڑیا بازار اردو گرلز اسکول میں ہوتے رہے۔ یہاں مشاعروں میں غزلوں اور نظموں کے پہلو بہ پہلو مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔ لیکن بزم کے اراکین کی تنظیمی صلاحیت تسلی بخش نہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد یہ بزم تعطل کا شکار ہو گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر کئی ماہ تک کٹک کی ادبی فضا سرد رہی۔ پھر کرامت علی کرامت نے بزم سخن کی تجدید و احیاء کے سلسلہ میں غور و خوض کرنے کے لئے اپنی رہائش گاہ پر ایک نشست رکھی جس میں جناب امجد نجمی کے علاوہ راقم الحروف، ظہیر اللہ نورؔ، ڈاکٹر محمد ایوب وغیرہ نے شرکت کی۔ بزم سخن کی نشأۃ ثانیہ کی تجویز متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ بخشی بازار میں واقع ضیاء اللہ بلڈنگ میں بزم سخن کے مشاعرے ہونے لگے۔ پھر ایم اے احد (ڈیویژنل ٹرانسپورٹ منیجر) کے زیر اہتمام بزم سخن کی مجلس انتظامیہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں جناب امجد نجمی صدر، جناب قادر بخش سلیم نائب صدر اور کرامت علی کرامت سکریٹری منتخب ہوتے۔ اس بزم کے دیگر اراکین میں مولوی عبدالرشید نقاد، ماسٹر سید محمد اکمل، راقم الحروف، ضمیر خاں ضمیرؔ، عبدالصمد واصفؔ، رفیق دردؔ، ظہیر اللہ نورؔ اور قادر شریف رونقؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بزم سخن کے زیر اہتمام ہر ماہ پابندی کے ساتھ مشاعرے ہوتے رہے جو عموماً غیر طرحی ہوا کرتے تھے اور جس میں کلاسیکل، ترقی پسند اور جدید ہر قسم کے نتیجہ ہائے افکار پیش کئے جاتے تھے۔

ملازمت کے سلسلہ میں کرامت علی کرامت پارلاکھنڈی چلے گئے تو عبدالصمد پریمی نے بزم سخن کے سکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۵۸ء میں مظہر امام آل انڈیا ریڈیو کٹک میں پروگرام ایکزیکیوٹیو کی حیثیت سے آئے۔ بزم سخن کے مشاعروں میں انھوں نے پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ دیگر بیرونی شعراء میں عبدالجلیل خنجرؔ حیدرآبادی، عظیم بنگلوری، مجیب الرحمٰن کوثر مظفر پوری، کامل صدیقی لکھنوی۔ جعفر رضا نقوی فیض آبادی، محمد عثمان ادرج اعظمی، فرحت زیدی جون پوری اور سیلانی سیوتے بھوپالی نے بھی اس بزم کے ساتھ اپنی گہری جذباتی وابستگی کا ثبوت دیا۔ بزم سخن کے انتخاب میں جناب امجد نجمی بقید حیات صدر منتخب ہوتے رہے۔ قادر بخش سلیم کے بعد اطہر الامین نائب صدر منتخب ہوئے۔

اطہرالامین کی ادبی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بہ سلسلۂ ملازمت کندرا پاڑہ میں اپنے قیام کے دوران کٹک اور مختلف مقامات کے شعراء کو دعوت سخن دے کر انھوں نے کندرا پاڑہ میں کئی مشاعرے منعقد کروائے اور کندرہ پاڑہ تک اردو کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو پہنچایا۔ اطہرالامین کی وفات کے بعد بابا سید مشرف علی کی خانقاہ چشتیہ قادریہ واقع بخشی بازار میں بزم سخن کے مشاعرے ہونے لگے۔

عبدالصمد پریمی کے بعد اسماعیل آذر، فرحت زیدی، ساجد اثر اور خالد رحیم یکے بعد دیگرے بزم سخن کے سکریٹری چنے گئے۔ خالد رحیم تادم تحریر بزم سخن کے سکریٹری ہیں۔ خالد رحیم نے بزم سخن کے توسط سے کٹک کے دبستان اردو کو قابل ذکر حد تک آگے بڑھایا۔ انھوں نے بزم سخن کی سرگرمیوں میں غیر معمولی انہماک کی بناء پر اپنا آبائی پیشہ تجارت تباہ کرلیا اور صرف شاعر رہ گئے۔

بزم سخن نے کٹک کی ایک پوری نسل کی ذہنی تربیت کا فرض انجام دیا ہے جس میں سے کرامت علی کرامت، حیدر نایاب، بہارالدین ریاض، خالد رحیم، رفیق درد، اطہر عزیز، ساجد اثر، رشمی کانت راہی، اسماعیل آذر، عبدالمتین جامی وغیرہ کی تخلیقات سے ساری اردو دنیا واقف ہے۔

امجد نجمی کی وفات کے بعد پروفیسر سید مسیح اللہ مسیح بزم سخن کے صدر رہے۔ اور رفیق درد نائب صدر اور اسماعیل آذر سکریٹری منتخب ہوئے۔ اسماعیل آذر آر کائیوز کی ٹریننگ میں دہلی چلے گئے تو فرحت زیدی نے سکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ بعد میں بشیر احمد خاں صدر، اوج اعظمی نائب صدر اور خالد رحیم سکریٹری منتخب ہوئے۔ بزم سخن کے زیر اہتمام متعدد آل انڈیا مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں اور اعلیٰ پیمانے پر جشن ظرافت بھی منایا گیا ہے۔

بزم ظرافت کٹک

اڑیسہ میں جہاں سنجیدہ شعروادب کی روایت زمانۂ قدیم سے اپنی سرگرمیاں قائم

رکھے ہوئے ہے وہاں طنز و ظرافت کی بوقلمونی بھی قابل اعتناء ہے۔ طنز و ظرافت کی تحریک کو زیادہ مقبول کرنے کے لئے طنز و ظرافت کے مشہور شاعر اسماعیل آذر کی کوششوں سے بزم ظرافت کا قیام عمل میں آیا۔ اس بزم ظرافت کی سرپرستی اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ جانکی ولبھ پٹنائک کر رہے ہیں۔ اور دیگر سرپرستوں میں جلیب اللہ خاں وزیر ریاست برائے آبکاری، ڈاکٹر سید مشتاق علی، ڈاکٹر سید سیف اللہ، پروفیسر قمر الدین خاں۔ حاجی جلیب ستار، ایم اے احد (DTM)، محمد یوسف ایڈووکیٹ اور محمد رفیق ایڈووکیٹ کے نام آتے ہیں۔ بزم ظرافت کے صدر محمد اقبال خاں، جنرل سکریٹری اسماعیل آذر اور ٹریزرر شہاب الدین شریف ہیں۔

بزم ظرافت کے زیر اہتمام مزاحیہ شاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ابھی ۲۶ مئی ۱۹۸۴ء کو شہر کٹک کے ناری سیوا سدن میں ایک آل انڈیا مزاحیہ مشاعرہ زیر صدارت ڈاکٹر سید مشتاق علی منعقد ہوا۔ مقامی شعراء کے علاوہ حیدرآباد سے نریندر لوتھر (آئی اے ایس)، طالب خوندمیری، صبغت اللہ بمباٹ، پٹنہ سے اسرار جامعی اور آندھرا پردیش سے پاگل عادل آبادی نے شرکت کی۔ سوء اتفاق کہ اس دن سرِ شام ہی بارش کا سلسلہ شروع ہوا اور رفتہ رفتہ بارش اس قدر تیز ہوئی اور ایسا طوفان آیا کہ سارا شہر تاریکی میں گم ہوگیا۔ لیکن اس بزم ظرافت نے طنز و مزاح کے ایسے قہقہے روشن کئے کہ اس تاریکی اور موسلادھار بارش کے باوجود سامعین کی اچھی خاصی تعداد ناری سیوا سدن میں آپہنچ گئی اور رات میں بڑی دیر تک یہ پروگرام چلتا رہا۔

اس سے قبل بھی اسماعیل آذر، خالد رحیم اور دوسرے مزاح پسندوں کی کدوکاوش سے بزم سخن کے زیر اہتمام اسی ناری سنگھ سدن میں ایک آل انڈیا جشن ظرافت منعقد ہو چکا تھا جس میں ملک کے دور دراز علاقوں سے طنز و مزاح کے شاعروں نے شرکت کی تھی اور اس جشن ظرافت میں شرکت کرنے کے لئے مہمان خصوصی کے طور پر دہلی سے مجتبیٰ حسین صاحب تشریف لائے تھے۔ اردو کے اس عظیم مزاحیہ نگار کو اڑیا سرس ساہتیہ سمیتی کی جانب سے "ہاسیہ رتن" ହାସ୍ୟ ରତ୍ନ کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن

MYCA

اڑیسہ میں بسنے والی دو فی صد مسلم آبادی کی زبوں حالی اور پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے نہ صرف سرکاری سطح پر بلکہ عوامی پیمانے پر منصوبہ بند طریقے سے کوشش کرنے کی غرض سے اڑیسہ کے چند پر جوش نوجوانوں نے ۱۹۶۹ء میں MYCA کی بنیاد رکھی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں کٹک کے مستان درگاہ سے متصل MYCA کے اولین دفتر کا آغاز ہوا اور اس ادارے کا اولین قدم ایک خیراتی دواخانہ کا قیام تھا۔ چنانچہ مستان درگاہ میں ایک دواخانہ کی بنیاد رکھی گئی۔

شفاخانہ

سنہ ۱۹۷۲ء تک یہ ادارہ سخت مالی بحران کا شکار رہا۔ اس کے بعد چند اہل خیر حضرات کی مالی معاونت سے کٹک کے دیوان بازار میں MYCA نے اپنی نجی عمارت حاصل کرلی۔ اس عمارت میں Charitable Dispensary کے تحت لیباریٹری معائنہ امراض اور تقسیم ادویات کے لئے الگ الگ کمرے ہیں۔ اس شفاخانہ کو شروع ہی سے شہر کے قابل اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ یہ لوگ بلامعاوضہ عوامی فلاح کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ ہر سال تقریباً چھ ہزار مریضوں کا بلا تخصیص مذہب و ملت مفت علاج کیا جاتا ہے۔

سلائی اور کشیدہ کاری

سنہ ۱۹۷۵ء اگست کی ۱۵ تاریخ سے قوم کی نادار بیواؤں اور غریب دوشیزاؤں کی راحت کاری کے لئے سلائی اور کشیدہ کاری کی تربیت کے لئے ایک شعبہ MYCA

کے زیر اہتمام قائم کیا گیا ہے جس میں شہر کٹک کی متعدد محتاج اور بیکس خواتین سلائی اور کشیدہ کاری کی تربیت حاصل کر کے معاشی اعتبار سے خود کفیل ہو رہی ہیں اور اس خیر سگالی ادارہ کی ممنون کرم ہیں۔

نرسری اسکول

MYCA نے اس عمارت میں قوم کے نونہالوں کے لئے ایک ابتدائی درسگاہ "LITTLE ANGELS' NURSARY" قائم کر رکھی ہے جہاں تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ذرائع کا استعمال ہوتا ہے اور ہر سال اس نرسری اسکول سے ۶۵ — ۷۰ طلباء فارغ ہو کر نکلتے ہیں۔

لائبریری

حضرت امجد نجمی کی یادگار کے طور پر مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن نے "نجمی لائبریری" اور ایک دارالمطالعہ بھی قائم کر رکھا ہے جس میں خاصی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ اور معاصر ادبی اور معلوماتی رسالے قارئین کے ذوق کی سیرابی کرتے ہیں۔

تعلیمی وظیفہ

مائیکا نے اپنے فنڈ کا ایک حصہ غریب و ذہین طلباء میں تقسیم وظائف کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اب تک تقریباً چالیس طلباء اس سے مستفید ہو چکے ہیں اور سر دست دس طلباء یہ تعلیمی وظیفے حاصل کر رہے ہیں۔ معاشی بدحالی کے دور میں یہ وظیفے ہونہار طلباء کی حوصلہ افزائی اور کامرانی میں قابل ذکر حد تک ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

ثقافتی پروگرام

مائیکا نے ثقافتی پروگراموں کے ذریعہ یہاں کے نوجوانوں میں جذبۂ عمل پیدا کرنے اور ان کی خفتہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی جانب خاص توجہ دی ہے۔ شعبۂ ثقافتی امور کے تحت عید ملن، مشاعرے، ادبی پروگرام اور وقتاً فوقتاً سماجی اور

اصلاحی ڈراموں کا انعقاد خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

جمنازیم

حفظان صحت کے لئے نوجوانوں کو کھیل اور ورزش کی جانب مائل کرنے کیلئے MYCA نے ایک جمنازیم بھی قائم کر رکھا ہے جو کٹک کے ایک نوجوان جمنا سٹ سید ذبیح اللہ کی کار کردگی میں روز بروز عوامی توجہ کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔

راحت کاری

صوبہ میں طوفان اور سیلاب کی تباہ کاریوں میں عوام کی راحت کاری کے لئے MYCA کے رضاکار متاثرہ لوگوں کی مدد و تحفظ کے لئے پیش پیش رہا کرتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء کے سیلاب میں سیلاب زدہ علاقوں میں پہنچ کر ان رضاکاروں نے تقریباً سات ہزار روپیوں کی دوائیں تقسیم کیں اور سیلاب زدہ افراد کو سات دنوں تک غذا فراہم کی۔

لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین

شہر میں اگر کسی لاوارث یا محتاج فرد کی موت واقع ہو جاتی ہے تو MYCA اس کی تجہیز و تکفین کا اپنے طور پر انتظام کرتا ہے۔

اردو پریس

بنگلور کے عظیم محسن قوم ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی عنایات سے MYCA نے روزنامہ "سالار بنگلور" کے دو لیتھو پریس حاصل کئے ہیں۔ یہ پریس Myca House دیوان بازار میں قائم کئے جا چکے ہیں۔ صرف برقی رابطہ ملتے ہی اڑیسہ کی تاریخ میں اردو طباعت کے نئے باب کا آغاز ہو گا۔ مدت دراز سے اردو پریس کی کمی کا قدم قدم پر احساس تھا۔ ڈاکٹر سید سیف اللہ کی ذاتی کوششوں اور قومی جذبۂ ایثار نے اڑیسہ کے اردو داں طبقہ کے لئے اردو پریس کا گراں مایہ ورثہ فراہم کیا ہے۔

مسافر خانہ

ادارہ MYCA نے شیشو بھون کٹک کے احاطہ میں حضرت منصور شاہؒ کی درگاہ کی مرمت کروائی اور اس سے متصل مسجد کی بھی مرمت کروائی۔ اس کے علاوہ ایک مسافر خانہ کی بھی تعمیر عمل میں آئی جہاں اُڑیسہ کے اس واحد بچوں کے اسپتال میں دور دراز مقامات سے آنے والے مریضوں کے تیمار دار قیام کر سکیں۔

گذشتہ ڈیڑھ دہائی میں MYCA نے قابل قدر کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ اب اس کے مستقبل کے لائحۂ عمل میں ایک زچہ خانہ اور نرسنگ ہوم کی تعمیر اور ایک کلچرل آڈیٹوریم کی تعمیر زیر غور ہے۔

MYCA کی روح رواں ڈاکٹر سید سیف اللہ ہیں، جن کی ذات ایک انجمن ہے اور جن کے ارادے عظیم و تعمیری ہیں اور جن کا عزم و استقلال DYNAMIC ہے۔ ان کے علاوہ اکبر خاں گوڑا خو کمپنی کے مالک حاجی قمر الدین خاں اس ادارہ کے سرپرست اعلیٰ ہیں جن کی فراخ دلی اور بیش بہا عطیات کی بنا پر مائیکا نے سارے ملک میں اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔

اس "مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن" کو کٹک کے ہر دل عزیز بزرگ شری شرت چندر مصرا، ڈاکٹر شیخ ابوطاہر، ڈاکٹر سفیر الدین احمد، مدراس کے حاجی عبدالستار، کلکتہ کے حاجی غلام رسول اور حاجی جمیل اور بنگلور کے عبدالغفار اور حاجی لطیف کی بھی سرپرستی حاصل ہے۔

اڑیسہ کے ادبی اور ثقافتی اداروں میں MYCA کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

اُردو لائبریری آف اُڑیسہ

ریٹائرڈ ڈیویژنل کمشنر الحاج معین الدین احمد نے ۱۹ر جون ۱۹۷۰ء کی شام کٹک میں اپنی رہائش گاہ پر اپنے چند احباب کو مدعو کیا اور ان کے سامنے ایک پبلک اردو لائبریری

کے قیام کی تجویز پیش کی کافی غور و خوض کے بعد طے ہوا کہ شہر کٹک میں اس نوعیت کی ایک لائبریری قائم کی جائے جس کی اساس جمہوری عناصر پر ہو۔ معین الدین احمد نے اس لائبریری کے قیام اور فروغ کے سلسلہ میں دس سال تک اپنا خون جگر جلا کر قوم کے لئے ایک عظیم اردو لائبریری عطاء کی۔

۳۰ اگست ۱۹۷۰ء کو گورنر اڑیسہ سید شوکت اللہ انصاری کے ہاتھوں اس لائبریری کی رسم افتتاح انجام پذیر ہوئی۔ لائبریری کا آغاز بخشی بازار میں واقع مدرسہ سلطانیہ کے بیرونی کمرہ میں عارضی طور پر ہوا تھا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو لائبریری کی ثقافتی سرگرمیوں کا آغاز "یوم نجمی" سے ہوا۔ اس تقریب میں جناب امجد نجمی کو لائبریری کی طرف سے ایک سپاس نامہ اور تحائف پیش کئے گئے۔

یکم اگست ۱۹۷۵ء کی صبح یہ لائبریری مدرسہ سلطانیہ کے احاطہ سے مشن روڈ پر اپنی ذاتی نو تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہو گئی اور رفتہ رفتہ شہر کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

مشاعرے

اگرچہ شہر کٹک میں بزم سخن کے زیر اہتمام ہر ماہ کے آخری یکشنبہ کو باقاعدگی کے ساتھ طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء سے اردو لائبریری کے زیر اہتمام بھی مشاعرے ہونے لگے۔ اردو لائبریری کا پہلا مشاعرہ پروفیسر اصغر علی بیدل کی صدارت میں ہوا۔ اس مشاعرہ کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ نظریاتی اختلافات کی بناء پر امجد نجمی اور منظر حسن دسنوی میں کشیدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ دونوں ایکدوسرے سے گریز کرنے لگے تھے، لیکن معین الدین احمد کی دعوت پر دونوں حضرات نے اردو لائبریری کے اس مشاعرہ میں شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔ اردو لائبریری کے اس خیر سگالی کارنامہ سے متاثر ہو کر اصغر صاحب نے فی البدیہہ ایک قطعہ کہا تھا۔

یاد آرہا ہے نجمی و منظر کا معرکہ — وہ معرکہ جسے کبھی دیکھا سنا نہ ہو
شکر خدا کا دونوں ہیں بیٹھے ملے جلے — معلوم کیا معین نے جادو کیا نہ ہو

اردو لائبریری کے مشاعرے ہر ماہ پابندی کے ساتھ ہوا کرتے تھے جس میں جناب امجد نجمی دم آخر تک بلاناغہ شرکت کرتے رہے۔ اس کے علاوہ لائبریری کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں دن بہ دن بڑھنے لگیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور ادبی خدمات پر اور دیگر ادبی اور سماجی موضوعات پر اردو، اڑیا اور انگریزی میں ہر ماہ بالترتیب مذاکرے منعقد ہوا کئے جن میں سے مندرجہ ذیل مذاکرے قابل ذکر ہیں:۔

مذاکرے:۔

تاریخ	موضوع	مہمان خصوصی	صدر مذاکرہ
۱۳ر مارچ ۱۹۷۵ء	Development of Urdu Literature	ڈاکٹر عبدالعلیم چیئرمین ترقی اردو بورڈ دہلی	ڈاکٹر رادھاناتھ رتھ مدیر سماج
۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۵ء	ଓଡ଼ିଆରେ [illegible]	ڈاکٹر رادھاناتھ رتھ	ڈاکٹر کالندی چرن پانی گراہی
۸ر نومبر ۱۹۷۵ء	اقبال کی حب الوطنی	شیخ حبیب اللہ	مولانا محمد جلال
۱۳ر دسمبر ۱۹۷۵ء	Horizon of Religions	پروفیسر ہردانند رائے	جسٹس راج کشور داس
۱۰ر جنوری ۱۹۷۶ء	[illegible]	اے این تیواری، ڈائرکٹر کلچرل افیرز، اڑیسہ	شری ہرش مصرا، مدیر روزنامہ پرجاتنتر
۱۴ر فروری ۱۹۷۶ء	دورِ جدید کا تقاضہ اور ہمارا سماج	اکبر علی خاں، گورنر اڑیسہ	الحاج معین الدین احمد بانی وصدر اردو لائبریری

تاریخ	موضوع	مہمان خصوصی	صدر مذاکرہ
۱۳ مارچ سنہ ۱۹۷۶ء	Profiles of Education in 2000 AD	ڈاکٹر سداشیو مصرا سابق وائس چانسلر اتکل یونیورسٹی	ڈاکٹر رادھاناتھ رتھ
۱۲ جون سنہ ۱۹۷۶ء	[illegible]	جسٹس ہری ہر مہاپاترا	اودیہ ناتھ سڑنگی نیوز ایڈیٹر روزنامہ سماج
۲۲ اگست سنہ ۱۹۷۶ء	اردو کا ماضی حال اور مستقبل	اکبر علی خاں گورنر اڑیسہ	الحاج معین الدین احمد
۲۱ جنوری سنہ ۱۹۷۷ء	What after Death?	جسٹس رنگ ناتھ مصرا	ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب
۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء	[illegible]	پروفیسر گوپال چندر مصرا سمبل پور یونیورسٹی	ڈاکٹر رادھاناتھ رتھ مدیر روزنامہ سماج کٹک
۱۳ مئی سنہ ۱۹۷۸ء	جنّت کا مشاعرہ	سیّد مظفر حسین برنی چیف سکریٹری حکومت اڑیسہ	الحاج معین الدین احمد
۲۷ جنوری سنہ ۱۹۸۰ء	Progress of Urdu Literature vis-a-vis Other Modern Indian Literature	سیّد مظفر حسین برنی	جسٹس راج کشور داس
۳۰ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء	ادب میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کی ضرورت	ڈاکٹر ظفر اوگانوی، کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر وہاب اشرفی رانچی یونی ورسٹی	حفیظ اللہ نیولپوری

تاریخ	موضوع	مہمان خصوصی	صدر مذاکرہ
۲۶ جنوری ۱۹۸۱ء	افکار و آثار غالب	حفیظ اللہ نیولپوری	ڈاکٹر جانکی بلبھ مہانتی بھرت دواج
۱۹ فروری ۱۹۸۲ء	نجم الشعراء امجد نجمی کی ادبی خدمات	ڈاکٹر سید مسیح اللہ پرنسپل پٹا مونڈائی کالج	ڈاکٹر کرامت علی کرامت پرنسپل کندراپاڑہ کالج
۵ ستمبر ۱۹۸۲ء	خدمت خلق اور عبادت خدا	ڈاکٹر شیخ ابوطاہر شیخ حبیب اللہ	مولانا محمد جلال
۱۰ ستمبر ۱۹۸۳ء	[illegible]	بیچتر انندکر مدیر روزنامہ ماتروبھومی	محمد فدائے رسول ڈی آئی جی آف پولیس

ثقافتی سرگرمیاں

اردو لائبریری آف اڑیسہ میں مشاعروں اور مذاکروں کے علاوہ "شبِ افسانہ" کا بھی اہتمام ہوتا رہا۔ لیکن ۵۔۶ نشستوں کے بعد لوگوں کی دلچسپی کی کمی کی بناء پر یہ سلسلہ ملتوی ہوگیا۔ لیکن ثقافتی اعتبار سے اردو لائبریری کی سرگرمیاں دن بہ دن بڑھتی گئیں۔ وقتاً فوقتاً ۳ دنوں سے لے کر ایک ہفتہ تک اردو لائبریری کے زیر اہتمام ادبی اور کلچرل پروگرام جاری رہے ہیں۔ خصوصی طور پر ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی منائی گئی۔ ۱۹۸۰ء میں لائبریری کی دس سالہ تقریبات منائی گئیں۔ جنوری ۱۹۸۱ء میں اردو لائبریری کے زیر اہتمام جشن غالب منایا گیا جس کی تقریبات ایک ہفتہ تک جاری رہیں۔ غالب کی حیات و شاعری پر اردو اور اڑیا میں مضمون نگاری کا مقابلہ ہوا اور "افکار و آثار غالب" پر ایک مذاکرہ بھی ہوا۔ آخری دن ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ غالب کی غزلوں پر مشتمل ان کے کلکتہ سے دہلی کے سفر پر اڑیا زبان میں ایک تمثیل پیش کی گئی۔ اس تقریب میں کلاوکاش کیندر کے فن کاروں نے درباری اور کلاسیکل

رقص پیش کئے۔ افتتاحی تقریب میں اڑیسہ کے سابق وزیراعلیٰ بشو ناتھ داس نے صدارت کی۔ اڑیسہ کی دوسری سابق وزیراعلیٰ نندنی ست پتھی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی اور روزنامہ پرجاتنتر کے مدیر شری ہرش مصرا نے خصوصی طور پر تقریر کی۔

فروری ۱۹۸۲ء میں اردو لائبریری کے زیراہتمام "یوم نجمی" منایا گیا۔ یوم نجمی کی تقریبات ۳ دنوں تک جاری رہیں۔ جناب امجد نجمی کی حیات اور ادبی خدمات" کے موضوع پر طلبا میں تحریری اور تقریری مقابلے ہوئے اور بیگم نجمی کی خدمت میں اردو لائبریری کی جانب سے اونی دوشالہ پیش کیا گیا۔

اردو لائبریری کا دارالمطالعہ

اردو لائبریری آف اڑیسہ مکمل جمہوری کردار کی حامل ہے۔ اس میں موجود اردو اڑیا اور انگریزی کتابوں کے ذخیرہ میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس لائبریری کا ایک وسیع دارالمطالعہ بھی ہے جو شام کے پانچ بجے سے رات کے ۹ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اس میں اردو، اڑیا اور انگریزی کے شائع ہونے والے تقریباً تمام مؤقر اخبارات، رسائل و جرائد قارئین کے لئے پابندی کے ساتھ مہیا کئے جاتے ہیں۔ دارالمطالعہ کا وسیع و عریض ہال قارئین سے بھرا ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں اردو لائبریری نے عوام میں مطالعہ کی قابل ذکر دلچسپی پیدا کی ہے اور عظیم قومی خدمات انجام دی ہیں جس کا سہرا حاجی معین الدین احمد کے سر ہے۔

لائبریری کی تعمیر کا کام مکمل ہوجانے کے بعد جب لائبریری خود کفیل ہوگئی تو حاجی معین الدین احمد نے مستقبل میں اس کے تحفظ کے پیش نظر ۱۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کو "اردو لائبریری ٹرسٹ" کے حق میں لائبریری اور اس کا کل اثاثہ وقف کردیا۔

ایم۔ اے۔ اردو کا شعبہ

چونکہ اتکل یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ ہنوز بروئے کار نہ آسکا۔ اردو تعلیم کے فروغ کے پیش نظر اردو لائبریری نے ایم اے کی تعلیم و تدریس کا شعبہ لائبریری میں قائم کیا جہاں سے ہر سال متعدد امیدوار اتکل یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے کا امتحان پرائیویٹ طور پر دے کر فراغت حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں سے فارغ شدہ طلباء و طالبات میں کشور جہاں

راونشا کالج میں اور فرحت شریف بھدرک کالج میں اردو کی لکچرر ہیں۔ اردو لائبریری کا یہ شعبہ سردست معطل ہے۔

اردو لائبریری آف اڑیسہ کے تعلیمی وظائف

یہ امر واضح ہے کہ مالی مشکلات اور معاشی بحران کے پیش نظر اڑیسہ کا اردو داں اقلیتی طبقہ عہد حاضر میں تعلیمی اعتبار سے دوسروں کے برابر آنہیں سکتا۔ چاہے وہ اعلیٰ تعلیم ہو یا صنعت و حرفت کی تعلیم۔ اڑیسہ میں یہ طبقہ یقینی طور پر تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ خداداد ذہانت کے باوجود اکثر و بیشتر طلباء و طالبات معاشی بحران کی بناء پر قطع تعلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں انھیں معاشی بحران سے گذر کر اعلیٰ تعلیم کی راہوں پر گامزن ہونے کے لئے حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ تعلیمی وظیفوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں اردو لائبریری آف اڑیسہ نے نہایت مناسب و مفید اقدامات کئے ہیں۔ اس ضمن میں الحاج معین الدین احمد رقمطراز ہیں:۔

The Urdu Library of Orissa Was conscious of this unhappy position. Even before the Institution was able to build its own Home and move into it, Free scholarships began to be awarded on the basis of 'Merit-cum-Poverty' month by month. The amount available for awards and the numbers of recepient scholars have increased from year to year." (1)

تعلیمی وظائف کے سلسلہ میں اردو لائبریری آف اڑیسہ نے مندرجہ ذیل سبیل فراہم کئے ہیں:۔

(۱) حاجی اشرف علی اسکالرشپ

حاجی معین الدین احمد نے اپنے والد مرحوم حاجی اشرف علی صاحب کی یادگار کے

---

(1) Moinuddin Ahmed : The origin and Development of the Urdu Library of Orissa. 1983/Page 110

طور پر ۱۹۷۸ء میں مذکورہ فنڈ میں دس ہزار روپیوں کا عطیہ دیا۔ بعد میں ان کے صاحبزادے احمد اے خالد اور صاحبزادی شمیمہ زماں اشرف نے مشترکہ طور پر پانچ ہزار روپیوں کا عطیہ اس مد میں پیش کیا۔ اس طرح پندرہ ہزار کی رقم اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں Fixed Deposit کی گئی۔ اس رقم کے سالانہ interest سے وظیفے عطا کئے جاتے ہیں۔

(۲) حاجی سراج الدین اسکالرشپ

۱۹۸۱ء میں حاجی معین الدین احمد کے برادر کلاں حاجی سراج الدین احمد نے اسکالرشپ فنڈ کو دس ہزار روپئے کا عطیہ عنایت کیا جس کو فکسڈ ڈپوزٹ رکھ کر اس کے interest سے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

(۳) ہمدرد اسکالرشپ

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم عبدالحمید صاحب کا سالانہ ڈیڑھ ہزار روپیوں کا عطیہ بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے جس سے چار وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

(۴) خیر سگالی اسکالرشپ

۱۹۷۰ء۔۔۔۷۱ کے دوران ۲۱ خواتین و حضرات نے لائبریری کی تعمیر کے لئے پانچ سو یا اس سے زیادہ کی رقم بطور عطیات دی تھیں لیکن ۱۹۷۹ء میں چند وجوہ کی بناء پر ان کے عطیات واپس کر دیئے گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنے مذکورہ عطیات لائبریری کے اسکالرشپ فنڈ کو عنایت کئے۔ اس طرح مزید بارہ ہزار روپئے خیر سگالی اسکالرشپ فنڈ میں آ گئے۔

اردو لائبریری آف اڑیسہ کی جانب سے ۱۹۷۴ء میں وظیفوں کا آغاز ہوا۔ اس سال پچاس روپئے ماہوار کے دو اسکالرشپ دیئے گئے۔ سال بہ سال اس منصوبہ میں توسیع ہوتی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں ۳۰ روپئے سے لے کر پچاس روپئے ماہوار کے ۱۲ وظائف عطا کئے گئے جن میں سے سات طلباء نے حاصل کئے اور پانچ طالبات نے اور دیگر دس

طلباء و طالبات کو تعلیمی امداد کے طور پر سو سو روپئے فی کس کے حساب سے دیئے گئے۔

اردو اکیڈمی

اڑیسہ میں اردو اکیڈمی کے قیام کے سلسلہ میں حاجی معین الدین احمد نے اردو لائبریری کی جانب سے ایک فعال تحریک چلائی۔ ترقی اردو بورڈ کے چیرمین ڈاکٹر عبدالعلیم سے لے کر گورنر اڑیسہ اکبر علی خاں اور وزیر اعلیٰ اڑیسہ نندنی ست پتھی تک کے ڈانڈے ملائے لیکن گورنر اور وزیر اعلیٰ کے ذاتی اختلافات کی بنا پر یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی۔ لیکن ہنوز اردو لائبریری کی جانب سے اڑیسہ اردو اکیڈمی کے قیام کے سلسلہ میں پوری سرگرمی کے ساتھ کوششیں جاری ہیں۔

اردو لائبریری ایوارڈ

۱۹ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو اردو لائبریری نے حیات کے ۱۳ سال پورے کر لئے۔ اس سلسلہ میں لائبریری کی جانب سے تقریبات ہوئیں جن میں حاجی معین الدین احمد کی کتاب "Origin and Development of Urdu Library of Orissa" کی رسم اجرا عمل میں آئی اور لائبریری کی جانب سے گورنر اڑیسہ نے شیخ حبیب اللہ کو ناول نگاری کے لئے کرامت علی کرامت کو اردو تنقید کے لئے راقم الحروف کو ادبی تخلیقات کے لئے اور شیخ قریش کو اردو صحافت کے لئے "ULC AWARD" عطا کئے۔

اڑیسہ مسلم ویلفیئر کمیٹی کٹک

مسلمانان اڑیسہ کی فلاح و بہبودی کے پیش نظر ۱۹۸۰ء میں مسلم ویلفیئر کمیٹی قائم ہوئی اور ۸ر مئی ۱۹۸۱ء کو سوسائٹی ایکٹ کے تحت اس کمیٹی کا رجسٹریشن عمل میں آیا۔

اس کمیٹی کا دفتر کٹک کے ہاتھی تالاب درگاہ بازار میں ہے ۔ یہ کمیٹی عام رفاہی کاموں کے لئے پیش پیش رہتی ہے ۔

اس کے تحت تین فنڈ قائم ہیں جس کے توسط سے عوام کی فلاح و بہبود کا کام عمل پذیر ہو رہا ہے ۔

۱۔ جنرل فنڈ :۔ اس فنڈ میں مخیر حضرات کے عطیات قبول کئے جاتے ہیں ۔ اور اس رقم سے ضرورت مند محتاجوں کی مالی مدد کی جاتی ہے ۔ اس فنڈ کے ذریعہ شہر کٹک میں ایک مسافر خانہ ، زچہ خانہ اور یتیم خانہ کی تعمیر کا منصوبہ ہے ۔

۲۔ بیت المال :۔ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم حاصل کر کے غریب طلباء ، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی مالی امداد کرنا اس بیت المال کا مقصد ہے ۔

۳۔ مسلم فنڈ :۔ کمیٹی کے پیش نظر یہ مسئلہ اہم ہے کہ آج کے دور میں لوگ سود کا فراوانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۔ جو شرعی نقطۂ نظر سے خلاف شریعت ہے اور اس کی وجہ سے مسلم معاشرہ کی جڑیں کھوکھلی ہوتی جارہی ہیں ۔ اس فنڈ کا اہم مقصد مسلمانوں کو مالی بحران سے محفوظ رکھنا ہے ۔ اس فنڈ میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس پر کسی طرح کا سود دیا نہیں جاتا بلکہ اس کو قرض حسنہ کے طور پر محتاجوں کو دے کر ان کی معیشت کی صورت پیدا کی جاتی ہے ۔

صدائے اڑیسہ کی ایک خبر کے مطابق :۔

"اس کی شروعات کو ابھی صرف چند ہی ماہ گذرے ہیں لیکن یہ اس قدر ہر دلعزیز ہو چکا ہے کہ اس میں رقم جمع کرانے والوں کی تعداد روز افزوں ہوتی جارہی ہے ۔ تادم تحریر یہ فنڈ تقریباً ایک لاکھ روپئے کا لین دین کر چکا ہے اور ۳۵۰۰۰ کی رقم بلا سود کے طور پر دی جا چکی ہے۔"[1]

اڑیسہ مسلم ویلفیئر سوسائٹی کے صدر سید سلیم اللہ ، منیجر حاجی سمیع بخش ، سکریٹری ایم اے احمد (ایڈوکیٹ) ہیں ۔

اس ویلفیئر کمیٹی نے اڑیسہ اردو اکیڈمی کے سلسلہ میں خاصی تگ و دو کی ہے ۔

---

(۱) اقتباس از صدائے اڑیسہ کٹک بابت جون ۱۹۸۲ء ، ص ۱۱

نجمی اکیڈمی کٹک

پچھلے کئی سالوں کی کدو کاوش کے بعد رشمی کانت راہی اور خالد رحیم کی مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس اکیڈمی کے لائحۂ عمل میں نجمی صاحب کی ادبی تخلیقات کا تحفظ اور ان کی اشاعت کے علاوہ اردو کے فروغ کا ہر ممکنہ پہلو شامل ہے۔ یہ ایک رجسٹرڈ ادبی اور ثقافتی ادارہ ہے جس کے صدر ڈاکٹر کرامت علی کرامت اور نائب صدر ڈاکٹر شبیر پروین اور رشمی کانت راہی ہیں۔ جنرل سکریٹری راقم الحروف اور جوائنٹ سکریٹری فرحت زیدی و خالد رحیم ہیں۔ ٹریزرر عبدالخالق (وکیل صاحب) ہیں۔

اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ میں ڈاکٹر سید سیف اللہ، حاجی ستار حبیب، ڈاکٹر سفیر احمد، اکبر علی، عبدالباسط خاں، بشیر احمد خاں، اسحاق خاں اور محمد شفیع اراکین ہیں۔

نجمی اکیڈمی کی اولین پیش کش نجمی صاحب کے شاگرد رشید رشمی کانت راہی کا شعری مجموعہ "حرف مستند" ہے جسے ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے مرتب کیا ہے۔

گلشنِ ادب سونگڑہ

سونگڑہ اُڑیسہ میں اسلامی کلچر کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں شعر و ادب سے گہری وابستگی رہی ہے۔ اڑیسہ میں اردو صحافت کی تاریخ میں سرزمین سونگڑہ کو اردو کا اولین جریدہ "المنصور" شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے سونگڑہ میں ایک ادبی انجمن "گلشن ادب" کے نام سے قائم ہے جس کے زیر اہتمام اکثر و بیشتر مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔ عام طور پر وہاں طرحی مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔ "گلشن ادب" نے عبدالعلیم نقیب، زین العابدین، مجیبہ خاتون مجیب، شمس الہدیٰ شمس، نورالہدیٰ قائد، فدائے غفار پیغام، اختر حسین شافی، محمد ایوب صابر، شہاب المتقین، راشد شبنم، علی یوسف نیر، نورالٰہی ناطق، عبدالمتین جامی، شفیق الرحمٰن عاجز، مجیب الرحمٰن میکش، انوارالحق شیدا، ابو داؤد نادر اور الیاس جیسے شعراء اڑیسہ کی اردو تاریخ کو عطا کئے ہیں۔

سنگم لٹریری سوسائٹی، بھدرک

۱۹۷۳ء میں سنگم لٹریری سوسائٹی کا قیام عبدالماجد احسنی، ترلوچن مصرا، راکھال چندر داس، ڈاکٹر وجے آنند دوبے منصور کاکوی۔ ڈاکٹر نور محمد غزنوی اور راقم الحروف کی تحریک سے عمل میں آیا۔ سنگم لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام اردو، ہندی اور اڑیا کے مشاعرے راکھال داس کی رہائش گاہ "آنند بھون" میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ۲۲ جون ۱۹۷۳ء کو سنگم کے زیر اہتمام بھدرک میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ متعدد بیرونی شعراء نے شرکت کی تھی۔

عبدالماجد احسنی سنگم کے کنوینر ہیں۔

بھدرک غالب اکیڈمی

۱۹۸۳ء میں بھدرک کے چند ادب دوست حضرات نے ایک ادبی اور ثقافتی ادارہ "بھدرک غالب اکیڈمی" کے نام سے قائم کیا ہے جس کے صدر غلام حسین اور سکریٹری ڈاکٹر لیاقت علی ہیں۔ ۱۸ مئی ۱۹۸۴ء کی شام بھدرک ویمنز کالج کے احاطہ میں غالب اکیڈمی کا سالانہ جلسہ اور مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کٹک کے بیشتر شعراء نے حصہ لیا۔ صدارت جگل کشور پٹنائک ریاستی وزیر برائے صحت عامہ نے کیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر سید مشتاق علی نے خصوصی مقرر کی حیثیت سے شرکت کی۔ گورنر اڑیسہ شری بی این پانڈے نے مہمان خصوصی کے طور پر جلسہ میں شرکت کی اور "سیرت پاک قومی یکجہتی کی بہترین مثال" کے موضوع پر تقریر کی۔ مشاعرہ کی نظامت راقم الحروف نے کی۔ یہ مشاعرہ بھدرک کا ایک یادگار مشاعرہ تھا جو اپنی مجموعی خوبیوں کی بناء پر اڑیسہ میں مشاعروں کی تاریخ میں ناقابل فراموش رہے گا۔

بزم اخلاق بالیسر

مولوی عبدالحلیم حلیم کی سرپرستی میں بالیسر میں شہر میں "بزم اخلاق" زمانۂ دراز سے قائم ہے۔ اس بزم کے زیر اہتمام ادبی اور کلچرل پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی چند ماہ بیشتر بزم اخلاق کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں سمبل پور کے شاعر عبدالمجید فیضی نے

بھی شرکت کی تھی۔

بزم ادب راؤرکیلا

بزم ادب راؤرکیلا سے اردو ادب کے ایک دبستان کی تاریخ منسلک ہے۔ بزم ادب کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعرے تو ہوا ہی کرتے ہیں لیکن سال میں ایک آدھ بار آل انڈیا مشاعروں کا بھی انتظام ہوا کرتا ہے۔ اس بزم ادب نے راؤرکیلا کے علی احمد شیدا، خان نیازی، عبدالقیوم قریشی، شفیق الرحمٰن عاجز، ظفر عالم ظفر، اشتیاق احمد اشتیاق، مشرف خاں حیرت جیبی، معین الدین اشک، عبدالرشید شاہد، انعام رسول مضطر، راج کمار کشیب راج، ظفر حسنین، سنی سموئیل، جیت تمنائی، جبّار غنی، غیاث الدین غیاث، ظہیر سہاروی، معین الدین رونق، اطہر مشتاق، شمس الحق فاروقی گردہ، محمد عباس رضوی، عبدالمجید شرر، عبدالرحیم نشتر، مسافر غریب، حبیب اللہ ادر بیکل وغیرہ شعراء کی ذہنی تربیت میں خاصہ رول ادا کیا ہے۔

اردو لائبریری راؤرکیلا

اردو لائبریری کا قیام راؤرکیلا میں مدت دراز سے ہے۔ اس لائبریری کے تحت مشاعرے اور ادبی وثقافتی پروگرامز ہوا کرتے ہیں۔ لائبریری کی سالانہ تقریبات میں آل انڈیا مشاعرے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس لائبریری میں کتابوں کی وافر تعداد موجود ہے۔ راؤرکیلا میں یہ لائبریری اردو کے فروغ کے لئے ایک فعال ادارہ سمجھی جاتی ہے۔

د

اُڑیسہ میں اُردو کی اشاعتی سرگرمیاں

اڑیسہ میں اردو طباعت کے وسائل کی کمی کی بنا پر اردو کی اشاعتی پیش رفت دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں نسبتاً کم ہونے کے باوجود دشواری عمل کے تناظر میں ناقابل اعتناء نہیں ہے۔ اڑیسہ میں اردو کا اولین پریس "مطبع مظہر النصائح" تھا جس میں مولوی سلطان راجی کی متعدد تصنیفات و تالیفات طبع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ ان کے منظوم اردو خطبوں کا مجموعہ "مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" ۱۲۸۶ھ میں، ان کی دوسری کتاب "معرفت خدا و رسول" ۱۲۸۷ھ میں اور تیسری کتاب "مہتاب المجالس" ۱۳۰۲ھ میں اسی پریس میں طبع ہوئی تھیں۔

۳۷-۱۲۳۶ھ میں کٹک کے لکشمی نرائن پریس میں اردو کے ٹائپ کے حروف آ چکے تھے۔

اس پریس میں اردو کی طباعت کا کام ہوا کرتا تھا جہاں سے ۱۹۳۷ء میں مسلم گزٹ شائع ہوا کرتا تھا۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں حافظ غلام رسول نسیم کٹکی نے اپنی رہائش گاہ بانس گلی کٹک میں ایک چھوٹا سا لیتھو پریس نسیمی پریس کے نام سے قائم کر رکھا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے ہینڈ بلز، شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے دعوت نامے طبع ہوتے تھے لیکن اس پریس میں کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی۔

اڑیسہ میں بھدرک، بالیسر، دھام نگر، سمبل پور، راج گانگ پور، جھارسونگڑہ، کندرا پاڑہ، سونگڑہ، کٹک، بھوبنیشور، برہم پور وغیرہ مقامات میں اردو کی سرگرمیاں ہر عہد میں جاری رہی ہیں لیکن ان تمام علاقوں میں کٹک کو ہی مرکزیت حاصل رہی ہے۔ لکشمی نرائن پریس میں اردو کی طباعت لیتھو پر نہیں بلکہ ٹائپ کے حروف سے ہوتی تھی جو عوامی مزاج کے مطابق نہ تھی۔ اردو والے خط نستعلیق کے عادی تھے۔ اس طرح اڑیسہ کے شعراء و ادباء کی تصنیفات و تالیفات اڑیسہ کے باہر مختلف مقامات پر طبع ہو کر اڑیسہ سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:-

۱۔ مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی

تصنیف مولوی محمد سلطان راجیؒ۔ دراصل یہ ساٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو خانۂ کعبہ کے خطیب نے سال کے ہر مہینے کے لئے جاری کیا تھا۔ حافظ احمد کبیر صاحب کی فرمائش پر مولوی محمد سلطان راجیؒ نے تمام عربی خطبوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۷۶ صفحات پر مشتمل ہے جو مطبع مظہر النصائح شہر کٹک میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی۔

۲۔ معرفتِ خدا و رسولؐ

تصنیف مولوی محمد سلطان راجیؒ۔ علم تصوف پر سلطان راجی کی یہ کتاب ۱۲۸۷ھ ہجری مطابق ۱۸۶۷ء میں کٹک کے مطبع مظہر النصائح میں شائع ہوئی۔

۳۔ دیوان مجید

"دیوان مجید" عبدالمجید بھونیا منفعت الحیا کا دیوان ہے جو ردیف وار مرتب کیا گیا ہے اور ۳۱۶ صفحات سے زیادہ پر محیط ہے۔ یہ اڑیسہ کا اولین شعری مجموعہ ہے جو دسمبر ۱۸۷۱ء مطابق ۱۲۸۶ھ ہجری میں منشی نول کشور پریس میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔

۴۔ اشرف الجمن

اس کتاب کا اول حصہ "اشرف الجمن" ہے اور حصہ دوئم "اظہار العشق" سے موسوم ہے۔ اس کتاب میں سید اولاد مرتضیٰ کٹکی، سید اشرف علی و سید اظہار علی کی غزلیں شریک اشاعت ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں مطبع نور الاسلام کلکتہ میں شائع ہوئی۔ (صفحات ۴۰)

۵۔ دیوان چرخی

شیخ امین اللہ چرخی کا اولین مجموعۂ کلام رضوانی پریس کلکتہ سنہ اشاعت ۱۹۰۷ء۔ صفحات ۱۴۰۔

۶۔ کاخ سخن

سید عبدالعزیز معلّم سنبل پوری (تلمیذ حضرت امیر مینائیؒ) کا دیوان ہے۔ یہ دیوان ردیف وار مرتب ہے۔ مطبع آگرہ اخبار میں ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۱ء شائع ہوا۔ صفحات ۱۱۲۔

۷۔ نبی العربی

مؤلفہ مولوی شیخ غلام غوث راوترا پوری۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر حالات زندگی۔ مطبوعہ کاشی رام (سابق نول کشور) پریس لاہور۔ سنہ اشاعت ۱۹۱۹ء صفحات ۶۸۔

۸۔ گلدستۂ گلزار

حاجی جان محمد کا مختصر سا مجموعۂ کلام۔ سنہ طباعت ۱۹۲۰ء۔ پریس کا نام درج نہیں ہے۔

۹۔ چاند رمضان پیام عید

سید نور علی انور، حکیم عبدالعزیز عاشق اور رفیع الدین خاں کی رمضان اور عید سے متعلقہ شعری کاوشوں کا مجموعہ۔ مطبع کا نام درج نہیں ہے۔ سنہ اشاعت ۱۹۲۶ء۔ صفحات ۵۶۔

۱۰۔ نغمۂ ستّار

سید عبدالستّار عبد کا اولین شعری مجموعہ جو کمال پریس ۱۰ بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۳۲ ڈیمائی سائز۔

۱۱۔ کلیات مولا گلشن اعلیٰ

بھدرک کے صوفی شاعر مولا بخش خاں مولا کا شعری مجموعہ ہے۔ تاج پریس کلکتہ سے

۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

۱۲۔ خدا کی عنایت بھدرک کی نعمت

تصنیف مولا بخش خاں مولا۔ شعری مجموعہ۔ مطبوعہ تاج پریس کلکتہ۔ سنہ طباعت ۱۹۵۵ء
صفحات ۱۲۔

۱۳۔ اللہ کی رحمت اڑیسہ کی دولت

تصنیف مولا بخش خاں مولا۔ شعری مجموعہ۔ مطبوعہ ہند پریس کلکتہ۔ سنہ طباعت ۱۹۵۹ء

۱۴۔ نوائے بھدرک

تصنیف محمد الیاس گوجی درّہ۔ زیر اہتمام اردو اشاعت گھر، فیئرس لین کلکتہ۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ صفحات ۸۔ اس منظوم کتابچہ میں گوجی درّہ کا عوامی رجحان اور ذہنی طور پر پاکستان سے وابستگی کا اظہار ہے۔

۱۵۔ قرآن قادیانی

مرتبہ مولوی سید محمد اسماعیل۔ مولوی اسماعیل صاحب نے یہ کتاب عقیدہ کے اختلافات کی بناء پر لکھی ہے۔ سنہ طباعت اور مطبع کا نام درج نہیں ہے۔

۱۶۔ نجمہ

تصنیف شیخ حبیب اللہ۔ ناولٹ۔ اس کتاب کا ایک ہی نسخہ مصنف کے پاس موجود ہے۔ اوراق پارہ پارہ ہو چکے ہیں جن کی وجہ سے مطبع اور تاریخ اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔

۱۷۔ عمر خیام

تصنیف شیخ حبیب اللہ۔ عمر خیام کے مختصر حالاتِ زندگی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ صفحات ۶۴ ہیں۔

۱۸۔ بھگوت گیتا

سنبل پور کے ایم ایل اے پنڈت لکشمی نرائن مصرا نے جیل میں اردو سیکھی اردو زبان و ادب میں ان کی دلچسپی ایسی بڑھی کہ انھوں نے ایک علمی اور مذہبی کتاب بھگوت گیتا لکھی جس میں مذہب کے فلسفہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ اس کتاب کا پیش لفظ اس دور میں اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب نے لکھا ہے ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکشمی نرائن مصرا کا تعارف پیش کیا ہے ۔ ۱۲۸ صفحات کی یہ کتاب کتب خانہ ترقی اردو (ہند) حیدرآباد نے شائع کی ہے ۔

۱۹۔ طلوع سحر

تصنیف امجد نجمی ۔ مرتبہ کرامت علی کرامت ۔ حضرت امجد نجمی کا اولین شعری مجموعہ جو ۱۹۶۰ء میں کلکتہ کے تاج پریس میں چھپا ۔ عصر حاضر میں اڑیسہ کا یہ اولین شعری مجموعہ ہے جس میں بیشتر مشاہیرِ نقد و ادب کی آرا شامل ہیں ۔

۲۰۔ صدائے ہمالہ

مرتبہ امجد نجمی ۔ چینی جارحیت کے خلاف شعرائے کٹک کی احتجاجی نظموں کا مجموعہ جو پرچارتنتر پرچار سمیتی کٹک کی جانب سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ۔ کتابت غلام رسول نسیم کٹکی نے کی ہے لیکن مطبع کا نام درج نہیں ہے ۔ صفحات ۳۲ ۔

۲۱۔ جوئے کہکشاں

تصنیف امجد نجمی ۔ مرتبہ کرامت علی کرامت ۔ اس شعری مجموعہ میں نجمی صاحب کی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک کی شعری تخلیقات کا انتخاب شائع کیا گیا ہے ۔ یہ شعری مجموعہ اُتکل یونی ورسٹی کے ایم ۔ اے اردو کے نصاب میں داخل ہے ۔ پیش لفظ سید حرمت الاکرام نے لکھا ہے ۔ کرامت علی کرامت نے "عرض مرتب" کے تحت نجمی صاحب کے فکر و فن کا مطالعہ پیش کیا ہے ۔ مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۹ء ۔

۲۲۔ آبِ خضر

تالیف کرامت علی کرامت ۔شعرائے اُڑیسہ کا تذکرہ مع انتخاب کلام۔ ناشر اُڑیسہ پبلشرز دیوان بازار کٹک ۔مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۔سنہ طباعت ۱۹۶۳ء ۔صفحات ۱۷۶۔

۲۳۔ سنگ و سمن

تصنیف خالد شفائی ۔خالد شفائی کا اولین شعری مجموعہ۔ ناشر مغل اکیڈمی حیدرآباد (دکن)
سنہ اشاعت ۱۹۶۶ء ۔صفحات ۱۹۲۔

۲۴۔ لمحوں کی بازگشت

تصنیف حیدر نایاب ۔حیدر نایاب کا اولین شعری مجموعہ جس کا پیش لفظ پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم) نے لکھا ہے ۔مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ سنہ طباعت ۱۹۷۱ء۔ صفحات ۱۲۸۔

۲۵۔ شعاعوں کی صلیب

تصنیف کرامت علی کرامت ۔کرامت کا اولین شعری مجموعہ۔مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ سنہ طباعت ۱۹۷۲ء۔

۲۶۔ اضافی تنقید

تصنیف کرامت علی کرامت ۔کرامت کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۔ناشر اردو رائٹرز گلڈ الٰہ آباد۔مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔سنہ اشاعت ۱۹۷۷ء ۔ دوسرے مضامین کے علاوہ اس کتاب میں جدید شاعری اور اس کے پس منظر پر ایک نہایت ہی مبسوط مقالہ شریک اشاعت ہے ۔صفحات ۳۶۰۔

۲۷۔ زندگی اے زندگی

تصنیف سید شکیل دسنوی۔ شکیل کا اولین شعری مجموعہ۔ مطبوعہ نعمانی پریس دہلی۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء۔ پیش لفظ مخمور سعیدی نے لکھا ہے اور تعارف اطہر عزیز نے۔ کتاب کے فلیپ پر عنوان چشتی اور مظفر حنفی کی آراء بھی شریک اشاعت ہیں۔ صفحات ۱۱۲۔

۲۸۔ عکس در عکس

تصنیف خالد رحیم۔ خالد کا اولین شعری مجموعہ۔ پیش لفظ کرامت علی کرامت نے لکھا ہے اور فلیپ پر پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر وزیر آغا اور رکمار پاشی کی آراء درج ہیں۔ صفحات ۱۱۲۔ اڑیسہ کے اس شعری مجموعہ کی ۲۰۰ جلدیں وزارت تعلیم حکومت ہند نے خریدی ہیں۔

۲۹۔ نقش جاوداں

مرتبین ظہیر الحق ظہیر سہاروی اور خان نیازی امروہوی۔ ناشر ادارۂ اردو تے معلّٰی راؤر کیلا ۳۔ ۱۹۶۸ء میں آل انڈیا ہندی اردو سنگم کی جانب سے راؤر کیلا میں جشن غالب منایا گیا تھا۔ اس تقریب کی روداد اور شعراء کا انتخاب کلام ہے۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ سنہ طباعت ۱۹۶۸ء۔ صفحات ۶۴۔

۳۰۔ حرف آرزو

مرتبہ حفیظ اللہ نیولپوری۔ خالد رحیم کی تقریب کتخدائی کے موقع پر ملک کے مشاہیر شعراء کی تہنیتی نظموں کا مجموعہ۔ مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ۔ سنہ اشاعت ۱۹۷۱ء۔ صفحات ۳۲۔

۳۱۔ نذرِ مجاہد

مرتبہ سید آل رسول ہاشمی۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے وصال پر کہی گئی تعزیتی نظموں کا مجموعہ۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

۳۲۔ اربعون حدیثاً

تالیف و ترجمہ مولانا ابوالقاسم خالد العربی۔ مولانا نے اس کتاب میں نہایت اہم چالیس حدیثوں کا عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا نمبر سلسلۂ اشاعت قاسمیہ کی ترتیب کے مطابق ۳۵ ہے۔ مولانا ابوالقاسم کی اس سے قبل ۳۴ کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا بالیسر ضلع کے ایک مضافاتی علاقہ بونت میں مقیم ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر کتابیں لکھنؤ اور دہلی میں طبع ہو کر سید منزل بونت سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ پیش نظر کتاب نامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۰ء۔ صفحات ۴۸۔

۳۳۔ انتخاب الحدیث حصّہ اوّل

تالیف و ترجمہ مولانا ابوالقاسم خالد العربی۔ مولانا نے اس کتاب میں روزمرّہ کی زندگی میں پیش آنے والی ضروریات سے متعلق حدیثوں کا انتخاب پیش کیا ہے اور اردو میں ان کا ترجمہ تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب پر مطبع کا نام درج نہیں ہے۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۰ء ہے۔ صفحات ۴۲۔ اس کتاب کا نمبر سلسلہ اشاعت قاسمیہ کی ترتیب کے مطابق ۳۶ ہے۔

۳۴۔ انتخاب الحدیث حصّہ دوم

تالیف و ترجمہ مولانا ابوالقاسم خالد العربی۔ یہ کتاب انتخاب الحدیث حصہ اول کی توسیع ہے۔ اور سلسلۂ اشاعت قاسمیہ کی ۳۷ ویں پیش کش ہے۔ مطبوعہ نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد ۳۔ سنہ اشاعت مارچ ۱۹۸۲ء۔ صفحات ۱۴۴۔

۳۵۔ موج نسیم

تصنیف مولوی عبدالحلیم حلیم۔ یہ مولوی حلیم صاحب کا مختصر سا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کے والد مولوی عبدالرشید قاصر کی بھی چند تخلیقات درج ہیں۔ بانکی پور پٹنہ کے کسی پریس میں اس کی طباعت ہوئی ہے۔ لیکن "موج نسیم" میں مطبع کا نام یا سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ صاحب آب خضر نے لکھا ہے کہ "آپ کا مختصر مجموعہ کلام "موج نسیم" دوران طالب علمی پٹنہ

میں شائع ہو چکا ہے۔"(۱) حلیم کا قیام پٹنہ میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک رہا۔ تو اسی دوران یہ کتابچہ شائع ہوا ہوگا۔ صفحات ۳۲۔

۳۶۔ حرفِ مُسبّب

تصنیف رشمی کانت راہی۔ مرتبہ کرامت علی کرامت - ناشر نجمی اکیڈمی کٹک۔ رشمی کانت راہی کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ مطبوعہ نعمانی پریس دہلی۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۴ء۔ صفحات ۱۱۲۔

۳۷۔ نذرانۂ عقیدت

عبدالمجید فیضی سنبلپوری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ۔ اردو پرنٹرس کلکتہ کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۴۰۔

---

(۱) آب خضر ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۶۹۔ کمال ظفر۔ مولانا عبدالحلیم کے سوانح حیات مطبوعہ صدائے اڑیسہ کٹک۔ دوسرا سال۔ شمارہ ۱۷۔ ص ۵۔

باب ششم

حاصل مطالعہ

اُڑیسہ میں اردو زبان کا آغاز چار صدیوں سے کچھ زیادہ عرصہ قبل یعنی ۱۵۱۰ء کے اطراف میں بنگال کے حکمراں حسین شاہ کے سپہ سالار اسمٰعیل غازی کے اڑیسہ پر حملہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد متواتر افغان اور مغل فوجی اور صوفیائے کرام کا اُڑیسہ میں ورود ہوتا رہا۔ اڑیسہ میں جو مسلمان آئے وہ ترک، مغل، تاتاری، افغانی، ماوراءالنہری اور ایرانی قوم اور قبیلے سے متعلق تھے اور ان کی مشترکہ تہذیبی زبان فارسی تھی۔ فارسی سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے یہاں کی مقامی زبان اڑیا کو بھی متاثر کرتی رہی۔ جو لوگ فاتحوں کے ساتھ باہر سے اُڑیسہ آئے ان میں سے اکثر نے اسے اپنا وطن بنالیا۔ اس لئے لسانی اور تہذیبی سمجھوتہ عمل میں آیا۔ فارسی اگرچہ سرکاری اور دفتری زبان تھی لیکن اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو فریقین کے درمیان رابطہ کی زبان بنی اور رفتہ رفتہ قومی تہذیب کی ترجمان بھی۔

۱۵۹۲ء میں مغلوں نے شمالی اڑیسہ پر قبضہ کرلیا اور اسی دوران دکن کی جانب سے گولکنڈہ کے سلطان نے جنوبی اُڑیسہ میں چلکا کے کنارے تک اپنے قبضہ میں کرلیا۔ بیک وقت شمال اور جنوب کی جانب سے دو مختلف سیاسی اقتدار کی توسیع نے اڑیسہ میں اُردو زبان کے ارتقاء میں خاصہ اہم رول ادا کیا۔ اڑیسہ کے ہندوؤں میں بھی جن کی مادری زبان اُڑیا تھی اردو اور فارسی مقبول ہوئیں جس کی بناء پر فقیر موہن سیناپتی اور رادھا ناتھ رائے نے اپنی اڑیا ادبی تخلیقات میں اردو الفاظ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ بعد میں تو اردو فارسی الفاظ اُڑیا زبان کا ایک حصہ بن گئے اور آج اُڑیا زبان میں دو ہزار سے زائد اردو، فارسی اور عربی الفاظ نے اپنا مستقل مقام بنالیا ہے۔ ان کے علاوہ آج تک اُڑیسہ کی عدالتوں اور

کچہریوں میں جو محرر استغاثے اور قبالے وغیرہ اڑیا زبان میں لکھتے ہیں۔ ان پر بھی فارسی کے اثرات حاوی ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے اُڑیا رسم الخط میں کرنی طرز تحریر بھی فارسی کی خط شکستہ کے زیر اثر وجود میں آئی۔ کرنی طرز تحریر کا نمونہ منشی شیخ احسان اللہ مرحوم کے منسلکہ خط سے ملتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب شجاع الدین محمد خان اڑیسہ کا صوبہ دار تھا اُڑیسہ میں ستیہ پیر کی پوجا کا آغاز ہوا۔ یہ پوجا ہندو مسلم اتحاد و یک جہتی کے نظریہ سے فروغ پذیر ہوئی۔ اس ضمن میں بہت سی ادبی تخلیقات بھی وجود میں آئیں جنھیں اُڑیسہ میں پالا کہا جاتا ہے۔ مغل اور افغان کلچر اور اردو زبان کا اڑیسہ کے ہندو کلچر پر جو گہرا اثر پڑا اس کی زندہ مثال اڑیا زبان کے پالا یا جاترا میں نظر آتی ہے۔ دراصل ستیہ پیر کی پوجا کا سلسلہ ایک قطعی غیر فرقہ وارانہ دینی رسم اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھا۔ اڑیسہ کے رسم و رواج، وضع قطع، خورد و نوش اور طرز معیشت کی بات کی جائے تو قدم قدم پر اردو کے اثرات پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔

مغلیہ دور حکومت میں شہر کٹک کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ یہی اڑیسہ کا دارالسلطنت تھا۔ بیرونی علماء و فضلاء مسلسل یہاں آتے رہے۔ اُڑیسہ کے مختلف علاقوں میں صوفیائے کرام کی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جہاں ایک طرف دہلی، پنجاب، اتر پردیش، بہار اور بنگال سے معیاری اردو زبان براہِ راست یہاں پہنچی، وہیں آندھرا کی طرف سے دکنی اردو بھی یہاں آئی۔ اڑیسہ کے جنوبی علاقوں یعنی گنجام اور کوراپٹ ضلعوں میں اب بھی دکنی اردو رائج ہے لیکن کٹک اور دیگر شہری اضلاع میں جو اردو بولی جاتی ہے وہ معیاری اردو اور دکنی اردو کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے لیکن رفتہ رفتہ دکنی زبان کے اثرات معیاری اردو کے اثرات کے تحت دب کر رہ گئے۔

پیش نظر مقالہ کے باب اول میں اُڑیسہ میں اردو زبان کی نشو و نما کی مخصوص صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کے اصل سرچشموں یعنی صوفیائے کرام کی تبلیغ، انتظامیہ کے تحت اردو کا فروغ، اڑیسہ کے تعلیمی اداروں کے رول پر تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ دورِ قدیم سے ہی اُڑیسہ کو ایک دور افتادہ سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے زبوں حال صوبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ انگریزوں کی حکومت سے قبل یہاں باقاعدہ تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا عام طور پر اعلیٰ خاندان کے لوگ کسی قدر تعلیم حاصل کرتے تھے مگر وہ بھی مذہبیات تک محدود

رہتی تھی۔ اس طرح تعلیم کا دائرہ محدود تھا۔ افغانوں اور مغلوں کے زمانہ میں کسب معاش کے لئے لوگوں نے فارسی پڑھی۔ اہل ثروت لوگ خانگی طور پر اتالیقوں سے اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کی آمد کے بعد اڑیسہ میں سیاسی اور سماجی حالات بدلنے لگے۔ سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۲۳-۱۸۲۲ء میں مدراس پریزیڈنسی میں تعلیمی اقدامات کئے۔

۱۸۳۶ء تک اڑیسہ میں تعلیم کی توسیع خاص طور پر قابل ذکر نہ تھی لیکن ۱۸۴۵ء کے بعد یہاں کی تعلیمی صورت حال میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ جب سر ہنری پوٹنگر شعبۂ تعلیم کے سربراہ ہو کر آئے تو انھوں نے تعلیمی اداروں کی ترقی پر کافی توجہ دی۔ ۱۸۵۶ء میں برہم پور ضلع اسکول قائم ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں اڑیا زبان کو اصطلاحی زبان کے طور پر حکومت نے تسلیم کرلیا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مقامی لوگ جو اب تک اپنی مادری زبان میں سرکاری امتحانات نہیں دے پاتے تھے اب انھیں یہ مراعات حاصل ہوئیں۔ ۱۸۶۶ء کے قحط کا تعلیمی صورت حال پر بھی خاصہ اثر پڑا۔ مشنریوں نے افلاس زدہ اور پریشان حال بچوں کو پناہ دی اور ان کی سرپرستی بھی کی۔

جنوبی اڑیسہ کے مقابلہ میں شمالی اڑیسہ میں تعلیمی صورت حال کسی حد تک مختلف تھی۔ ۱۸۰۳ء میں اڑیسہ پر قابض ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے پوری اور کٹک میں تعلیم کی توسیع کے لئے اقدامات کئے تھے۔ ان دنوں توسیع تعلیم کا کام مشنریوں کے ہاتھ میں تھا۔ مشنریوں نے تعلیم کی توسیع کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کی۔ انھوں نے اڑیسہ میں کاغذ فراہم کیا اور یہاں پریس بھی قائم کئے۔ مشنریوں میں ولیم کیری بنگلہ کے عالم تھے۔ انھوں نے اڑیا ٹائپ کے حروف بنائے اور ۱۸۰۴ء میں پہلا بائبل شائع ہوا۔ اڑیا کی ایک چھوٹی سی ڈکشنری اور ایک پرائمری کتاب ولیم کیری اور مارشمین کی مساعیٔ جمیلہ سے منظر عام پر آئیں۔

۵۹-۱۸۵۸ء کے دوران شمالی اڑیسہ میں صرف ۳۰ اسکول تھے۔ ۱۸۶۸ء میں ان کی تعداد ۶۳ ہوئی اور ۱۸۷۰ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۹۵ ہوگئی۔ اسی دوران کندراپاڑہ، پوری، بھدرک اور بالیسر کے ہائی اسکولوں میں اردو تعلیم کا آغاز ہوا۔ بھدرک کی تقریباً ساٹھ فی صد آبادی اردو بولنے والوں پر مشتمل تھی اور وہاں اردو کے اثرات مقامی اڑیا زبان پر حاوی تھے۔ اُدھر صوبہ میں اردو کے نئے اصناف کی تشکیل زیر عمل تھی جس کی مثال بنسی بلبھ گوسوامی کے "مغل تماشہ" سے دی جاسکتی ہے۔ مغل تماشہ اردو کا اولین ڈرامہ ہے جسے بنسی بلبھ گوسوامی نے سنسکرت ڈرامے کی طرز پر لکھا ہے۔ یہ ڈرامہ بھدرک کے عوام میں مقبول عام ہے۔

اگرچہ اڑیسہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد محض دو فی صد ہے لیکن تعلیم کے ضمن میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں پس ماندہ نہیں ہیں۔ آبادی کے تناسب سے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد ہمیشہ بہتر رہی ہے۔ ۱۸۸۵ء میں مجموعی طور پر اردو خواں طلباء کی تعداد ۳۱۸۳، ۱۸۹۵ء میں ۳۲۳۹، اور ۱۹۰۵ء میں ۴۰۲۸ تھی۔

اڑیسہ میں اردو ادب کا قابل اعتنا سرمایہ موجود ہے جن میں سے باب دوم میں "اڑیسہ میں اردو شاعری کا ارتقاء" کے زیر عنوان ہردے رام جودت، مولوی سلطان راجی، شیخ امین اللہ چرخی، عبدالمجید بھونیاں حیا، خاتم بہراج پوری، ظہورالحق ظہوری، مجرم سنبل پوری، فیض النساء تسخیر، شمس الحق شمس، محمد یوسف، معلم سنبل پوری، منشی عبدالرحیم احسن، عبدالستار عبد، اشرف علی کٹکی، اظہار علی کٹکی، اولاد مرتضیٰ علی، جان محمد حازم، محمد محسن، نور علی انور، عبدالعزیز عاشق، مولا بخش مولا، مولوی رحمت علی رحمت اور امجد نجمی جیسے منتخب شاعروں کی تخلیقات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی نگارشات میں سے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ پیش نظر باب میں تمام شاعروں کا تذکرہ یا ان کی پوری تخلیقات کو منظر عام پر لانے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے انتخاب میں چند باتیں پیش نظر رہی ہیں۔ اوّل یہ کہ اہم فن کاروں کا انتخاب ہو اور دوم یہ کہ انتخاب اس لحاظ سے ہو کہ اردو کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت واضح ہو سوم یہ کہ ان ادبی نمونوں کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے جن سے اردو دنیا عام طور پر واقف نہیں ہے۔

باب دوم کی پیش کش میں یہ ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے کہ پہلے شعرائے متقدمین کا بیان ہو پھر دورِ وسطیٰ کے شعراء کا ذکر اور آخر میں دورِ جدید کے شعراء کا تذکرہ سامنے آئے۔ دورِ جدید کے شعراء میں "جدید شاعروں" کو صف بستہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُڑیسہ میں جدید شاعری کے پس منظر میں مذکورہ شاعروں کا بیان آخر میں رکھا گیا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اردو ایک مکمل تخلیقی زبان بن چکی تھی۔ اردو کے مرکز سے دور ہوتے کے باوجود اڑیسہ سے اردو بولنے والوں کا رابطہ قائم تھا۔ خان دوراں ستمبر ۱۶۶۰ء سے ۱۶۶۷ء تک اُڑیسہ کے صوبہ دار رہے۔ اسی زمانہ میں مرزا عبدالقادر بیدل اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ شہر کٹک میں قیام پذیر تھے۔ اسلوب و معانی کے لحاظ سے ان کا کلام گنجینۂ معانی کا طلسم اور درک و بصیرت کا سنگ آئینہ ہے۔

نساخ، عشقی اور شورش نے اپنے تذکروں میں ہردے رام جودت کا تذکرہ کیا ہے

جو اڑیسہ کا اوّلین شاعر گذرا ہے۔ ہردے رام جودت کا وطن کٹک تھا لیکن ان کا قیام زیادہ تر مرشد آباد میں رہا اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ جودت فارسی کے جیّد عالم تھے۔ بنیادی طور پر وہ فارسی کے شاعر تھے۔ اردو میں محض تفنن طبع اور شوق کی خاطر کہہ لیا کرتے تھے۔

مولوی محمد سلطان راجیؔ ایک صوفی المسلک بزرگ تھے۔ دکن سے شہر کٹک میں وارد ہوئے۔ شہر کٹک کے بخشی بازار میں ایک مسجد تعمیر کروائی۔ عمر عزیز کا بیشتر حصہ مذہبی تبلیغ اور رشد و ہدایات میں صرف کیا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں فصیح الحلال والحرام (۱۲۸۴ھ)، مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی (۱۲۸۶ھ)، معرفت خدا و رسول (۱۲۸۷ھ)، اور مہتاب المجالس (۱۳۰۳ھ) اڑیسہ میں اردو شعر و ادب کے ابتدائی رجحانات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی میں موصوف نے ہر خطبہ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے جس سے ان کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ بہرحال ان کے اشعار کو محض شاعری کے تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ اڑیسہ میں اردو کے ارتقاء میں مذہبی لٹریچر اور تبلیغ کے توسط سے سلطان راجی کی ادبی خدمات کا محاسبہ کیا گیا ہے۔

شیخ امین اللہ چرخی (متوفی ۱۸۷۹ء) اڑیسہ کے اولین صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ "دیوانِ چرخی" ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا جس میں ۲۵۲۰ اشعار پر مشتمل ۲۲۷ غزلیں ہیں۔ چرخیؔ ایک صوفی شاعر تھے اور وحدت الوجود کے فلسفہ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے سوا اڑیسہ کے کسی اور شاعر کو خالصتاً صوفی شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری کے بجائے فارسی کی صوفیانہ شاعری سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ ان کی شاعری کا موضوع تصوف ہے اور انھوں نے اظہار کے پیرایہ میں مشکل زمینیں منتخب کی ہیں اور اس کے باوجود اپنے کلام میں سلاست اور روانی قائم رکھی ہے۔

عبدالمجید بھونیاں حیا (ولادت ۱۸۴۰ء) ۱۸۷۱ء میں حیا نے "دیوان مجید" ردیف وار مرتب کیا۔ اس کی بارہ جلدیں ہیں جو بارہ وفات کی مجالس میلاد کے لئے مختص ہیں۔ حیا نے اپنے تصور اور تخیل کے گرد عشق رسول کا ہالہ قائم کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں ترقی پذیر اردو زبان کا نمونہ پیش کیا ہے۔ جس سے اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقاء کے پس منظر میں تہذیبی اعتبار سے ارتقاء پذیر اردو کا نقشہ واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

باب دوم میں اڑیسہ کی اولین شاعرہ فیض النساء تسخیر (ولادت ۱۸۶۶ء) کی حیات

وشاعری کا محاسبہ پیش کیا گیا ہے۔ تسخیر کے کلام میں جو پختگی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عرصۂ دراز تک شاعری کی ہوگی۔ سب سے پہلی چیز جو اس دور کی خصوصیت کا اہم جزو سمجھی جاتی ہے مذہبی رچاؤ ہے۔ تسخیر کے کلام میں مذہبی قنوطیت تو نہیں ہے بلکہ ایک نئی فکر کا احساس جھلکتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے روایتی انداز سے اپنا رشتہ مستحکم کر رکھا تھا پھر بھی اس دور میں اڑیسہ کی مسلم خواتین میں تعلیم کے وسائل کی کمی کے پس منظر میں ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی فنی پختگی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

محمد یوسف (ولادت ۱۸۴۷ء) غالباً اڑیسہ کے اولین شاعر گذرے ہیں جن کا کلام شمالی ہند کے معیاری رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ موصوف اڑیسہ کے نامور شاعر امجد نجمی کے والد تھے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی حسیات کا مظہر تھی۔ ان کے آخری دور کی شاعری سے ذاتی کرب اور قنوطیت آشکارا ہے۔

معلّم سنبلپوری (متوفی ۱۹۲۴ء)۔ اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقاء میں معلّم سنبل پوری کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ موصوف کو امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ معلّم کا دیوان ''کاخ سخن''، ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ دیوان میں ان کی ۱۵۵ غزلیں ردیف وار مرتب ہیں۔ وہ ایک پرگو شاعر تھے اور ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ انھوں نے درد و گداز اور نغمگی میں ڈوبے ہوئے اشعار کہے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں صنائع و بدائع کا وافر استعمال کیا ہے جو اس دور کی اردو شاعری کے لئے باعث فخر سمجھے جاتے تھے۔

سیّد عبدالستّار عبد (ولادت ۱۸۹۳ء)۔ ۱۹۳۴ء میں عبد کا مجموعۂ کلام "نغمۂ ستّار" کے نام سے شائع ہوا جس میں ان کی ۴۰ نعتیہ غزلیں درج ہیں۔

انیسویں صدی میں اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کو خاصہ فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل رہا تھا۔ شعراء کے کلام میں مذہبی رچاؤ پر تغزل کا رنگ حاوی ہو رہا تھا۔ جس کا مظاہرہ اشرف علی کٹکی، اظہار علی کٹکی، اور اولاد مرتضیٰ کٹکی کی تخلیقات سے ہوتا ہے۔

جان محمد حازم (متوفی ۱۹۴۱ء) مولوی محمد سلطان راجی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کا ایک مختصر سا شعری مجموعہ ''گلدستۂ گلزار'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ حازم کی تخلیقات اڑیسہ کی اردو پر دکنی اثرات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں مقامی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔

محمد محسن (۱۹۴۵ء) اُڑیسہ کے ایک مقتدر شاعر تھے۔ ان کے کلام سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاعرانہ وجدان کی پنہائیوں میں مست اور تخیل کی وسعتوں میں گم ہیں۔ ان کے کلام میں تازگی اور شگفتگی کے ساتھ غزل کی جذباتی فضاء قائم رہتی ہے۔

نور علی انور (ولادت ۱۸۶۰ء)۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "چاند رمضان اور پیام عید" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں ان کے ہمعصر دیگر چند شعراء عبدالعزیز عاشق اور رفیع الدین رفیع کی تخلیقات بھی شائع ہوئی ہیں۔ نور علی انور کا کلام اڑیسہ کی ادبی، تہذیبی اور لسانی خصوصیات کا حامل ہے۔

مولا بخش مولا (متوفی ۱۹۵۸ء)۔ بھدرک کے ایک صوفی بزرگ شاعر تھے۔ رشد وہدایت میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ اردو زبان کی تبلیغ واشاعت میں ان کے کارنامے لائق ستائش ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آئے ہیں۔

مولوی رحمت علی رحمت (ولادت ۱۸۹۱ء وفات ۱۹۶۳ء) کے کلام کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں طنز کی تیز دھار ہے اور زیریں لہروں میں تصوف کی گہرائی بھی۔

اس باب کے آخر میں اُڑیسہ کے نامور شاعر امجد نجمی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم میں اُڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء کا بسیط جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اُڑیسہ میں شاعری کے مقابلہ میں نثری تخلیقات کا سرمایہ نسبتاً کم ہے۔ سب سے قدیم نثری تصنیف مولوی محمد سلطان راجی کی ہے۔ عام طور پر ایک ایسے شاعر کے لئے جو اپنے شاعرانہ وجدان کی پنہائیوں میں گم رہتا ہو سنجیدہ نثر لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن مولوی سلطان راجی کے سامنے مذہبی اور تہذیبی ارتقاء کی راہیں تصوف کے مدارج سے ہو کر گذرتی تھیں۔ ان کی نثری تخلیقات میں اس عہد کی ادبی زبان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اس باب میں مولوی شیخ غلام غوث کی تصنیف "نبیؐ العربی" کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں آنحضرتؐ کی زندگی، جہاد اور اس سے متعلق دیگر واقعات صراحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

اس باب میں مولوی رحمت علی رحمت کی نثری تصنیف "رفیق العقل" کا بھی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو یقینی طور پر اُڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقاء کی ایک اہم کڑی ہے۔

محمد یوسف، مولوی عبدالرشد نقاد، امجد نجمی، پنڈت لکشمی نرائن مصرا اور شیخ حبیب اللہ کی نثری تخلیقات کے علاوہ اڑیسہ کے اردو اسٹیج کی تاریخ اور اردو ڈراموں کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں اڑیسہ میں اردو افسانوں کی پیش رفت کا بھی صراحت کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں اُڑیسہ میں اردو صحافت کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ اور اردو صحافت کے ارتقاء میں ماہنامہ المنصور کٹک، ہفتہ وار مسلم گزٹ کٹک، ہفتہ وار دور جدید کٹک، ہفتہ وار بیداری، ماہنامہ شاخسار اور صدائے اُڑیسہ کی اہمیت کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ذیلی ابواب میں اردو تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو تنقید میں کرامت علی کرامت، محمود بالیسری، یوسف جمال، تجمل علی فہمی اور شیخ حبیب اللہ کی تنقیدی بصیرت کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ آخری ذیلی باب میں اُڑیسہ میں اردو تحقیق کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

ماہنامہ المنصور چند شماروں تک ہی محدود رہا اور اس کی کاپیاں ناپید ہوگئیں۔ ۳۰ر جون ۱۹۴۳ء کو ہفتہ وار مسلم گزٹ اڑیسہ کے چرخ صحافت پر طلوع ہوا اور اڑیسہ کے اردو داں طبقہ میں خاصا مقبول بھی ہوا۔ لیکن مالی وسائل کی کمی کی بنا پر زیادہ دنوں تک تہہ دار خساروں کا متحمل نہ ہو سکا۔ اڑیسہ کی اردو صحافت کی تاریخ میں شاخسار اولین معیاری ادبی جریدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آٹھ سال کے عرصۂ اشاعت میں شاخسار نے ہندوپاک کے قارئین میں اپنی شناخت قائم کرلی تھی لیکن مدیر شاخسار امجد نجمی کی وفات کے بعد اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ ماہنامہ صدائے اڑیسہ اب تک اشاعت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ لیکن اردو صحافت کے معیار پر پورا اترنے کے لئے اسے کئی برس ضرور لگیں گے۔

باب پنجم "عہد جدید میں اُڑیسہ میں اردو کی صورت حال" سے متعلق ہے۔ اس باب کے تحت چار ذیلی ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

(الف) پہلے ذیلی باب میں عہد جدید میں اڑیسہ میں اردو شعروادب کا تذکرہ ہے۔ اس میں اڑیسہ کے شعرائے متاخرین مولوی برکت اللہ برکت، مولوی عبدالحلیم حلیم، عجیبہ خاتون عجب۔ عبدالرحیم راقم، عبدالحلیم نقیب، عبداللطیف عارف، حفظ الباری حافظ، سید منظر حسن دسنوی، شمس الہدیٰ شمس، مصلحت ایزدی اور تجمل علی فہمی کا تذکرہ ہے۔

اُڑیسہ کے جدید شاعروں میں سے حیدر نایاب، رفیق درد، بہاء الدین ریاض، کرامت علی

کرامت، عبدالمجید فیضی، شکیل دسنوی، خالد رحیم، یوسف جمال، ساجد اثر، اسماعیل آذر، رشمی کانت راہی، اطہر عزیز، الطاف حسین حسرت، راشد شبنم، الطاف نادر، عبدالمتین جامی، اور اولادرسول قدسی کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ان شاعروں نے اپنے عہد کے مختلف ادبی رجحانات اور شعری روایات سے متاثر ہو کر مختلف النوع شعری تجربے کئے جس سے ان کی عصری آگہی اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان شعراء نے کلاسیکل شعری روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدت، تنوع اور عصری حسیت کو اپنے تخلیقی رویہ کا جزء بنا لیا۔

اس کے علاوہ بیرونی شعراء جو زمانہ دراز تک اُڑیسہ میں مقیم رہے اور یہاں اردو کی تحریکوں سے وابستہ رہے ان کے شعری رویّوں کا بھی بطور خاص جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں حافظ شمس منیری، اصغر علی بیدل، عبدالجلیل خنجر، مظہر امام، اوج اعظمی، فرحت زیدی، سیلانی سیوتے، خالد شفائی، خان نیازی، گھائل فریدی، جبار غنی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، شجاع الدین ہمدانی، ڈی این شرما سوز، نذیر چشتی وغیرہم کا تذکرہ آیا ہے۔

(ب) اس ذیلی باب میں " عہد جدید میں اُڑیسہ میں اردو تعلیم کی صورت حال " کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے جس کے تحت ابتدائی، ثانوی، فوق لسانی اور درس نظامیہ کی تعلیم مذہبیات تک کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اردو تعلیم کے مسائل اور مستقبل پر بھی بحث کی گئی ہے۔

(ج) اُڑیسہ میں اردو کے ارتقاء میں یہاں کے ادبی اور ثقافتی اداروں نے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ اس ذیلی باب میں اہم ادبی اور ثقافتی اداروں کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

(د) اُڑیسہ میں زمانۂ قدیم سے اردو کتابت وطباعت کے ذرائع محدود رہے ہیں۔ اس کے باوجود اہل قلم حضرات نے اپنی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس باب میں اُڑیسہ میں اردو کی اشاعتی سرگرمیوں کا عمیق جائزہ لیا گیا ہے۔

نتائج

پیش نظر مقالہ میں اُڑیسہ میں اردو زبان کی نشو و نما کی مخصوص صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں چار اہم سرچشمے سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلے صوفیائے کرام نے اپنے رشد و ہدایت میں اردو زبان کا وافر استعمال کیا ہے جس سے اُڑیسہ جیسے غیر اردو

علاقے میں اس زبان کے فروغ کی فضا تیار ہوئی۔ اسحاق مدنی ایک صوفی بزرگ تھے جن کا مزار و یتر گا پٹنم میں ہے۔ اس شہر کا نام انہی کے نام پر اسحاق پٹنم تھا۔ ان کے ایک بھائی جو خود بھی اعلیٰ مرتبت صوفی بزرگ تھے اُڑیسہ آئے۔ یہاں ان کے مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ ان کا مزار گنجام اور پوری کے درمیان موجود ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ متعدد بار موصوف نے پیدل چل کر فریضہ حج ادا کئے۔ رشد و ہدایت دیتے ہوئے اُڑیسہ پہنچے تھے اور یہاں طویل عرصہ تک قیام بھی کیا تھا۔ پوری ضلع میں ان کی خانقاہ آج بھی موجود ہے۔ پوری ضلع کے کائی پد ر میں حضرت جلال الدین شاہ بخاری کا مزار مرجع خاص و عام ہے جہاں ہمیشہ زائرین کا ازدحام رہا کرتا ہے۔ بھدرک میں پہلوان شاہ نامی ایک صوفی بزرگ کا مزار پایا جاتا ہے۔ اس طرح اُڑیسہ میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے مزارات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اردو کے ابتدائی سرچشمے ان صوفیائے کرام کی خانقاہوں سے متعلق تھے۔ اُڑیسہ میں مسلم حکمرانوں کی سرپرستی اور ان کی پناہ میں صوفیائے کرام کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے مواقع فراہم ہوئے۔ انھوں نے اڑیسہ کے مرکزی شہروں میں اپنی خانقاہیں قائم کیں اور وہیں رچ بس گئے۔ اس زمانہ میں بیرونی مسلمانوں کی افواج اور صوفیائے کرام کے پاس اُڑیسہ میں عوام سے رابطہ کی ایک ہی ٹوٹی پھوٹی زبان تھی جو دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں اپنے تانے درست کر رہی تھی۔ اس لئے حاکموں اور صوفیوں نے قدرتی طور پر اسی زبان کو اختیار کیا۔ اور اس طرح سے اردو کی نشو و نما کے لئے فضا سازگار ہوئی۔ دوسری طرف ہجرت کے عمل نے اردو کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ اُڑیسہ بھی اس عمل سے سرفراز ہوا۔

اردو زبان کی نشو و نما میں انتظامیہ کا بھی بڑا حد تک دخل رہا ہے۔ ۱۸۳۶ء سے ۱۹۳۶ء تک اردو اُڑیسہ کی سرکاری زبان رہی ہے۔ راقم الحروف کو وسط انیسوی صدی کے اردو میں تحریر شدہ متعدد قوانین اور ایکٹ دستیاب ہوتے ہیں جن سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ انتظامیہ کے وسیلے سے اُڑیسہ میں اردو زبان کو خاصہ فروغ حاصل ہوا۔

اردو زبان کے فروغ میں اُڑیسہ کے تعلیمی اداروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ابتدائی طور پر مکاتب اور مدارس نے اردو تعلیم کے فروغ میں قابل ذکر خدمات انجام دیئے۔ بعد میں اسکول اور کالج وجود میں آئے جہاں زبان و ادب کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔

اردو زبان کی نشو و نما میں جہاں صوفیائے کرام، انتظامیہ اور تعلیمی اداروں نے اہم خدمات انجام دیں، اردو اخبارات و رسائل نے بھی قابل ذکر رول ادا کئے۔ اگرچہ اُڑیسہ میں زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک محض چند اخبارات و رسائل شائع ہوئے جن میں ماہنامہ المنصور، ہفتہ وار مسلم گزٹ، ہفتہ وار دور جدید، پندرہ روزہ بیداری، دو ماہی (ثم ماہنامہ) شاخسار اور ماہنامہ صدائے اُڑیسہ نے عوامی مقبولیت حاصل کی اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں پیش پیش رہے۔ اس کے علاوہ ملک کے دور دراز علاقوں سے شائع ہونے والے اردو کے تقریباً تمام علمی، مذہبی، ادبی اور سیاسی رسائل و جرائد اڑیسہ کے مرکزی علاقوں میں پہنچتے رہے ہیں اور اُڑیسہ میں اردو کے قارئین کے ادبی ذوق کو جلا دیتے رہے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے اُڑیسہ میں اردو کی لسانی خصوصیات

ماہرین لسانیات کی رائے کے مطابق کسی بھی زبان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلی قسم ادبی معیار کی زبان ہے۔ اس کا تعلق بول چال اور تحریر کی بنیادی شکل سے ہے اور یہ عام تعلیم کے ذریعہ رواج پاتی ہے۔

دوسری قسم میں زبان کا "عام فہم معیار" آتا ہے جو زبان کے شائستہ طبقے کے عام فہم اسلوب سے عبارت ہے۔ ایسی زبان سماج کے تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ بولتے ہیں۔ بلکہ اس معیار کی زبان کو اپنی روز مرّہ کی زندگی میں استعمال بھی کرتے ہیں۔

تیسری قسم "علاقائی معیار" کی ہے۔ اس ضمن میں زبان کی ایسی شکل شمار کی جاسکتی ہے جو عام فہم معیار کی زبان سے کم و بیش مماثلت رکھتی ہو۔

چوتھی قسم "پست معیار" زبان کی ہے۔ زبان میں یہ فرق مختلف سماجی گروہوں یا جغرافیائی حالات کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ سماج کے پسماندہ لوگ اپنی زبان کو بگاڑ کر بولتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کی ساخت کے اصولوں سے وہ بے نیاز ہوتے ہیں۔ تلفظ اور زبان کے قواعد ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ عام طور پر سماج کے اَن پڑھ اور مزدور طبقہ سے متعلق ہوتے ہیں۔

پانچویں قسم زبان کا "دیسی معیار" ہے۔ زبان کی یہ قسم سماج کے دوسرے بولنے والوں کے لئے اس وقت تک ناقابل فہم ہوتی ہے جب تک ذاتی طور پر اس سے واقفیت نہ ہو۔

اُڑیسہ میں بول چال کی اردو پر علاقائی اُڑیا زبان کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ انھیں تلفظ، قواعد اور لغت غرض زبان کی تینوں سطحوں پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنی بعض لسانی خصوصیات کی بنا پر اُڑیسہ میں بولی جانے والی اردو کے کئی روپ ملتے ہیں۔

پہلی شکل اُڑیسہ کے اُن مقامی لوگوں سے متعلق ہے جو نسلوں سے وہاں کے قصبات میں رہتے چلے آئے ہیں۔ ان لوگوں کی اردو پر اڑیا زبان کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جسے زبان کی ہر سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پوری ضلع کے نیا گڑھ، کاکٹ پور، رسول پور، خان پور، لتا ہرن، نیالی پہلی، بنمالی پور، گووند پور، گوپ، نیما پاڑہ، بسلی پاڑہ، خردہ، فتح گڑھ، موکوند پرشاد، بان پور وغیرہ میں جو اردو بولی جاتی ہے اس پر اڑیا زبان کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

دوسری جانب بالیسر ضلع کے بالیسر، بستہ، جلیسر، روپسا، بھوگرائی، چاندی پور و چاندبالی، جسی پور، ریمونا، باسودیو پور کی زبان پر اُڑیا کے بجائے بنگلہ کے اثرات زیادہ واضح ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ بالیسر بنگال کی سرحد میں ہونے کی وجہ سے وہاں کی مقامی اڑیا پر بنگلہ کے گہرے اثرات موجود ہیں جو بالواسطہ اردو زبان میں بھی دخیل ہو گئے ہیں۔

تیسری جانب شمالی مغربی اُڑیسہ میں راؤرکیلا، راج گانگ پور، جھارسوگڑہ وغیرہ علاقوں کی اردو زبان پر بہاری اثرات حاوی ہیں۔ سمبل پور کی زبان پر مدھیہ پردیش کی زبان کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

برہم پور، جے پور، پارلا کھمنڈی، سُرڈا وغیرہ علاقوں میں بولی جانے والی اردو پر اور کٹک کے پنشن لین کے علاقہ میں بولی جانے اردو پر دکنی اثرات پائے جاتے ہیں۔

اڑیسہ میں بولی جانے والی اردو کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیتے وقت کٹک، سونگڑہ، معصوم پور، کندرا پاڑہ، وغیرہ مقامات پر بولی جانے والی اردو معیاری زبان کے سانچہ پر پوری اترتی ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے اُڑیسہ میں بولی جانے والی اردو کی چند لسانی خصوصیات ذیل کے مطابق ہیں:۔

(۱) اردو میں عربی و فارسی کے مصوتے ق ف ز خ غ اُڑیسہ کی علاقائی معیار کی زبان میں ک پھ ج کھ ہو جاتے ہیں۔ ش پر مشتمل الفاظ بھی س مصوتے کے ساتھ تلفظ ہوتے ہیں۔

(۲) "ہ" کی آواز کی جانب رجحان کم ہے۔ اکثر الفاظ "ہ" مصوتے کے بغیر

تلفظ کئے جاتے ہیں جیسے آہستہ کے بجائے آستے۔ نہیں کی جگہ نئیں وغیرہ۔

(۳) عام طور پر دو مصوتے ایک ساتھ نہیں آتے۔ ایسے الفاظ میں مصوتے کو گرادیا جاتا ہے یا اس کی جگہ کوئی مصمتہ تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

جائے گا سے جاگا، جائے گی سے جاگی، کھائے گا سے کھاگا، کھائیں گے سے کھانگے وغیرہ۔

(۴) 'و' مصمتہ اکثر 'ب' میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً تصویر سے تصبیر، مولوی سے مولبی وغیرہ۔

(۵) لفظ کے آخر میں مصمتی خوشوں کو توڑ دیا جاتا ہے یا آخری مصمتے کو گرادیا جاتا ہے، مثلاً:۔ چاند سے چان، گوشت سے گوش، عشق سے اسک وغیرہ۔

(۶) طویل مصوتوں کو مختصر کرنے کا عام رجحان پایا جاتا ہے۔ جیسے دوسرا سے دُسرا، آسمان سے اَسمان۔

(۷) مصمتوں کو مشدّد کرنے کا رجحان بھی اڑیسہ کی اردو میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً کر سے کرّ، فجر سے پھجّر وغیرہ۔

(۸) اکثر مصمتوں کے ادغام کا عمل بھی سامنے آتا ہے۔ مثلاً جتنا سے جتّا، اُتنا سے اُتّا وغیرہ۔

(۹) نیم مصوتے لفظ کے شروع میں اکثر گر جاتے ہیں۔ جیسے وہاں سے ہواں، یہاں سے یاں وغیرہ۔

(۱۰) ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں مصمتے لفظ میں اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔ جیسے لعنت سے نالت، بغل سے گبل (غبل)، رکشہ سے ریکسا، وبال سے بوال۔ چٹک سے چکٹ وغیرہ۔

(۱۱) اڑیسہ کی اردو میں بعض ضمیریں بدلی ہوئی ملتی ہیں مثلاً تو سے تیں، ہمارا سے ہمرا وغیرہ۔

(۱۲) اردو میں ماضی کا لاحقہ 'ا' اور 'یا' ہے جو جنس، تعداد اور حالت وغیرہ کے لئے گردان کرتا ہے۔ جبکہ یہاں کی مقامی اردو میں 'اِس' لاحقہ ملتا ہے جس میں کوئی تصریفی عمل نہیں ہوتا۔ جیسے دیکھا سے دیکھس/دیکھین، گئی/گیا سے گیَن، بیٹھا/بیٹھی

سے بیٹھس وغیرہ۔

(۱۳) اردو کی دو جنسوں مذکر اور مؤنث کے مقابلہ میں مقامی اردو میں عام طور پر الفاظ مذکر ملتے ہیں۔ جو الفاظ اپنی اصل کے اعتبار سے مؤنث ہیں ان سے رشتہ رکھنے والے الفاظ بھی مذکر استعمال ہوتے ہیں۔

(۱۴) اُڑیسہ میں اردو کے بعض الفاظ کے تلفظ اس طرح بدل جاتے ہیں،۔

اندھیرا سے اندھیارا، فیرینی سے پھرنی، بدنامی سے بدلامی، میلاد سے مولود، نمک سے نیمک، مسجد سے مہجد، سحری سے سرگہی، کم سے کمتی، الوداع سے الیدا، اور سے آر وغیرہ۔

(۱۵) اُڑیسہ کی اردو میں بعض الفاظ ایسے پائے جاتے ہیں جو اردو کی لغات میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً:۔

کچّو (اروی)۔ چلتا (ایک ترش پھل جو سالن میں استعمال ہوتا ہے۔) اُول (زمیں قلم)۔ پوئی (ساگ)۔ جاؤ (کھچڑی)۔ امانی (باسی چاول میں ڈالا ہوا پانی)۔ پکھال (پانی بھات/ پن بھتہ)۔ ترازہ (مصالحہ دار سکھایا ہوا گوشت)۔ منڈا پیٹھا، پھچی سیمنا، بوتال، کونڈہ وغیرہ

اُڑیسہ میں اردو کا لسانی ماحول

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر جگہ کی زبان اپنی الگ خصوصیات رکھتی ہے۔ ساخت کی تبدیلیوں کو ایک ملک کے مختلف علاقوں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زبان کی بدلی ہوئی ایسی شکل "علاقائی بولی" سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ہر علاقہ میں مختلف فرقہ کے لوگ پائے جاتے ہیں اور عام طور پر ہر فرقہ اپنی الگ زبان رکھتا ہے۔ اس صورت میں جب سماج کے مختلف فرقے ایک مشترک زبان بولیں گے تو قدرتی طور پر اس زبان پر دوسری زبان کے اثرات پڑیں گے۔ اور اس زبان میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ زبان سماج کا ہی ایک حصہ ہوتی ہے اور سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوتا ہے جس میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ، ترقی یافتہ اور پس ماندہ، غیر مہذب اور مزدور طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ سماج کا یہ طبقاتی فرق زبان میں کافی اہم تبدیلیاں لاتا ہے اور ہر بولنے والا

اپنی مرضی کے مطابق زبان کے قواعد، لغت اور تلفظ استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ یہ عمل غیر شعوری طور پر ہوتا ہے جس کے پیچھے اس کی پوری شخصیت کارفرما رہتی ہے۔

اڑیسہ میں اردو کے جو علاقے ہیں وہاں اردو کے علاوہ متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کٹک ضلع میں اردو کے ساتھ اڑیا بولی جاتی ہے تو گنجام ضلع میں اردو کے ساتھ اڑیا اور تیلگو بولی جاتی ہیں۔ بالیسر ضلع میں اڑیا کے علاوہ بنگلہ بھی بولی جاتی ہے۔ سمبلپور میں اردو کے ساتھ سمبلپوری اڑیا اور چھتیس گڑھی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کیونجھر اور میور بھنج ضلعوں میں اڑیا کے علاوہ متعدد قبائلی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ کوراپٹ ضلع میں اردو کے ساتھ اڑیا اور تیلگو بولی جاتی ہیں۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق اڑیسہ میں مختلف زبانیں بولنے والوں کی آبادی اگلے صفحہ پر مندرجہ گوشوارہ سے واضح ہوتی ہے[1]

نمبر ترتیب	زبان	بولنے والوں کی تعداد	کل آبادی کا فی صد
۱	آسامی	۸۸	N
۲	بنگلہ	۳۳۱۲۳۷	1.61
۳	گجراتی	۱۳۷۵۴	0.06
۴	ہندی	۱۹۳۸۶۷	0.88
۵	کنڑ	۷۹۶	0.01
۶	کشمیری	۳۲	N
۷	ملیالم	۱۱۴۰۱	0.05
۸	مراٹھی	۱۰۶۱	0.01
۹	اڑیا	۱۸،۴۵۷،۹۵۹	84.11
۱۰	پنجابی	۱۵۹۳۸	0.07
۱۱	سنسکرت	۱۰	N

نمبر ترتیب	زبان	بولنے والوں کی تعداد	کل آبادی کا فی صد
۱۲	سندھی	۱۴۸۹	0.01
۱۳	تامل	۹۱۵۸	0.04
۱۴	تیلگو	۴۹۹۴۲۵	2.28
۱۵	اردو	۲۸۶۵۴۱	1.31

اُڑیسہ کے مسلمانوں نے اردو کو تہذیبی زبان کے طور پر اپنایا ہے۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے وہ عام طور پر کٹک، پوری، بالیسر، سمبل پور، سندر گڑھ وغیرہ اضلاع میں ساج میں اُڑیا بولتے ہیں اور گنجام کوراپٹ کے علاقوں میں سماجی زبان اڑیا اور تیلگو ہیں۔

اُڑیسہ کی اردو پر دکنی اثرات

برہم پور گنجام اور کوراپٹ ضلع میں بولی جانے والی اردو پر دکنی اثرات حاوی ہیں۔ کٹک، سنبل پور اور جٹنی کے ایک مخصوص علاقہ کی اردو پر بھی دکنی اثرات پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر دکنی اثرات کے جو الفاظ اُڑیسہ کی اردو میں مستعمل ہیں اُن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

ماٹی (مٹی)۔ پکائے (پکائی)۔ ہو جی (ہاں جی)۔ ہمنا (ہمیں)۔ نئیں (نہیں)۔ اَیّو ماں (ارے ماں)۔ گھراں (گھر کی جمع)۔ لوگاں (لوگ)۔ کونبا (کنبہ)۔ کونڈے (برتن)۔ کورتے رہنا (کھاتے رہنا)۔ کبیّ (کبھی)۔ ہوندے (اوندھے)۔ کو پّا (کپ/پیالہ)۔ پوٹّا (چھوکرا)۔ ابھی ہونا (فوراً چاہئے)۔ آکو ہے (آیا ہوا ہے)۔ پکوسٹے (بازو)۔ جمائی (داماد)۔ اماں باوا (ماں باپ)۔ اے (ہے) وغیرہ وغیرہ۔

اڑیسہ میں اردو کی ادبی خصوصیات

سرزمین اُڑیسہ میں اردو ادب کا جو سرمایہ اب تک سامنے آیا ہے اس میں ہیئت کے اعتبار سے شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور تنقید قابل ذکر ہیں۔ مواد کے اعتبار

سے ان تخلیقات پر مختلف عہد کی تحریکوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اڑیسہ میں اردو کے متقدمین شعراء صرف اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لئے شاعری کرتے تھے۔ نہ انھیں ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پرواہ پھر بھی ان شعراء کے کلام نے عرصۂ دراز تک اُڑیسہ کے عوام کی زندگی کو اپنی لطافتوں سے مسحور کیا۔ ان شعراء کے کلام میں جو مذہبی یکسانیت و مناسبت پائی جاتی ہے وہ کسی خارجی تحریک کی پیداوار نہ تھی بلکہ ان کے داخلی جذبات کے پرخلوص اظہار کا نتیجہ تھی۔ اُڑیسہ کے قدیم شعراء کا مذہبی رجحان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں بھی اردو شاعری نے فطری طور پر نشو و نما پائی ہے۔ اس عہد کے شعراء میں پختہ کاری قابل تحسین ہے۔ صنف قصیدہ پر بھی بعض شعراء کو عبور حاصل تھا۔ معلم سنبلپوری، محمد محسن اور عبدالعزیز عاشق کے قصائد اس امر کے شاہد ہیں۔ مولوی رحمت علی رحمت کا کلام تصوف، تغزل اور طنز و ظرافت کے عناصر سے مرکب ہے۔ امجد نجمی کی شاعری سے اڑیسہ کی اردو شاعری کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے جس زمانہ میں شاعری شروع کی وہ ہندوستان کی بیداری کا زمانہ تھا۔ ۲۱—۱۹۲۰ء میں جب خلافت تحریک کا زور ہوا تو اس سے متاثر ہو کر نجمی صاحب کی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور نتیجہ میں ان کی شاعری صرف سطحی جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہ رہی بلکہ حیات و کائنات کے باہمی رشتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی شعوری کوشش کے طور پر سامنے آئی۔ امجد نجمی اور اس عہد کے متعدد شعراء نے قومی تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ جہاں آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اردو شاعروں نے نمایاں حصہ لیا ہے وہاں اڑیسہ کے شاعروں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے ہمیشہ بدلتے ہوئے رجحان کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ ترقی پسند تحریک سے بھی گہرا اثر قبول کیا۔ یہاں کے شعراء نے شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہیں۔

دورِ جدید میں سعید اختر، ظہیر اللہ نور، خلیل تاباں، حیدر نایاب، رفیق درد، بہاء الدین ریاض، کرامت علی کرامت، خالد رحیم، یوسف جمال، ساجد اثر وغیرہ شعراء تخلیق کے تمام تجرباتی مدارج سے گذرے ہیں۔

دورِ حاضر میں شیخ حبیب اللہ نے اقبالیات پر قابل اعتناء مضامین لکھے ہیں۔ یوسف جمال نے ملکی اور غیر ملکی زبان کے وافر تعداد میں ترجمے کئے ہیں۔ انھوں نے ادبی اور تنقیدی مضامین اور متعدد افسانے بھی لکھے ہیں۔ شیخ مبین اللہ نے متعدد تحقیقی مضامین

لکھے اور کئی اڑیا افسانوں اور نظموں کے ترجمے کئے ہیں۔ کرامت علی کرامت نے اڑیا کے ناقد اور شاعر سیتا کانت مہاپاترا کے شعری مجموعہ کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی کے زیر اہتمام طباعت کے (لفظوں کا آسمان) مراحل سے گذر رہا ہے۔ کرامت نے اڑیسہ کی اردو صحافت کو شاخسار جیسا گراں قدر ادبی رسالہ عطا کیا اور تنقید کے میدان میں ہندو پاک کے تنقید نگاروں میں اپنی شناخت قائم کی۔ انھوں نے اردو شاعری میں مختلف تجربے بھی کئے ہیں۔ خالد رحیم نے آزاد غزل کی پیش رفت میں خاصے تجربے کئے۔ شکیل دسنوی نے اڑیسہ کی اردو شاعری کو لہجہ کی رعنائی اور اسلوب کا سلونا پن عطا کیا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں انتہائی بے تکلفی کے ساتھ ہندی الفاظ استعمال کئے جس سے ان کی غزلوں میں بانکپن کی لو چمکی۔

شیخ امین اللہ حیرتی اُڑیسہ کے اولین صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ ان کا کلام عام طور پر متصوفانہ ہے لیکن ان کے لفظیات میں خاصی انفرادیت پائی جاتی جو انھیں اپنے ہمعصر شعراء سے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ میر درد، مظہر جان جاناں وغیرہ کے صوفیانہ کلام کے مقابلہ میں حیرتی لفظیات کے اعتبار سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

دوسری طرف دیکھا جاتا ہے کہ امجد نجمی کی نظموں پر اڑیا کے شاعر رادھا ناتھ رائے کے اثرات حاوی ہیں۔ فطری مناظر کی عکاسی میں نجمی کا شعری رویہ خاص طور پر اُڑیا سے متاثر ہے۔ نجمی صاحب نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان آغا حشر کاشمیری کی طرز پر متعدد تاریخی ڈرامے لکھے جو اڑیسہ کی منفرد ادبی دین ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل نظموں میں اُڑیسہ کی لوک روایت کی گہری چھاپ ہے۔ اَنی کٹ، قلعہ کٹک، چلیکا، صبح جوبرا، شام تلسی پور وغیرہ۔

اُڑیسہ کے اردو کے ادبی سرمایہ میں نئے اصناف

یوں تو اڑیسہ میں اردو کے ادبی سرمایہ کا بیشتر حصہ طباعت سے محروم ہونے کی بناء پر عوام کی نظروں سے اوجھل ہے لیکن جو کچھ بھی منظر عام پر آیا ہے اس میں صنف جدید کی روشنی میں بنسی و تیھ گوسوامی کا ”مغل تماشہ“ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کی تصنیف ہے اور ایسے شخص کی اردو تصنیف ہے جس کی مادری زبان

اُڑیا تھی۔ جس طرح ہندی کی سب سے عظیم و قدیم تصنیف " پدماوت" اردو رسم الخط میں ہے۔ آدم جی کا ڈرامہ " خورشید " گجراتی رسم میں ہے۔ انشاء کی " رانی کیتکی " ہندی ہونے کے باوجود فارسی رسم الخط میں ہے۔ بابا فرید وارث شاہ اور گلریز شاہ کی تمام تخلیقات پنجابی زبان میں ہونے کے باوجود فارسی رسم الخط میں ہیں۔ مغل تماشہ بھی اردو ڈرامہ ہونے کے باوجود اڑیا رسم الخط میں ہے اور پچھلی دو صدیوں سے اڑیسہ کے عوام کی دلبستگی کا سامان فراہم کرتا رہا ہے۔ اور اس طرح ہندو مسلم تہذیبی ہم آہنگی کی روایت بن چکا ہے۔

تہذیبی لین دین کے سلسلہ میں مغل تماشہ میں ہر سطح کے لوگ اس سے مربوط ہیں۔ اس میں کرداروں کے اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کے اثرات اس قدر گہرے ہیں کہ یہ سماج کے سب سے نچلے طبقے تک پہونچتا ہے اور اس کی تنقید بھی کرتا ہے۔ اس طرح مغل تماشہ تہذیبی لین دین یعنی CULTURAL EXCHAN کا گہرا مطالعہ پیش کرتا ہے جس کی خاص اہمیت ہے۔ گویا کہ یہ اس عمل کا مطالعہ ہے جو لوک کتھا کو ادبی پیرایہ تک پہونچاتا ہے۔ اس اعتبار سے مغل تماشہ ہماری پوری لوک کتھا اور ادب کے سیاق و سباق میں تہذیبی ارتقاء کی پہچان کا عمل ہے۔ دوسری طرف دیکھا جاتا ہے کہ اردو ڈرامہ صرف تہذیبی ادب کا نام نہیں بلکہ مختلف اسکرپٹ میں ہونے کے باوجود اسٹیج ہونے کا نام ہے۔ مغل تماشہ زندگی سے قریب ہے اور اس کے مکالمے سماج کے حاکمانہ کردار سے لے کر اوسط درجے کے زمیندار اور نچلے درجے کے عام خدمت گار کی زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔

مغل تماشہ کا مرکزی تاثر یا نقطۂ ارتکاز محض مغلیہ دور کی عیش پرستی کا اظہار نہیں بلکہ عوامی زندگی میں غیر ذمہ دارانہ رجحان، نشہ خوری کی لت اور مہینوں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے نچلے درجہ کے ملازمین کی زندگی میں جس طرح کی کشمکش جاری ہے اس کی عکاسی ہے اور یہی وہ مرکزی تاثر ہے جو ڈرامہ دیکھنے والے ناظرین قبول کرتے ہیں۔

آج اڑیا جاترا یا OPERA کے نام سے جو چیز متعارف ہے اس کے روپ مختلف جگہوں میں ہیں لیکن اڑیسہ کے ساحلی ضلعوں میں جس طرح سے اڑیا جاترے آج ہو رہے ہیں ان کا آغاز مغل تماشہ سے ہی ہوتا ہے۔ اڑیا زبان کے ایک معروف ناٹیہ کار وشنو پانڑہین نے اڑیا جاتراؤں کی ٹکنک میں کافی تبدیلیاں کی ہیں لیکن اس سے قبل اڑیا جاتراؤں کا یہی روپ تھا کہ سب سے پہلے سازندے پکھاوج ، قبوضی ،

وائلن بجایا کرتے تھے اور اجتماعی طور پر وندنا کی جاتی تھی۔ اس کے بعد نو عمر بچے رقص کیا کرتے تھے۔ رقص کے بعد مسلم دورِ حکومت کی تصویر پیش کی جاتی تھی۔ یعنی ایک کردار اسلامی لباس میں آکر فارسی میں مناجات پڑھتا، گیت گاتا اور فوراً چھوکری، بکری، چھپر کھٹ مسہری کا دعویٰ کرتا۔ جس طرح جاگیردار اپنی رعایا سے خراج طلب کرتا ہے۔ اس کے بعد چوبدار آیا کرتے۔ اور آخر میں راجہ رانی وغیرہ کے مکالمے ہوتے۔ ٹھیک اس سے قبل کے جاتراؤں کا روپ مغل تماشہ تھا۔

سنسکرت ناٹکوں میں صرف سنسکرت اور پراکرت کا استعمال ہوا کرتا تھا لیکن اڑیا شاعروں نے اس میں اُڑیا گیت داخل کئے۔ اس طرح سے اُڑیسہ کے ناٹک ساہتیہ میں کئی طرح کے انقلابات آئے۔ ایک بہت ہی قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ سنسکرت ڈراموں میں اعلیٰ خاندان کے مہذب لوگ سنسکرت میں گفتگو کیا کرتے ہیں لیکن ان کی عورتیں پراکرت بولا کرتی ہیں اور دوسرے کردار بھی یہی زبان بولا کرتے ہیں۔ ذیلی سطح کے کردار ماگدھی، پساچی وغیرہ پراکرت میں گفتگو کیا کرتے ہیں۔ اس قسم کی زبان کے استعمال سے ہی مختلف کرداروں کی سماجی سطح کا علم ہوتا ہے۔ بنسی ولبھ گوسوامی نے بھی اس روایت کو دوسری طرح سے استعمال کیا ہے۔ سماج میں سب سے اعلیٰ سطح پر ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب (مغل تماشہ کا مرکزی کردار) فارسی بولتے ہیں۔ چونکہ فارسی سب کی سمجھ میں نہیں آتی اس لئے چوبدار اردو میں مکالمہ کا مطلب واضح کرتے ہیں۔ مرزا صاحب سے ہر شخص کا ملنا ممکن نہ تھا۔ مغل تماشہ میں دیگر کرداروں نے اپنی سماجی سطح کے مطابق اردو، اڑیا اور بنگلہ میں مکالمے ادا کئے ہیں۔ اس طرح لسانی نقطۂ نظر سے مغل تماشہ کی اہمیت مسلّم ہے۔

دوسری طرف عبدالمجید بھونیاں حیاؔ کی ذو لسانی غزلیں بھی اڑیسہ میں اردو کی ادبی خصوصیات کے تحت نئے اصناف میں آئی ہیں۔ ان کا اس قبیل کا ایک شعر اڑیسہ میں عوامی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

حسن کا نور صنم ہے جو ترے تن میں بھرا

اس مختصر جائزہ سے مراد یہ ہے کہ اردو دہلی، لکھنؤ اور دکن میں ہی نہیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان علاقوں کی تہذیبی خصوصیات کو سمیٹ کر اور ان اثرات کو اپنے جلو میں لے کر اور اپنا کر ابھری ہے اور اس اعتبار سے د ؟ ایسی کل ہند زبان اور ادب کی نمائندہ ہے جو قومی بھی ہے اور علاقائی انفرادیت ؟ خوشبو سے بھی مالا مال ہے۔

اڑیسہ کے آسمان ادب کے روشن ستارے

اڑیسہ کے مقالہ نگار

۱۔ شیخ حبیب اللہ۔
۲۔ سید منظر حسن دسنوی۔
۳۔ کرامت علی کرامت۔
۴۔ حفیظ اللہ نیولپوری۔
۵۔ سید مسیح اللہ۔
۶۔ یوسف جمال۔
۷۔ شیخ مبین اللہ۔
۸۔ ڈاکٹر شیریں پروین۔

اڑیسہ کے افسانہ نگار

۱۔ محمود بالیسری۔
۲۔ یوسف پرویز۔
۳۔ حفیظ اللہ نیولپوری۔
۴۔ یوسف جمال۔
۵۔ ڈاکٹر نسیمہ بیگم۔
۶۔ ڈاکٹر شیریں پروین۔
۷۔ شیخ مبین اللہ۔
۸۔ شیخ حبیب اللہ۔
۹۔ عبدالرزاق راہی۔
۱۰۔ اسلام احمد اسلام۔

اڑیسہ کے ناول نگار

۱۔ محمد یوسف یوسف۔
۲۔ شیخ حبیب اللہ۔
۳۔ سلیمان خاکی۔
۴۔ حیدر نایاب۔
۵۔ عبدالرزاق راہی۔

اڑیسہ کے ڈرامہ نگار

۱۔ امجد نجمی۔
۲۔ نورالہدیٰ۔
۳۔ ظہیراللہ نور۔
۴۔ یوسف پرویز۔
۵۔ نورالدین احمد۔

سمبلپور کے شعراء

۱۔ الطاف حسین حسرت۔
۲۔ عبدالمجید فیضی۔
۳۔ صفدر علی خاور۔
۴۔ انور علی انور۔
۵۔ معین الدین آرزو۔
۶۔ ظہور اختر۔
۷۔ ارشاد احمد ارشاد۔
۸۔ عبداللہ شیدا۔
۹۔ عثمان وحشی۔
۱۰۔ جمیل احمد مردار بھوت نگری۔
۱۱۔ غوث فریاد۔
۱۲۔ مراد شریف مراد۔
۱۳۔ حقیقت علی نقش۔
۱۴۔ شکیل احمد جھنجھٹ۔

سونگڑہ کے شعراء

۱۔ عبدالحلیم نقیب۔
۲۔ عجیبہ خاتون عجیب۔
۳۔ زین العابدین۔
۴۔ شہاب المتقین۔
۵۔ راشد شبنم۔
۶۔ علی یوسف نیر۔
۷۔ نورالہٰی ناطق۔
۸۔ عبدالمتین جامی۔
۹۔ شفیق الرحمٰن عاجز۔
۱۰۔ فدائے غفار پیغام۔
۱۱۔ اختر حسین شافی۔
۱۲۔ مجیب الرحمٰن میکش۔
۱۳۔ انوارالحق شیدا۔
۱۴۔ ابوداؤد نادر۔

۱۵۔ محمد الیاس آباد۔
۱۶۔ شمس الہدیٰ شمس۔
۱۷۔ نور الہدیٰ قائد۔
۱۸۔ محمد ایوب صابر۔

راؤر کیلا کے شعراء

۱۔ علی احمد شیدا۔
۲۔ خان نیازی امروہوی۔
۳۔ عبد القیوم قریشی۔
۴۔ ظفر عالم ظفر۔
۵۔ اشتیاق احمد اشتیاق۔
۶۔ مشرف خاں حیرت حبیبی۔
۷۔ معین الدین اشک۔
۸۔ عبد الرشید شاہد۔
۹۔ انعام رسول مضطر۔
۱۰۔ راج کمار کشیپ راج
۱۱۔ سید ظفر حسنین۔
۱۲۔ سنّی سموئیل۔
۱۳۔ جیت تمنائی۔
۱۴۔ جبّار غنی۔
۱۵۔ غیاث الدین غیاث۔
۱۶۔ ظہیر سہاروی۔
۱۷۔ معین الدین رونق۔
۱۸۔ اطہر مشتاق۔
۱۹۔ شمس الحق فاروقی۔
۲۰۔ عباس رضوی۔
۲۱۔ عبد المجید شرر۔
۲۲۔ عبد الرحیم نشتر۔
۲۳۔ حبیب اللہ بیکل۔
۲۴۔ محمد یوسف۔
۲۵۔ عبد الصمد نعمانی۔
۲۶۔ راہی مسافر غریب۔

راج گانگ پور کے شعراء

۱۔ گھائل فریدی۔
۲۔ یوسف جمال۔
۳۔ ناصر بلہوری۔
۴۔ ابرار احمد ابرار۔
۵۔ محمد افضال بیدار۔
۶۔ ابو الحامد مجاہد۔
۷۔ ابو صالح۔

محمد شوکت زیبا (سندرگڑھ)

جھارسوگڑہ کے شعراء

۱۔ عبدالمجید ماہر عزیزی۔
۲۔ حافظ محمد اختر۔
۳۔ معین الدین زخمی۔
۴۔ کاوش حسینی۔

کٹک کے شعراء

۱۔ امجد تجمی۔
۲۔ مولانا سید برکت اللہ برکت۔
۳۔ مولوی رحمت علی رحمت۔
۴۔ حفظ الباری حافظ۔
۵۔ مولوی عبداللطیف عارف۔
۶۔ عبدالرحیم راقم۔
۷۔ عنایت اللہ جرآز۔
۸۔ اسماعیل بجلی۔
۹۔ تلوک ناتھ انجم۔
۱۰۔ پروفیسر سید منظر حسن۔
۱۱۔ ظہیر اللہ نور۔
۱۲۔ مسیح اللہ مسیح۔
۱۳۔ رفیق درد۔
۱۴۔ کرامت علی کرامت۔
۱۵۔ سید شکیل دسنوی۔
۱۶۔ خالد رحیم۔
۱۷۔ اسماعیل آذر۔
۱۸۔ ساجد اثر۔
۱۹۔ بہار الدین ریاض۔
۲۰۔ شہید اکرامی۔
۲۱۔ قادر شریف رونق۔
۲۲۔ سعید رحمانی۔
۲۳۔ عبدالصمد واصف۔
۲۴۔ حامد ندیم۔
۲۵۔ قاسم خلش۔
۲۶۔ نفیس منظر۔
۲۷۔ غلام محی الدین سائر۔
۲۸۔ ضمیر خاں ضمیر۔
۲۹۔ عبدالصمد پریمی۔
۳۰۔ رشمی کانت راہی۔

۳۱۔ اطہر عزیز۔ ۳۲۔ اعظم علی جوکر۔
۳۳۔ محمد ریاض تشنہ۔ ۳۴۔ نورالہٰی ناطق

بھدرک کے شعراء

۱۔ الطاف نادر۔ ۲۔ عبدالقیوم خاکی۔
۳۔ مظہر مجیدی۔ ۴۔ اولاد رسول قدسی۔

بالیسر کے شعراء

۱۔ عبدالحلیم حلیم۔ ۲۔ عزیز مضطر۔
۳۔ اثر نظامی۔ ۴۔ عباس پرویز۔

اڑیسہ کے شعرائے متقدمین

۱۔ ہردے رام جودت۔ ۲۔ شیخ امین اللہ جرخی۔
۳۔ مولوی محمد سلطان راجی۔ ۴۔ خاتم بہراج پوری۔
۵۔ ظہور الحق ظہوری۔ ۶۔ مجرم سنبلپوری۔
۷۔ محمد یوسف یوسف۔ ۸۔ معلم سنبلپوری۔
۹۔ عبدالرحیم احسن۔ ۱۰۔ فیض النساء تسخیر۔
۱۱۔ عرفان علی فدائی۔ ۱۲۔ عبدالمجید بھونیاں حیا۔
۱۳۔ سید عبدالستار عبد ۱۴۔ جان محمد حازم۔
۱۵۔ محمد محسن محسن۔ ۱۶۔ سید نور علی نور۔
۱۷۔ شیخ عبدالعزیز عاشق ۱۸۔ رفیع الدین خاں رفیع۔
۱۹۔ مولا بخش شاہ مولا۔ ۲۰۔ رسول بخش کاشف۔

اڑیسہ کی شاعرات

۱۔ فیض النساء تسخیر۔
۲۔ تمت النساء تمت۔
۳۔ عجیبہ خاتون عجب۔
۴۔ سیدہ مصلحت ایزدی۔
۵۔ معزّہ خاتون موزوں۔
۶۔ طاہرہ حفیظ۔

اڑیسہ کے کالج جہاں اردو تعلیم دی جاتی ہے

۱۔ راونشا کالج کٹک۔
۲۔ شیل بالا ویمنز کالج کٹک۔
۳۔ بی جے بی کالج بھونیشور۔
۴۔ کاکٹ پور کالج کاکٹ پور۔
۵۔ نیما پاڑہ کالج نیما پاڑہ۔
۶۔ فقیر موہن کالج بالیسر۔
۷۔ بھدرک کالج بھدرک۔
۸۔ بھدرک ایوننگ کالج بھدرک۔
۹۔ چرمپا کالج بھدرک۔
۱۰۔ سالندی کالج بھدرک۔
۱۱۔ دھام نگر کالج دھام نگر۔
۱۲۔ این سی کالج جاج پور۔
۱۳۔ پالیا کالج پالیا بندھا بھدرک۔
۱۴۔ بھدرک ویمنز کالج
۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد کالج کٹک

بیرونی اصحاب قلم جو اڑیسہ کی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ رہے

۱۔ حافظ شمس الدین احمد شمس منیری۔
۲۔ بے حس الٰہ آبادی۔
۳۔ مولانا سیف الرحمٰن پشاوری۔
۴۔ شاہد رامپوری۔
۵۔ اصغر علی بیدل۔
۶۔ خان نیازی امروہوی۔

۷۔ عبدالجلیل خنجر۔
۸۔ خالد شفائی۔
۹۔ مظہر امام۔
۱۰۔ اوج اعظمی۔
۱۱۔ محب الرحمن کوثر۔
۱۲۔ پنہاں لکھنوی۔
۱۳۔ فرحت زیدی۔
۱۴۔ ڈی۔ این۔ شرما سوز۔
۱۵۔ کامل صدیقی لکھنوی۔
۱۶۔ سیلانی سیوتے۔
۱۷۔ پروفیسر شکیل الرحمن۔
۱۸۔ خواجہ بدیع الزماں۔
۱۹۔ شجاع الدین ہمدانی۔
۲۰۔ غلام مہدی راز۔
۲۱۔ نذیر چشتی۔
۲۲۔ ناصر بلہوری۔
۲۳۔ سید منظر حسن۔
۲۴۔ سید شکیل دسنوی۔
۲۵۔ سید نفیس منظر۔
۲۶۔ جعفر رضا نقوی۔
۲۷۔ عظیم بنگلوری۔
۲۸۔ راجریہ سورام پرساد۔
۲۹۔ جبار غنی۔
۳۰۔ اطہر مشتاق۔
۳۱۔ راہی مسافر غریب۔
۳۲۔ عبدالرزاق راہی۔

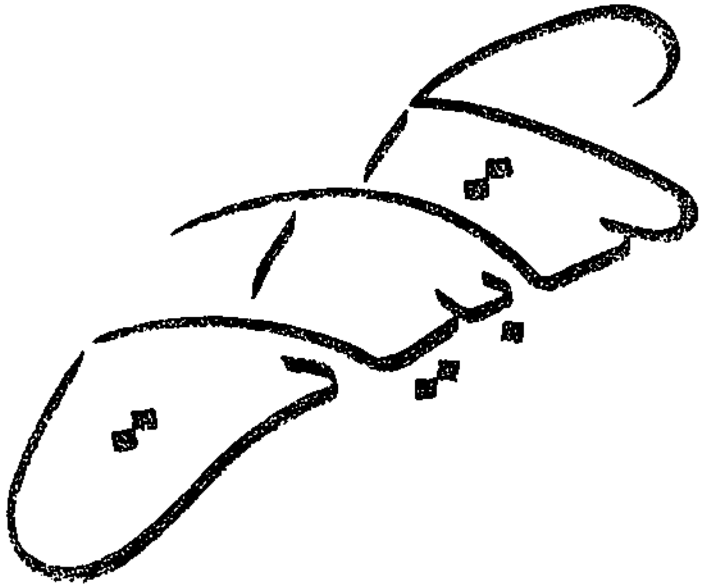

کتابیات

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۱	اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۳۴ء
۲	آزاد، محمد حسین	آب حیات	رام نرائن لال بینی مادھو، الٰہ آباد	۱۹۷۲ء
۳	احمد، نظام الدین	حدیقۃ السلاطین	درج نہیں	درج نہیں
۴	ابن فرید	میں ہم اور ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	〃
۵	اختر اورینوی	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	—	—
۶	احتشام حسین	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ		
۷	ابراہیم یوسف	اندرسبھا اور اندرسبھائیں	نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ	۱۹۸۰ء
۸	ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۹	انجمن آرا	آغا حشر اور اردو ڈرامہ	〃	〃
۱۰	امجد نجمی	طلوع سحر	اڑیسہ اردو پبلشرز کٹک	۱۹۶۲ء
۱۱	امجد نجمی	صدائے ہمالہ	پرجا تنتر پرچار سمیتی کٹک	۱۹۶۲ء
۱۲	امجد نجمی	نکہت باغ یوسف	قلمی نسخہ	۱۹۲۸ء

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۱۳	امجد نجمی	جوئے کہکشاں	اڑیسہ اردو پبلشرز کٹک	۱۹۶۹ء
۱۴	ابراہیم علی خاں	گلزار ابراہیم	—	۱۹۶۸ء
۱۵	امداد صابری	روحِ صحافت	مکتبہ شاہراہ دہلی	۱۹۶۸ء
۱۶	امداد صابری	تاریخ صحافت اردو (جلد دوم)	جدید پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۳ء
۱۷	اوج اعظمی	انتخاب اوج	روضۃ المعارف، خیرآباد	۱۹۸۲ء
۱۸	اعجاز حسین، ڈاکٹر	ادب اور ادیب	ادارہ انیس اردو الٰہ آباد	۱۹۶۰ء
۱۹	اعظمی، خلیل الرحمٰن	نئی نظم کا سفر ۱۹۳۶ء کے بعد	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۷۲ء
۲۰	ابوالفضل	اکبر نامہ	—	—
۲۱	آزاد، محمد حسین	دربار اکبری	—	—
۲۲	اظہار علی/اشرف علی کٹکی	گلدستۂ اظہار العشق/اشرف الجمن	برکاتی پریس، کلکتہ	۱۹۰۴ء
۲۳	انور، سید انور علی	چاند رمضان پیام عید	سید انور علی انور، اڑیا بازار کٹک	۱۹۲۶ء
۲۴	الیاس، شیخ محمد	نوائے بھدرک	جیبہ انجمن۔ پاکستان بازار۔ گوجیدرہ	۱۹۴۶ء
۲۴ (الف)	آمنہ خاتون	میسور میں اردو	—	—

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۲۵	اکرام الحق	شعر العجم فی الہند	——	——
۲۶	امانت، ڈاکٹر	حیات بیدل	——	——
۲۷	باسط، شیریں پروین	مُلّا وجہی۔ حیات اور شاعری	تحقیقی مقالہ/ ایم فل یونی ورسٹی	۱۹۸۰ء
۲۸	ثریا حسین	جمالیات اور ادب	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۲۹	جاوید نہال	بنگال کا اردو ادب	اردو رائٹرز گلڈ، کلکتہ	۱۹۶۹ء
۳۰	جگن ناتھ آزاد	نشانِ منزل	موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۳۱	چرخی، شیخ امین اللہ	دیوانِ چرخی	رضوانی پریس کلکتہ	۱۹۰۷ء
۳۲	حبیب اللہ، شیخ	عمر خیام	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	درج نہیں
۳۳	حبیب اللہ، شیخ	نجمہ	ایضاً	ایضاً
۳۴	حازم، جان محمد	گلدستۂ گلزار	درج نہیں	۱۳۳۸ء
۳۵	حیدر نایاب	لموں کی بازگشت	نایاب پبلی کیشنز بھوبنیشور	۱۹۷۰ء
۳۶	حالی، الطاف حسین	مقدمۂ شعر و شاعری	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۷۷ء

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۳۷	حامد حسین، سیّد	اردو شاعری میں تلمیحات	پاشا پرنٹنگ پریس، بھوپال	۱۹۷۷ء
۳۸	حیا، عبدالمجید بھونیاں	دیوان مجید	نول کشور پریس لکھنؤ	۱۸۷۱ء
۳۹	حلیم، مولوی عبدالحلیم	موجِ نسیم	بانکی پور پریس پٹنہ	درج نہیں
۴۰	خالد رحیم	عکس در عکس	نعمانی پریس، دہلی	۱۹۸۳ء
۴۱	خالد شفائی	سنگ وسمن	مغل اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۴۲	خلیق انجم	متنی تنقید	غالب پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۶۷ء
۴۳	خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	—
۴۴	خالد العربی، ابوالقاسم	انتخاب الحدیث	دارالکتاب۔ بونت۔ اڑیسہ	۱۹۸۰ء
۴۵	خالد العربی، ابوالقاسم	اربعون حدیثاً	نامی پریس۔ لکھنؤ	۱۹۸۰ء
۴۶ الف	درد، جگدیش مہتہ	اردو کے ہندو شعراء (حصہ اول)	حقیقت بیانی و یکلی، دہلی	۱۹۷۲ء
۴۶ ب	رشید حسن خاں	ادبی تحقیق مسائل وتجزیہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۸ء
۴۷	رضوی، سلیم حامد	اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ	درج نہیں	درج نہیں

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۴۸	راہی۔ رشمی کانت پاریکھ	حرفِ مُستب	نجمی اکیڈمی، کٹک	۱۹۸۴ء
۴۹	سلیم شہزاد	جدید شاعری کی ابجد	منظر نما پبلی کیشنز، مالیگاؤں	۱۹۸۳ء
۵۰	سید حسن، پروفیسر	بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامہ	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	۱۹۸۲ء
۵۱	سلیم، غلام حسین	ریاض السلاطین	ــــــ	ــــــ
۵۲	سلطان راجی، مولوی	فصیح الحلال والحرام	مطبع مظہر العجائب، مدراس	۱۲۸۴ھ
۵۳	سلطان راجی، مولوی	خطبہائے دوازہ ماہی	مطبع مظہر النصائح، کٹک	۱۲۸۶ھ
۵۴	سلطان راجی، مولوی	معرفِ خدا و رسول	ایضاً	۱۲۸۷ھ
۵۵	سلطان راجی، مولوی	مہتاب المجالس	ایضاً	۱۳۰۳ھ
۵۶	ساحل احمد	غزل پس منظر پیش منظر	اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد	۱۹۷۹ء
۵۷	سروری، عبدالقادر	اردو کی ادبی تاریخ	ــــــ	ــــــ
۵۸	سرہندی، یحیٰ بن احمد بن عبداللہ	تاریخ مبارک شاہی	ــــــ	ــــــ
۵۹	سہیل بخاری	اردو کا روپ	چودھری بشیر احمد آزاد بٹالوی، لاہور	۱۹۷۱ء

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۶۰	شوکت سبزواری	اردو زبان کا ارتقاء	چمن بک ڈپو، اردو بازار دہلی	—
۶۱	شوکت سبزواری	اردو لسانیات	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۵ء
۶۲	شکیل دسنوی، سید	زندگی اے زندگی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۶۳	ظہیر احمد صدیقی	ادب میں جمالیاتی اقدار	مکتبہ الفاظ، علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۶۴	ظہیر ناشاد دربھنگوی	دربھنگہ میں اردو	صدیقیہ پرنٹرس، مولوی لین، کلکتہ	۱۹۷۷ء
۶۵	ظہیر سہاروی/خان نیازی	نقش جاوداں	ادارہ اردوئے معلیٰ، راؤرکیلا	۱۹۶۸ء
۶۶	عابد علی عابد	اسلوب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۲ء
۶۷	عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقاء	چمن بک ڈپو، اردو بازار دہلی	—
۶۸	عبادت بریلوی	جدید شاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۳ء
۶۹	عشرت رحمانی	اردو ڈرامہ، تاریخ و تنقید	ایضاً	—
۷۰	عشرت رحمانی	اردو ڈرامہ کا ارتقاء	ایضاً	—
۷۱	عقیل، سید محمد	سماجی تنقید اور تنقیدی عمل	تہذیب نو پبلی کیشن، الہ آباد	۱۹۸۰ء

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۷۲	عبدالودود خاں	اردو نثر میں ادب لطیف	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۰ء
۷۳	عبدالودود، قاضی	چہار عنصر	—	—
۷۴	عبدالحق، مولوی	اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	—
۷۵	عطیہ نشاط	اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۷۶	عتیق صدیقی	اٹھارہ سو ستاون: اخبار اور دستاویزیں	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۶۶ء
۷۷	عبادت بریلوی	شاعری اور شاعری کی تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۵ء
۷۸	عبد، سید عبدالستار	نغمۂ ستار	کمالی پریس بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ	۱۹۳۴ء
۷۹	عالم، قیصر صفی	شرارِ جستجو	ناہید عالم، کانکے روڈ، رانچی	۱۹۸۲ء
۸۰	غلام غوث، شیخ	نبیؐ العربی	کاشی رام پریس، لاہور	۱۹۱۹ء
۸۱	غیاث الرحیم	برار میں زبان وادب کا ارتقاء	ناگ پور	۱۹۸۲ء
۸۲	قیصر جہاں	اردو گیت	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	—

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۸۳	قمر رئیس	ترجمہ کا فن اور روایت	خواجہ پریس، دہلی	۱۹۷۶ء
۸۴	کرامت علی کرامت	آبِ خضر	اڑیسہ پبلشرز کٹک	۱۹۶۳ء
۸۵	کرامت علی کرامت	شعاعوں کی صلیب	شاخسار پبلی کیشنز کٹک	۱۹۷۲ء
۸۶	کرامت علی کرامت	اضافی تنقید	اردو رائٹرز گلڈ، الٰہ آباد	۱۹۷۷ء
۸۷	کلیم عاجز	بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء	بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ	—
۸۸	کمار پاشی	محمد علوی: ایک مطالعہ	سطور پرکاشن، دہلی گیٹ	۱۹۷۹ء
۸۹	مُعظّم سنبلپوری	کارخِ سخن	اسلامیہ کمیٹی جاٹا پاڑہ بلاسپور	۱۹۱۳ء
۹۰	مسعود حسین خاں	مقدمہ تاریخ زبانِ اردو	سرسید بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۵۰ء
۹۱	محمد حسن، پروفیسر	اردو میں رومانوی تحریک	دانش محل، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
۹۲	محمد حسن، پروفیسر	جدید اردو ادب	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی	۱۹۷۵ء
۹۳	محمد حسن، پروفیسر	مورپنکھی	مکتبہ دین و ادب لکھنؤ	۱۹۷۵ء

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۹۴	محمد حسن، پروفیسر	معاصر ادب کے پیش رو	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۹۵	مصرا، لکشمی نارائن	بھگوت گیتا	انجمن ترقی اردو ہند حیدرآباد	—
۹۶	میمونہ دہلوی، ڈاکٹر	بمبئی میں اردو	بمبئی	—
۹۷	مالک رام	تذکرۂ معاصرین (۴)	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۹۸	مظہر امام	زخم تمنا	اڑیسہ اردو پبلشرز کٹک	۱۹۶۲ء
۹۹	مظہر امام	آتی جاتی لہریں	اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد	۱۹۸۱ء
۱۰۰	مسیح اللہ، سید	نجم الشعرا امجد نجمی حیات اور شاعری	رانچی یونی ورسٹی، رانچی	
۱۰۱	محمود شیرانی، حافظ	پنجاب میں اردو		
۱۰۲	مولا، مولا بخش	خدا کی عنایت، بھدرک کی نعمت	تاج پریس کلکتہ	۱۹۵۵ء
۱۰۳	مولا، مولا بخش	اللہ کی رحمت اڑیسہ کی دولت	ہند پریس کلکتہ	۱۹۵۹ء
۱۰۴	نصیر احمد خاں، ڈاکٹر	اردو کی بولیاں اور کارخانہ داری کا مطالعہ	ادارۂ تصنیف ۷/ ڈی ماڈل ٹاؤن دہلی	۱۹۷۹ء

نمبر شمار	مصنفوں کے نام	کتابوں کے نام	ناشر	سنہ اشاعت
۱۰۶	وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	—
۱۰۷	وزیر آغا	تخلیقی عمل	ایضاً	۱۹۷۵ء
۱۰۸	وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج	ایضاً	—
۱۰۹	وزیر آغا	تنقید اور احتساب	ایضاً	۱۹۷۶ء
۱۱۰	وفا راشدی	بنگال میں اردو	مکتبہ اشاعت اردو حیدر آباد سندھ	۱۹۵۵ء
۱۱۱	وقار عظیم	نیا افسانہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
۱۱۲	ہاشمی، نصیر الدین	دکن میں اردو		
۱۱۳				

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۱	ہفتہ وار مسلم گزٹ	کٹک	۳ر جون ۱۹۳۷ء	جلد ۱ شمارہ ۱۵
۲	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۸ر جولائی ۱۹۳۷ء	جلد ۱ شمارہ ۶
۳	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۱۷ر جون ۱۹۳۷ء	۱—۳
۴	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۱۰ر جون ۱۹۳۷ء	۱—۲
۵	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۲۴ر جون ۱۹۳۷ء	۱—۴
۶	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	یکم جولائی ۱۹۳۷ء	۱—۵
۷	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۱۵ر جولائی ۱۹۳۷ء	۱—۷
۸	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۲۲ر جولائی ۱۹۳۷ء	۱—۸
۹	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۲۹ر جولائی ۱۹۳۷ء	۱—۹
۱۰	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۵ر اگست ۱۹۳۷ء	۱—۱۰
۱۱	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۱۳ر اگست ۱۹۳۷ء	۱—۱۱

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۱۲	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۲۰ر اگست ۱۹۳۶ء	۱-۱۲
۱۳	ہفتہ وار مسلم گزٹ	ایضاً	۲۷ر اگست ۱۹۳۶ء	۱-۱۳
۱۴	دوماہی شاخسار	بخشی بازار کٹک ۱؎	جون جولائی ۱۹۶۵ء	شمارے ۱-۱
۱۵	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۶۶ء	۲-۳
۱۶	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۶۶ء	۶
۱۷	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۶۸ء	۱-۲
۱۸	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۶۹ء	۲۲-۲۳
۱۹	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۶۹ء	۲۴-۲۵
۲۰	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۷۰ء	۲۶-۲۷-۲۸
۲۱	دوماہی شاخسار	ایضاً	۱۹۷۲ء	۳۹-۴۰
۲۲	ماہنامہ شاخسار	ایضاً	۱۹۷۲ء	۴۱-۴۲-۴۳

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۲۳	ماہنامہ شاخسار	بخشی بازار کٹک	۱۹۷۲ء	۴۴-۴۵-۴۶
۲۴	ماہنامہ صدائے اُڑیسہ	نیو کالونی، کیسرپور، کٹک اُڑیسہ	یکم جون ۱۹۸۲ء	۱-۱
۲۵	ماہنامہ صدائے اُڑیسہ	ایضاً	جولائی ۱۹۸۲ء	۱-۲
۲۶	ماہنامہ صدائے اُڑیسہ	ایضاً	اگست ۱۹۸۲ء	۱-۳
۲۷	ماہنامہ صدائے اُڑیسہ، نجمی نمبر	ایضاً	اکتوبر نومبر ۱۹۸۲ء	۱-۵-۶
۲۸	ماہنامہ صدائے اڑیسہ	ایضاً	۱۹۸۳ء	۱-۹-۱۰
۲۹	ماہنامہ صدائے اڑیسہ	ایضاً	۱۹۸۳ء	۱-۱۲
۳۰	ماہنامہ صدائے اڑیسہ	ایضاً	۱۹۸۴ء	۲-۱۳
۳۱	ماہنامہ صدائے اڑیسہ	ایضاً	۱۹۸۴ء	۲-۱۷
۳۲	اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر	روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی	۱۹۸۲ء	
۳۳	ماہنامہ کاف نون	پی ۳۵ نیا امام باڑہ، گارڈن ریچ کلکتہ	اکتوبر ۱۹۸۱ء	

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۳۴	ماہنامہ شاعر	مکتبہ قصر الادب، بمبئی ۸	۱۹۸۱ء	ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام
۳۵	ماہنامہ شاعر	ایضاً	۱۹۸۱ء	گوشۂ مظہر امام
۳۶	سوونیئر آل انڈیا مشاعرہ	بزم سخن اڑیسہ۔ کٹک	۱۳ر اگست ۱۹۷۷ء	—
۳۷	ماہنامہ جواز	مولانا آزاد روڈ۔ نیا پورہ۔ مالیگاؤں	۷ر دسمبر ۱۹۷۷ء تا مئی ۱۹۷۸ء	شمارہ ۵
۳۸	ماہنامہ جواز	ایضاً	دسمبر ۱۹۷۹ء تا فروری ۱۹۸۰ء	شمارہ ۱۱
۳۹	ماہنامہ آجکل	پبلی کیشن ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی	اگست ۱۹۷۴ء	
۴۰	ماہنامہ آجکل	ایضاً	جون ۱۹۷۸ء	۳۶—۱۱
۴۱	ماہنامہ آجکل	ایضاً	جولائی ۱۹۷۸ء	۳۶—۱۲
۴۲	ماہنامہ سب رس	حیدرآباد	جنوری ۱۹۷۲ء	
۴۳	ماہنامہ محشر	بمبئی	جنوری ۱۹۴۳ء	
۴۴	ہفتہ وار ہماری زبان	اردو گھر راؤز ایونیو۔ نئی دہلی	۸ر جولائی ۱۹۷۹ء	

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۴۵	ماہنامہ اقبال	آسنسول	۱۹۷۲ء	جلد ۶
۴۶	ماہنامہ فروغ اردو	لکھنؤ	فروری ۱۹۷۳ء	
۴۷	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	جنوری ۱۹۷۳ء	
۴۸	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	اکتوبر ۱۹۷۲ء	
۴۹	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	نومبر ۱۹۷۲ء	
۵۰	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	اپریل ۱۹۷۹ء	
۵۱	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	فروری ۱۹۸۰ء	
۵۲	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	مارچ ۱۹۸۰ء	
۵۳	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	جون تا اکتوبر ۱۹۸۰ء	
۵۴	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	جنوری ۱۹۸۱ء	
۵۵	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	مارچ ۱۹۸۱ء	

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۵۶	ماہنامہ فروغ اردو	لکھنؤ	اپریل سنہ ۱۹۸۱ء	
۵۷	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	مئی سنہ ۱۹۸۳ء	
۵۸	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	جون سنہ ۱۹۸۳ء	
۵۹	ماہنامہ فروغ اردو	ایضاً	جولائی سنہ ۱۹۷۲ء	
۶۰	ایضاً	ایضاً	مارچ سنہ ۱۹۷۲ء	
۶۱	ایضاً	ایضاً	جون سنہ ۱۹۷۲ء	
۶۲	ایضاً	ایضاً	اگست سنہ ۱۹۷۲ء	
۶۳	ایضاً	ایضاً	دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	
۶۴	ایضاً	ایضاً	اپریل سنہ ۱۹۷۳ء	
۶۵	ایضاً	ایضاً	مئی سنہ ۱۹۷۳ء	
۶۶	ایضاً	ایضاً	جون سنہ ۱۹۷۳ء	

نمبر شمارہ	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۶۷	ماہنامہ فروغ اردو	لکھنؤ	جون ۱۹۷۴ء	
۶۸	ایضاً	ایضاً	اکتوبر ۱۹۷۴ء	
۶۹	ایضاً	ایضاً	دسمبر ۱۹۷۴ء	
۷۰	ایضاً	ایضاً	مارچ ۱۹۷۵ء	
۷۱	ایضاً	ایضاً	اپریل ۱۹۷۵ء	
۷۲	ایضاً	ایضاً	جولائی اگست ۱۹۷۵ء	
۷۳	ایضاً	ایضاً	اکتوبر ۱۹۷۵ء	
۷۴	ایضاً	ایضاً	دسمبر ۱۹۷۵ء	
۷۵	ایضاً	ایضاً	اگست ۱۹۷۶ء	
۷۶	ایضاً	ایضاً	نومبر ۱۹۷۶ء	
۷۷	ایضاً	ایضاً	دسمبر ۱۹۷۶ء	

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۷۸	ماہنامہ فروغ اردو	لکھنؤ	نومبر ۱۹۷۷ء	
۷۹	ماہنامہ صبح امید	بمبئی	جولائی ۱۹۷۳ء	قومی یکجہتی نمبر
۸۰	ایضاً	ایضاً	ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء	
۸۱	ایضاً	ایضاً	جون ۱۹۷۴ء	
۸۲	ایضاً	ایضاً	اگست ۱۹۷۴ء	
۸۳	ایضاً	ایضاً	ستمبر ۱۹۷۴ء	
۸۴	ایضاً	ایضاً	دسمبر ۱۹۷۴ء	
۸۵	ایضاً	ایضاً	فروری مارچ ۱۹۷۵ء	
۸۶	ایضاً	ایضاً	اپریل ۱۹۷۵ء	
۸۷	ماہنامہ صنم "بہار نمبر"	پٹنہ	۱۹۵۹ء	
۸۸	ماہنامہ شاعر	بمبئی	۱۹۷۴ء	قومی یکجہتی نمبر

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۸۹	ماہنامہ گنگ وجمن	کانپور	دسمبر ۱۹۷۵ء	
۹۰	ماہنامہ آج کل	نئی دہلی	جنوری ۱۹۷۶ء	
۹۱	ماہنامہ پرواز	لدھیانہ	اگست ۱۹۶۴ء	
۹۲	ایضاً	ایضاً	اکتوبر ۱۹۶۴ء	
۹۳	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۴ء	دیوالی ایڈیشن
۹۴	ایضاً	ایضاً	جون ۱۹۶۵ء	
۹۵	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۵ء	آزادی ایڈیشن
۹۶	ایضاً	ایضاً	جنوری ۱۹۶۶ء	
۹۷	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۶ء	بیساکھی ایڈیشن
۹۸	ایضاً	ایضاً	ستمبر ۱۹۶۶ء	
۹۹	ماہنامہ خاتون مشرق	دہلی	ستمبر ۱۹۶۶ء	

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۱۰۰	ماہنامہ خاتون مشرق	دہلی	نومبر ۱۹۶۶ء	
۱۰۱	ماہنامہ واقعات	دہلی	اپریل ۱۹۷۳ء	
۱۰۲	ماہنامہ معمار	آرمور، حیدرآباد	نومبر ۱۹۷۴ء	
۱۰۳	ماہنامہ نشانات	مالیگاؤں	ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء	
۱۰۴	ماہنامہ آہنگ	گیا	ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء	
۱۰۵	ماہنامہ گل نو	حیدرآباد	جنوری ۱۹۷۶ء	
۱۰۶	ماہنامہ تحریک	دہلی	جنوری ۱۹۷۶ء	
۱۰۷	ماہنامہ تحریک	دہلی	مئی ۱۹۷۶ء	
۱۰۸	ہفت روزہ مورچہ	گیا	۲۵ر دسمبر ۱۹۷۶ء	
۱۰۹	ماہنامہ تحریک	دہلی	نومبر ۱۹۷۶ء	
۱۱۰	دوماہی الفاظ	علی گڑھ	نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء	

نمبر شمار	اخبار/رسائل کے نام	جائے اشاعت	تاریخ اشاعت	جلد/شمارہ
۱۱۱	ماہنامہ شیبا	بمبئی	اپریل ۱۹۷۷ء	
۱۱۲	ماہنامہ تحریک	دہلی	جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۸ء	سلور جوبلی نمبر
۱۱۳	ماہنامہ شاعر	بمبئی	۱۹۷۸ء	شمارہ ۱۲
۱۱۴	ماہنامہ تحریک	دہلی	جنوری ۱۹۷۹ء	
۱۱۵	ماہنامہ سب رنگ	بمبئی	فروری ۱۹۷۷ء	
۱۱۶	ماہنامہ آجکل	دہلی	فروری ۱۹۸۴ء	
۱۱۷	ماہنامہ تحریک	نئی دہلی	نومبر ۱۹۸۰ء	
۱۱۸	عصری ادب	۷/ڈی ماڈل ٹاؤن، دہلی	شمارہ ۳۵ ۱۹۸۳ء	

English

1. Adam, W. - Vernacular Education in Bengal and Bihar - 1835
2. Anwarul Haque, Dr. - Muslim Administration in Orissa - 1981
3. Basu : History of Education in India under the company
4. Cunningham : Ancient Geography of India.
5. Jena, K.C. : The Ascendancy of the British Raj in Orissa, June 1982
6. Kary, J.W. : The Administration of East India Company
7. Machaulay, L : Minute on Education - 1835
8. Mahtab, Dr. H.K. : History of Orissa Part I
9. Mansinha, M. : History of Oriya Literature
10. Noorullah, & Naik : History of Education in India.
11. O'Malley, LSS : Early History of Education, 1933
12. O' Malley, LSS : Education, Bihar & Orissa District Gazetteers (PURI) 1929
13. Peggs, I : A General History of Baptist Mission in Orissa, 1846
14. Patro, K.M. : India under East India Company
15. Rath, B.N. : Development of Education in Orissa
16. Sahu, Dr. N.K. : Historical Geography of Orissa, 1982
17. Samal, J.K. : Orissa under the British Crown, 1977
18. Samantray, N : History of Oriya Literature
19. Sattianandham : History of Education in the Madras Presidency

20. Sharp, W.H. : Selection from Educational Records
21. Stara, H.A. : Vernacular Education in Bengal, 1916
22. Starling, A. : An Account of Orissa Proper or Cuttack. 1822
23. Sutton, A. : Narrative of the Mission in Orissa
24. Yripathy, Dr. K.B. : The Evolution of Oriya Language and Script.

Other Records

1. Selection from Education Records 1781-1894
2. Asiatic Researches, Vol. XV
3. Orissa History Research Journal Vol. I No. I
4. Orisssa Historical Journal, Vol. II September 1953 & Jan. 1954
5. Revenue Report Dated 21.2.1825 from Secretary to the Board of Revenue.
6. Journal of Education, Madras Vol. XXXVI-1896
7. Selection from the Records of Madras Government Vol. XV, Report on Public Instruction in the Madras Presidency for the year 1968-69.
8. Report on the 3rd tour of Pent land, Governor of Madras to Ganjam in 1913.
9. Papers Relating to East India Affairs : Hindoo widows & voluntary immolation, 1.7.1821
10. General Report on the Public Instruction in the Lower Provinces of Bengal Presidency 1857-58.
11. Ibid, 1869
12. Abstract from the Annual Report in Progress of Education in Orissa, 1904-5
13. Woods Despatch, 1854

Price Rs.157/-

Printed at : JK Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-6